بیس ملکوں کا سفرنامہ

جہانِ دیدہ

محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

جملہ حقوقِ طباعت بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی محفوظ ہیں

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی
طبع جدید : جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ - مئی ۲۰۱۱ء
مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
فون : 92-21-35031565, 35123130
ای میل : info@quranicpublishers.com
mm.q@live.com
ویب سائٹ :
ONLINE SHARIAH
www.ONLINESHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

کس کا خیال کونسی منزلِ نظر میں ہے؟
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے!

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- ادارۃ المعارف، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- ادارہ اسلامیات، کراچی/ لاہور
- بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدر آباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان

www.freepdfpost.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

پیش لفظ

اپنی ذات کی طرف دیکھوں تو اپنا سفرنامہ لکھنے کا خیال بھی ایک خبط معلوم ہوتا ہے، میرے والد ماجد (رحمتہ اللہ علیہ) کے بقول کوئی مکھی مچھر ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ کر چلا جائے تو اس کا سفرنامہ کون لکھے؟ اور کیوں لکھے؟ لیکن جب میں نے ۱۹۶۳ء میں برادرِ محترم جناب محمد ولی رازی صاحب کے ساتھ عمرے کا سفر کیا تو سفرنامے لکھنے کا شوق اس لیے پیدا ہوا کہ اس کے بہانے حجاز کے مقاماتِ مقدسہ اور ان سے وابستہ تاریخ کے دلکش واقعات لکھنے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے وہ سفرنامہ بڑے ذوق وشوق اور تفصیل سے لکھنا شروع کیا، اور یہ واقعہ ہے کہ

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

لیکن اس سفرنامے کی تکمیل اور اشاعت مقدر میں نہ تھی۔ اسی سفر سے واپسی میں ایک روز بحری جہاز کے عرشے سے اس کا مسودہ ایسا گم ہوا کہ ہزار تلاش اور اعلانات کے باوجود مل نہیں سکا، اور اس کے بعد ایسی ہمت ٹوٹی کہ میں اسے دوبارہ نہ لکھ سکا، اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں حجاز کا مفصل سفرنامہ شامل نہیں ہے۔

اس واقعے کے بعد مدتوں حجاز کے علاوہ کسی جگہ نہ کوئی قابل ذکر سفر پیش آیا، نہ سفرنامہ لکھنے کا کوئی داعیہ پیدا ہوا۔ لیکن ماہنامہ "البلاغ" کی ادارت کے دوران جو سفر پیش آتے رہے، ان کے بارے میں اپنے ہلکے پھلکے تاثرات میں "البلاغ" میں لکھتا رہا۔ بالآخر ایک ایسا دور آیا کہ سفر جزو زندگی بن گیا، اور پے در پے ملکی اور غیر ملکی سفروں کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ

www.freepdfpost.blogspot.com

یہاں تک کہہ دیا کہ اب تمہیں ''غیر رہائشی'' (Non-Resident Pakistani) پاکستان قرار دے دینا چاہئے۔

ان سفروں کا آغاز عالم اسلام کے ان خطوں سے ہوا جن سے تاریخ اسلام کی بڑی قیمتی یادیں وابستہ تھیں، اور جنہیں دیکھنے کا شوق اس وقت سے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ جب سے تاریخ اسلام کی ابجد پڑھنی شروع کی تھی۔ لہٰذا ایک بار پھر ان علاقوں کے سفر کی سرگزشت لکھنے کا داعیہ اس خیال سے پیدا ہوا کہ اس بہانے تاریخ کے ان گم گشتہ اوراق کو سامنے لانے اور بہت سی مایۂ ناز شخصیتوں کا تذکرہ کرنے کی حلاوت نصیب ہوگی۔ چنانچہ میں نے عراق، مصر، الجزائر، اردن، شام اور ترکی وغیرہ کے سفرنامے اسی جذبے کے ماتحت لکھے، اور قسط وار ''البلاغ'' میں شائع ہوتے رہے۔

اگرچہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بناء پر یہ نامے بھاگ دوڑ ہی کی حالت میں لکھے گئے، اور دلجمعی کے ساتھ لکھنے کا موقع کم ہی ملا، لیکن چونکہ وہ سفرنامے کم، اور تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے مجموعے زیادہ تھے، اس لیے قارئین نے انہیں بہت دلچسپی سے پڑھا، اور میرے پاس ایسے خطوط کا ایک انبار لگ گیا جن میں ان سفرناموں کو مستقل کتابی شکل میں شائع کرنے کی تجویز بڑی تاکید کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

یہ کتاب ''جہانِ دیدہ'' اپنے کرم فرماؤں کی اسی فرمائش کی تعمیل ہے، اور اس میں میرے اب تک کے لکھے ہوئے اہم سفرنامے یکجا ہوگئے ہیں۔ ان سفرناموں کو تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا، بلکہ پہلے عالم اسلام کے سفرنامے دیئے گئے ہیں اور ان کے بعد غیر مسلم ممالک کے۔ عزیز گرامی مولانا محمود اشرف عثمانی سلمہٗ اور برادر زادۂ عزیز سعود اشرف عثمانی سلمہٗ نے لاہور میں اپنی نگرانی میں اس کتاب کی کتابت میں جو دلچسپی لی، اس کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔ پھر کتابت تیار ہونے پر میرے بیٹے عزیزم عمران اشرف سلمہٗ کا اصرار ہوا کہ اس کے ساتھ اشاریہ بھی ضرور ہونا چاہئے، چنانچہ انہوں نے عزیزم محمد یحییٰ سلمہٗ کے ساتھ مل کر بڑی خوش اسلوبی سے اس کا اشاریہ مرتب کیا جو کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ خدا کرے کہ یہ مجموعہ قارئین کے لئے دلچسپی، معلومات اور فائدے کا باعث ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴ — ۱۵ محرم ۱۴۱۰ھ

رختِ سفر

ایک مسافر جب کسی طویل سفر پر روانہ ہوتا ہے، خواہ وہ سفر کتنے شوق اور کتنی اُمنگوں کا کیوں نہ ہو، تو اس کے دل میں ملے جلے جذبات کا ایک عجیب عالم ہوتا ہے، وطن اور گھر والوں کی جدائی اُن کی خیر و عافیت کی فکر، اپنے سفر کے مراحل کا خیال، منزل کی دوری کا احساس، نئے ماحول اور نئے ملک کے بارے میں تخمینے اور اندیشے، واپس خیریت و سہولت کے ساتھ گھر پہنچنے اور گھر والوں کو بعافیت پانے کی آرزو، غرض نہ جانے کتنے خیالات و احساسات ہوتے ہیں، جن کے تلاطم میں انسان گھر سے روانہ ہوتا ہے۔

خیالات و احساسات کے اس ہجوم میں مجھے ہمیشہ جس چیز نے بڑی تسکین بخشی، دل چاہتا ہے کہ سفرنامے شروع کرنے سے پہلے قارئین کو اس کا تحفہ پیش کر دیا جائے، اور وہ ہیں حضور سرورِ دو عالم ﷺ کی وہ پاکیزہ اور پُراثر دعائیں جو آپ ﷺ سفر پر روانہ ہوتے وقت فرماتے تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مسافر کی ضروریات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جو ان اثر بھرے الفاظ میں سمٹ نہ آیا ہو، ایک مسافر کی بشری نفسیات سے آپ ﷺ سے زیادہ کون واقف ہوسکتا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا، جس کا احاطہ ان دعاؤں میں نہ کرلیا ہو، دعائیں یہ ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ وَاعْتَصَمْتُ بِاللّٰهِ وَتَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ
وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ.

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ
وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ.

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ
وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ.

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا هٰذَا السَّفَرَ وَاطْوِعَنَّا بُعْدَهٗ،

www.freepdfpost.blogspot.com

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ فِیْ سَفَرِیْ ھٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی وَمِنَ الْعَمَلِ مَاتَرْضٰی.

ان دعاؤں کی اصل تاثیر اور ان میں چھپے ہوئے معانی کا صحیح ادراک تو انہی عربی الفاظ میں ہوسکتا ہے جو زبانِ رسالت مآب ﷺ سے ادا ہوئے، اور کون ہے جو ان معانی اور کیفیات کو کسی اور زبان میں منتقل کر سکے۔ تاہم مرکزی مفہوم سمجھنے کیلئے ان کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ کے نام سے، میں اللہ کا سہارا لیتا ہوں، میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

اے اللہ! تو ہی میرے سفر کا ساتھی ہے، اور تُو ہی میری غیر موجودگی میں میرے گھر والوں، میرے مال اور اولاد کا محافظ ہے۔

اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں سفر کی مشقت سے، ایسے منظر سے جو غم انگیز ہو، اور اس بات سے کہ جب میں اپنے گھر والوں اور مال و اولاد کے پاس واپس آؤں تو بُری حالت میں آؤں۔

یا اللہ! ہمارے لئے سفر کو آسان بنا دیجئے، اور اس کی مسافت کو ہمارے لیے لپیٹ دیجئے۔

اے اللہ! میں تجھ سے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کی توفیق مانگتا ہوں، اور ایسے عمل کی جس سے تو راضی ہو۔

جب سواری پر سوار ہوتے تو فرماتے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ.

پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس سواری کو رام کر دیا، جبکہ ہم میں اس کی طاقت نہ تھی، اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

جب کسی نئی بستی یا نئے شہر میں قیام کی غرض سے داخل ہوتے تو یہ دعا فرماتے کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ مِنْ خَیْرِ ھٰذِہِ الْقَرْیَةِ وَخَیْرِ اَھْلِھَا وَخَیْرِ مَافِیْھَا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَ شَرِّ اَھْلِھَا وَشَرِّمَا فِیْھَا.

اے اللہ! میں آپ سے اس بستی کی، اس کے رہنے والوں کی اور اس میں جو کچھ ہے اس کی بھلائی کا طلب گار ہوں، اور اس بستی، اس کے باشندوں اور اس میں جو کچھ ہے، اس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

قلب و نگاہ اگر مادّے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں تو بات دوسری ہے، ورنہ ایک مسافر کے لیے اس سے بہتر رخت سفر کیا ہوسکتا ہے؟

www.freepdfpost.blogspot.com

فہرست

مضمون	صفحہ نمبر
پیش لفظ	
رختِ سفر	
وادئ دجلہ وفرات (عراق)	۳
سعودی عرب	۸
اسلامی فقہ اکیڈمی	۹
عراق	۱۵
اولیائے کرام کے مزارات پر	۲۴
حضرت معروف کرخیؒ	۲۵
حضرت سری سقطیؒ	۲۷
حضرت جنید بغدادیؒ	۲۹
کاظمیہ میں	۳۲
امام ابو یوسفؒ کے مزار پر	۳۶
حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر	۴۰
کتب خانوں میں	۴۳
وزارتِ اوقاف میں	۴۴
مدائن میں	۴۵
حضرت حذیفہ بن یمانؓ	۵۲

مضمون	صفحہ نمبر
حضرت عبداللہ بن جابرؓ	۵۵
ایک عجیب ایمان افروز واقعہ	۵۵
کسریٰ کا محل	۵۸
کوفہ کا سفر	۶۴
جامع کوفہ	۶۸
دارالامارۃ	۷۱
حضرت علیؓ کا مکان	۷۲
نجف میں	۷۳
کربلا کا سفر	۷۵
بغداد میں آخری رات	۷۷
مصر اور الجزائر میں چند روز	۸۱
اہرامِ مصر	۸۳
ابوالہول	۸۷
جامع عمرو بن العاصؓ	۸۸
سفر الجزائر	۹۰
بجایہ میں	۹۰
کانفرنس	۹۳

مضمون	صفحہ نمبر
قدیم شہر بجایہ میں	۹۷
جامع مسجد اور باب البعود	۹۹
علامہ عبدالحق اشبیلی کے مزار پر	۱۰۰
وادئ صومام میں	۱۰۳
الجزائر واپسی	۱۰۵
عقبہ بن نافع اور ان کی فتوحات	۱۰۶
الجزائر کی مختصر تاریخ	۱۱۱
مجوسی تاثرات	۱۱۹
دوبارہ قاہرہ میں	۱۲۰
روضہ اور اس کی فتح کا واقعہ	۱۲۲
سورالعیون	۱۲۸
سلطان صلاح الدینؒ کا قلعہ	۱۲۸
جبل المقطم	۱۲۹
امام شافعیؒ کے مزار پر	۱۲۹
حضرت لیث بن سعدؒ کے مزار پر	۱۳۳
شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کے مزار پر	۱۳۵
فسطاط کا علاقہ	۱۳۹
حضرت عقبہ بن عامرؓ	۱۴۴
دریائے نیل	۱۴۵
جامعۃ الأزہر میں	۱۴۸

مضمون	صفحہ نمبر
شیخ الازہر اور وکیل الازہر سے ملاقات	۱۵۱
حافظ ابن حجر کی مسجد میں	۱۵۲
حافظ بلقینی کے مزار پر	۱۵۶
جامع الحاکم	۱۵۸
ابن ہشام نحویؒ	۱۵۸
علامہ عینی کی مسجد	۱۵۹
علامہ دردیر مالکیؒ	۱۶۱
مجوسی تاثرات	۱۶۲
اُحد سے قاسیون تک (سعودی عرب، اُردن، شام)	۱۶۷
خیبر	۱۶۹
تیماء میں	۱۷۷
تبوک میں ایک رات	۱۷۹
عمان میں	۱۸۳
رومی اسٹیڈیم	۱۸۴
حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار پر	۱۸۶
وادئ شعیبؑ میں	۱۸۸
اغوار میں	۱۹۰
حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ	۱۹۲
حضرت ضرار بن ازورؓ	۲۰۰

www.freepdfpost.blogspot.com

مضمون	صفحہ نمبر
حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کا مزار	۲۰۰
بحرمیت کے کنارے	۲۰۷
اصحابِ کہف کے غار میں	۲۱۵
مُوتہ کا سفر	۲۲۵
غزوۂ موتہ	۲۲۸
میدانِ موتہ	۲۳۴
حضرت زید بن حارثہؓ	۲۳۵
حضرت جعفر طیارؓ کے مزار پر	۲۳۹
حضرت عبداللہ بن رواحہؓ	۲۴۰
دریائے اردن	۲۴۳
مجوسی تاثرات	۲۴۷
شام کی حدود میں	۲۴۹
جامعہ دمشق میں	۲۵۲
شہر دمشق	۲۵۳
غوطہ میں	۲۵۵
الباب الصغیر کے قبرستان میں	۲۵۷
حضرت بلال حبشیؓ	۲۵۸
حضرت ابن اُم مکتومؓ	۲۶۲
اُم المومنین حضرت اُم حبیبہؓ	۲۶۵
حضرت اسماءؓ بنت یزید	۲۷۰

مضمون	صفحہ نمبر
حضرت اسماءؓ بنت عمیس	۲۷۱
جامع اموی دمشق میں	۲۷۲
نورالدینؒ زنگی کے مزار پر	۲۷۸
سلطان صلاح الدین ایوبیؒ	۲۸۰
بازار حمیدیہ میں	۲۸۱
باب الجابیہ	۲۸۲
جبل قاسیون پر	۲۸۴
شیخ محی الدین ابن عربی	۲۸۵
کتب خانے	۲۸۸
داریا میں	۲۸۹
حضرت ابوسلیمان دارانیؒ	۲۹۰
حضرت ابوثعلبہ الخشنیؓ	۲۹۲
حضرت ابومسلم خولانی	۲۹۳
حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار	۲۹۶
مزّہ میں	۲۹۷
حضرت دحیہ کلبیؓ	۲۹۸
علماء کا اجتماع	۳۰۰
دمشق کا عجائب گھر	۳۰۱
حضرت معاویہؓ کے مزار پر	۳۰۲
علامہ ابن عابدین شامیؒ	۳۰۴

مضمون	صفحہ نمبر
مجوسی تاثرات	۳۰۸
سلطان محمد فاتح کے شہر میں (ترکی)	۳۱۳
ایتھنز	۳۱۴
استنبول شہر کا تعارف	۳۱۸
قسطنطنیہ پر حملے	۳۱۹
سلطان محمد فاتحؒ	۳۲۳
خشکی پر جہاز	۳۲۵
آخری حملہ اور فتح	۳۲۷
مذاکرے کا افتتاح	۳۳۰
سلطان احمد کی مسجد میں	۳۳۲
اَت میدان	۳۳۵
توپ کاپے سرائے اور اسکے نوادر	۳۳۶
تبرکات	۳۳۸
دوسرے تاریخی نوادر	۳۴۰
آیا صوفیا	۳۴۳
آبنائے باسفورس اور طرابیہ	۳۴۸
قصر یلدز میں	۳۴۹
باربروسا	۳۵۲
متفرق مصروفیات	۳۵۳
جامع ابوایوب انصاریؓ	۳۵۴

مضمون	صفحہ نمبر
فاتح نمازگاہی	۳۵۷
خشکی پر جہاز چلانے کی جگہ قاسم پاشا	۳۵۷
برج غلاطہ	۳۵۸
جامع سلیمانیہ	۳۵۹
سلیمانِ اعظم	۳۶۱
زینانِ معمار	۳۶۲
کتب خانہ سلیمانیہ	۳۶۳
بند بازار (قبالی جارشی)	۳۶۴
مدرسہ تحفیظ القرآن	۳۶۴
آخری دن	۳۶۷
ایمریگان پارک	۳۶۷
رومیلی حصار	۳۶۸
باسفورس کا پُل اور ایشیائی استنبول	۳۶۹
واپسی کا سفر	۳۷۱
جزیروں کا ملک (سنگاپور و انڈونیشیا)	۳۷۵
بنگلہ دیش میں چند دن (بنگلہ دیش)	۳۸۷
قطر سیرت کانفرنس (قطر)	۳۹۵

www.freepdfpost.blogspot.com

وادیٔ دجلہ وفرات

جنوبی افریقہ، سعودی عرب اور عراق

ربیع الاول ۱۴۰۵ھ نومبر ۱۹۸۴ء

مضمون	صفحہ نمبر
دورۂ چین (چین)	۴۰۹
بیجنگ کی نیو جے مسجد	۴۱۷
جامع مسجد دونگ سی	۴۲۱
شہرِ ممنوعہ کی سیر	۴۲۳
دیوارِ چین	۴۲۵
منگ مقبرے	۴۲۸
گریٹ ہال میں ضیافت	۴۳۰
نائب صدر سپریم کورٹ کی طرف سے ظہرانہ	۴۳۲
صوبہ کانسو کا سفر	۴۳۵
لن شا کا سفر	۴۳۹
لن شا کی جامع مسجد میں جمعہ	۴۴۳
چھینگ ہائی کا سفر	۴۴۵
سالار کاؤنٹی میں	۴۴۶
ھنگ شہر میں	۴۵۰
بیجنگ کی طرف واپسی	۴۵۲
مجموعی تاثرات	۴۵۴
چین میں اشتراکیت کا تجربہ	۴۵۴
ثقافتی انقلاب	۴۵۷
عام نظامِ زندگی	۴۶۵

مضمون	صفحہ نمبر
مسلمانوں کا حال اور مستقبل	۶۹
امریکہ اور یورپ کا پہلا سفر (امریکہ ، برطانیہ)	۷۵
ہندوستان کا سفر (انڈیا)	۹۷
جنوبی افریقہ کے دو سفر (کینیا اور جنوبی افریقہ)	۴۱
دوسرا سفر	۵۳
دیارِ مغرب میں تین ہفتے (فرانس، امریکہ، کینیڈا)	۷۵
ٹورنٹو میں	۷۹
نیاگرا آبشار	۸۳
سائنس سینٹر	۸۶
مانٹریال میں	۸۸
میکگل یونیورسٹی	۸۹
معہد الرشید الاسلامی	۹۵
اولمپک اسٹیڈیم	۹۷
شکاگو	۱۰۱
آخری دن پیرس میں	۱۰۵
مجموعی تاثرات	۱۰۸
انڈکس (اشاریہ)	۱۰۹

www.freepdfpost.blogspot.com

قافلۂ حجاز میں ایک حُسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسُوئے دجلہ و فرات

(۱)

وادیٔ دجلہ و فرات

میرا صفر کا پورا مہینہ اور اس کے بعد ربیع الاوّل کے کچھ ایام بیرونِ ملک سفر میں صرف ہوئے۔ پانچ ہفتوں کے اس سفر میں مجھے کینیا، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، اور عراق چار ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دورے کی بہت سی باتیں یقیناً قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہوں گی۔ اس لیے اس کے مختصر حالات و تاثرات پیش خدمت ہیں۔

آج سے تقریباً دو سال قبل مرزا غلام احمد قادیانی کے لاہور متبعین نے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) کی سپریم کورٹ میں مسلمانوں کے خلاف یہ درخواست دائر کی تھی کہ یہاں کے مسلمان ہمیں اپنی مسجدوں میں پڑھنے اور اپنے قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکتے ہیں، اور ہمیں غیر مسلم قرار دیتے ہیں، حالانکہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہماری ہتک عزت ہوئی ہے، اس سلسلے میں ہم ایک باضابطہ مقدمہ سپریم کورٹ میں دائر کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب تک اس مقدمہ کا تصفیہ ہو، مسلمانوں کو عارضی حکم امتناعی جاری کیا جائے کہ وہ اس دوران ہمیں کافر کہنے اور مسجد اور قبرستانوں کو ہمارے لئے ممنوع قرار دینے سے باز رہیں، اس وقت وہاں کی سپریم کورٹ نے اس قسم کا عبوری حکم امتناعی جاری بھی کر دیا تھا۔

جب اس حکم امتناعی کی توثیق کا مرحلہ آیا تو وہاں کے مسلمانوں کی فرمائش پر پاکستان سے ایک وفد مسلمانوں کی مدد کیلئے گیا تھا، جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس مرحلے پر عدالت نے اپنا حکم امتناعی واپس لے کر مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جس کی مفصل روداد میں دو سال قبل البلاغ کے محرم وصفر ۱۴۰۳ھ کے شمارے میں لکھ چکا ہوں۔

اس کے بعد مرزائی صاحبان نے سپریم کورٹ میں اصل مقدمہ دائر کر دیا۔ وہاں کے عدالتی طریق کار کے مطابق دعویٰ، جواب دعویٰ اور جانبین کی طرف سے ان کی تحریریں وضاحتوں میں تقریباً دو سال لگ گئے اور بالآخر مقدمے کی سماعت کے لئے یکم نومبر کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

اس مقدمے کے مختلف مراحل کا جائزہ لینے کیلئے پاکستان میں ایک کمیٹی بنی ہوئی تھی۔ اس مرحلے پر کیپ ٹاؤن کے مسلمانوں نے اس کمیٹی سے دوبارہ فرمائش کی کہ وہ مقدمے سے کچھ پہلے وہاں پہنچ کر اُن کی مدد کرے، اور ایسے ماہر گواہوں کا بھی انتظام کرے، جو بوقت ضرورت مسلمانوں کی طرف سے گواہی دے سکیں۔ چنانچہ یہاں سے رابطۃ العالم الاسلامی کے زیر اہتمام اور جناب مولانا ظفر احمد انصاری کی زیر قیادت ایک گیارہ رُکنی وفد تشکیل دیا گیا، جس میں قائد وفد اور احقر کے علاوہ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) محمد افضل چیمہ صاحب، جناب ریاض الحسن گیلانی ڈپٹی اٹارنی جنرل پاکستان، جناب مولانا محمد یوسف لدھیانوی، جناب علامہ خالد محمود، جناب مولانا عبدالرحیم اشعر، جناب حاجی غیاث محمد صاحب (سابق اٹارنی جنرل پاکستان)، جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری اور جناب پروفیسر محمود احمد غازی صاحب شامل تھے۔

۲۵ر اکتوبر کو شام پانچ بجے ہم پی آئی اے کے طیارے کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے اور ابوظہبی میں ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد رات کے گیارہ بجے نیروبی پہنچے، رات نیروبی میں گزار کر صبح ۷ بجے برٹش ایئرویز کے طیارے سے دوبارہ روانہ ہوئے، اور مقامی وقت کے مطابق گیارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ پہنچے، جوہانسبرگ میں جمعیۃ علماء ٹرانسوال کے سربراہ مولانا ابراہیم میاں اور ان کے رفقاء اور دوسرے احباب نے استقبال کیا، نمازِ جمعہ کا وقت قریب تھا اس لئے پہلے جمعہ کی ادائیگی ضروری تھی، چنانچہ میزبانوں کی تجویز کے مطابق اعضاء وفد مختلف مساجد میں تقسیم ہوگئے۔ احقر نے کرک اسٹریٹ کی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھائی، اور انگریزی میں مختصر خطاب بھی ہوا۔

جمعہ کے بعد وفد کے تمام ارکان مولانا ابراہیم میاں کے مدرسے اسلامی مرکز ”واٹر فال اسلامک انسٹیٹیوٹ“ پہنچے، اور رات وہیں گذاری۔ اس دوران انسٹیٹیوٹ کے کتب خانے سے استفادہ ہوتا رہا۔ مولانا نے اس دور دراز مقام پر علمی کتابوں پر بڑا ذخیرہ یہاں جمع کر لیا ہے، جو غالباً جنوبی افریقہ میں دینی کتب کا سب سے بہترین ذخیرہ ہے۔

۲۷ر اکتوبر کی صبح دس بجے جوہانسبرگ سے روانہ ہوئے، اور دو گھنٹے کی پرواز کے بعد بارہ بجے کیپ ٹاؤن کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ اگرچہ جنوبی افریقہ میں گرمیوں کی آمد آمد تھی، لیکن موسم بڑا خوشگوار اور ہمارے لحاظ سے کسی قدر سرد تھا۔ ہوائی اڈے پر کیپ ٹاؤن کی مسلم تنظیموں کے نمائندے اور عام مسلمان بڑی تعداد میں استقبال کے لیے موجود تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی روایتی مہمان نوازی کا غیر معمولی نقش دلوں پر قائم کیا۔

شروع میں مقدمے کی تاریخ یکم نومبر مقرر تھی، لیکن مدعی کی طرف سے چار روز کی مزید مہلت طلب کی گئی جو عدالت نے دے دی۔ لہٰذا مقدمہ ۴ر نومبر کو شروع ہوا۔ مقدمے کے پہلے دن سماعت کے لئے کیپ ٹاؤن شہر سے باہر ایک مضافاتی بستی کی عدالت کو منتخب کیا گیا تھا جو شہر سے تقریباً تیس میل دور ہوگی۔ لیکن مقدمے سے عام مسلمانوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سویرے سے وہاں پہنچنے شروع ہو گئے تھے، اور جب مقدمہ شروع ہوا تو نہ صرف ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بلکہ راہداریوں میں بھی تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، اور ملحقہ برآمدے میں بھی کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ ابتداء میں مسلمانوں کے فاضل وکیل اسماعیل محمد صاحب نے عدالت سے درخواست کی کہ اصل مقدمے کی کارروائی سے قبل وہ اس نکتے پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اس مقدمے کی سماعت اس عدالت کیلئے مناسب نہیں ہے۔ جج نے اس نکتے پر بحث کرنے کا جواز فاضل وکیل سے طلب کیا تو انہوں نے اس سلسلے میں اپنے دلائل پیش کئے۔ بعد میں جج نے مدعی کے وکیل مسٹر فارم سے پوچھا کہ اس بارے میں ان کا کیا مؤقف ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر مسٹر اسماعیل محمد اس موضوع پر بحث کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ان کی بحث گواہیوں کے بغیر محض بحث ہونی چاہئے۔ اس پر جج نے

www.freepdfpost.blogspot.com

کہا کہ میں اس بات کا فیصلہ کل سناؤں گا کہ ان ابتدائی قانونی نکات پر بحث سنی جائے یا نہیں؟ اور اس پر اُس دن عدالت برخاست ہوگئی۔

اگلے روز جج صاحب نے یہ فیصلہ دیا کہ مسٹر اسماعیل محمد کو ابتدائی قانونی نکات پر بحث کی اجازت دی جاتی ہے، البتہ وہ اپنے نکات کے ثبوت میں صرف بحث کریں گے، کوئی گواہی پیش نہیں کریں گے۔ چنانچہ پھر شام تک مسٹر اسماعیل محمد اپنے نکات کے حق میں دلائل پیش کرتے رہے۔ ان کی تقریر ماشاء اللہ اتنی مدلل، عمیق، حوالوں سے بھرپور اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اتنی مسحور کن تھی کہ سارا دن گزر گیا، اور وقت کا اندازہ بھی نہ ہوسکا۔ مقدمے کی اتنی بھرپور تیاری اور اُسے پیش کرنے کا ایسا دل کش اور مرتب انداز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

۶ نومبر کو فریق مخالف کے ایڈوکیٹ مسٹر فارلم نے مسٹر اسماعیل محمد کے دلائل کا جواب دینا شروع کیا، انہوں نے اپنی تقریر میں متعدد قانونی نکات اُٹھائے اور اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے کافی مفصل بحث کی جو شام تین بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد مسٹر اسماعیل محمد نے تقریباً ایک گھنٹہ جوابی تقریر کی، اور مسٹر فارلم کے اعتراضات کا نکتہ بہ نکتہ دلچسپ جواب دیا۔ آخر میں جج صاحب نے کہا کہ وہ ان ابتدائی قانونی نکات پر اپنا فیصلہ محفوظ کرتے ہیں، اور اس پر عدالت برخاست ہوگئی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ان ابتدائی نکات پر عدالت کا فیصلہ بظاہر جنوری ۱۹۸۵ء تک سامنے آسکے گا، اگر عدالت نے مسٹر اسماعیل محمد کے نکات سے اتفاق کیا اور یہ قرار دیا کہ عدالت کے لئے اس مسئلے کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں ہے تو مرزائی صاحبان کی درخواست ناقابل سماعت ہوکر خارج ہوجائے گی، اور اگر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ مقدمہ قابل سماعت ہے تو پھر مقدمہ تفصیلاً چلے گا جس میں دونوں طرف سے طویل گواہیوں کی نوبت آئے گی۔

مقدمے اور اس کی مزید تفصیلات اگر زندگی رہی اور مناسب ہوا تو انشاء اللہ مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد عرض کی جائے گی۔ لیکن کیپ ٹاؤن کے پندرہ روزہ قیام میں جس قابل ذکر اور سبق آموز بات کا نقش دل پر قائم ہوا وہ اس علاقے کے مسلمانوں

کا پُرجوش دینی جذبہ ہے۔ کیپ ٹاؤن کو جنوب میں دنیا کا آخری سرا سمجھنا چاہئے۔ اس دور افتادہ علاقے میں جو صدیوں سے مغربی اقوام کے زیرِ تسلط ہے، اور جہاں قدم قدم پر بے دینی، عیش وعشرت اور عریانی وفحاشی کے محرکات شب وروز کارفرما ہیں، یہ مسلمان اپنی دینی روایات کو بڑی حد تک تھامے بیٹھے ہیں، اقلیت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے، اور جب کبھی کسی دینی مسئلے پر آنچ آتی ہے تو ان کا جذبۂ بے تاب قابل دید ہوتا ہے۔

اس مقدمے کے موقع پر بھی ملک کے تینوں صوبوں ٹرانسوال، نٹال اور کیپ سے مسلمانوں کے نمائندے کیپ ٹاؤن میں جمع ہوگئے تھے، اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا قابل رشک جذبہ کھلی آنکھوں محسوس ہوتا تھا۔

ان حضرات نے خالص دینی جذبے کے تحت جس طرح پاکستانی وفد کیلئے دیدہ ودل فرشِ راہ کئے، اور جس محبت اور گرم جوشی کا معاملہ کیا وہ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ناقابل فراموش یادگار ہے۔

کیپ ٹاؤن دنیا کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے، یہاں سمندروں، پہاڑوں، جھیلوں اور سرسبز میدانوں، ہر طرح کا فطری حسن موجود ہے۔ اور اسی شہر کے جنوب میں تقریباً ۷۰۔۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر وہ مشہور تاریخی ٹیلہ ہے جسے اُردو میں راس اُمید، عربی میں رأس الرجاء الصالح اور انگریزی میں کیپ آف گڈ ہوپ کہا جاتا ہے، اور جو اس سمت میں آباد دنیا کا آخری کنارہ ہے۔ یہیں سے واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا، اور اسی مقام پر دنیا کے دو بڑے سمندروں، بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا وہ سنگم ہے جو مرج البحرین یلتقیان کا دلآویز منظر پیش کرتا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہاں آنا ہوا تھا۔ اس مرتبہ موسم صاف تھا، اس لیے وہ امتیازی لکیر میلوں دور تک نظر آرہی تھی، جسے قرآنِ کریم نے بینھما برزخ لایبغیان سے تعبیر فرمایا ہے، اور جسے دیکھ کر انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ: فتبارک اللہ أحسن الخالقین۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سعودی عرب

کیپ ٹاؤن کے مقدمے سے فراغت کے بعد ایک دن جوہانسبرگ اور آزادویل میں قیام رہا، جہاں قدیم احباب سے ملاقات ہوئی۔ اور ۱۱ر نومبر کی شام کو واپسی نیروبی کیلئے روانہ ہوئے۔ رات بارہ بجے نیروبی پہنچے۔ دو گھنٹے وہیں وی آئی پی لاؤنج میں گذارے۔ دو بجے شب سعودی ایئر لائنز کے ذریعے جدہ روانگی ہوئی۔ اور صبح ۷ بجے کے قریب جدہ ایئرپورٹ پر جہاز اُترا۔ یہاں رابطۃ العالم الاسلامی کے پروٹوکول آفیسر وفد کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ چنانچہ چند گھنٹے جدہ ٹھہرنے کے بعد مکہ مکرمہ روانہ ہوئے اور نمازِ ظہر سے کافی پہلے مکہ مکرہ پہنچ گئے۔ ظہر سے پہلے ہی عمرہ شروع کر دیا اور ظہر کے بعد اس کی تکمیل ہوئی۔

احقر کو ڈیڑھ سال بعد یہاں حاضری کا موقع ملا تھا، اور ایک بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ یہاں کے احوال دیدنی ہیں، شنیدنی نہیں۔ موسم نہایت خوشگوار تھا، اور ہجوم بھی کم تھا، اللہ تعالیٰ نے بڑے سکون واطمینان کیساتھ حاضری نصیب فرمائی۔ اپنے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ہی خیال ہمہ وقت دامن گیر رہا کہ

کہاں میں؟ اور کہاں یہ نکہتِ گل؟
نسیم صبح! تیری مہربانی

اللہ تعالیٰ نے اس مقام کی جو رفعتیں بخشی ہیں، اور اُسے اپنے جن انوار وتجلیات کا مہبط بنایا ہے ان کی عظمتِ شان کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم جیسوں کو یہاں پر مارنے کی بھی اجازت نہ ہوتی، لیکن یہ انہی کی عطا اور حضورِ رحمۃ اللعالمین ﷺ کا صدقہ ہے کہ بار بار حاضری کا موقع عنایت فرمایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حاضری کو خالص لوجہ الکریم بنادے، اور اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نواز دے۔ آمین ثم آمین

ایک دن مکہ مکرمہ کے قیام کے بعد اگلے روز مدینہ طیبہ روانگی ہوئی۔ اب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے جو جدید سڑک اسی سال تعمیر ہوئی ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے سفرِ ہجرت کے راستوں سے گذرتی ہے اور قبا کی طرف سے مدینہ طیبہ میں داخل ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کا نام "طریق الہجرہ" ہے۔ اس سڑک کی وجہ سے مسافت بھی کم ہوگئی ہے، اور دو رویہ کشادہ ہائی وے ہونے کی بناء پر سفر بھی تیز رفتار ہوگیا ہے، اور اگر بیچ میں وقفے زیادہ نہ ہوں تو تقریباً چار گھنٹے میں انسان مدینہ طیبہ پہنچ سکتا ہے۔

ہم مدینہ طیبہ پہنچے تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی، سامان گاڑیوں میں چھوڑ کر ہی نماز میں شامل ہوئے۔ مسجد نبوی ﷺ کا پُرنور ماحول اور اس میں شیخ حذیفی کی سادہ مگر انتہائی دلکش تلاوت، ایسا محسوس ہوا کہ کائنات کا ہر ذرّہ قرآنِ کریم کی نورانیت میں غرق اور اس کی تلاوت کے سرور سے سرشار ہے۔

وفد کے دوسرے رفقاء اگلے روز واپس مکہ مکرمہ اور وہاں سے پاکستان چلے گئے، مجھے چونکہ ۱۸ر نومبر کو اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی، اس لئے مجھے چند روز مزید مدینہ طیبہ میں مقیم رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور یہ ایام حضرت والد صاحبؒ کے الفاظ میں اس کیفیت کے ساتھ بسر ہوئے کہ:

پھر پیش نظر گنبد خضرا ہے، حرم ہے — پھر نامِ خدا، روضۂ جنت میں قدم ہے
پھر منت دربان کا اعزاز ملا ہے — یہ اُن کا کرم، اُن کا کرم، اُن کا کرم ہے

پانچ دن بعد اس احساسِ ندامت کے ساتھ مدینہ طیبہ سے رُخصت ہوا کہ یہ گرانقدر لمحات جو محض رحمت خداوندی سے نصیب ہوئے تھے۔ اُن کی صحیح قدر و قیمت پہچان کر ان کو صحیح مصرف میں صرف نہ کر سکا۔ اُن کی طرف سے رحمت کی بارشوں میں تو کوئی کمی نہ تھی، لیکن زمین میں ان بارشوں کی جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو کیا کرے؟ لیکن اُنہی کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب انہوں نے اس منبع فیض پر حاضری کی توفیق بخشی تو..... وہ نااہلیوں کے علی الرغم۔ انشاء اللہ محروم نہ فرمائیں گے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی

"تنظیم اسلامی کانفرنس" مسلمان ملکوں کی وہ واحد تنظیم ہے جو چند سال سے عالم اسلام

www.freepdfpost.blogspot.com

کے ایک مشترک پلیٹ فارم کا کام کر رہی ہے۔ اس تنظیم کے تحت مختلف ملکوں میں مسلم سربراہ کانفرنسیں، اور مسلم وزرائے خارجہ کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور مسلمان ملکوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں جو انتشار و افتراق کی موجودہ فضا میں بسا غنیمت ہے۔ پھر اس تنظیم نے..... جس کا ہیڈ کوارٹر جدہ میں ہے..... متعدد ایسے ادارے قائم کئے ہیں جن کے تحت مسلمان ممالک مختلف شعبہ ہائے زندگی میں باہمی تعاون و اشتراک سے کام کر رہے ہیں اور بحمد للہ سائنس، معیشت، تجارت اور اطلاعات کے شعبوں میں یہ باہمی تعاون رفتہ رفتہ فروغ پا رہا ہے۔

آج سے تین سال پہلے جب طائف میں مسلم سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تو شاہ خالد مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "تنظیم اسلامی کانفرنس" کو ایک ایسی "مجمع الفقہ الاسلامی" (اسلامی فقہ کمیٹی) قائم کرنی چاہئے جس میں عالم اسلام کے علماء باہمی صلاح و مشورے اور مشترک غور و تحقیق سے اُن فقہی مسائل کی تحقیق کریں جو عالمگیر نوعیت رکھتے ہیں۔ نیز فقہ کے قدیم ذخیرے کو جدید لباس میں شائع کریں، اور اس سے استفادے کو آسان بنائیں۔

اس تجویز کے مطابق "تنظیم اسلامی کانفرنس" نے اکیڈمی کا قیام منظور کر لیا، اور اس کا دستور کا مسودہ تیار کیا گیا، جو کئی مرحلوں سے گذر کر پچھلے سال منظور ہو گیا۔

اس دستور کی رُو سے اس اکیڈمی کی رکنیت کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ رُکن اسلامی فقہ پر عبور رکھتا ہو، اور عربی زبان میں اظہار مافی الضمیر پر ٹھیک ٹھیک قادر ہو۔ اسی دستور میں یہ بھی طے کر دیا گیا کہ اس معیار کے حامل افراد میں سے ایک ایک رکن تمام اسلامی ملکوں سے لیا جائے گا۔ اور تمام ملکوں سے نامزدگیاں آ جانے کے بعد اکیڈمی کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا۔ جس میں اُس طریق کار باہمی مشورے سے طے کیا جائے گا، اور اس مرحلے پر مختلف اسلامی ملکوں اور اُن ملکوں سے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، مزید ارکان کا انتخاب کیا جا سکے گا۔

چنانچہ "مجمع الفقہ الاسلامی" کا پہلا اجلاس ۲۰ رنومبر کو طے کیا گیا۔ پاکستان سے احقر

بطور رکن نامزد کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں مدینہ طیبہ سے ۱۹ رنومبر کو واپس مکہ مکرمہ حاضر ہو گیا۔

۲۰ رنومبر کی صبح کو "مجمع الفقہ الاسلامی" کا پہلا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت شاہ فہد کی نیابت میں امیر ماجد بن عبدالعزیز امیر منطقہ مکۃ المکرمہ نے کی۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کے سیکریٹری جنرل جناب حبیب شطی رابطۃ العالم الاسلامی کے جنرل سیکریٹری شیخ عمر عبداللہ النصیف اور مجمع الفقہ الاسلامی کے نامزد سیکریٹری جنرل شیخ حبیب بلخوجہ (جو تیونس کے ممتاز علماء میں سے ہیں) بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ افتتاحی اجلاس ان سب حضرات کی رسمی تقریروں پر ختم ہو گیا۔

اس کے بعد مجمع الفقہ الاسلامی کے صدر، تین نائب صدر اور ہیئۃ المکتب (مجلس عاملہ) کا انتخاب ہونا تھا، چنانچہ شام کے اجلاس میں حسب ذیل انتخاب عمل میں آیا۔

صدر:	شیخ بکر ابوزید۔ وکیل وزارۃ العدل	(سعودی عرب)
نائب صدور:	(۱) ڈاکٹر عبدالسلام عبادی	(اردن)
	(۲) ڈاکٹر عبداللہ ابراہیم	(ملائیشیا)
	(۳) الحاج سیّد عبدالرحمٰن باہ	(گینیا)

دستور کی رُو سے ہیئۃ المکتب (BEUAREAU) چھ ارکان پر مشتمل ہونی تھی، چنانچہ اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل کے علاوہ (جو بہ لحاظ عہدہ) ہیئۃ المکتب کے رکن ہیں، مندرجہ ذیل چھ افراد پر مشتمل ہیئۃ المکتب کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱)	ڈاکٹر صالح طوغ۔ عمید کلیۃ الشریعۃ، مرمارا یونیورسٹی	(ترکی)
(۲)	محمد تقی عثمانی	(پاکستان)
(۳)	استاذ سید روان بھائی۔ مدیر المعہد الاسلامی، ڈاکار	(سینیگال)
(۴)	سیدی محمد یوسف جیری۔ سفیر مالی برائے ریاست ہائے خلیج	(مالی)
(۵)	استاذ عجیل جاسم النشمی۔ عمید کلیۃ الشریعۃ، کویت	(کویت)
(۶)	استاذ عبدالرحمٰن شیبان۔ وزیر الشؤن الدینیہ، الجزائر	(الجزائر)

موجودہ اجلاس کا اصل مقصد مجمع الفقہ الاسلامی کا دائرۂ عمل اور طریق کار طے کرنا

www.freepdfpost.blogspot.com

تھا، تاکہ آئندہ اس کے مطابق کام شروع کیا جاسکے۔ چنانچہ دستور کے مطابق ''مجمع'' کے تینوں شعبوں کے لیے تین کمیٹیاں قائم کردی گئیں۔ شعبۂ[1] التحفیظ، شعبۂ[2] الدراسات والبحوث اور شعبۂ[3] الافتاء۔ راقم الحروف تیسری کمیٹی میں شامل ہوا، جس کی نشستیں دوسرے تمام دن جاری رہیں۔ احقر نے اس شعبے کے دائرۂ عمل اور طریق کار سے متعلق مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:

(۱) ''مجمع'' کی جانب سے کوئی فتویٰ جاری کرنے سے قبل عالم اسلام کے افتاء کے اُن مراکز سے جو ''مجمع'' کے رکن نہیں ہیں، متعلقہ مسئلے میں مفصل استفتاء کیا جائے، اور عالم اسلام کے جید علماء کے فتاویٰ اور دلائل سامنے آنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

(۲) جن مسائل کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی، سیاسی، اور اقتصادی زندگی سے ہے، اُن کے بارے میں کوئی حتمی فتویٰ جاری کرنے سے قبل متعلقہ علوم وفنون کے ماہرین سے صحیح صورتِ واقعہ سمجھنے میں مدد لی جائے۔

(۳) مذاہب اربعہ کی فتویٰ کی وہ کتب جو اب تک مخطوطات کی شکل میں ہیں، یا کبھی شائع ہوکر نایاب ہوچکی ہیں، ''مجمع'' کی طرف سے اُن کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

(۴) فقہ وفتویٰ کی جو کتب شائع شدہ ہیں، اُن کو ترقیم وترتیب کے جدید اسلوب کے مطابق شائع کیا جائے۔

(۵) تمام اہم فقہی کتابوں کی مفصل فہرستیں اور اشاریے تیار کرنے کا اہتمام کیا جائے جس کے ذریعے ان کتب سے استفادہ اور ان سے مسائل کا استخراج آسان ہوجائے۔

یہ تمام تجاویز باتفاق رائے منظور ہوئیں، اور ان کو ''مجمع'' کے دستور العمل میں شامل کرلیا گیا۔

بعد میں تینوں کمیٹیوں کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں ہر کمیٹی کی تجاویز پر مشترک غور ہوا، تکرار کو حذف کیا گیا، اور پھر تینوں شعبوں کا ایک جامع دستور العمل تیار ہوا۔ اس

دستور العمل کا خلاصہ یہ ہے کہ مجمع الفقہ الاسلامی مندرجہ ذیل کام کرے گی۔

(۱) جن فقہی مسائل کا تعلق پورے عالم اسلام سے ہے اُن پر تحقیقی تصانیف اور مقالات کی تیاری۔

(۲) فقہ کی ایک جامعہ موسوعہ (انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنا جس میں تمام فقہی مذاہب کی تفصیل اُن کے اصل مستند مآخذ سے بیان کی گئی ہو، اور جو تمام موسوعات اب تک تیار ہوئے ہیں، ان کی تکمیل۔

(۳) جو فقہی کتب اب تک تشنۂ طباعت ہیں یا نایاب ہیں، ان کو تحقیق کے ساتھ شائع کرنے کا انتظام۔

(۴) قدیم فقہی کتب کو ترقیم وترتیب اور تصحیح کے جدید اسلوب کے ساتھ شائع کرنے کا انتظام۔

(۵) فقہ کے مستند مآخذ کی مفصل فہرستیں اور اشاریے تیار کرنا جن کے ذریعے فقہی مسائل کی مراجعت آسان ہوجائے۔

(۶) عالمگیر نوعیت کے فقہی سوالات پر اجتماعی طور سے غور وفکر کرکے اُن کا جواب مفصل فقہی مسائل کے ساتھ تیار کرکے اس کی اشاعت۔

(۷) ایک جامع مجموعہ قوانین اسلام کی تیاری، جو ان تمام اسلامی ممالک کا قانون بن سکے جو اپنے یہاں اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

اس غرض کے لیے جو تین شعبے قائم کئے گئے ہیں، ہر سہ ماہی پر یکے بعد دیگرے ان کے اجلاسات منعقد ہوا کریں گے۔ ان اجلاسات میں ہر آئندہ سہ ماہی کے لیے کام طے کرکے اُسے مناسب افراد پر تقسیم کیا جائے گا اور جو کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بالآخر مجمع الفقہ الاسلامی کی مجلس عام میں پیش ہوں گے جس کا اجلاس سال میں کم از کم ایک مرتبہ اور بوقت ضرورت زیادہ مرتبہ بھی منعقد ہوسکے گا۔ ہیئۃ المکتب کا اجلاس سال میں کم از کم دو مرتبہ ہوگا، اور وہ تینوں شعبوں اور مجلس عام کے کاموں کے لیے بنیاد مہیا کرے گا۔

کمیٹیوں کی جامع رپورٹ کی ترتیب کے بعد مجلس عام کی نشستیں دوبارہ شروع ہوئیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جن میں اس رپورٹ کو منظور کیا گیا، نیز ''مجمع'' کے ابتدائی تاسیسی اُمور اور بجٹ وغیرہ پر بحث ہوئی، جس کے بعد مجمع کا یہ پہلا اجلاس، جس کا مقصد دستور العمل طے کرنا تھا، برخاست ہوگیا۔

''مجمع الفقہ الاسلامی'' نے جو اغراض و مقاصد اپنے پیش نظر رکھے ہیں، ان کی تکمیل بلاشبہ اس وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اگرچہ عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں بہت سے افراد اور ادارے اپنے اپنے وسائل کے دائرے میں یہ کام انفرادی طور پر انجام دے رہے ہیں، لیکن وہ اکثر و بیشتر وسائل کی قلّت کے شکار ہیں۔ اگر یہ عالمی ادارہ ان تمام کاوشوں کو منظم کرسکے، اور انہیں مطلوبہ وسائل فراہم کرکے اس کام کو ایک جامع منصوبے کے تحت لے آئے بلاشبہ اس سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ ہمارے دور کے قوی صلاحیتوں اور مصروفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انفرادی طور پر ان کی تکمیل بہت دشوار ہے، اُس کے لئے واقعۃً کسی بڑے ادارے کے صحیح ثمرات کا حصول درحقیقت اسی وقت ممکن ہے جب اس کو ایسے مخلص، قابل اور جذبہ خدمت کے حامل افراد میسر آئیں جو سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس کے مقاصد کو پورا کرنے کی لگن رکھتے ہوں، اُن کے پیش نظر نام و نمود اور دکھلاوے کے بجائے اللہ کے دین کی خدمت اور اس کی رضا کا حصول ہو، جو رسمی کارروائیوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے بجائے واقعۃً کچھ کام کرنا چاہتے ہوں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلامی فقہ کی خدمت اُسی طرح کرنا چاہتے ہوں جو فقہ کے اُصول اور مزاج کا تقاضا ہے، اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے لیے فقہ کو زینہ بنانے سے کوسوں دور ہوں، جو مسلمانوں کی واقعی ضروریات اور زمانے کے جھوٹے پروپیگنڈے میں امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور جن کے پیش نظر واقعۃً اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اتباع ہو، اور وہ اس مقدس نام کو غیروں کی ذہنی غلامی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے استعمال نہ کریں۔

(جس کے اثرات غالباً مستقبل میں کافی دوررس ہوں گے) ایسے ہی مخلص افراد مہیا

فرمادے، ان کو علمی اور عملی ہر اعتبار سے یہ عظیم کار انجام دینے کی واقعی صلاحیت عطا فرمائے، اور انہیں توفیق بخشے کہ وہ اس ادارے کو اپنے مالک و خالق کی رضا کے مطابق چلاسکیں۔ آمین

عراق:

عراق کے ساتھ ہم مسلمانوں کو جو قلبی تعلق اور لگاؤ ہمیشہ رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں، مدینہ طیبہ کے بعد عالم اسلام کا پہلا دارالحکومت عراق ہی میں قائم ہوا۔ دینی علوم کی جو مرکزیت حرمین شریفین کے بعد اس خطے کو حاصل ہوئی، وہ علام اسلام کے کسی اور خطے کو نصیب نہیں ہوسکی۔ پھر بغداد صدیوں تک پورے عالم اسلام کا سیاسی، علمی اور ثقافتی مرکز بنا رہا، اور اس نے ہر شعبۂ زندگی میں جو بے مثال شخصیتیں پیدا کیں وہ ہماری تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔

ان تمام وجوہ سے عراق دیکھنے کی خواہش تو مدت سے تھی، لیکن عراق کی وزارتِ اوقاف نے پچھلے دنوں اسلامی علوم کی وہ نادر و نایاب کتابیں شائع کی ہیں جو اب تک مخطوطات کی شکل میں تھیں، اور پہلے کبھی طبع نہیں ہوئی تھیں۔ مثلاً ''المعجم الکبیر للطبرانی'' کا صرف حوالہ ہی دوسری کتابوں میں ملتا تھا، اصل کتاب دستیاب نہ تھی۔ عراق کی وزارتِ اوقاف اسے پہلی بار شائع کررہی ہے اور بیچ کی چند جلدوں کو چھوڑ کر (جن کا مخطوطہ اسے دستیاب نہ ہوسکا) اب تک اس کی چھبیس جلدیں شائع ہوچکی ہیں، اسی طرح کی سو سے زائد کتابوں کا ذخیرہ وزارتِ اوقاف نے شائع کردیا ہے۔ ان کتابوں کے حصول کا شوق عراق کے سفر کا فوری داعیہ بن گیا۔ اور مدینہ طیبہ میں ہمارے محب محترم جناب قاری بشیر احمد صاحب بھی اس سفر میں رفاقت کے لیے تیار ہوگئے۔

خیال یہ تھا کہ یہ سفر خالص نجی نوعیت کا ہوگا۔ لیکن اتفاق سے مکہ مکرمہ کی ''مجمع الفقہ الاسلامی'' میں عراق کے نمائندے ڈاکٹر محمد شریف صاحب (مستشار وزیر الاوقاف) کو میرے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اصرار کیا کہ ہم عراق کے اس سفر میں وزارتِ مذہبی اُمور

www.freepdfpost.blogspot.com

کے مہمان بنیں۔ اپنی افتادِ طبع کی بناء پر میں نے اس بات کو دوسری باتوں میں ٹلا دیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ ٹیلیکس کے ذریعے وزارت کو میری آمد کے بارے میں مطلع کر چکے ہیں، اب ان کی میزبانی قبول کرنی ہی پڑے گی۔

چنانچہ ۲۵ر نومبر کی شام کو مغرب کے وقت ہم جدہ ایئرپورٹ سے عراق ایئرویز کے طیارے میں سوار ہوئے۔ عراق جس افسوسناک جنگ میں مبتلا ہے، اُس کی وجہ سے اُس کی سیٹ تک پہنچنے سے قبل کئی جگہ تلاشی دینی پڑی۔ ہاتھ کا بریف کیس بھی اندرونی سامان میں بھجوا دیا گیا۔ جنگ کی حالت میں اس کے جہازوں کی پروازوں کا جاری رہنا ہی غنیمت ہے، اس لیے یہ غیر معمولی احتیاطی اقدامات قابلِ تعجب نہ تھے۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم بغداد ایئرپورٹ پر اُترے تو وہاں کی وزارت مذہبی اُمور کے سیکریٹری، ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ اور بعض دوسرے حضرات استقبال کے لئے موجود تھے، بغداد کا نیا ایئرپورٹ جو ''مطارِ صدام'' کہلاتا ہے، اپنی وسعت، حسنِ اور تعمیر کی دلکشی اور رعنائی میں بعض مغربی ممالک کے ہوائی اڈوں کو مات کر رہا ہے استقبال کیلئے آنے والے افسران نے ہوائی اڈے کے مراحل منٹوں میں طے کرا دیئے اور بتایا کہ انہوں نے پہلے ہی سے ہمارے لیے رہائش، گاڑی اور ایک رہنما کا انتظام کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک کے نجی سفر میں اس قسم کے انتظامات یوں بھی ایک بڑی نعمت تھے، پھر ان میزبانوں نے جس محبت، اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا، اُس کے پیشِ نظر اس میزبانی کو ٹھکرانا مروت کے بھی خلاف تھا، اس لیے ان انتظامات کو غیبی نعمت سمجھ کر قبول کر لیا، اور بعد میں اندازہ ہوا کہ ان انتظامات کے بغیر اتنے مختصر وقت میں وہ کام ممکن نہ تھے جو اَب ہو گئے۔

ہوائی اڈہ شہر سے کافی دور ہے، میزبانوں نے بغداد کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل ''فندق الرشید'' میں قیام کا انتظام کیا۔ یہ ہوٹل دراصل غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس کے لیے بنا تھا، لیکن جب یہ کانفرنس بغداد میں منعقد نہ ہو سکی تو اسے تجارتی ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کی تعمیر، رقبہ اور متعلقات عام فائیو اسٹار ہوٹلوں سے زیادہ وسیع

کشادہ اور آرام دہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ملحق لان تو ایک مستقل پارک ہے جو شاید ایک مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہو۔

ہوٹل کے دسویں منزل پر قیام ہوا، یہاں سے بغداد کا نصف علاقہ نظروں کے سامنے تھا، اور حدِ نظر تک بھکری ہوئی روشنیوں نے زمین پر تاروں بھرے آسمان کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ بستر پر لیٹا تو ذہن بغداد کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے لگا۔ اس سرزمین نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کیا کیا داستانیں دیکھی ہیں؟ یہاں علم و فضل کے کیسے کیسے پہاڑ نمودار ہوئے ہیں؟ علم و ادب کی کیسی کیسی محفلیں سجی ہیں؟ ورع و تقویٰ کی کیا کیا مثالیں نقش ہوئی ہیں؟ اور آج بھی اس خاک میں ہماری جگمگاتی ہوئی تاریخ کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب روپوش ہیں؟ اللہ اکبر!

جب مسلمانوں نے عراق فتح کیا تو بغداد کوئی قابلِ ذکر شہر نہ تھا، کسریٰ کے زمانے میں دجلہ کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی تھے، کہتے ہیں کہ کسریٰ نے ایک بت پرست غلام کو یہ علاقہ بطورِ جاگیر دیا تھا، وہ جس بت کی پرستش کرتا تھا، اُس کا نام ''بغ'' تھا، اس لیے اُس نے کہا کہ ''بغ داد'' (یعنی یہ علاقہ مجھے بغ نے دیا ہے) اسی لئے بہت سے علماء اس شہر کو بغداد کہنا پسند نہ کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ اور بصرہ جیسے شہر بسائے گئے، لیکن یہ علاقہ حسبِ سابق رہا۔ بنو عباس کے زمانے میں خلیفہ منصور نے کوفہ اور حیرہ کے درمیان ایک شہر ''ہاشمیہ'' کے نام سے بسایا، لیکن راوندیوں کی بغاوت کی وجہ سے اُسے اپنا مستقر نہ بنا سکا۔ کوفہ کی بغاوتیں تو مشہور رہی تھیں، اس لیے وہاں اسے دارالحکومت بنانا پسند نہ تھا۔ بالآخر اُس نے کوفہ سے موصل تک کا دورہ کرنے کے بعد دجلہ کے کنارے اس جگہ کو پسند کیا اور کہا کہ ''اس جگہ کے ایک طرف دجلہ ہے، یہاں سے ہمارے اور چین کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہوگی، اور دوسری طرف فرات ہے، جہاں سے شام اور رقہ کے ساتھ رابطہ رہے گا۔'' (مقدمۃ المعارف لابن قتیبۃ)

چنانچہ منصور کے لشکر نے دجلہ کے مغربی کنارے پر پڑاؤ ڈالا اور ۱۴۶ھ میں اس

www.freepdfpost.blogspot.com

کے حکم سے بغداد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ منصور ہی نے اس شہر کا نام مدینۃ السلام رکھا۔ کیونکہ بغداد کے نام میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، شرک کا شائبہ تھا۔ اور یہ بھی عجائب میں سے ہے کہ یہ ''مدینۃ السلام'' صدیوں خلفائے اسلام کا دارالحکومت رہا، لیکن اُن میں سے کسی کا اس شہر میں انتقال نہیں ہوا، صرف ہارون رشید کے بیٹے امین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بغداد میں قتل ہوا۔ لیکن خطیب بغدادیؒ نقل کرتے ہیں کہ درحقیقت وہ بھی بغداد میں قتل نہیں ہوا، بلکہ دریائے دجلہ میں تفریحاً کشتی رانی کرتے ہوئے شہر سے دور نکل گیا تھا، وہیں گرفتار ہوا، اور وہیں قتل کیا گیا۔ (تاریخ بغداد للخطیب ص ۶۹، ج ۱)

رفتہ رفتہ بغداد مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور علم وفن کا وہ گہوارہ بنا کہ دنیا میں اُس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ حسن و جمال، ترتیب وتنسیق اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے یہ شہر اتنا دلکش تھا کہ امام شافعیؒ جیسے متقی فقیہ اور بزرگ نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد یونس بن عبدالاعلیٰ سے پوچھا کہ کیا تم نے بغداد دیکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں! تو امام شافعیؒ نے فرمایا: ''پھر تو تم نے دنیا ہی نہیں دیکھی۔''

(الخطیب۔ ص ۴، ج ۱)

اِس وقت بغداد دریائے دجلہ کے دونوں طرف آباد ہے۔ ابتداء میں خلیفہ منصور نے یہ شہر دجلہ کے مشرقی کنارے پر بسایا تھا۔ بعد میں اس کے بیٹے خلیفہ مہدی نے مغربی کنارے کو اپنی چھاؤنی بنایا، اور رفتہ رفتہ وہ حصہ بھی شہر میں شامل ہوگیا، اور مشرقی حصہ کرخ، اور مغربی حصہ رصافہ کے نام سے موسوم ہوا۔ ان دونوں حصوں کے یہی نام آج تک چلے آتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے بہت سے نامور علماء ''کرخی'' اور ''رصافی'' انہی حصوں کی طرف منسوب ہیں۔

(۲)

اگلی صبح اتوار تھا، ناشتے کے بعد میزبانوں کے نمائندے عبدالرزاق صاحب (پروٹوکول آفیسر) ہوٹل پہنچ گئے۔ ہم نے سب سے پہلے حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت عبدالقادر گیلانیؒ اور بزرگوں کے مزارات پر حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے سہولت کے لحاظ سے حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کے مزار پر پہلے حاضری کا پروگرام بنایا۔

دن کی روشنی میں بغداد کی سڑکیں اور عمارتیں پہلی بار نظر آئیں، تو یہ بیسویں صدی کا ایک جدید شہر تھا، عمارتیں خوبصورت، سڑکیں صاف ستھری اور کشادہ، جابجا چوراہوں پر بنے ہوئے پلوں اور زمین دوز راستوں نے ایک طرف ٹریفک کا مسئلہ بخوبی حل کردیا ہے، اور دوسری طرف راستوں کے حسن کو چار چاند لگادیئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صدر صدام حسین کے زمانے میں بغداد کو جو تمدنی ترقی ہوئی ہے، اُس نے شہر کو کہیں سے کہیں پہنچادیا ہے۔ خطیبؒ نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ منصور نے جب یہ شہر بسایا تو اس کا طول بھی دو میل تھا، اور عرض بھی، اور یہ دنیا کا پہلا شہر تھا جو دائرے کی شکل میں بسایا گیا۔ اور آج حال یہ ہے کہ اس کا ایک ایک محلہ بھی میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔

جدید شہر کے مختلف علاقوں کے بعد دیگر گزرتے چلے گئے، یہاں تک کہ کار شہر کے قدیم حصے میں داخل ہوگئی، اور گلی کوچوں سے عہد گذشتہ کی بوباس آنے لگی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے رُک گئی۔ یہاں ایک عالیشان مسجد کی دیواریں نظر آئی، برابر میں ایک گلی تھی اور مسجد کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ دروازہ قدیم شاہی عمارتوں کی طرح بڑا پُرشکوہ تھا۔ یہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کی مسجد اور ان کا مدرسہ تھا، جس کے ایک حصہ میں حضرت شیخؒ خود بھی آسودہ ہیں۔

یہ مسجد یہاں حضرت شیخؒ کے زمانے ہی سے قائم ہے، اور اسی کی دیوارِ قبلہ کے پیچھے حضرت شیخؒ کا مزار مبارک ہے۔ وہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ دراصل ایران کے شمال کے مغربی صوبے

www.freepdfpost.blogspot.com

گیلان میں پیدا ہوئے تھے۔ جسے دیلم بھی کہا جاتا ہے، لیکن اٹھارہ سال کی عمر (تقریباً ۴۸۸ھ) میں بغداد تشریف لائے، اور پھر اسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ اسے کہنے والے تو شاید اتفاق کہیں، لیکن یہ یقیناً قدرت کی حکمت بالغہ کا نتیجہ تھا کہ یہی وہ سال ہے جس میں حضرت امام غزالیؒ نے بغداد کو خیر باد کہا۔ گویا یہ شہر ایک مصلح سے محروم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخؒ کی شکل میں فوراً ہی اسے دوسرا عظیم الشان مصلح عطا فرمادیا۔

یہ محلّہ حضرتؒ کا جہاں مزار ہے، قدیم زمانے میں بغداد کی فصیل کے قریب واقع تھا، اور اسے "باب الأزج" کہتے تھے۔ حضرت شیخ گیلانی قدس سرہٗ کے استاذ و شیخ حضرت قاضی ابوسعد مخرمی رحمہ اللہ نے یہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ بنایا تھا، جو ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سپرد کردیا گیا۔ حضرتؒ نے اسی مدرسے کو اپنے افادات کا مرکز بنایا۔ اور یہیں درس و تدریس، تصنیف و افتاء اور وعظ ارشاد کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یہاں تک کہ یہ ایک عظیم الشان مدرسہ بن گیا۔ (المنتظم لابن الجوزہ ص ۲۱۹، ج ۱۰) اس مدرسے کی شکل میں حضرتؒ کا فیض آج تک جاری ہے۔

حضرتؒ کے زمانے میں یہ مدرسہ مرجع خاص و عام تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ یہاں آپؒ بہ نفس نفیس درس دیتے تھے۔ روزانہ ایک سبق تفسیر کا، ایک فقہ کا اور ایک خلافیات کا بذات خود پڑھایا کرتے تھے، صبح اور شام کے اوقات میں تفسیر، حدیث فقہ اور نحو وغیرہ کے اسباق ہوتے تھے اور ظہر کے بعد حضرتؒ خود مختلف قراءتوں میں تلاوت فرمایا کرتے تھے اس کے علاوہ فتاویٰ کا بھی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آپ عموماً شافعی اور حنبلی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ص ۱۰۹، ج ۱)۔

امام شعرانیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا کہ روئے زمین کا کوئی شخص اس وقت وہ عبادت نہ کررہا ہو اور اگر یہ پوری نہ ہوسکی تو اس کی بیوی کو تین طلاق۔ یہ سوال بغداد کے بہت سے علماء کے پاس گیا۔ عام طور پر یہ سوال سن کر اسی نتیجے پر پہنچے کہ بظاہر اس شخص کے پاس طلاق سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ ایسی عبادت کونسی ہوسکتی ہے جس کے

بارے میں یہ یقین ہوجائے کہ روئے زمین کا کوئی شخص وہ عبادت نہیں کررہا ہے۔ آخر میں سوال حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے برجستہ جواب دیا کہ اس شخص کے لئے حرم مکّہ میں مطاف خالی کرادیا جائے اور وہ اس حالت میں طواف کرے کہ کوئی اور شخص اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔

حضرتؒ کے بے شمار ارشادات و ملفوظات اتباع شریعت و سنّت اور بدعات سے اجتناب کی تعلیم و تلقین پر شاہد عدل ہیں۔ آپ کے مواعظ سے متاثر ہوکر تقریباً ہر مجلس میں بیسیوں افراد تائب ہوتے تھے۔ امام شعرانیؒ ہی نے حضرتؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے کہ "ایک مرتبہ میرے سامنے ایک ایسا عظیم الشان نور ظاہر ہوا جس سے سارا افق بھر گیا۔ پھر اس میں سے ایک مجھے صورت دکھائی دی اور آواز آئی کہ اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے آج سے تمہارے لئے تمام حرام کام حلال کردیئے ہیں۔ میں نے فوراً کہا: مردود دور ہوجا۔ بس یہ کہتے ہی وہ نور اندھیرے سے بدل گیا، اور وہ صورت دھواں بن کر ختم ہوگئی۔ پھر آواز آئی کہ "اے عبدالقادر! تم میری چال سے اپنے علم کی بدولت بچ گئے ورنہ میں نے اس جیسی چالوں سے ستر اہل طریق کو گمراہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے کہا! کہ یہ سب (میرے علم کی بدولت نہیں بلکہ) محض اللہ کے فضل و کرم کی بدولت ہوا۔" (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ص ۱۰۹ ج ۱)۔

مشائخ نے فرمایا کہ شیطان کا دوسرا حملہ زیادہ مکّارانہ اور زیادہ سنگین تھا کیونکہ پہلے وار سے بخوبی بچ جانے کے بعد اس نے حضرتؒ کو ان کے علم کا حوالہ دے کر پندار علم میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نازک حملے سے بھی محفوظ رکھا۔

اس قسم کے واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ قدس سرہ کو طریقت کے ساتھ ساتھ شریعت کا اور علوم باطنہ کے ساتھ ساتھ علوم ظاہرہ کا کس قدر اہتمام تھا، چنانچہ آپ آخر وقت تک علوم دینیہ کی تدریس اور افتاء وغیرہ میں بذات خود مشغول رہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سنداں باختن

www.freepdfpost.blogspot.com

لیکن دوسرے بہت سے اولیاء کرامؒ کے مزارات کی طرح شریعت وطریقت کے اس امامِ عالی مقام کے مزار پر بھی جاہلانہ عقیدت کے مظاہرے بدعات کی شکل میں نظر آئے، جس ذات والا صفات کی ساری زندگی اتباع شریعت کی تعلیم میں صرف ہوئی، اس کے مزار مبارک پر یہ خلاف شرع امور خود ان کے لئے کتنے تکلیف دہ ہوں گے؟ اس احساس سے دل پژمردہ رہا۔

مزار مبارک سے نکل کر قریب ہی وہ مدرسہ آج تک قائم ہے جس کی بنیاد خود حضرت شیخؒ نے ڈالی تھی۔ اگلے دن بعد مغرب اسی مدرسے میں ایک مقدس بزرگ شیخ محمد عبدالکریم المدرس (حفظ اللہ) کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ وہ حضرت شیخ امجد الزاھاوی رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے ہیں اور انہوں نے عصر جامعات کے ''ڈگری زدہ'' طریقے کے بجائے قدیم طریقے پر ماہر اساتذہ و شیوخ سے علوم دینیہ کی تکمیل فرمائی ہے۔ ''ماجستیر'' اور ''دکتوراہ''، کے اس دور میں ایسے علماء کی قدر قیمت پہچاننے والے بہت کم ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ علم دین کی جو خوشبوں اور شریعت وسنت کی جو مہک ان بوریہ نشینوں کے پاس محسوس ہوتی ہے، وہ عموماً یونیورسٹیوں کی عالی شان عمارتوں اور ان کے پر تکلف ماحول میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے جہاں کہیں جانا ہوتا ہے ایسے علماء کی تلاش رہتی ہے۔

شیخ موصوف مدرسے کے پہلو میں ایک سادہ سے فلیٹ میں مقیم ہیں۔ قدیم عربی طرز کی نشست، آس پاس کتابوں کے ڈھیر، دروازہ ہر آنے والے کے لئے کھلا ہوا، چہرہ ہمہ وقت گلاب کی طرح متبسم باتوں میں بلا کی معصومیت برجستگی اور بے تکلفی، تصنع اور دکھاوے سے کوسوں دور۔ پہلی ہی نظر میں زیارت سے دل باغ باغ ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد شریف صاحب (مستشار وزراۃ الاوقاف) نے شیخ کو پہلے سے فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی تھی اور شیخ یہ سن کر بہت مسرور تھے کہ ناچیز کو انہی پرانے طرز کے دینی مدارس اور ان کے علماء سے خادمانہ نسبت حاصل ہے چنانچہ ابتدائی سلام و کلام کے بعد ان کا پہلا سوال مدارس کے نصاب ونظام سے متعلق تھا اور جب میں نے درسی کتب میں سے کافیہ، شرح جامی، شرح تہذیب، نور الانوار اور توضیح

جیسی کتب کا نام لیا تو وہ تقریباً چیخ پڑے اور وصیت فرمائی کہ اس قسم کی ٹھوس استعداد پیدا کرنے والے نظام تعلیم کو آپ کبھی نہ چھوڑئے کیونکہ ہم اس نظام کو چھوڑنے کے نتائج بد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی دوسری وصیت یہ کی کہ عراق جس جنگ میں مبتلا ہے اس سے رہائی کیلئے دعا میں ہمیں فراموش نہ کریں اور علماء پاکستان سے بھی اس کے لئے دعا کروائیں۔

شیخ اصلاً کُردی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے کُردی اور عربی دونوں زبانوں میں بیسیوں کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات کُردی زبان میں ہیں جنہوں نے کُردعلاقوں میں دینی تعلیم کی نشر واشاعت کا فریضہ بطریقِ احسن انجام دیا ہے۔ کُردی زبان نہ سمجھنے کی بنا پر ان کتب سے استفادہ ہمارے لئے ممکن نہ تھا اس لئے شیخ نے اپنی عربی کتابوں کا ایک سیٹ عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک کتاب ''علمائونا فی العراق'' عراق کے کُردی علماء کا تذکرہ ہے جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب علم عقائد پر ہے۔

شیخ سے رخصت ہو کر ہم مدرسے کے کتب خانے میں پہنچے، یہ کتب خانہ بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ ہی کا قائم فرمودہ ہے اور تقریباً چالیس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کتب خانے کے صرف مخطوطات کا تعارف پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ علم کے اس سدا بہار گلشن سے استفادے کے لئے تو مہینے درکار تھے، لیکن مختصر وقت میں بہت سے نادر مخطوطات کی زیارت نصیب ہوئی۔ بہت سی نئی کتابوں کا پتہ چلا۔ لیکن ان تمام مخطوطات میں ایک مخطوط دیکھ کر دل پر جو کچھ گذری، اسے حیطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ میں تفسیر کی ایک کتاب کا مخطوط دیکھ رہا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اچانک ایک اور قلمی نسخہ میرے سامنے کر دیا اور اس طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا، میں نے نظر اٹھائی تو یہ امام راغب اصفہانیؒ کی ''مفردات القرآن'' کا ایک قلمی نسخہ تھا جس کے حروف جگہ جگہ سے اڑے ہوئے تھے، جیسے کبھی ان پر پانی گر گیا ہو۔ ابھی میں اس نسخے کی کوئی خصوصیت دریافت نہ کر سکا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اس کے ٹائٹل پر لکھی ہوئی ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

عبارت کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''اسے پڑھئے۔'' میں نے پڑھا تو عبارت یہ تھی۔

''لقد انتشلت هذا الكتاب من نهر د جلة بعدأن رماه التتر، و ذلک سنة ٦٥٦ھ. وانا الفقير إليه تعالىٰ عبدالله بن محمد ابن عبد القادر المكّي.''

میں نے ۶۵۶ھ میں یہ کتاب دریائے دجلہ میں پڑی ہوئی پائی تھی،، جبکہ اسے تاتاریوں نے وہاں ڈال دیا تھا، میں نے یہ کتاب وہیں سے اٹھائی تھی۔ فقیر عبداللہ بن محمد بن عبدالقادر مکی۔

اس عبارت نے ذہن میں ساڑھے سات سو سال پہلے کے دلگداز واقعات کی ایک فلم چلا دی۔ تاریخ میں پڑھا تھا کہ تاتاریوں نے بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کی کتابوں سے دریائے دجلہ پر پل تعمیر کیا تھا اور کتابوں کی رشنائی سے دجلہ کا رنگ تک متغیر ہوگیا تھا۔ علم و حکمت کے کیسے کیسے خزانے اس وحشت و بربریت کی نذر ہوئے؟ ان کی تفصیل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ قلمی نسخہ اس تاریخی واقعہ کی اصلیت کی آج بھی شہادت دے رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

(۳)

اولیائے کرامؒ کے مزارات پر:

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہ کے مزار کے بعد اسی شام کو بغداد کے ایک قدیم قبرستان میں حاضری ہوئی جو ''مقبرہ باب الدیر'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں ایک چھوٹے سے احاطے میں حضرت معروف کرخی، حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت سری سقطی رحمہم اللہ تعالیٰ کے مزارات ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ تینوں مزارات پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت معروف کرخیؒ:

حضرت معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ دوسری صدی کے مشہور اولیاء کرام میں سے ہیں، حضرت علی بن موسی الرضاؒ کے آزاد کردہ غلام تھے اور ان کے ملفوظات و افادات صوفیاء کرامؒ کے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنے رہے ہیں

آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن آپ کے بھائی عیسیٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی زمانے سے ان کو عقیدہ توحید کے لئے چن لیا تھا، میں اور وہ ایک عیسائی استاد کے پاس پڑھا کرتے تھے، استاد ہمیں ''باپ، بیٹا'' کا عقیدہ سکھاتا، لیکن حضرت معروف کرخیؒ جواب میں ''احد، احد'' فرماتے، اس پر استاد انہیں مارتے تھے، ایک مرتبہ استاد نے انہیں اتنا مارا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور لاپتہ ہوگئے، ان کی والدہ رو رو کر کہتی تھی اگر اللہ تعالیٰ نے معروف کو میرے پاس لوٹایا تو وہ جو دین چاہے گا اسے اختیار کرنے سے نہیں روکوں گی۔ کئی سال بعد آپ واپس آئے تو ماں نے پوچھا بیٹا! تم کس دین پر ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ اسلام پر، اس پر والدہ بھی مسلمان ہوگئیں اور ہمارا پورا گھر مشرف باسلام ہوگیا۔

(صفۃ الصفوۃ لابن الجوزیؒ ص ۱۸۰ ج ۲)

آپ اُن اولیاء کرام میں سے ہیں جن پر کثرتِ نوافل سے زیادہ ذکر و فکر کا غلبہ تھا۔ ان کے ایک معاصر راوی ابوبکر بن ابی طالبؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت معروف کرخیؒ کے پاس ان کی مسجد میں گیا۔ جب انہوں نے اذان شروع کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت معروف کرخی قدس سرہ پر اضطراب کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور جب مؤذن نے اشہد اَن لا الٰہ الا اللہ کہا تو ان کی ریش مبارک اور ابرو تک کے بال کھڑے ہوگئے اور وہ بے قابو ہو کر اس درجہ جھکنے لگے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ اذان پوری بھی کر سکیں گے یا نہیں۔

(حلیۃ الاولیاء لابی نعیمؒ ج ۸، ص ۳۶۱)

ایک مرتبہ ایک حجام حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ کا خط بنا رہا تھا، حضرتؒ اس

www.freepdfpost.blogspot.com

وقت بھی تسبیح میں مصروف تھے۔ حجام نے کہا کہ ''آپ تسبیح پڑھتے رہیں گے تو مونچھیں نہ بن سکیں گی۔'' حضرت نے فرمایا: ''تم اپنا کام کر رہے ہو، میں اپنا کام نہ کروں؟

(ایضاً ص ۳۶۲)

آپ کا معمول تھا کہ جو کوئی دعوت دیتا، سنّت کے مطابق اس کی دعوت قبول فرما لیتے۔ ایک مرتبہ ایک ولیمہ میں گئے تو وہاں انواع اقسام کے پُر تکلّف کھانے چنے ہوئے تھے۔ وہاں ایک اور صوفی بزرگ موجود تھے، انہوں نے یہ پُر تکلّف کھانے دیکھے تو حضرت معروف کرخیؒ سے فرمایا: ''آپ دیکھ رہے ہیں، یہ کیا ہے؟'' ان کا مقصد یہ تھا کہ اتنے پُر تکلّف کھانے مناسب نہیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ ''میں نے یہ کھانے بنانے کو نہیں کہا تھا۔'' پھر جوں جوں مزید کھانے آتے رہے، وہ صاحب اپنی سابقہ شکایت دہراتے رہے۔ آخر میں حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا۔

أنا عبد مدبر آكل مايطعمني، وأنزل حيث ينزلني.

''میں تو غلام ہوں'' میرے آقا جو کھلاتا ہے، کھاتا ہوں اور جہاں لے جاتا ہے۔ چلا جاتا ہوں۔'' (ایضاً ص ۳۶۴)

ایک مرتبہ آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ ایک سقّاء آواز لگا رہا ہے ''جو مجھ سے پانی پیئے، اللہ اس پر رحم کرے۔'' حضرت معروف کرخیؒ نے اس کی آواز سنی تو آگے بڑھ کر اس سے پانی مانگا اور پی لیا۔ کسی نے پوچھا کہ ''آپ تو روزے سے تھے؟'' فرمایا کہ ''ہاں! لیکن میں نے سوچا کہ شاید اس اللہ کے بندے کی دعا مجھے لگ جائے۔'' (اور روزہ نفلی تھا، بعد میں قضا کر لی ہوگی) (ایضاً ص ۳۶۵)

ایک مرتبہ آپ دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے سے ایک کشتی گذری جس میں کچھ بے فکر نوجوان گانے بجاتے جا رہے تھے، کسی نے حضرت معروف کرخیؒ سے کہا کہ: ''دیکھئے یہ لوگ دریا میں بھی اللہ کی نافرمانی سے باز نہیں آتے، ان کے لئے بددعا کر دیجئے۔'' اس پر حضرت معروف کرخیؒ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی کہ:

''یا الٰہی، اے میرے آقا میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جس طرح آپ

نے نوجوانوں کو دنیا میں مسرّتیں بخشی ہیں، ان کو جنّت میں بھی مسرّتیں عطا فرمائیے۔''

حاضرین نے کہا کہ ہم نے تو آپ سے بددعا کے لئے کہا تھا، فرمایا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آخرت میں مسرّتیں عطا فرمائیں تو ان کے دُنیوی اعمال سے ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اس میں تمہارا تو کوئی نقصان نہیں۔'' (صفۃ الصفوۃ ص ۱۸۱ ج ۲)

حضرت معروف کرخیؒ کی وفات ۲۰۰ھ میں ہوئی اور یہ بات اہل بغداد میں مشہور تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے مزار پر کی ہوئی دعا قبول فرماتے ہیں۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں بارش کی دعا (الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ ص ۶۱ ج ۱) ابوعبداللہ بن الجلاءؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں معروف کرخیؒ کی قبر کے بارے میں ستّر سال سے جانتا ہوں کہ جو کوئی غمزدہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے ہیں۔''

(تاریخ بغداد للخطیبؒ ص ۱۲۳ ج ۱)

حضرت سَری سقطیؒ:

حضرت سَری بن مغلس سقطیؒ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۵۱ھ) انہی حضرت معروف کرخیؒ کے خلیفہ خاص ہیں، اپنے زمانے میں تصوّف اور عقائد کے امام تھے۔ امام شعرانیؒ نے لکھا کہ بغداد میں علم توحید پر سب سے پہلے انہوں نے ہی کلام کیا۔ (طبقات ص ۶۳۰، ج ۱) امام ابونعیمؒ نے ان کا یہ زرّیں ملفوظ روایت کیا ہے کہ:

من ادعى باطن علم ينقض ظاهر حكم فهو غالط

جو کوئی شخص کسی ایسے علم باطن کا دعویٰ کرے جو کسی ظاہری حکم شرعی کے خلاف ہو تو وہ خطا کار ہے۔

(حلیۃ الاولیاء ص ۱۲۱ ج ۱۰)

حضرت سَری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا خصوصی اہتمام تھا کہ دین کے کسی کام میں طلب دنیا کا شائبہ نہ آنے پائے۔ چنانچہ وہ اپنے معتقدین سے کوئی ھدیہ قبول

www.freepdfpost.blogspot.com

نہیں فرماتے تھے۔ حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کھانسی کی شکایت ہوئی تو ان کے معتقدین میں سے کسی نے کھانسی کے لئے ایک گولی اپنے بیٹے کے ہاتھ ان کے پاس بھیج دی، بیٹے نے گولی پیش کی تو حضرتؒ نے پوچھا: اس کی کیا قیمت ہے؟ بیٹے نے جواب دیا کہ میرے والد نے مجھے قیمت نہیں بتائی۔ حضرتؒ نے فرمایا: ''اپنے والد کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ ہم پچاس سال سے لوگوں کو یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ اپنے دین کو دنیا خوری کا ذریعہ نہ بناؤ، آج ہم خود اپنے دین کے عوض دنیا خوری کیسے کریں؟''

(حلیہ ص ۱۱۷، ج ۱۰)

حضرت سَری سقطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے اچھی حالت بخشی ہے، وہ سب حضرت معروف کرخیؒ کی برکت ہے، ایک دن میں نماز عید پڑھ کر واپس آ رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ حضرت معروف کرخیؒ ایک پراگندہ بال بچے کو لے کر کہیں جا رہے ہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ فرمایا کہ میں نے راستے میں دیکھا کہ بچے کھیل رہے ہیں اور یہ بچہ اُن سے الگ اداس کھڑا ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ ''تم کیوں نہیں کھیلتے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''میں یتیم ہوں۔'' حضرت سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت معروف کرخیؒ سے پوچھا کہ ''آپ اس بچے کو ساتھ لے جا کر کیا کریں گے؟'' انہوں نے فرمایا کہ ''کہیں سے گٹھلیاں جمع کر کے اسے دوں گا جس سے یہ اخروٹ خرید کر خوش ہوگا۔'' اس پر میں نے عرض کیا کہ ''یہ بچہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی دیکھ بھال کروں گا۔'' انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ ''واقعی کرو گے؟'' میں نے وعدہ کیا تو فرمایا: ''لے جاؤ اللہ تمہارا دل غنی کرے۔''

حضرت سَری سقطی فرماتے ہیں کہ: حضرت معروف کرخیؒ کی اس دعا کی بدولت میرے دل کی یہ حالت ہوگئی کہ دنیا مجھے حقیر سے حقیر شے کے مقابلے میں بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ (حلیہ ص ۱۲۳، ج ۱۰)

یہ بھی حضرت سَری سقطی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو کچھ لوگ عیادت کے لئے آئے۔ احادیث کی رُو سے عیادت کا مسنون طریقہ یہ ہے

کہ جو لوگ بیمار شخص سے بے تکلف نہ ہوں، ان کو مختصر طور پر بیمار پُرسی کرنے کے بعد بیمار کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھنا چاہیئے۔ تاکہ اُسے تکلیف نہ ہو، لیکن حضرت سقطیؒ کی بیمار پُرسی کرنے والے دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے، بے تکلف والے افراد کے دیر تک بیٹھنے سے بیمار کو طبعی طور پر تکلیف ہوتی ہی ہے، حضرتؒ کو بھی ہوئی جب کافی دیر گذر گئی تو آنے والوں نے کہا کہ ''دُعا فرما دیجئے۔'' اس پر حضرت سقطیؒ نے ہاتھ اٹھایا اور فرمایا: ''یا اللہ! ہمیں عیادت کے آداب سکھا دیجئے۔'' (ایضاً ص ۱۲۲)

حضرت جنید بغدادیؒ:

سیّد الطائفہ حضرت جنید بن محمد بغدادیؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں، آپ حضرت سَری سقطیؒ کے بھانجے بھی تھے اور ان کے خلیفہ بھی۔ آپ کے آباء واجداد نہاوند کے باشندے تھے۔ لیکن آپ کی ولادت اور نشو نما عراق میں ہوئی۔ آپ صوفیاء کرام کے سرخیل ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ ظاہرہ کے بھی زبردست عالم تھے اور فقہ میں عموماً حضرت امام ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ دیتے تھے جو امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔

(طبقات الشعرانی ص ۷۲، ج ۱)

امام ابونعیم اصفہانیؒ نے آپؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے کہ: ''جو شخص حافظِ قرآن نہ ہو، اس نے کتاب حدیث کا مشغلہ نہ رکھا ہو اور علم فقہ نہ حاصل کیا ہو، وہ اقتداء کے لائق نہیں۔''

(حلیہ الاولیاء ص ۲۵۵، ج ۱۰)

آپ کے بے شمار ملفوظات اولیاء کرامؒ نے محفوظ کر کے ہم تک پہنچائے ہیں، جن میں علم وحکمت اور فراستِ ایمانی کے خزانے پنہاں ہیں۔ امام ابونعیم اصفہانیؒ نے اپنی مشہور کتاب حلیۃ الاولیاء کی دسویں جلد میں آپ کے ملفوظات تیس صفحات میں بیان فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند بطور مثال پیش خدمت ہیں:

(۱) فرمایا کہ:

من ظنّ أنه يصل ببذل المجهود فمتعن ومن ظن أنه

www.freepdfpost.blogspot.com

يصل بغير بذل المجهود فمتمنّ.

جو شخص یہ سمجھتا کہ وہ اپنی کوشش سے اللہ تک پہنچ جائے گا وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈال رہا ہے اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر محنت اور کوشش کے پہنچ جائے گا وہ خواہ مخواہ آرزوئیں باندھ رہا ہے۔

(صفحہ ۲۲۷)

مطلب یہ ہے کہ بے عملی کے ساتھ آرزوئیں لگانا بھی غلط ہے اور محنت و کوشش کر کے اس پر ناز اور اعتماد کرنا بھی غلط، صحیح راستہ یہ ہے کہ کوشش میں لگا رہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و رحمت کا طلب گار رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و رحمت ہی سے وصول ہوتا ہے۔

(۲) فرمایا کہ:

لاتيأس من نفسک و أنت تشفق من ذنبک و تندم عليه بعد فعلک. (ص ۲۶۷)

جب تم اپنے گناہوں سے خائف ہو اور اگر کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر ندامت محسوس کرتے ہو، اس وقت تک اپنے آپ سے مایوس نہ ہو۔

(۳) آپ کے شیخ حضرت سرّی سقطیؒ نے آپ سے پوچھا کہ شکر کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا:

ألا يستعان بشيئي من نعمه على معاصيه.

شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کو اس کی معصیتوں میں استعمال نہ کیا جائے۔

حضرت سرّی سقطیؒ نے اس جواب کو بیحد پسند فرمایا۔ (ص ۱۱۹ و ۲۶۸ ج ۱۰)

(۴) فرمایا کہ:

الانسان لا يعاب بمافي طبعه، إنما يعاب إذافعل بما في

طبعه. (ص ۲۶۹)

جب کوئی انسان کوئی بُری بات انسان کی طبیعت (دل) میں رہے، اس وقت تک وہ کوئی عیب نہیں، ہاں جب وہ طبیعت کی اس بات پر عمل کر لے تو یہ عیب کی بات ہے۔

یہ بعینہ وہ بات ہے جو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ ملفوظات میں ملتی ہے کہ جب تک رذائل کے مقتضاء پر عمل نہ کیا جائے، اُس وقت تک وہ رذائل مضر نہیں ہوتے۔

(۵) ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ "مجھے دنیا میں پیش آنے والا کوئی واقعہ ناگوار نہیں ہوتا، اس لئے کہ میں نے یہ اصول دل میں طے کر رکھا ہے کہ یہ دُنیا رنج و غم اور بلاء اور فتنہ کا گھر ہے، لہٰذا اس کو تو میرے پاس برائی ہی لے کر آنا چاہئے۔ لہٰذا اگر کبھی وہ کوئی پسندیدہ بات لے کر آئے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، ورنہ اصل وہی پہلی بات ہے۔" (ص ۲۷۰)

(۶) ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ "دنیا" (جس سے پرہیز کی تاکید کی جاتی ہے) کیا ہے؟ فرمایا:

مادنا من القلب، وشغل عن الله

جو دل کے قریب آ جائے اور اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے۔ (ص ۲۷۴)

(۷) ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ "**متى تصير النفس داء ها دواء ها؟**" ایسا کب ہوتا ہے کہ نفس کے امراض خود اس نفس کا علاج بن جائیں؟ آپ نے برجستہ جواب دیا:

اذا خالفت هواء ها صار داء ها دواء ها

جب تم نفس کی مخالفت کرو تو اس کی بیماری ہی اس کا علاج بن جاتی ہے۔ (ص ۲۷۴)

یہ تو چند مثالیں ہیں، ورنہ آپ کے تمام ملفوظات اسی قسم کی حکمتوں سے لبریز ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
www.freepdfpost.blogspot.com

کو ساتھ لے کر آیا اور بغداد میں آپ کو دوبارہ قید کر دیا اور اسی قید کی حالت میں آپ کی وفات ہوئی۔ اس دوسری قید کے دوران آپ نے ہارون رشید کو جو ایک مختصر خط لکھا ہے وہ اپنی بلاغت اور تاثیر کا شاہکار ہے اور اس کو جتنی بار پڑھا جائے، اس میں حکمت و موعظت کی ایک کائنات سمٹی ہوئی نظر آتی ہے، فرمایا:

إنه لن ينقضي عني يوم من البلاء إلاّ انقضى عنك معه يوم من الرخاء حتى نفضي جميعا إلى يوم ليس له انقضاء، يخسر فيه المبطلون. (صفة الصفوة ص ١٠٥ ج ٢)

اس دریا بکوزہ فقرے کی اصل تاثر تو عربی ہی میں ہے، لیکن اُردو میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ۔

''میری اس آزمائش کا جو دن بھی کٹتا ہے وہ تمہاری عیش و عشرت کا ایک دن اپنے ساتھ کاٹ کر لے جاتا ہے، یہاں تک کہ ہم دونوں ایک ایسے دن تک پہنچ جائیں گے جو کبھی کٹ نہیں سکے گا، اُس دن خسارہ اُن لوگوں کا ہوگا جو باطل پر ہیں۔

حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے، کثرت عبادت کی بنا پر ان کا لقب ''العبد الصالح''، مشہور تھا، جو سخا میں بھی یکتا تھے جب کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ آپ کی غیبت کرتا ہے تو اس کے پاس کوئی مالی ہدیہ بھیج دیتے۔ ہارون رشید کی قید ہی میں ۵ رجب ۱۶۳ھ کو وفات ہوئی۔

(الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ ص ۳۳، ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد بھی ان کے مزار کو یہ مقام بخشا کہ بزرگوں کے تجربے کے مطابق وہاں جو دعا کی جائے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں۔ ابو علی خلال کہتے ہیں کہ ''مجھے جب بھی کوئی پریشانی پیش آئی تو میں حضرت موسیٰ بن جعفرؒ کے مزار پر گیا اور ان کے توسّل سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ میرے مقصد کو آسان فرمادیا۔'' (تاریخ بغداد للخطیب ص ۱۲۰، ج ۱)

یہاں تک تو بات صحیح تھی لیکن حدود کی فہم نہ رکھنے والے نادان معتقدین نے اس

مقدس بزرگ کے مزار کو نہ جانے کیا بنا دیا ہے؟ وہاں ہر وقت بدعات اور بدعقیدگی کا وہ طوفان برپا رہتا ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو سنت کے مطابق قبر کی زیارت کرنا چاہتا ہو، وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنا مشکل معلوم ہے۔

چونکہ اہل تشیع کے نزدیک حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ بارہ اماموں میں سے ایک ہیں، اس لئے ان کے مزار پر جو عمارت تعمیر کی گئی ہے، وہ فنِ تعمیر کا بھی ایک نمونہ ہے، اس کے میناروں اور دروازوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے جو دور سے چمکتا نظر آتا ہے اور اس مزار پر ہر وقت ایک میلے کا سماں رہتا ہے۔ کوئی عمارت کا حسن دیکھنے آرہا ہے، کوئی اُسے (معاذ اللہ) کعبہ بنائے ہوئے ہے اور مزار کی جالیاں چوم چوم کر اس کا طواف کر رہے کوئی صاحب مزار کو بذاتِ خود حاجت روا سمجھ کر انہی سے اپنی مرادیں مانگ رہا ہے۔ مزار کے آس پاس دُور تک زائرین کے قیام کے لئے ہر طرح کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں کچھ لوگ مزار کی زیارت کرانے کے لئے باقاعدہ مزوّر بنے ہوئے ہیں، کچھ لوگ پھولوں کی تجارت کر رہے ہیں کہ آنے والے ان سے پھول خرید کر مزار پر نچھاور کریں، کچھ لوگ نقد روپے اور سکے لا لا کر مزار کی جالیوں میں ڈال رہے ہیں اور اسی کو اپنے لئے باعث نجات سمجھے بیٹھے ہیں..... جہالت اور بد اعتقادی کے اس سیلاب میں یہ سوچنے کی فرصت کسے ہے کہ خود صاحب مزار ان تمام لغویات سے بَری ہیں۔ اگر اپنی وفات کے بعد اُن کا اختیار چلتا تو ان کا مزار سنت کے مطابق ایک سادہ کچی قبر کے سوا کچھ نہ ہوتا، نہ قبر پختہ ہوتی، نہ اس پر یہ جھلمل کرتا ہوا محل بنتا، نہ کسی کی یہ مجال ہوتی کہ وہاں کسی بدعت یا شرک کا ادنیٰ شائبہ رکھنے والے کسی فعل کا ارتکاب کر سکے۔

بدعات و رسوم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کو کوئی خاص شکل عموماً عالمگیر نہیں ہوتی، بلکہ ہر علاقے میں اس کی کوئی الگ ضرورت نظر آتی ہے، چونکہ ان رسوم و بدعات کی کوئی بنیاد قرآن و سنت میں نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر علاقے کے لوگ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق کچھ رسمیں گھڑ لیتے ہیں جن کی دوسرے علاقے میں بعض اوقات خبر بھی نہیں ہوتی اور وہاں کچھ لوگ اور طرح کی رسوم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ مزار پر کی جانے والی بدعات میں

www.freepdfpost.blogspot.com

بھی یہ بات نظر آتی ہے بعض رسمیں تو عراق کے مزارات میں وہی نظر آئیں جو ہم پاکستان ہندوستان میں دیکھتے آئے ہیں اور بعض ایسی نئی نئی رسوم بھی نظر آئیں جو ہمارے ملکوں میں رائج نہیں ہیں۔

ایک بے بس مُسافر ان بزرگوں کے مزارات کے ساتھ ہونے والی ان زیادتیوں پر کُڑھنے اور اُن مذہبی رہنماؤں کے حق میں دعائے ہدایت کے سوا اور کیا کر سکتا ہے جنہوں نے بھولے بھالے اَن پڑھ عوام کو ان بزرگوں کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرانے کے بجائے ان لغو بدعات و رسوم میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔

..... ☆.....☆.....☆.....

(۴)

امام ابو یوسفؒ کے مزار پر:

حضرت موسیٰ الکاظمؒ کے مزار ہی کے احاطے میں جنوبی جانب ایک مسجد ''جامع ابی یوسفؒ'' کے نام سے بنی ہوئی ہے۔ اسی مسجد کے ایک حصے میں حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہاں حاضری ہوئی۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امت کے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جن کے احسانات سے اس امت کی گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔ خاص طور پر فقہِ حنفی کے پیروؤں کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بحیثیت فقیہ اپنے شیخ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کو امت کی طرف منتقل کیا، بلکہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے اس فقہ کو محض نظریاتی حیثیت سے نکال کر جیتی جاگتی زندگی میں عملاً نافذ فرمایا۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے والد ابراہیم ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، ان کی والدہ نے فکر معاش کی وجہ سے انہیں ایک دھوبی کے حوالے کر دیا، لیکن انہیں پڑھنے کا شوق تھا یہ جا کر امام ابو حنیفہؒ کے درس میں بیٹھنے لگے۔ والدہ کو علم ہوا تو انہوں نے منع کیا، اور

اس بنا پر وہ کئی روز امام ابو حنیفہؒ کے درس میں نہ جا سکے۔ ذہین اور شوقین طالب علم کی طرف استاذ کی توجہ طبعی بات ہے۔ جب کئی دن بعد وہ درس میں پہنچے تو امام صاحبؒ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ حضرت امام ابو حنیفہ نے درس کے بعد انہیں بلایا، ایک تھیلی حوالے کی جس میں سو درہم تھے اور فرمایا کہ: ''اس سے کام چلاؤ، اور جب ختم ہو جائے تو مجھے بتانا۔'' حضرت امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی مجھے امام صاحب کو بتانے کی نوبت نہیں آئی کہ تھیلی ختم ہو چکی ہے، ہمیشہ جب پیسے ختم ہو جاتے امام صاحبؒ خود ہی مزید پیسے عطا فرما دیتے، جیسے انہیں ختم ہونے کا الہام ہو جاتا ہو۔

ان کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہوں گی یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کوئی مستقل ذریعۂ معاش ہونا چاہئے۔ اس لئے ایک مرتبہ انہوں نے امام ابو حنیفہ سے کہا کہ یہ یتیم بچہ ہے میں چاہتی ہوں کہ کوئی کام سیکھ کر کمانے کے لائق ہو جائے، اس لئے آپ اسے اپنے درس میں شریک ہونے سے روکیے۔ لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ نے جواب دیا کہ: ''یہ تو پستے کے گھی میں فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے۔'' والدہ نے اسے مذاق سمجھا اور چلی گئیں۔

لیکن امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی علم کی بدولت وہ قدر و منزلت عطا فرمائی کہ میں قضاء کے منصب تک پہنچا اور اس دور ان بکثرت خلیفہ وقت ہارون رشید کے دسترخوان پر کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ایک روز میں ہارون رشید کے پاس بیٹھا تھا کہ اس نے ایک پیالہ مجھے پیش کیا اور بتایا کہ ''یہ بڑی خاص چیز ہے جو ہمارے لئے بھی کبھی کبھی بنتی ہے۔'' میں نے پوچھا: ''امیر المومنین! یہ کیا ہے؟'' کہنے لگے کہ: ''یہ پستے کے روغن میں بنا ہوا فالودہ ہے۔'' یہ سن کر مجھے حیرت کی وجہ سے ہنسی آ گئی۔ ہارون رشید نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے سارا قصہ سنایا وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا اور کہنے لگا کہ ''اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہؒ پر رحم فرمائے وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو چشمِ سر سے نظر نہیں آ سکتا۔'' (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۴۵، ج ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ کی صحبت کی برکت سے علم و فقہ میں وہ مقام بخشا جو بہت کم کسی کو نصیب ہوتا ہے، فقہ کے علاوہ علم حدیث میں

www.freepdfpost.blogspot.com

بھی ان کا مقام مسلم ہے، یہاں تک کہ جن حضرات نے غلط فہمیوں کی بنا پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ پر علم حدیث میں جرح کی ہے، وہ بھی امام ابو یوسفؒ کو حدیث میں ثقہ مانتے ہیں۔ (دیکھئے کتاب الثقات، لابن حبانؒ) بلکہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے علمِ حدیث حاصل کرنا چاہا تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسفؒ کے پاس گیا، اس کے بعد دوسرے مشائخ سے علم حاصل کیا۔ (تاریخ بغداد، ص ۲۵۵ ج ۱۴)

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد تقریباً سترہ سال آپ قاضی کے منصب پر فائز رہے اور اسلام میں ''قاضی القضاۃ'' کا لقب سب سے پہلے آپ ہی کے لئے استعمال ہوا۔ لیکن حضرت یحییٰ بن معینؒ سے مروی ہے کہ منصبِ قضاء کی زبردست مصروفیات کے باوجود آپ یہ عہدہ سنبھالنے کے بعد دن اور رات میں ملا کر دو سو رکعتیں یومیہ پڑھا کرتے تھے۔ (مرآۃ الجنان للیافعی ص ۳۸۲ ج ۱)

حضرت امام ابو یوسفؒ کو سب سے پہلے خلیفہ موسیٰ بن المہدیؒ نے قاضی بنایا تھا اتفاق سے اسی کا ایک عام شہری سے، ایک باغ کے سلسلے میں کچھ تنازعہ پیش آ گیا اور مقدمہ قاضی ابو یوسفؒ کے پاس آیا۔ خلیفہ موسیٰ کی طرف سے اس کی ملکیت پر گواہ پیش ہو گئے اور گواہوں کی گواہی کی بنا پر بظاہر فیصلہ خلیفہ ہی کے حق میں ہونا تھا، لیکن امام ابو یوسفؒ کو کچھ شبہ ہو گیا کہ شاید حقیقت اس کے خلاف ہے جو گواہوں کی گواہی سے ظاہر ہو رہی ہے، اس لئے انہوں نے موسیٰ بن المہدی کو عدالت میں طلب کر کے ان سے کہا کہ ''امیر المومنین! آپ کے فریقِ مخالف کا مطالبہ ہے کہ آپ سے یہ قسم لی جائے کہ آپ کے گواہوں نے سچی گواہی دی ہے۔''

عام قاعدے کی رو سے مدعی اگر اپنے دعوے پر قابل اعتماد گواہ پیش کر دے، تو مدعی کو قسم کھانے پر مجبور نہیں کیا جاتا، اس لئے موسیٰ نے پوچھا:

''کیا آپ کی رائے میں اس طرح مدعی سے قسم لینا درست ہے؟''

امام ابو یوسفؒ نے جواب دیا ''قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا مسلک یہی تھا کہ وہ مدعی سے قسم لینے کو جائز سمجھتے تھے۔''

خلیفہ کو کسی مادی تنازعے میں قسم کھانا گوارہ نہ تھا، اس لئے خلیفہ نے کہا: ''میں باغ سے مدعا علیہ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔''

چنانچہ باغ مدعا علیہ کو دلوا دیا گیا۔ (تاریخ بغداد ص ۲۴۹، ج ۱۴)

سترہ سال قضاء کی نازک ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد جب وفات کا وقت آیا تو امام ابو یوسفؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ''الحمد اللہ، میں نے جان بوجھ کر کسی مقدمے میں ناحق فیصلہ نہیں کیا۔ ہمیشہ کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی کوشش کی اور جس مسئلے میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی، اس میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر اعتماد کیا کیونکہ میرے علم کے مطابق وہ اللہ کے احکام کے بہترین شارح تھے۔''

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے کچھ حالات اسی مضمون میں بیان ہو چکے ہیں) امام ابو یوسفؒ کے ہمعصر تھے، ایک دن انہوں نے اپنے متوسلین میں سے کسی سے کہا کہ: ''امام ابو یوسفؒ آج کل بیمار ہیں، اگر ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔'' (مقصد یہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کریں)

وہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسفؒ کی حالت معلوم کرنے کے لئے ان کے گھر پہنچا تو وہاں سے جنازہ باہر نکل رہا تھا، میں نے سوچا کہ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ حضرت معروف کرخیؒ کو اطلاع کی جائے اور وہ جنازے میں شریک ہو سکیں، اس لئے میں خود ان کی نماز جنازہ میں شامل ہو گیا اور بعد میں حضرت معروف کرخیؒ کو سارا واقعہ بتایا۔ حضرت معروف کرخیؒ بار بار انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے رہے اور جنازے میں شریک نہ کر سکنے پر بہت افسوس کا اظہار کرنے لگے۔

جو عالم سترہ سال تک قضاء کے سرکاری منصب پر فائز رہا ہو، اُس کے بارے میں معاصرین کو اگر بدگمانیاں پیدا نہ ہوں تو کم از کم اُن کی بزرگی اور ورع وتقویٰ کا ایسا احساس باقی نہیں رہتا کہ حضرت معروف کرخیؒ جیسے صوفی بزرگ ان کے جنازے میں شریک نہ ہونے پر رنجیدہ ہوں۔ شاید اس لئے اُن صاحب نے حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ ''ان کے جنازے میں شریک نہ کرنے پر آپ کو اتنا افسوس کیوں ہے؟

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت معروف کرخی نے فرمایا: ''میں نے (غالباً خواب میں) دیکھا ہے کہ جیسے میں جنّت میں گیا ہوں، وہاں ایک محل بن کر تیار ہوا ہے، اس کے دروازے پر پردے لٹکائے گئے ہیں؟ میں نے پوچھا کہ: یہ محل کس کا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ یہ قاضی ابو یوسفؒ کا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان کو یہ مرتبہ کس عمل کی بدولت ملا؟ جواب دیا گیا کہ: وہ لوگوں کو بھلائی کی تعلیم بھی دیتے تھے اور خود بھی اس کے حریص تھے اور لوگوں نے انہیں تکلیفیں بھی بہت پہنچائیں۔'' (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۶۱ ج ۱۴)

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر:

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے نکلے تو سورج ڈھلنے کے قریب تھا اور اب دل میں شدید اشتیاق حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کا تھا جو یہاں سے کافی دور واقع ہے، لیکن ہمارے ڈرائیور نے جو صرف ڈرائیونگ نہیں، بلکہ مہمان نوازی کے فرائض بھی بڑے خلوص و محبت کے ساتھ انجام دے رہا تھا، مغرب کے وقت جامع الامام الاعظمؒ میں پہنچا دیا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی وجہ سے یہ پورا علاقہ ''اعظمیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اب تو یہ شہر خاصا بارونق ہے، لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے عہد مبارک میں یہ ایک قبرستان تھا اور چونکہ خلیفہ کی کنیز ''خیزران'' یہاں دفن ہوئی تھی، اس لئے ''مقبرۃ الخیزران'' کے نام سے مشہور تھا۔ خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کے مشہور راوی محمد ابن اسحاقؒ بھی اسی قبرستان میں مدفون ہیں، لیکن اب دوسری قبریں تو بے نشان ہو چکی ہیں اور اس کی جگہ آبادی نے لے لی ہے، البتہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ابھی باقی ہے اور اس کے قریب ایک شاندار مسجد ''جامع الامام ابی حنیفہؒ'' کے نام سے تعمیر کر دی گئی ہے۔

ہم مسجد کے دروازے پر پہنچے تو اذان مغرب کی دلکش صدا گونج رہی تھی۔ مزار پر حاضری سے پہلے مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر شوق و ذوق کے جذبات دل میں لئے

مزار پر حاضری ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ سرور و سکون اور نورانیت نے مجسّم ہو کر اس مبارک مزار کے گرد ایک دھالہ بنایا ہے۔ سامنے وہ محبوب شخصیت آسودہ تھی جس کے ساتھ بچپن ہی سے تعلق خاطر کی کیفیت یہ رہی ہے کہ ان کا اسمِ گرامی آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کی پھواریں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں کوفہ میں پیدا ہوئے جب یہ شہر علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے چپّہ چپّہ پر بڑے بڑے محدثین اور فقہاء کے حلقہ ہائے درس آراستہ تھے اور علم حدیث کا کوئی بھی طالب کوفہ کے علماء سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت امام صاحبؒ کے والد ماجد کا نام ثابتؒ تھا اور ان کا انتقال امام صاحبؒ کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے بعد میں حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کر لیا تھا اور آپ ان کی آغوش تربیت میں پروان چڑھے۔

(حدائق الحنفیہ ص ۴۳، بحوالۂ مفتاح السعادہ)

شروع میں حضرت امام صاحبؒ تجارت میں زیادہ مشغول رہے، لیکن ساتھ ساتھ علم عقائد و کلام سے بھی شغف تھا۔ حضرت عامر بن شراحیل شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ میں ذہانت و فطانت کے آثار دیکھے تو تحصیل علم میں انہماک کی نصیحت کی۔ یہ نصیحت کارگر ہوئی اور آپ نے تجارت کے مشغلے کے بجائے تحصیل علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی ص ۵۹ ج ۱) اور اپنے عہد کے بیشتر جلیل القدر مشائخ سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ بعض حضرات نے امام صاحبؒ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار تک بتائی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے علم و دین کی جو عظیم خدمت لی وہ محتاج بیان نہیں اور اسی کا ثمرہ ہے کہ آج آدھی سے زائد مسلم دنیا نے قرآن و سنّت کی تشریح و تعبیر میں انہی کو اپنا امام اور مقتدا مانا ہوا ہے۔

شروع میں حضرت امام صاحبؒ کوفہ میں ہی مقیم رہے، لیکن کوفہ کے امیر ابن ہبیرہ نے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر آپ کو نہ صرف قید کیا، بلکہ اذیتیں بھی دیں، بالآخر جب آپ قید سے رہا ہوئے تو اس کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے مکہ مکرمہ کا رخ کیا اور کئی سال وہاں مقیم

www.freepdfpost.blogspot.com

رہے بعد میں جب عراق کے حالات سازگار ہوئے تو دوبارہ عراق تشریف لائے، اُس وقت عبّاسی خلافت کا آغاز ہو رہا تھا۔ شروع میں آپ نے اس اُمید پر عبّاسی خلافت کا خیر مقدم کیا کہ وہ دینی اعتبار سے بنوامیّہ سے بہتر ثابت ہوں گے۔ لیکن جب یہ اُمید بر نہ آئی تو عبّاسی خلفاء سے بھی آپ کا اختلاف شروع ہو گیا۔ خلیفہ منصور اپنے عہد حکومت میں یہ چاہتا تھا کہ امام صاحبؒ کوئی سرکاری منصب قبول فرمالیں تاکہ لوگوں کو ان کی حمایت کا تاثر دیا جاسکے، لیکن حضرت امام صاحبؒ اس لئے کوئی منصب قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ اس میں بعض خلافِ شرع امور میں سرکاری احکام کی تعمیل کرنی پڑے گی، بالآخر جب اصرار زیادہ بڑھا تو آپ نے بغداد کے معماروں کی نگرانی اور اینٹیں شمار کرنے کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ بعد میں منصور کی طرف سے عہدۂ قضا قبول کرنے پر اصرار کیا گیا۔ لیکن حضرت امام صاحبؒ اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، جس کی پاداش میں منصور نے آپ کو قید بھی کیا اور ایک سو دس کوڑے بھی لگوائے۔ پھر بعض روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قید کی حالت میں وفات ہوئی اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رہائی تو ہو چکی تھی، لیکن حکومت کی طرف سے فتویٰ دینا اور گھر سے باہر لوگوں سے میل جول رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی حالت میں وقتِ موعود آ پہنچا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس طرح بغداد کے اس حصّے کو آپ کی آرامگاہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، یہ جگہ جہاں امام اعظمؒ کا مزار ہے، ایک قبرستان تھا جو ''مقبرۃ الخیزران'' کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن حضرت امام صاحبؒ کی تدفین کے بعد یہ ''اعظمیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے معتقدین نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرلی، اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا یہی مسجد وسیع ہوتے ہوتے ایک شاندار جامع مسجد بن گئی اور اس کی ایک مستقل تاریخ ہے جس پر مسجد کے موجودہ امام صاحب نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہمیشہ مرجع خاص وعام رہا۔ بلکہ خطیب بغدادیؒ اپنی پسند سے امام شافعیؒ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:

انّی لأ تبرک بأبی حنیفة وأجیئ إلی قبره فی کل یوم. یعنی زائرا. فا ذاعرضت لی حاجة صلیت رکعتین، وجئت إلی قبره وسألت اللہ تعالیٰ الحاجة عنده، فما تبعد عنی حتی تقضی. (تاریخ بغداد ص۱۲۳، ج۱)

''میں امام ابوحنیفہؒ سے برکت حاصل کرنے کے لئے روزانہ ان کی قبر پر جاتا ہوں اور جب کبھی مجھے کوئی ضرورت لاحق ہوتی ہے، میں دو رکعتیں پڑھ کر ان کی قبر پر حاضر ہوتا ہوں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ میری حاجت جلد پوری فرمالیتے ہیں۔''

اور یہ بات تو بہت مشہور ہے ہی کہ ایک مرتبہ امام شافعیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو وہاں اپنے مسلک کے خلاف نماز فجر میں قنوت نہیں پڑھا کیونکہ امام ابو حنیفہؒ اس کے قائل نہیں تھے۔

حضرت امام صاحبؒ کے مزار پر بیٹھ کر ایسا سرور وسکون محسوس ہوا جیسے کوئی بچّہ ماں کی آغوش میں پہنچ کر سکون محسوس کرتا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ یہ کیفیت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے، لیکن کافی دیر ہو چکی تھی، اُٹھے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بادلِ ناخواستہ یہاں سے رخصت ہوئے۔

کتب خانوں میں:

رات ہو چکی تھی، اس لئے حضرت امام صاحبؒ کے مزار پر حاضری کے بعد خواہش یہ تھی کہ یہاں کے تجارتی کتب خانوں سے ایسی کتابیں خریدی جائیں جو پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں، چنانچہ وہاں سے بغداد کے سب سے بارونق اور مرکزی علاقے ''الباب الشرقی'' پہنچے، عرصۂ دراز سے ذہن پر تأثر یہ تھا کہ دنیا بھر میں عربی کتابوں کا سب سے بڑا اسٹاکسٹ بغداد کا مکتبۃ المثنی ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے ہم نے اس کتابوں کی فہرست منگوائی تھی تو وہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھی، اس لئے اپنے رہنما عبدالرزاق صاحب سے ہم

www.freepdfpost.blogspot.com

نے وہیں جانے کی خواہش ظاہر کی، خیال یہ تھا کہ تنہا اس ایک مکتبہ ہی سے اتنی کتابیں مل جائیں گی کہ کہیں اور جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

لیکن جب پتہ پوچھتے پوچھتے ''مکتبۃ المثنی'' پہنچے تو دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں کتابوں سے زیادہ اسٹیشنری کا سامان برائے فروخت رکھا تھا، میں سمجھا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ اب مکتبۃ المثنی کی وہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ غالباً اصل مالک کا انتقال ہو گیا، اور وارثوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اسے اچھی طرح سنبھال سکے۔ اس لئے وہ ختم ہوتے ہوتے درسی کتابوں، ناولوں، افسانوں اور اسٹیشنری کی دکان بن کر رہ گیا۔ انقلابات زمانہ کا یہ منظر اس درجہ عبرت خیز تھا کہ کافی دیر تک دل اس سے متاثر رہا۔ انسان دُنیا کی کس چیز پر بھروسہ کر سکتا ہے؟ **ماعندکم ینفد وما عنداللہ باق.**

تاہم آس پاس کچھ اور کتب خانے موجود تھے، وہاں سے کچھ کتابیں خریدی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ایک عراقی دینار کی سرکاری قیمت چار ڈالر ہے، گویا تقریباً پینسٹھ پاکستانی روپے تو مزید خریداری کا حوصلہ نہ رہا، وہ تو غنیمت یہ ہوا کہ احقر کے رفیق سفر جناب قاری بشیر احمد صاحب سعودی عرب کے کھلے بازار سے کچھ عراقی دینار تقریباً ایک ڈالر فی دینار کے حساب سے خرید لائے تھے، اس لئے جتنی کتابیں خریدی اُن میں زیادہ نقصان نہیں ہوا اور بعض بڑے کام کی کتابیں مل گئیں۔ لیکن مزید خریداری بڑی مہنگی پڑنے والی تھی، دوسرے کتب خانوں میں پھرنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوا کہ غالباً جنگ کی وجہ سے کتابوں کا کوئی بہت بڑا ذخیرہ اب بغداد میں موجود نہیں ہے۔ اسلئے جتنی کتابیں لے چکے تھے، انہیں پر قناعت کر کے ہوٹل واپس آ گئے۔

وزارتِ اوقاف میں:

اگلی صبح دس بجے میزبانوں نے وزارتِ اوقاف کے دفتر میں مدعو کیا تھا، وہاں عراقی وزیر اوقاف عبد اللہ فاضل صاحب سے ملاقات ہوئی جو بڑے خلیق ہنس مکھ، ملنسار

اور علم دوست آدمی ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان آئے تو دارالعلوم بھی آئے تھے اور بفضلہٖ تعالیٰ یہاں کے انداز درس وتدریس اور حسن انتظام سے بڑے متاثر ہو کر گئے تھے، انہوں نے بڑی گرمجوشی کا معاملہ کیا۔

عراق کی وزارت اوقاف اس لحاظ سے عالمِ اسلام کی تمام وزارتوں میں ممتاز ہے کہ اس نے نایاب اور نادر علمی و دینی کتابوں کو بڑے حسنِ اہتمام سے شائع کر کے ان کا ایک بڑا ذخیرہ تیار کر دیا ہے، وہ اب تک سو سے زائد ایسی نادر و نایاب کتابیں شائع کر چکی ہے، جو اس سے پہلے مخطوطات کی شکل میں تھیں، اور عام علمی دنیا ان سے استفادہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان کتابوں میں ''المعجم الکبیر للطبرانیؒ'' امام خصافؒ کی ''ادب القاضی'' پر حضرت صدر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شرح، امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج کی شرح ''الرتاج'' امام سُغدیؒ کی ''النتف فی الفتاوی'' علامہ قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ کی ''موجبات الاحکام'' وغیرہ بطورِ خاص قابل ذکر ہیں، اگر عراق کو جنگ کا سامنا نہ ہوتا تو اب تک یہ سلسلہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوتا۔

ان میں سے بہت سی کتابیں شائع ہو کر نایاب ہو چکی ہیں۔ لان میں جو کتابیں موجود تھیں، تین کارٹنوں پر مشتمل ان کا ایک سیٹ بھی وزیر موصوف نے ناچیز کو ہدیۃً دیا جو احقر کے لئے انتہائی گرانقدر تحفہ تھا اور سچ پوچھئے تو سفرِ عراق کے مقاصد میں سے احقر کا ایک اہم مقصد بھی تھا۔ **فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء.**

مدائن میں:

وزارت اوقاف سے فارغ ہو کر ہم نے مدائن کا رُخ کیا جو بغداد سے تقریباً پچاس کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بغداد سے نکل کر مدائن کی سڑک پر روانہ ہوئے تو دونوں طرف پھیلے ہوئے نخلستانوں کا سلسلہ نظر افروز ہوتا رہا، لیکن ملک چونکہ حالت جنگ میں ہے اور یہاں سے ایران کی سرحد کچھ زیادہ دور نہیں اس لئے جا بجا مورچے اور دمدمے بنے نظر آئے جن میں مسلح فوجی توپیں سنبھالے کھڑے تھے۔ عراق میں داخل ہونے کے بعد پہلی بار محسوس

www.freepdfpost.blogspot.com

ہوا کہ یہ ملک حالت جنگ میں ہے ورنہ بغداد کی چہل پہل رات کے وقت روشنیوں کے ہجوم اور معمول کے مطابق رواں دواں زندگی کو دیکھ کر اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس ملک میں کوئی جنگ ہو رہی ہے۔

لیکن ان جنگی مورچوں، دمدموں اور ان میں نظر آنے والے سپاہیوں اور ان کے اسلحہ کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوئی۔ حقیقت میں دشمن کون تھا؟ اور لڑائی کس سے شروع ہوگئی؟ عراق ہو یا ایران دونوں مسلم ملک ہونے کے دعویدار ہیں۔ دنیا بھر کی سامراجی طاقتیں دونوں کی دشمن ہیں، یہ دونوں ملک متحد ہو کر ان دشمن کا مقابلہ کرتے تو یہ اسلحہ، یہ سپاہی، یہ جنگی ساز و سامان امت کے تحفظ، اس کی سلامتی اور عزت و آزادی کیلئے استعمال ہوتا، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ دونوں ملک آپس میں لڑ بھڑ کر کمزور سے کمزور تر ہو رہے ہیں، دونوں طرف سے روزانہ کروڑوں روپیہ ایک بے مقصد جنگ میں پھنک رہا ہے دونوں ملکوں کے بیسیوں خاندان روزانہ اپنے رکھوالوں سے محروم ہو رہے ہیں اور اسلام دشمن طاقتیں مزے کے ساتھ تماشا دیکھ رہی ہیں، اب تو ان ملکوں میں کوئی خاندان بمشکل ایسا ملے گا جس کا کوئی نہ کوئی عزیز اس بے مصرف لڑائی کی بھینٹ نہ چڑھ چکا ہو۔

جنگ کی ابتدا کس نے کی؟ اس بارے میں دونوں ملکوں کے بیانات مختلف ہیں لیکن اگر ابتداء کی سنگین غلطی عراق ہی سے سرزد ہوئی ہو، تب بھی اب کچھ عرصے سے عراق نے غیر مشروط جنگ بندی کی پیشکش کی ہوئی ہے، جسے قبول کر کے مسائل کو مفاہمت کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے، مگر ایران کی موجودہ حکومت کسی قیمت پر جنگ بند کرنے کے لئے تیار نہیں، خدا جانے ان کے سامنے کونسی منزل ہے؟ اور اس تباہ کن لڑائی کو جاری رکھنے سے کیا مقصد ان کے پیش نظر ہے؟

ابھی میں انہی خیالات میں محو تھا کہ مدائن کی آبادی شروع ہوگئی۔

.....☆.....☆.....☆.....

(۵)

تھوڑے دیر میں دیکھتے ہی دیکھتے کار مدائن شہر میں داخل ہوگئی۔ اب تو یہ ایک چھوٹا شہر بلکہ قصبہ ہے، لیکن ساسانی حکومت کے دور میں یہ ایران کا پایہ تخت تھا اور کسریٰ اسی شہر میں رہا کرتا تھا، اس دور میں دریائے دجلہ اس شہر کے بیچ سے گذرتا تھا، اور دجلہ کے مغربی حصے کو بہرہ شیر اور مشرقی حصے کو مدائن کہا جاتا تھا، اب دریا اس شہر سے ذرا دور ہٹ گیا ہے اور شہر اس کے مشرقی حصے ہی میں آباد ہے۔

ایرانی بادشاہوں نے مدائن کو اس کی بہترین آب و ہوا اور عمدہ محل وقوع کی بنا پر اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا اور اس میں ایک ایسا مستحکم قلعہ تعمیر کیا تھا جسے اپنی مضبوطی کی بنا پر ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، لیکن عرب کے وہ صحرا نشین جن کے ہاتھوں سرکار دو عالم ﷺ کی کیمیا اثر صحبت نے قیصر و کسریٰ کے استبداد سے انسانیت کی نجات مقرر کر دی تھی، بظاہر بے سروسامانی کے عالم میں اپنے بوسیدہ لباس اور بے آب تلواروں کے ساتھ یہاں پہنچے۔ شروع میں کسریٰ نے ان کو غیر اہم مدِ مقابل سمجھ کر نظر انداز کیا، لیکن قادسیہ کے بلا خیز معرکے نے کسریٰ کی کمر توڑ دی تو وہ مدائن میں محصور ہو کر رہ گیا وہ سمجھتا تھا کہ اس ناقابل تسخیر قلعہ اور اس کے سامنے بہتا ہوا دریائے دجلہ اسے مسلمانوں کی دست بُرد سے بچا سکے گا، لیکن اللہ کے جو بندے اس روئے زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے نکلے تھے، کوئی دریا اور کوئی پہاڑ ان کی یلغار کا راستہ روک نہ سکا اور بالآخر مدائن کا یہ شہر جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، اس پر سے کسریٰ کی سطوت و جلال کا پرچم ایسا اترا کہ پھر کبھی یہاں نہ لہرا سکا، اس دن کے بعد آج تک یہ شہر مسلمانوں ہی کے تصرف میں چلا آتا ہے۔

مدائن میں داخل ہو کر سب سے پہلے ایک جامع مسجد آتی ہے، اس جامع مسجد کے احاطے میں تین صحابۂ کرام (رضوان علیہم) مدفون ہیں، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت حذیفہ

www.freepdfpost.blogspot.com

بن یمانؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ۔ ان تینوں کے مزارات پر حاضر ہو کر سلام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت سلمان فارسیؓ اصلاً ایران ہی کے باشندے اور ایک آتش پرست خاندان کے فرد تھے، لیکن حق کی تلاش نے اُنہیں آتش پرستی سے متنفر کر دیا تو اپنے آتش پرست باپ کے علی الرغم عیسائی مذہب قبول کر کے شام چلے گئے اور شام اور عراق کے مختلف عیسائی علماء کی صحبت اختیار کی بالآخر عموریہ کے ایک نصرانی عالم کے پاس پہنچے، اور ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ جب اس عالم کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ اب تک میں فلاں فلاں علماء کے پاس رہا ہوں، اب کہاں جاؤں؟ اس نصرانی عالم نے کہا کہ میں تمہیں کسی ایسے عالم کا پتہ بتانے سے قاصر ہوں جو بالکل صحیح راستے پر ہو، البتہ اب ایک نبیؐ کے ظہور کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو دین ابراہیمی پر ہوگا عرب کی سرزمین میں معبوث ہوگا اور ایک سرزمین کی طرف ہجرت کرے گا، جو نخلستانوں سے معمور ہوگی اگر تمہارے لئے اس نبیؐ کے پاس پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچ جانا۔ اس نبی کی تین علامتیں ہوں گی، ایک یہ کہ وہ صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے، دوسری یہ کہ وہ ہدیہ قبول کر لیں گے اور تیسری یہ کہ ان کے شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔

نصرانی عالم کی وفات کے بعد حضرت سلمانؓ ایک قافلے کے ساتھ عرب کی طرف روانہ ہوئے لیکن قافلے کے ظالم ہمراہیوں نے راستے میں آپ کو ایک یہودی کے ہاتھ غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ وہ یہودی مدینہ طیبہ کا رہنے والا تھا، آپ کو مدینہ طیبہ لے آیا۔ اس سرزمین کے نخلستان دیکھ کر انہیں یقین سا ہو گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں نصرانی عالم نے بتایا تھا۔ اس یہودی کے پاس غلام بن کر کام کرتے ہوئے مدت گذر گئی۔ ایک دن یہ ایک درخت پر چڑھے ہوئے کام کر رہے تھے اور ان کا یہودی آقا درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں اس یہودی کا ایک چچازاد بھائی آیا اور اس سے کہنے لگا کہ ''خدا بنی قیلہ (انصار) کو ہلاک کر کرے قبا میں ایک شخص کے گرد جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور اسے نبی اور پیغمبر قرار دے رہے ہیں۔''

حضرت سلمانؓ خود فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ جملہ میرے کان میں پڑا تو میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں اپنے آقا کے اُوپر گر پڑوں گا۔

دل کو تھام کر درخت سے نیچے اترے اور یہودی سے پورا واقعہ معلوم کرنا چاہا لیکن جواب میں یہودی آقا نے ایک طمانچہ رسید کیا اور اسی وقت حضورؐ کی خدمت میں پہنچنے کی آرزو دل ہی میں رہ گئی..... لیکن شام کو کام سے فراغت کے بعد اپنی تھوڑی سی پونجی لے کر قبا پہنچے اور جا کر وہ پونجی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی اور عرض کیا کہ آپ حضرات حاجت مند ہیں، اس لئے میں آپ کے اور آپ کے رفقاء کے لئے کچھ صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں، آپؐ نے اپنے لئے صدقہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور صحابہؓ کو لینے کی اجازت دی۔ حضرت سلمانؓ کے سامنے پہلی علامت ظاہر ہو چکی تھی۔

جب آپ قبا سے مدینہ تشریف لے آئے تو حضرت سلمانؓ دوبارہ حاضر خدمت ہوئے اور صدقہ کے بجائے کچھ ہدیہ پیش کیا، آپؐ نے اسے قبول فرما لیا..... یہ حضرت سلمانؓ کے لئے دوسری علامت تھی۔

دو چار روز بعد حضرت سلمانؓ پھر حاضرِ خدمت ہوئے تو اس وقت آنحضرت ﷺ ایک جنازے کے ساتھ بقیع تشریف لائے تھے، صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت آپؐ کے ساتھ تھی اور آپؐ درمیان میں تشریف فرما تھے، انہوں نے سلام کیا اور تیسری علامت یعنی مہر نبوت دیکھنے کے لئے سامنے سے اٹھ کر پیچھے آ بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ ان کے پیچھے آنے کا مقصد سمجھ گئے اور پُشت مبارک سے چادر ہٹا دی۔ انہوں نے مہر نبوت کو دیکھتے ہی پہچان لیا، تلاش حق کے طویل اور پُر مشقت سفر کی منزل مقصود سامنے تھی۔ جس ذاتِ اقدسؐ کے انتظار میں غریب الوطنی سے لے کر غلامی تک نہ جانے کتنی صعوبتیں جھیلی تھیں، آج وہ فردوسِ نظر بن چکی تھی، سالہا سال کی جدوجہد کا پھل اچانک سرور و قرار کی شکل میں نظروں کے سامنے آیا، تو دل میں امڈے ہوئے وہ طوفان جو نہ جانے کب سے سینے میں روپوش تھے، آنسوؤں کے دھارے کی شکل میں نگاہوں سے پھوٹ نکلے، آگے بڑھ کر مہر نبوت کو بوسہ دیا اور برسوں سے رُکے ہوئے عقیدت و اخلاص کے

www.freepdfpost.blogspot.com

آنسوؤں کی سوغات اُس کی نذر کردی۔

آنحضرت ﷺ کو ان کے رونے کا احساس ہوا اپنے سامنے بلایا ان سے ماجرا دریافت کیا، انہوں نے اپنی ساری سرگزشت سنائی اور آپ کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو غریب الوطنی اور اسلام کی راہ میں مشقتیں جھیلنے کا جو صلہ عطا فرمایا اُس پر حضرت سلمانؓ نہ صرف وطن اور خاندان کی، بلکہ دُنیا و مافیہا کی ساری راحتیں قربان کر سکتے تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

سلمان منّا أهل البيت

سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔

ایک طرف عزت و تکریم کا یہ مقام تھا کہ سرورِ کائناتؐ نے انہیں اپنے اہل خاندان میں سے قرار دیا اور دوسری طرف یہودی کی غلامی اب بھی باقی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں مشورہ دیا کہ اس یہودی سے کتاب کا معاملہ کرو، یعنی یہ کہ اسے کچھ رقم دے کر آزادی حاصل کرلو، یہودی نے جو آزادی کی جو شرائط عائد کیں وہ تقریباً ناقابل عمل تھیں۔ کہا کہ چالیس اوقیہ سونا ادا کردو اور کھجور کے تین سو درخت لگاؤ، جب ان درختوں پر پھل آجائے گا تو تم آزاد ہوگے۔ تین سو کھجور کے درخت پر پھل آنے کے لئے ایک عُمر درکار تھی، لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ترغیب دی کہ وہ کھجور کے پودوں سے حضرت سلمانؓ کی امداد کریں۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ کے تعاون سے تین سو پودے جمع ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ ان پودوں کے لئے گڑھے تیار کرو۔ جب گڑھے تیار ہوگئے تو آپؐ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور تمام درخت خود اپنے دستِ مبارک سے لگائے اور برکت کی دعا فرمائی۔ پودے اس مقدس ہاتھ سے لگے تھے جس نے دلوں کے ویران کھیتیاں سیراب کیں تھیں اور جس نے چند ہی سالوں میں حق کے تناور درخت اگائے تھے۔ اس مبارک ہاتھ کا یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ ان تمام کھجور کے درختوں پر ایک ہی سال میں پھل آگیا اور حضرت سلمانؓ کی آزادی کی سب سے مشکل شرط پوری ہوگئی۔

اب چالیس اوقیہ سونے کی شرط باقی تھی، ایک مرتبہ آپؐ کے پاس کہیں سے سونا آیا تو آپؐ نے حضرت سلمانؓ کے حوالے فرمادیا کہ اس کے ذریعے آزادی حاصل کرلیں۔ بظاہر سونا چالیس اوقیہ سے بہت کم تھا، لیکن جب حضرت سلمانؓ نے وزن کیا تو پورا چالیس اوقیہ اُگلا اور اس طرح رحمۃ اللعالمین ﷺ کی بدولت انہیں غلامی سے رہائی نصیب ہوئی۔ غلامی کی وجہ سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں شریک نہیں ہوسکے، آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کا پہلا غزوہ غزوۂ احزاب تھا اور اس غزوے میں آپ ہی کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد آپ مسلسل جہاد میں حصّہ لیتے رہے، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ایران پر لشکر کشی ہوئی تو اس میں آپ نے ایک نمایاں سالار کی حیثیت سے حصّہ لیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں عرب مسلمان آپ کی کمان میں جہاد کرتے تھے اور جامع ترمذی میں روایت ہے کہ جب ایران کے کسی قلعے پر حملہ کرنا ہوتا تو پہلے حضرت سلمان فارسیؓ انہیں دعوت اسلام دیتے اور یہ بتاتے کہ میں ایرانی ہونے کے باوجود اسلام کی بدولت عربوں کا امیر بنا ہوا ہوں۔

ایران فتح ہونے کے بعد آپ نے مدائن کو اپنا مستقر بنالیا تھا کچھ عرصے وہاں کے گورنر بھی رہے، لیکن اپنی امارت کے زمانے میں بھی اتنے سادہ رہتے کہ دیکھ کر کوئی شخص انہیں امیر مدائن نہ سمجھ سکتا تھا۔

ایک مرتبہ شام کا ایک تاجر کچھ سامان لے کر مدائن آیا تو حضرت سلمانؓ ایک عام آدمی کی طرح سڑکوں پر پھر رہے تھے۔ شام کا وہ تاجر انہیں مزدور سمجھا اور ان سے کہا کہ یہ گٹھری اٹھالو۔ حضرت سلمانؓ نے کسی تأمل اور توقف کے بغیر گٹھری اٹھالی، کچھ دیر بعد مدائن کے باشندوں نے انہیں بوجھ اٹھائے دیکھا تو اس شامی تاجر سے کہا کہ ''یہ امیر مدائن ہیں۔'' اس پر وہ تاجر بہت حیران بھی ہوا اور شرمندہ بھی اور حضرت سلمانؓ سے معذرت کے ساتھ درخواست کی کہ وہ بوجھ اتار دیں، لیکن سلمانؓ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ ''میں نے ایک نیکی کی نیت کرلی ہے، اب جب تک وہ پوری نہ ہو، یہ سامان نہیں اتاروں

www.freepdfpost.blogspot.com

گا، چنانچہ وہ سامان منزل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ (طبقات ابن سعد ص ۸۸، ج ۴)

حضرت سلمان فاسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مدائن ہی میں ہوئی اور یہیں آپ کو دفن کیا گیا، آپ کی قبرِ مبارک پر آج بھی یہ حدیث کندہ ہے کہ:

"سلمان منّا أهل البيت"

☆.....☆.....☆.....

(۶)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ:

حضرت سلمان فارسیؓ کے مزار کے قریب ہی دو مزارات اور ہیں، ان میں ایک حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور دوسرے صاحب مزار کا نام حضرت عبداللہ بن جابرؓ لکھا ہوا ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور جلیل القدر صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں۔ یہ قبیلۂ بنو عبس سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے وطن ہی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ اسلام لے آئے تھے جن کا اصل نام "حسل" تھا اور لقب "یمان"۔ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے ٹھیک وہ وقت تھا جب آنحضرت ﷺ غزوۂ بدر کی تیاری فرما رہے تھے اور آپؐ کے مقابلے کے لئے ابوجہل کا لشکر مکہ مکرمہ سے روانہ ہو چکا تھا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد کی راستے میں ابوجہل کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے دونوں کو گرفتار کر لیا اور کہا کہ تم لوگ محمد (ﷺ) کے پاس جا رہے ہو۔" انہوں نے جواب دیا کہ "ہم تو مدینہ جا رہے ہیں۔" اس پر ابوجہل کے لشکر والوں نے ان سے کہا کہ "ہم تمہیں اس وقت تک آزاد نہیں کرے گے جب تم ہمارے ساتھ یہ

معاہدہ نہ کرو کہ صرف مدینہ جاؤ گے لیکن ہمارے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ نہیں دو گے۔"

مجبوراً ان حضرات نے معاہدہ کر لیا اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر آپؐ سے سارا واقعہ ذکر کیا۔

اُس وقت حق و باطل کا سب سے پہلا معرکہ درپیش تھا۔ مقابلہ ان کفارِ قریش سے تھا جو اسلحہ میں غرق ہو کر آئے تھے اور جن کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے مین تین گناہ سے بھی زائد تھی اور مسلمانوں کے لئے ایک ایک آدمی بڑا قیمتی تھا۔ لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے سنگین حالات میں بھی معاہدے کی خلاف ورزی کو گوارہ نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ:

نفی بعهد هم، و نستعين الله عليهم

"ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور کفار کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے۔"

(صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الوفاء بالعہد (نمبر ۱۷۷۸) ومسند احمد ج ۵ ص ۳۹۵ ومستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۷۹)

اس بنا پر آپ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ امانت اور وفا کی ایسی تابناک مثالیں کسی اور قوم کی تاریخ میں کہاں مل سکتی ہیں۔؟

غزوۂ احد میں حضرت خذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ شریک ہوئے، افسوسناک غلط فہمی کی بنا پر ان کے والد ماجد حضرت یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ چونکہ یہ حادثہ غلط فہمی میں پیش آیا تھا اس لئے حضرت حذیفہ نے اپنے بھائیوں کو یہاں بھی معاف فرما دیا۔ (صحیح بخاری وغیرہ)

غزوۂ احزاب میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے، آنحضرت ﷺ نے غزوۂ احزاب کی آخری رات میں آپ کو کفار کے لشکر کی خبر گیری کے لئے بھیجا تھا اور انہوں نے انتہائی جرأت و شجاعت اور حکمت و تدبر کے ساتھ یہ خطرناک مہم انجام دی یہاں تک کہ کفار کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی مردم شماری بھی آپ ہی کے سپرد

www.freepdfpost.blogspot.com

فرمائی تھی۔ جسے آپ نے بطریقِ احسن انجام دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔
(صحیح مسلم، کتاب الایمان نمبر ۱۴۹)

آنحضرت ﷺ نے آپ کو آنے والے فتنوں کے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا تھا اور بہت سے منافقین کی نشاندہی بھی فرما رکھی تھی۔ اسی لئے آپ کو "صاحب السّر" (آنحضرت ﷺ کا رازدار) کہا جاتا تھا۔ حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کو قسم دے کر پوچھا کہ "میرا نام تو منافقین کی فہرست میں شامل نہیں۔" حضرت حذیفہؓ نے انکار فرمایا۔
(کنزل العمال ص ۳۴۴، ج ۱۳)

آنحضرت ﷺ کے بعد بھی آپ مسلسل مصروف جہاد رہے، دینور کا علاقہ آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے فتح ہوا۔ عراق اور ایران کی فتوحات میں آپ نے غیر معمولی خدمات انجام دی۔ کسریٰ کے دربار میں آپ ہی نے وہ ولولہ انگیز تقریر فرمائی جس نے کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا۔

ایران کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے آپ کو مدائن کا عامل (گورنر) مقرر فرما دیا تھا۔ آپ کسریٰ کے دارالحکومت کے گورنر بن کر پہنچے تو اس شان سے کہ ایک دراز گوش پر سوار تھے جس کے پالان کے ساتھ تھوڑا سا زادِ راہ رکھا ہوا تھا۔ اہل مدائن نے آپ کا استقبال کیا اور پیشکش کی کہ ہم آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔

طعا ما آکله ، وعلف حماری هذا من تبن

"بس میرے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے کھانے کے لئے کھانا مل جائے
اور میرے اس دراز گوش کا چارہ۔"

عرصۂ دراز تک حضرت حذیفہ اسی سادگی کے ساتھ مدائن کے گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ایک مرتبہ یہاں سے مدینہ طیبہ گئے تو حضرت عمرؓ پہلے سے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے، مقصد یہ تھا کہ اگر مدائن سے کچھ مال و دولت لے کر آئے ہوں تو پتہ چل جائے لیکن دیکھا کہ وہ جس حال میں گئے تھے، اسی حال میں واپس آ گئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

(سیر اعلام النبلا للذھبی ص ۳۶۶ ج ۲)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ آخر میں مدائن ہی میں مقیم رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے چالیس دن بعد آپ نے مدائن ہی میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

حضرت عبداللہ جابرؓ:

انہی کے برابر میں دوسرے مزار پر صاحب مزار کا نام "عبداللہ بن جابرؓ" لکھا ہوا ہے۔ آپ کے بارے میں احقر کو پوری تحقیق نہ ہو سکی کہ کون بزرگ ہیں؟ جہاں تک جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق ہے، وہ مشہور انصاری صحابی ہیں، لیکن اُن کا قیام مدینہ طیبہ ہی میں رہا ہے اور وہیں اُن کی وفات ہوئی۔ (الاصابہ ص ۲۱۴، ج ۱)

عبداللہ بن جابرؓ نام کے دو صحابہ کرامؓ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، ایک عبداللہ بن جابر الأنصاری الیماضیؓ ہیں اور دوسرے عبداللہ بن جابر العبدیؓ۔ لیکن دونوں بزرگوں کے نہ حالات دستیاب ہیں، اور نہ یہ معلوم ہے کہ انہوں نے کہاں وفات پائی، (ملاحظہ ہو الاصابہ ص ۲۷۷، ج ۲) لہٰذا ایک احتمال تو یہ ہے کہ صاحب مزار ان میں سے کوئی بزرگ ہوں۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ آپ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ کے صاحبزادے ہوں اور مدائن میں آ کر مقیم ہو گئے ہوں، لیکن معمولی جستجو سے احقر کو حضرت جابر بن عبداللہؓ کے صاحبزادے کا کوئی تذکرہ نہیں مل سکا جس سے اس احتمال کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔ بہر کیف! اس علاقے میں مشہور یہی ہے کہ یہ صحابہ میں سے ہیں۔

ایک عجیب ایمان افروز واقعہ:

حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ کے مزارات کے ساتھ اسی صدی میں ایک عجیب و غریب اور ایمان افروز واقعہ رُونما ہوا جو آج کل بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ واقعہ میں نے پہلی بار جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مدظلہم سے سنا تھا۔ پھر بغداد میں وزارتِ اوقاف کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ جناب خیر اللہ حدیثی صاحب نے

www.freepdfpost.blogspot.com

بھی اجمالاً اس کا ذکر کیا۔

یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، اس وقت عراق میں بادشاہت تھی۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قبریں اُس وقت یہاں (جامع مسجد سلمانؓ کے احاطے میں) نہیں تھیں، بلکہ یہاں سے کافی فاصلے پر دریائے دجلہ اور مسجد سلمان کے درمیان کسی جگہ واقع تھی۔

۱۹۲۹ء بادشاہِ وقت نے خواب میں دیکھا کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ اس سے فرما رہے ہیں کہ ہماری قبروں میں پانی آ رہا ہے، اس کا مناسب انتظام کرو۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دریائے دجلہ اور قبروں کے درمیان کسی جگہ گہری کھدائی کر کے دیکھا جائے کہ دجلہ کا پانی اندرونی طور پر قبروں کی طرف رس رہا ہے یا نہیں۔ کھدائی کی گئی، لیکن پانی رسنے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس بات کو خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

لیکن اس کے بعد پھر..... غالباً ایک سے زیادہ مرتبہ وہی خواب دکھائی دیا جس سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی اور اس نے علماء کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ اس وقت عراق کے کسی عالم نے بھی بیان کیا کہ انہوں نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا ہے۔ اس وقت مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ دونوں بزرگوں کی قبر مبارک کو کھول کر دیکھا جائے اور اگر پانی وغیرہ آ رہا ہو تو ان کے جسموں کو منتقل کیا جائے۔ اُس وقت کے علماء نے بھی اس رائے سے اتفاق کر لیا۔

چونکہ قرونِ اولیٰ کے دو عظیم بزرگوں اور صحابۂ رسول اللہ ﷺ کی قبروں کو کھودنے کا یہ واقعہ تاریخ میں پہلا واقعہ تھا، اس لئے حکومتِ عراق نے اس کا بڑا زبردست اہتمام کیا، اس کے لئے ایک تاریخ مقرر کی، تاکہ لوگ اس عمل میں شریک ہو سکیں۔ اتفاق سے وہ تاریخ ایامِ حج کے قریب تھی، جب اس ارادے کی اطلاع حجاز پہنچی تو وہاں حج پر آئے ہوئے لوگوں نے حکومت عراق سے درخواست کی کہ اس تاریخ کو قدرے مؤخر کر دیا جائے تاکہ حج سے فارغ ہو کر جو لوگ عراق آنا چاہیں وہ آ سکیں چنانچہ حکومتِ عراق

نے حج کے بعد ایک تاریخ مقرر کر دی۔

کہا جاتا ہے کہ مقررہ وتاریخ پر نہ صرف اندرونی عراق بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی خلقت کا اس قدر ازدحام ہوا کہ حکومت نے سب کو یہ عمل دکھانے کے لئے بڑی بڑی اسکرینیں دُور دُور تک فٹ کیں تاکہ جو لوگ براہ راست قبروں کے پاس یہ عمل نہ دیکھ سکیں وہ اس اسکرینوں پر اس کا عکس دیکھ لیں۔

اس طرح یہ مُبارک قبریں کھولی گئیں اور ہزارہا افراد کے سمندر نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تقریباً تیرہ صدیاں گذر جانے کے باوجود دونوں بزرگوں کی نعش ہائے مبارک صحیح وسالم اور تروتازہ تھیں، بلکہ ایک غیر مسلم ماہر امراض چشم وہاں موجود تھا۔ اس نے نعش مبارک کو دیکھ کر بتایا کہ ان کی آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک موجود ہے جو کسی مُردے میں آنکھوں میں انتقال کے کچھ دیر بعد بھی موجود نہیں رہ سکتی، چنانچہ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

نعش مبارک کو منتقل کرنے کے لئے پہلے سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب جگہ تیار کر لی گئی تھی، وہاں تک لے جانے کے لئے نعش مبارک کو جنازے پر رکھا گیا، اس میں لمبے لمبے بانس باندھے گئے اور ہزارہا افراد کو کندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس طرح اب ان دونوں بزرگوں کی قبریں موجودہ جگہ پر بنی ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مدظلہم کا بیان ہے کہ ۱۹۲۹ء کا یہ واقعہ مجھے یاد ہے اس زمانے میں اخبارات کے اندر اس کا بڑا چرچا ہوا تھا اور اُس وقت ہندوستان سے ایک ادبی گھرانے کا ایک جوڑا عراق گیا ہوا تھا اور اُن دونوں میاں بیوی نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا اور غالباً بیوی نے اپنے اس سفر کی رُوداد ایک سفرنامے میں تحریر کی جو کتابی شکل میں شائع ہوا اور اس کی ایک کاپی حضرت مولانا مدظلہم کے پاس محفوظ ہے۔

اس سفرنامے میں بھی مذکور ہے کہ اُس وقت کسی غیر ملکی فرم کے ذریعے اس پورے عمل کی عکس بندی بھی کی گئی تھی اور بہت سے غیر مسلم بھی یہ واقعہ خاص طور پر دیکھنے آئے تھے وہ اس اثر انگیز منظر سے نہ صرف بہت متاثر ہوئے بلکہ بہت سے لوگوں نے اس منظر

www.freepdfpost.blogspot.com

کو دیکھ کر اسلام قبول کیا۔

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور اپنے دین کی حقانیت کے ایسے معجزے کبھی کبھی دکھلاتے ہیں۔

سنریھم آیا تنافی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انّہ الحقّ.

ہم ان کو آفاق میں بھی اور خود ان کے وجود میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ یہی (دین) حق ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر عبداللہ بن جابرؓ حضرت جابر ہی کے صاحبزادے ہیں تو عجیب وغریب اتفاق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ان کے دادا کے ساتھ بھی بعینہٖ اسی طرح کا واقعہ پیش آ چکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد کے سب سے پہلے شہید تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو حضرت عمرو بن جموحؓ کے ساتھ ایک ہی قبرستان میں دفن فرمایا تھا، اس وقت مسلمانوں کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ شہداء کے لئے کفن تک میسّر نہ تھے، اس لئے حضرت عبداللہؓ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا جس میں چہرہ تو چھپ گیا، لیکن پاؤں کھلے رہے جن پر گھاس ڈال دی گئی۔ اتفاق سے یہ قبر نشیب میں واقع تھی۔ چالیس سال بعد حضرت معاویہؓ کے زمانے میں یہاں سیلاب آ گیا اور وہاں ایک نہر بھی نکالنی تھی۔ اس موقع پر قبر کو حضرت جابرؓ کی موجودگی میں کھولا گیا تو دونوں بزرگوں کے اجسام بالکل صحیح وسالم تروتازہ تھے۔ بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ ان کے چہرے پر جو زخم تھا، اُن کا ہاتھ اس زخم پر رکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے ہاتھ وہاں سے ہٹایا تو تازہ خون بہنے لگا۔ پھر ہاتھ دوبارہ رکھا تو خون بند ہو گیا۔

(طبقات ابنِ سعد ص ۵۶۲ و ۵۶۳، ج ۳)

کسریٰ کا محل:

ان صحابۂ کرامؓ کے مزارات کی زیارت کے بعد ہم آگے بڑھے تو مدائن شہر کے تقریباً

اختتام پر کسریٰ کے محل کی ایک دیوار اب تک باقی ہے اور عبرت کا منظر بنی ہوئی ہے، یہ کسی زمانے میں دنیا کی عظیم ترین مادی طاقت کسریٰ کا وہی محل تھا جس کے کنگرے سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت باسعادت پر گر گئے تھے اور جس کی شان وشوکت آنحضرت ﷺ کو خندق کھودتے وقت کدال سے اڑتی ہوئی چنگاریوں میں دکھا کر یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ یہ محل مسلمانوں کے قبضے میں آنے والا ہے۔ جس وقت یہ خوشخبری دی جا رہی تھی۔ اُس وقت خود مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ عرب کے قبائل کے متحدہ محاذ کے حملے کی وجہ سے خود مدینہ طیبہ میں کلیجہ منہ کو آ رہے تھے۔ دونوں جہانوں کا سردار خود اپنے مقدس ہاتھوں سے خندق کی کھدائی میں عملاً شریک تھا اور بھوک کی شدت سے صحابۂ کرامؓ نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے اور خود رحمۃ اللعالمین ﷺ کے بطن مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، اور کون تصور کر سکتا ہے کہ یہ بے سروسامان اور نہتے افراد دنیا کی عظیم ترین طاقت کسریٰ کا غرور خاک میں ملا کر رہیں گے۔

لیکن دنیا نے دیکھا کہ اس واقعے کے پندرہ سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ انہی محمد عربی ﷺ کے نام لیوا اپنے ربّ کا نام لے کر اٹھے اور اس عظیم طاقت سے ٹکرا گئے جس کے جاہ وجلال سے کبھی روم کے محلات تک لرزا کرتے تھے۔ کسریٰ کے محل کی یہ ایک دیوار چودہ صدیوں سے زائد کے تھپیڑے سہنے کے باوجود آج بھی شان وشکوہ کی تصویر ہے اور اس کے نیچے کھڑے ہو کر آج بھی کوئی شخص سطوت کا تأثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے معدّد برج ابھی تک سلامت ہیں، بیچ میں ایک بلند قامت محرابی دروازہ ہے۔ جس کے بعد ایک وسیع وعریض ہال کے آثار نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کسریٰ کا دربار ہوگا یا محل کا کوئی اہم حصہ۔

ایک روایت کے مطابق اس ایوان کے دروازے پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، فتح مدائن کے وقت اس کو آگ لگا دی گئی تھی، بعد میں اس پردے سے دس لاکھ مثقال سونا برآمد ہوا، جس کی قیمت ایک کروڑ درہم تھی۔ (تاریخ بغداد، للخطیب، ص ۱۳۱، ج ۱)

جب اس بوسیدہ اور فرسودگی کے عالم میں اس عمارت کے شکوہ کا یہ حال ہے تو جب

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ محل اپنے عہدِ شباب پر ہوگا، اُس وقت اس کی شان وشوکت کا کیا عالم ہوگا؟ اس کی سر بفلک فصیل اُس دور کے لحاظ سے یقیناً ناقابلِ تسخیر ہوگی۔ اس زمانے میں دجلہ اسی فصیل کے نیچے بہتا تھا، اس لئے دریا عبور کر کے اس فصیل پر چڑھنا اور اسے فتح کرنا، جبکہ فصیل کے ہر قدم پر کھڑے ہوئے پہرے دار ہر لمحے تیروں، نیزوں اور کھولتے ہوئے تیل کی بارش کر رہے ہوں، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

لیکن نہ جانے سرکار دو عالم ﷺ کے غلام کونسا جذبہ اور ایمان کی کونسی طاقت لے کر آئے تھے کہ یہ پیکر سطوت عمارتیں ان کی یلغار کو نہ روک سکیں، کج کلاہ ایران کی صدیوں پرانی تاریخ آن کی آن میں پیوندِ خاک ہوگئی اور اس کا شہر آفاق دبدبہ مجاہدین کے غبارِ راہ میں گم ہو کر رہ گیا۔

مسلمانوں نے کسریٰ کے اس ایوان کو ایک عبرتناک یادگار کے طور پر باقی رکھا۔ خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر ان کے ایک ایرانی مشیر نے مشورہ دیا کہ آپ اگر اس ایوان کو باقی رکھیں گے تو اس سے ہر دیکھنے والے پر یہ تأثر قائم ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد شامل تھی ورنہ عرب کے بے سروسامان صحرا نشین اس جیسے ایوان کو ہرگز فتح نہ کر سکتے۔

منصور نے مشورہ سنا لیکن دل میں یہ خیال ہوا کہ شاید یہ مشیر ایرانی ہونے کی بنا پر اپنے آباء واجداد کی یادگار قائم رکھنے کے لئے یہ مشورہ دے رہا ہے چنانچہ خلیفہ نے مشورے کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن جب ایوان کو توڑنا شروع کیا تو تھوڑا ہی حصہ توڑنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے توڑنے پر اتنی زبردست لاگت آئے گی کہ اس کے ملبے سے اس کا بہت تھوڑا وصول ہوگا اور اس طرح بہت سی قومی دولت ضائع ہو جائے گی۔ اس موقع پر منصور نے پھر اسی مشیر کو بلا کر مشورہ کیا۔ اُس نے کہا کہ ”میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ اسے نہ توڑیں۔ لیکن اب میں آپ کے لئے یہ بات عار سمجھتا ہوں کہ کہنے والے یہ کہیں کہ ایرانیوں نے ایسی عمارت بنائی تھی کہ آپ اسے منہدم کرنے پر بھی قادر نہ ہوئے۔ لہٰذا اب میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے ضرور توڑا جائے۔“

خلیفہ منصور پھر شش وپنج میں پڑ گئے، لیکن غور وفکر کے بعد آخر میں فیصلہ یہی کیا کہ کام بند کرا دیا جائے کیونکہ اس میں دولت کا بڑا ضیاع ہے۔ چنانچہ یہ ایوان اس وقت سے باقی چلا آتا ہے۔ (تاریخ بغداد للخطیب۔ ۱۳۰ و ۱۳۱، ج ۱)

عربی کے مشہور شاعر بحتری نے اس ایوان کی منظر کشی میں مرکۃ الآرا قصیدہ کہا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں اس سے بہتر ”قصیدۂ سینیہ“ نہیں کہا گیا اور بحتری کے دو قصیدے ایسے ہیں، ایک ایوان کسریٰ کی منظر کشی میں اور دوسرا متوکل کے بنائے ہوئے ایک تالاب کی تعریف میں کہ اگر وہ ان دو قصیدوں کے سوا کچھ نہ کہتا تو بھی وہ اس کی شاعرانہ عظمت کے لئے کافی تھے۔ ایوانِ کسریٰ کے بارے میں اس کے قصیدے کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

صنت نفسی عمّا یدنّس نفسی و ترفعت عن جدا کلّ جبس
وکان الایوانَ من عجب الصّر عة جوب فی جنب أرعن جلس

طاقِ کسریٰ کے نیچے کھڑے ہو کر چودہ صدیوں کے بیشمار واقعات کی ایک فلم تھی جو دل ودماغ میں چلتی رہی، تصور کی نگاہ کو کبھی یہاں وہ کج کُلاہ نظر آئے جن کے عہدِ حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، کبھی کبر وغرور کے وہ پتلے دکھائی دیئے جنہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کرنے کی جسارت کی تھی، کبھی اس ایوان کے زرنگار کمروں میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت ربعی بن عامرؓ کی گونجتی ہوئی تقریر سنائی دیں، کبھی اس کی فصیل پر چڑھتے ہوئے وہ سرفروش مجاہدین نظر آئے جن کے ہاتھوں اس کبر وغرور کا استیصال مقدر تھا، کبھی یہاں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت خالد بن عرفطہؓ اور ان کے رفقاء کو فتح کے تشکر میں سجدہ ریز دیکھا۔ غرض نہ جانے ماضی کی کتنی دلآویز تصویریں تھیں جو چند لمحوں میں نظروں کے سامنے سے گذر گئیں اور جب اس عالمِ تصور سے جیتی جاگتی زندگی کی طرف واپسی ہوئی تو حسین تصورات کا یہ سارا محل زمین پر آ رہا۔ میں ایک ایسی زمین پر کھڑا تھا جہاں جو فا تحسینِ مدائن کے نام لیواؤں پر تنگ ہو رہی ہے جہاں انہی صحرا نشینوں کی ہم جیسی ناخلف اولاد وسائل واسباب کی فراوانی کے باوجود

www.freepdfpost.blogspot.com

ایمان ویقین کی اس دولت سے محروم ہوتی جارہی ہے جو روم وایران کی تسخیر کا حوصلہ پیدا کرتی تھی اوراس کے نتیجے میں وہ قیصروکسریٰ کے ماڈرن جانشینوں سے آنکھیں چار کرنے کے بجائے ان کے دبدبے کے سامنے ہتھیار ڈالے کھڑی ہے اور زندگی کے ہر کام میں ان کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہے۔

اس عظیم اور المناک تضاد کا تصور کر کے دل میں بھی کلپا، حیرت بھی ہوئی لیکن پھر تمام شکوک وشبہات کا جواب ایک ہی شعر میں مل گیا۔

حیرت نہ کر بدن کو مرے چُور دیکھ کر
اُن رفعتوں کو دیکھ جہاں سے گرا تھا میں

.....☆.....☆.....☆.....

(۷)

مدائن ہی میں حکومت عراق نے ایک عجیب وغریب پنوراما تعمیر کیا ہے جس میں جنگ قادسیہ کا منظر اسی طرح دکھایا گیا ہے کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے جیسے وہ ٹھیک میدانِ جنگ کے اوپر کھڑا تمام منظر اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے، یہ تقریباً سات منزلہ عمارت ہے جس کے زینوں پر چڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کسی کشادہ مینار پر چڑھ رہا ہے، سب سے آخری زینہ ایک گنبد نما ہال پر ختم ہوتا ہے اور اس ہال میں پہنچتے ہی انسان یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی بلند قلعے کی بُرج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے حدّ نظر تک پھیلا ہوا میدان ہے جس کے آخری سرے پر ایک قدیم طرز کا قلعہ بنا ہوا ہے، یہ قلعہ قدیس ہے جہاں بیٹھ کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ قادسیہ کی قیادت فرمائی تھی اور اس کے تینوں اطراف میں مسلمانوں اور کسریٰ کے لشکر برسرِ پیکار نظر آتے تھے۔

دراصل اس ہال کی دیواروں پر چھت تک ایسی سہ العبادی (Three Diamansional) تصویریں بنائی ہیں جن کی زمین کا رنگ بالترتیب آسمان، فضا اور

زمین کے رنگ کے اتنا مطابق ہے کہ وہ فطری آسمان، فضا اور زمین معلوم ہوتے ہیں۔ اور پینٹنگ کے سہ العبادی ہونے کی بنا پر ان تمام اشیاء کے فاصلے حقیقی نظر آتے ہیں۔ افق تک پھیلے ہوئے اس میدان میں جنگ قادسیہ کے تمام اہم واقعات دکھائے گئے ہیں۔ ایرانیوں کے ہاتھیوں کا حملہ، مسلمانوں کی طرف سے ان کی سونڈیں کاٹنے کا منظر، جوابی طور پر مسلمانوں کی طرف سے برقع پوش اونٹوں کا حملہ، چاروں طرف کے افق سے امڈتے ہوئے سو سو شہسواروں کے دستے جو حضرت قعقاعؓ کی نفسیاتی تدبیر کے مطابق ہر تھوڑی دیر بعد کسی افق سے نمودار ہوتے تھے۔ ایرانی فوج کی ابتری، جگہ جگہ تڑپتی ہوئی لاشیں اور میدان میں حدّ نظر تک پھیلے ہوئے مختلف اسلحہ جنہیں دیکھ کر انیس کا یہ بند یاد آتا ہے ؎

بے رُخ کمانیں تیروں سے، چلّے کماں سے دور مرغا تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے، نیزے سناں سے دور پیروں سے عقل دُور، تہور جواں سے دُور
تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزے ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

غرض یہ پنوراما فن کا ایک عجوبہ ہے لیکن کاش! اس کے بنانے والے اس بات کا خیال رکھ سکتے کہ جنگ قادسیہ کے بیشتر شرکاء صحابۂ کرامؓ تھے اور ان کی فرضی تصویریں بنانا شریعت کے خلاف تو ہے ہی، ان حضرات کی شان میں سوءِ ادب بھی ہے۔ استغفر اللہ العظیم۔

ایوانِ کسریٰ کے قریب ہی ایک میدان میں عراق کے محکمۂ سیاحت کے ایک قدیم طرز کا وسیع وعریض خیمہ بنایا ہوا ہے، یہ ٹھیک اس طرز کا خیمہ ہے جیسا قدیم زمانے میں لشکر کے سردار وغیرہ کہیں پڑاؤں ڈالتے وقت لگایا کرتے تھے۔ اُس خیمہ کے اندر قدیم عربی تہذیب کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم صدیوں پہلے کے دور میں پہنچ گئے ہیں، قدیم طرز کے قالین اور دریاں، ان پر لگے ہوئے پرانے گدے اور تکیے پانی کی چھاگل، مٹی اور لکڑی کے برتن، پتھروں سے بنے ہوئے چولہے اور اندر بیٹھے ہوئے عربوں کے جسم پر وہی بدویانہ لباس۔ غرض ہر چیز پرانی عرب تہذیب کی آئینہ دار۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ہم خیمے میں داخل ہوئے تو یہاں بیٹھے ہوئے بدوی نما عربوں نے روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے تپاک سے خیر مقدم کیا اور بڑے اصرار کے ساتھ عربی قہوہ پیش کیا جس کی تلخی کی یاد اب تک ذہن سے محو نہیں ہوئی، قہوے کا دستور سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں بھی ہے۔ اس کی تلخی کا عادی بنتے بنتے بھی کام و دہن کو خاصا وقت لگا، لیکن یہ سیاہ فام عراقی قہوہ اس سے کہیں آگے ہے اور اندازہ یہ ہوا کہ اس کا عادی بننا ہم جیسوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

مدائن کے قابل دید مقامات سے فراغت ہوئی تو نماز ظہر جامع مسجد سلمان فارسیؓ میں ادا کرنے کے بعد دجلہ کے کنارے ایک خوبصورت ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا، ہوٹل کے دالان کے ساتھ ہی دجلہ پوری آب و تاب سے بہہ رہا تھا۔ یہ وہی دجلہ تھا جسے مدائن کے ایرانی حکمرانوں کے مسلمانوں کی یلغار کے آگے اپنا سب سے مضبوط حصار قرار دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ مجاہدین اسلام کے گھوڑے جو عرب اور عراق کے لق و دق صحرا عبور کر کے آئے ہیں، اس پُرشور دریا پر پہنچ کر بے بس ہو جائیں گے اور کسریٰ کے دارالحکومت تک ان کی پیش نہ جا سکے گی۔

لیکن مجاہدین اسلام کے وہ قافلے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے تسخیر کائنات کا معجزاتی حوصلہ لے کر آئے تھے، دجلہ نے ان کے لئے اپنی آغوشِ محبت کھول دی، انہوں نے گھوڑے دریا کی موجوں کے حوالے کر دیئے اور پورا لشکر صحیح و سلامت پار اتر گیا۔

کوفہ کا سفر:

اگلے دن نو بجے کے قریب ہم کار کے ذریعے بغداد سے کوفہ روانہ ہوئے۔ کوفہ بغداد سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور وہاں جانے کے لئے بغداد سے صاف ستھری اور خاصی کشادہ سڑک موجود ہے، راستہ اکثر دونوں طرف سرسبز نخلستانوں سے معمور ہے، کھجور عراق کی خاص زرعی پیداوار ہے اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کھجور یہیں پیدا ہوتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی بستیاں

اور قصبے راستے میں آتے رہتے ہیں، ان میں اہم ترین شہر حِلّہ ہے جو عراق کے تاریخی شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

حِلّہ کے آس پاس ہی دنیا کا قدیم ترین تاریخی شہر بابل آباد تھا، بابل کلدانی تہذیب کا عظیم مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد آباد کیا تھا اور یہاں سے ان کی اور ان کے رفقاء کی نسل پھیلی۔ انہوں نے دجلہ اور فرات کے آس پاس بہت سے شہر آباد کئے۔ یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے وہ کسکر تک اور فرات کے کنارے کوفہ سے ہیرے تک پہنچ گئے اور یہ سارا علاقہ سواد کے نام سے مشہور ہوا۔

(معجم البلدان للحموی ص ۳۰۹، ج ۳)

انہی کی اولاد میں کلدانیوں نے جنم لیا جو ان کے سپاہی سمجھے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ بادشاہ بن گئے۔ کلدانیوں سے پہلے بابل کا نام خیتارث تھا۔ کلدانیوں نے اس کا نام بابل رکھا، بابل ان کی زبان میں مشتری ستارے کو کہتے تھے، اسی کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ اپنے عروج کے دور میں بابل بارہ فرسخ میں پھیلا ہوا تھا اور اپنے زمانے کے فن تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر کے بارے میں بہت سی طلسماتی داستانیں بھی مشہور ہیں اور جادوگروں کی کثرت کی بنا پر یہ ''مدینۃ السحر'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ (معجم ما استعجم للبکری ص ۲۱۹، ج ۱)

قرآن کریم نے بھی سورۃ بقرہ میں بابل کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ یہاں ہاروت و ماروت دو فرشتے بھیجے گئے تھے اور انہیں ایک خاص علم سکھا کر اہل بابل کی آزمائش کے لئے معبوث کیا تھا یہاں ایک اندھا کنواں ''جب دانیال علیہ السلام'' کے نام سے مشہور تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہی ہاروت و ماروت کا کنواں تھا۔

(آثار البلاد و اخبار العباد، للقزوینی، ص ۳۰۴)

بابل کے کھنڈرات اب تک اس علاقے میں پائے جاتے ہیں، اور کوفہ جانے والی سڑک سے بھی ان کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

پھر اسی علاقے میں ۴۹۵ھ میں سیف الدولہ صدقۃ بن منصور نے حِلّہ شہر آباد کیا اور

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ اس کے زمانے میں عراق کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، (حموی ص ۲۹۴، ج ۷)

اور اس کی طرف بہت سے علما بھی منسوب ہیں۔ اب یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور اپنے ضلع کا صدر مقام ہے۔

کوفہ یہاں سے جنوب مشرق میں واقع ہے اور حِلّہ سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کوفہ کے آثار شروع ہو گئے۔

کوفہ قرون اولیٰ کی تاریخ اسلام کا بڑا عظیم الشان مرکز رہا ہے۔ پہلی اور دوسری صدی میں یہ شہر مرکز کے خلاف سیاسی تحریکوں کا منبع رہا اور اس نے تاریخ کے نہ جانے کتنے انقلابات دیکھے اس کے ساتھ ہی حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ کی بنا پر علم وفضل کا بھی بڑا عظیم الشان مرکز بنا رہا جہاں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، حضرت وکیع بن الجراحؒ اور نہ جانے علم وفضل کے کتنے پہاڑ نمودار ہوئے، اس لئے مجھ جیسے طالب علم کے لئے کوفہ کے ساتھ خاص قلبی لگاؤ ایک فطری بات تھی، چنانچہ عراق کے سفر میں جن مقامات کو بطور خاص دیکھنے کا شوق تھا ان میں کوفہ سرفہرست تھا۔

کوفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فاتحِ عراق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا اور اس میں عرب کے مختلف قبیلوں نے اپنے اپنے محلے بنا لئے تھے۔ اس سے قبل یہ علاقہ سورستان کہلاتا تھا۔ شروع میں چونکہ یہ ایک چھاؤنی تھی، اس لئے یہاں کے باشندوں نے پختہ مکانات کے بجائے بانسوں اور کھجور کے پتوں سے عارضی مکان بنائے تھے۔ جب کہیں جہاد پر جانا ہوتا تو یہ مکان توڑ کر صدقہ کر جاتے اور جب واپس آتے تو دوبارہ بنا لیتے۔ جب حضرت مغیرہ بن شعبہؓ یہاں کے گورنر ہوئے تو ان کے زمانے میں اینٹوں کے مکانات بنائے گئے۔

کوفہ سے پہلے حضرت عمرؓ نے بصرہ آباد فرمایا تھا، ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں دونوں شہروں کے درمیان موازنہ کا مسئلہ زیر بحث آیا، تو حجاج بن یوسف نے کہا کہ امیر المؤمنین! مجھے دونوں شہروں کا اچھی طرح علم ہے، (حجاج دونوں شہروں کا گورنر رہ چکا تھا) عبدالملک نے کہا کہ "پھر ٹھیک ٹھیک بتاؤں کے دونوں شہروں میں کیا فرق ہے؟ اس پر

حجاج نے مشہور فقرہ کہا کہ:

أما الكوفة فبكر عاطل لاحلى لها ولا زينة، وأما البصرة فعجوز شمطاء بخراء ذفراء أو تيت من كلّ حلى وزينة.

کوفہ تو ایک ایسی دوشیزہ ہے جس پر نہ کوئی زیور ہے، نہ سنگھار، لیکن بصرہ ایک ایسی بڑھیا ہے جس کے بال کھچڑی ہیں، منہ اور بغلوں سے بو آتی ہے، مگر ہر طرح کے زیور اور سنگھار سے آراستہ ہے۔

(آثار البلاد، للقزوینی ص ۲۵۰)

کوفہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہ شہر اطراف واکناف کے قبائل کا مرکز بن گیا اور اس کی آبادی پھیلتی چلی گئی۔ یہاں مجاہدین اور نومسلم تو بڑی تعداد میں آباد تھے، لیکن شروع میں انہیں دین کی تعلیم دینے والی کوئی ایسی شخصیت نہ تھی، جو تعلیم ہی کو اپنا مقصد بنا کر ان کی تربیت کرے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہاں بھیج کر اہل کوفہ کو لکھا کہ "ان کے معاملے میں میں نے تمہیں اپنے پر ترجیح دی ہے۔" یعنی حضرت ابن مسعودؓ کی ضرورت تو مجھے تھی لیکن تمہاری ضرورت کی بنا پر ایثار کر کے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس شہر کو علم وفضل سے جگمگا دیا، اُن کے شاگردوں نے ان سے علم حاصل کر کے یہاں اپنا حلقہ ہائے درس قائم کئے اور حرمین شریفین کے بعد یہ علم حدیث وفقہ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لائے تو انہوں نے علم کا یہ چرچا دیکھ کر فرمایا کہ "اللہ ابن ام عبد (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) پر رحم فرمائے، انہوں نے اس شہر کو علم سے بھر دیا ہے۔"

حموی نے لکھا ہے کہ کوفہ اپنے عہد عروج میں (تقریباً ۲۶۴ھ میں) سولہ میل اندر پھیلا ہوا تھا اور اس میں ستر ہزار مکانات تھے (معجم البلدان ص ۴۹۲، ج ۱۶)۔ لیکن اب تمدنی حیثیت سے اس شہر کا کوئی خاص مقام نہیں، رقبہ اور آبادی دونوں کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ معلوم ہوتا ہے، ہم کوفہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کوفہ کی تاریخی مسجد پہنچے جو دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جامع مسجد کوفہ:

یہ مسجد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے تقریباً ۱۹ھ میں بنائی تھی جس میں چالیس ہزار آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی۔ بعد میں زیاد بن ابی سفیان نے اس میں اور اضافہ کیا، جس سے مزید بیس ہزار آدمیوں کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ آج بھی انسان اس میں داخل ہو کر اس کی غیر معمولی وسعت کا تأثر لیے بغیر نہیں رہتا، اس کے چاروں طرف فصیل نما مستحکم دیوار ہے جس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں اور اس کے اندرونی جانب دسیوں حجرے بنے ہوئے ہیں، جن کے دروازے مسجد کے صحن میں کھلتے ہیں۔ یہ حجرے کسی زمانے میں طالبانِ علم کا مستقر تھے اور ان میں مسافر طلبا مقیم رہتے تھے۔

مسجد کے صحن کے بیچوں بیچ بہت سی چھوٹی چھوٹی محرابیں بنی ہوئی ہیں، ایک جگہ چوکور احاطہ سا ہے۔ ہر جگہ کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان مقامات کے بارے میں طرح طرح کی بے سروپا روایتیں مشہور ہیں۔ کسی جگہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی ہے، کہیں لکھا ہے کہ یہاں نوح علیہ السلام نے نماز پڑھی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

درحقیقت ان باتوں کا مأخذ ایک بے اصل روایت ہے، جو حمویؒ نے معجم البلدان (ص ۴۹۲، ج ۱۶) اور قزوینیؒ نے آثار البلاد (ص ۲۵۰) میں نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص کوفہ سے بیت المقدس جانا چاہتا تھا، حضرت علیؓ نے اسے منع کیا اور فرمایا کہ تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ کوفہ کی جامع مسجد بڑی فضیلت والی ہے، یہاں دو رکعتیں دوسری مسجدوں کے مقابلے میں دس گناہ فضیلت رکھتی ہیں، اسی کے ایک گوشے میں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں تنور پھوٹا تھا (جس سے طوفانِ نوحؑ برپا ہوا) اسی کے پانچویں ستون کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی اور یہاں ایک ہزار انبیاء اور ایک ہزار اولیاء نماز پڑھتے رہے، اسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مدفون ہے اور اسی میں وہ کدو کا درخت تھا جس سے حضرت یونس علیہ السلام کو شفا عطا ہوئی،..... وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ بڑی واہی تباہی روایت ہے، حمویؒ اور قزوینیؒ دونوں نے اسے ایک شخص

حبتہ بن جُوین العُرنی سے روایت کیا ہے، حافظ ذھبیؒ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"من غلاة الشيعة ، وهو الّذى حدّث أن عليّا كان معه بصفّين ثما نون بدريّا، وهذا محال."

یہ شخص غالی شیعوں میں سے ہے، اسی نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں اسّی بدری صحابہ شامل تھے، حالانکہ یہ عقلاً محال ہے۔

(میزان الاعتدال للذھبی، ص ۴۵۰، ج ۱)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی التہذیب (ص ۱۷۶، ج ۲) میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور اکثر علماء رجال کی اس پر شدید جرح نقل کی ہے۔ البتہ شیعہ کتب رجال، میں اس کا تذکرہ مدح و توصیف کے ساتھ آیا ہے۔ مامقانی نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس کا دفاع کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا تعلق اُس قبیلۂ عرینہ سے ہے، جس کے لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر مرتد ہو گئے تھے اور صدقہ کے اونٹ بھگا کر لے گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو تنقیح المقال للمامقانی ص ۲۵۰، ج ۱)

یہ تو روایت کے اصل مأخذ حبتہ العرنیؒ کا حال ہے ان کے نیچے کون کون راوی ہیں؟ یہ حمویؒ اور قزوینیؒ نے بھی نہیں لکھا، لہٰذا یہ روایت کسی بھی طرح قابلِ اعتماد نہیں، نہ روایۃً نہ درایۃً۔

جامع کوفہ کی فضیلت کے یہ قصے تو بے اصل ہیں، لیکن اس کی یہ تاریخی اہمیت ناقابل انکار ہے کہ وہ عہد صحابہؓ کی قدیم ترین مسجد ہے جہاں حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، حضرت علیؓ حضرت حسنینؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ، حضرت عبداللہ بن الحارثؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، اور نہ جانے کتنے صحابۂ کرامؓ نے نمازیں پڑھی ہیں۔ عرب کے نہ جانے کتنے نامور خطیب خطبہ دیتے رہے ہیں، پھر یہ مسجد یکتائے روزگار محدثین و فقہاء کا مرکز بنی رہی ہے، بلا مبالغہ ہزاروں اہل علم نے یہاں درس دیا ہے۔ کیسے کیسے عابد و زاہد اولیاء کرامؒ کیسے کیسے مفسرین اور فقہاء و محدثین اور عربی اور عقلی علوم کے کیسے کیسے شناور یہاں دادِ علم و تحقیق دیتے رہے، اس مسجد کی فضا میں مجھ جیسے طالب علم

www.freepdfpost.blogspot.com

کوان کے انفاس قدسیہ، ان کے ذکر و تسبیح اور ان کے عملی افادات کی مہک محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جامع کوفہ آج بھی اپنے اسی طول و عرض اور شان و شکوہ کے ساتھ موجود ہے، لیکن نگاہیں وہ حلقہ ہائے درس تلاش کرتی رہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، وکیع بن الجرحؒ، قاضی ابی یوسفؒ اور امام محمدؒ جیسے جبالِ علم پیدا کئے اور جنہوں نے اپنے علم و فضل سے دنیا بھر کو سیراب کیا۔

آج اس مسجد میں کوئی شخص کتاب پڑھتا بھی نظر نہ آیا، بس جا بجا بے علم مزور لوگوں کو بے سروپا حکایتیں سناتے پھر رہے تھے کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ ان جاہلانہ حکایتوں کی حقیقت لوگوں کو بتا سکے۔ میں اس وسیع و عریض صحن میں چشمِ تصور سے علم و فضل کی وہ سجی ہوئی مجلسیں دیکھتا رہا، جن کی خوشبو سے کبھی اس مسجد کے بام و در معطر رہتے تھے اور دل میں یہ حسرت تھی کہ مجھ جیسا طالب علم یہاں پہنچا تو اتنی دیر میں کہ اب کوئی ان مجلسوں کو یاد کرنے والا بھی یہاں نظر نہیں آتا ؎

جمگھٹ وہ گُل رُخوں کے الٰہی کدھر گئے
کیا ہوگیا گُلاب کا تختہ کھِلا ہوا

صحن عبور کر کے مسجد کے مسقّف حصّے کا عرض زیادہ نہیں ہے اس میں بمشکل پانچ چھ صفیں نظر آتی ہوں گی اور یہیں وہ محراب ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کو شہید کیا گیا۔ غالباً مسقّف حصّہ شروع ہی سے اتنا ہے۔

نماز کے بڑے اجتماعات کے موقع پر صحن اور برآمدوں ہی سے کام لیا جاتا ہوگا۔ الحمد اللہ! اس تاریخی مسجد میں تحیۃ المسجد ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور یہاں سے دوبارہ صحن کی طرف نکلے تو دائیں ہاتھ کی طرف دو بڑے قبّے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک قبہ حضرت مسلم بن عقیل کا مزار ہے جو واقعۂ کربلا سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نائب کی حیثیت سے کوفہ میں مقیم تھے اور یہیں شہید کئے گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ معروف ہے۔

بائیں طرف والا قبہ حضرت ہانی بن عروہؓ کا مزار ہے جو کوفہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے اور انہوں نے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو اپنے گھر میں روپوش رکھا تھا۔

دارُ الاِمارۃ:

دنوں مزارات کی حاضری کے بعد ہم جامع کوفہ سے باہر نکلے، مسجد کی مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گلی قبلے (جنوب) کی طرف گئی ہے۔ یہاں سے گذر کر مسجد کے جنوبی سرے پر پہنچے تو دیوار قبلہ کے ساتھ ساتھ ایک قلعہ نما عمارت کے کھنڈر نظر آئے۔ یہ کوفہ کا دارالامارۃ تھا۔ پہلی صدی ہجری میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا اکھاڑہ، مختصر سے عرصے میں نہ جانے یہاں کتنے گورنر آئے اور گئے اور اہل کوفہ نے کسی کو ٹکنے نہ دیا۔

کوفہ چونکہ متنوع قبائل کا شہر تھا اور یہاں ہر طرح کے لوگ آ کر بس گئے تھے خاص طور پر سیاسی خلفشار کے بہت سے سرگرد یہاں آباد تھے، اس لئے انہوں نے کسی گورنر کو زیادہ عرصہ چلنے ہی نہ دیا، حد تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی پر جو عشرہ مبشرہ میں سے ہونے کے علاوہ عراق کے فاتح اور کوفہ کے بانی بھی تھے یہ الزام لگا دیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بھی کوفہ کے انتشار پسندوں کا بڑا ہاتھ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اگرچہ یہ لوگ اظہار عقیدت و محبت کرتے تھے، لیکن ان کو بھی سارے زمانۂ خلافت میں عملاً پریشان ہی رکھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلانے والے بھی یہی لوگ تھے اور پھر انہیں بے یارومددگار چھوڑ کر سانحۂ کربلا کا سبب بھی یہی بنے۔

اس دارالامارۃ میں کتنے گورنر آئے اور مارے گئے۔ اس کا عبرتناک واقعہ عبدالملک بن عمیر لیثی نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان اس دارالامارۃ میں چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ میں نے اس امارت میں سب سے پہلے حضرت حسینؓ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا، پھر اسی قصر میں عبیداللہ بن زیاد کا کٹا ہوا سر مختار بن عبید ثقفی کے سامنے دیکھا، پھر اسی قصر میں مختار کا کٹا ہوا سر مصعب بن عمیر کے سامنے دیکھا، پھر اسی جگہ مصعب بن عمیر کا کٹا ہوا سر آپ کے سامنے

www.freepdfpost.blogspot.com

دیکھا.....عبدالملک پر یہ سنکر خوف ساطاری ہوگیا اور وہ یہاں سے منتقل ہوگئے۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی)

.....☆.....☆.....☆.....

(۸)

حضرت علیؓ کا مکان

کوفہ کے دارالامارۃ کے دائیں جانب ایک قدیم طرز کا پختہ مکان ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا مکان تھا۔ یہ بات یہاں اتنی معروف ہے کہ یہ جگہ زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے، لیکن اپنے محدود مطالعے میں احقر کو کوئی تاریخی دلیل ایسی نہیں مل سکی جس کی بنا پر یقین سے کہا جا سکے کہ یہ مکان واقعۃً حضرت علیؓ ہی کا تھا۔ کوفہ کے حالات میں احقر کو کہیں اس کا ذکر نہیں مل سکا۔ لیکن اہل کوفہ میں یہ بات جس قدر مشہور ہے کہ اس کے پیش نظر یہ کچھ بعید بھی نہیں ہے کہ یہ واقعۃً درست ہو۔

یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کا دروازہ شمال کی طرف کھلتا ہے اور دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک مختصر سا صحن ہے جس کے مشرقی دیوار کے دونوں کونوں میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حسنین رضی اللہ عنہما کی اقامت گاہ تھی، مکان کا اصل حصہ مغربی کی طرف ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی سُرنگ نما راہداری ہے، جو ایک چھوٹے سے دالان نما کمرے پر ختم ہوتی ہے۔ جس میں ایک کنواں بھی ہے۔ دالان کی جنوبی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو ایک بڑے کمرے میں کھلتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ کمرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کے جنوب مغربی کونے میں ایک چھوٹا سا آتشدان بھی بنا ہوا ہے۔

مکان کی چھتیں خاصی نیچی ہیں اور اندازِ تعمیر قدیم ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ مکان شروع سے اپنے اصل نقشے پر چلا آتا ہے، یعنی اس کو بار بار تعمیر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی

دیواریں اب سیمنٹ کی بنی ہوئی ہیں، لیکن نقشہ وہی رکھا گیا ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے عہد مبارک میں تھا۔ واللہ اعلم بالصواف.

نجف میں:

کوفہ کے بعد نجف کے لئے روانگی ہوئی۔ اب تو کوفہ اور نجف کے درمیان کئی کیلو میٹر کا فاصلہ ہے اور درمیان میں خاصا طویل جنگل پڑتا ہے جس میں کوئی آبادی نہیں ہے لیکن کوفہ کے عہد عروج میں کوفے کی آبادی نجف تک تقریباً مسلسل تھی اور جس جگہ کو اب نجف کہا جاتا ہے اسے قدیم دور میں ''ظہر الکوفہ'' (کوفہ کا پچھواڑ) کہا جاتا تھا، یہاں ربص اور نجف کے نام سے دو چشمے تھے جن سے آس پاس کے نخلستان سیراب ہوتے تھے اور چونکہ خطرہ یہ تھا کہ ان چشموں کا پانی قبرستان اور آبادی کو نقصان پہنچائے گا، اس لئے اس علاقے کی زمین کو اس طرح ڈھلوان بنایا گیا تھا کہ اس کی اونچائی کوفہ کی سمت رہے تاکہ پانی کا بہاؤ ادھر رُخ نہ کرے۔ (مراصد الاطلاع للبغدادی ص ۱۳۶۰ ج ۳)

رفتہ رفتہ یہاں آبادی بڑھتی رہی اور کوفے کی آبادی سمٹتے سمٹتے جامع کوفہ کے آس پاس رہ گئی اور اس طرح یہ علاقہ اس چشمے کے نام پر ''نجف'' کہلانے لگا جو ایک مستقل شہر بن گیا۔

آج کل نجف میں شیعہ صاحبان کی ایک بڑی درس گاہ ہے اور ان کے مراجع میں سے ایک اہم مرجع آقائے خوئی کا قیام بھی یہیں ہے، بلکہ نجف شہر میں داخل ہونے کے بعد ہمارے رہنماؤں نے ہمیں وہ مکان بھی دکھایا جس میں ایرانی انقلاب کے رہنما خمینی صاحب سالہا سال عراقی حکومت کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔

نجف کی مختلف سڑکوں سے گذر کر ہم اس شاندار سنہری عمارت کے پاس پہنچے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا مزار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدفون ہونا تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے۔ اگرچہ اب یہ بات تواتر کے ساتھ مشہور ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ کا مزار یہی ہے۔ لیکن حضرتؓ کے مقامِ تدفین کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف اور متضاد ہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

کہ کوئی یہ بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔

خطیب بغدادؒ نے اپنی تاریخ میں اس سلسلے میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ احمد بن عبداللہ العجلیؒ کہتے ہیں کہ ''حضرت علیؓ کو عبدالرحمٰن ابن ملجم نے کوفہ میں شہید کیا اور حضرت حسنؓ نے عبد الرحمٰن بن ملجم کو قتل کیا۔ حضرت علیؓ کو کوفہ میں دفن کیا گیا لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔''

ابن سعدؒ کا کہنا ہے کہ ''حضرت علیؓ کو کوفہ میں جامع مسجد کے قریب قصر الامارۃ میں دفن کیا گیا۔'' ابوزید بن ظریفؒ کہتے ہیں کہ ''جامع مسجد کی دیوار قبلہ کے ساتھ باب الوراقین کے سامنے ایک گھر ہے، حضرت علیؓ اس میں مدفون ہیں۔'' یہ گھر یزید بن خالد نامی ایک صاحب کا تھا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی موقع پر اس گھر کو کھودنا پڑا تو اس میں سے حضرت علیؓ کی نعش تروتازہ برآمد ہوئی۔

بعض روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ دفن تو کوفہ میں ہی کئے گئے تھے لیکن حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں آپ کی نعش مبارک کو مدینہ طیبہ لے گئے تھے اور وہاں حضرت فاطمہؓ کے مزار کے قریب جنت البقیع میں آپ کو مدفون کیا گیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو شہادت کے فوراً بعد ہی ایک تابوت میں رکھ کر ایک اونٹ پر سوار کر دیا گیا تاکہ انہیں مدینہ طیبہ لے جائیں لیکن راستے میں قبیلہ طے کے علاقے میں پہنچ کر وہ اونٹ گم ہو گیا۔ قبیلہ طے کے لوگوں نے اس صندوق کو خزانہ سمجھ کر اٹھا لیا، لیکن جب نعش دیکھی تو اسے وہیں اپنے علاقے میں دفن کر دیا۔

ابو جعفر حضریؒ جو ''مطیّن'' کے لقب سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں کہ ''آج (نجف میں) جس قبر کو لوگ حضرت علیؓ کی قبر سمجھ کر اس کی زیارت کرتے ہیں، اگر وہ واقعتاً حضرت علیؓ کا مزار ہوتا تو میں دن رات وہی رہا کرتا، لیکن درحقیقت وہ حضرت علیؓ کا مزار نہیں ہے اور جن صاحب کا مزار ہے اگر ان کا نام روافض کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی زیارت کرنے کی بجائے اسے سنگسار کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صاحب مزار دراصل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔''

ان تمام روایات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد الخطیبؒ (ص ۱۳۶ تا ۱۳۸ ج ۱)

ظاہر ہے کہ ان متضاد روایات کے پیش نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے مزار کے بارے میں کوئی بھی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

کربلا کا سفر

نجف سے ہم کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں ایک خاصی کشادہ اور صاف ستھری سڑک کربلا جاتی ہے جس کے دونوں طرف حد نظر تک لق ودق صحرا اور ریگستان نظر آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں اونٹوں کے قافلے محوِ سفر دکھائی دیئے جنہوں نے صدیوں پرانی قافلوں کی یاد تازہ کر دی۔ اب کربلا تو ایک بارونق شہر ہے اور وہاں پہنچ کر اس صحرائے کربلا کا تصور ناممکن ہے جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا، لیکن نجف سے کربلا جاتے ہوئے راستے میں جو ریگ زار دکھائی دیتے ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سرزمین کیسی دُشوار گزار اور مُسافروں کے لئے کتنی صبر آزما رہی ہوگی۔

تقریباً ظہر کے وقت ہم کربلا شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شہر خاصا بارونق اور شاید کوفہ اور نجف دونوں کے مقابلے میں زیادہ آباد ہے۔ جس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حادثہ شہادت پیش آیا۔ اُس وقت یہ ایک لق ودق صحرا تھا۔ اس پورے علاقے کو زمانہ قدیم میں ''طف'' کہتے تھے اور یہ خاص صحرا جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے کربلا کے نام سے موسوم تھا، اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال مشہور ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ کَربلۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنٰی پاؤں کے تلووں کی نرمی کے ہیں، یہ زمین چونکہ نرم تھی اس لئے اس کا نام ''کربلا'' رکھ دیا گیا۔ ''کربلا عربی زبان میں گند صاف کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس لئے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سرزمین میں چونکہ روڑے پتھر نہیں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس زمین کو باقاعدہ صاف کیا گیا ہے اس لیے ''کربلا'' کہتے ہیں۔

اس کے برعکس..... بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''کربَل'' سے نکلا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ ایک قسم کی گھاس کا نام ہے جو اس صحرا میں بکثرت پائی جاتی ہے اس لئے اس کا نام کربلا مشہور ہوگیا۔ (معجم البلدان ؒ للحموی ص ۴۴۵ ج ۴) واللہ اعلم۔

کربلا پہنچ کر ہم سب سے پہلے اس عمارت پر حاضر ہوئے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کے بارے میں بھی روایتیں بہت مختلف ہیں۔ عام طور سے مشہور یہ ہے کہ آپ کا جسم مبارک تو کربلا ہی میں مدفون ہے لیکن سر مبارک چونکہ یزید کے پاس دمشق لے جایا گیا تھا۔ اس لئے وہ یہاں مدفون نہیں۔ پھر سر مباک کے مزار کے نام سے مختلف شہروں میں بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ اگر یہ روایت درست ہو کہ سر مبارک یزد کے پاس شام لے جایا گیا تھا تو اس کا دمشق میں مدفون ہونا تو کچھ سمجھ میں آتا ہے لیکن ایک عظیم الشان مزار قاہرہ میں جامع ازہر کے سامنے بھی بنا ہوا ہے اور یہ پورا محلہ ''سیدنا الحسنؓ'' کے نام سے مشہور ہے۔

بہر صورت! سر مبارک کے بارے میں تو روایات بہت مختلف ہیں لیکن جسم مبارک کے بارے میں قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کربلا میں مدفون ہوگا۔ اگرچہ اس کی خاص جگہ کا تعین تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے۔ امام ابونعیم مشہور محدث اور مؤرخ ہیں۔ ان سے کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کی جگہ دریافت کی تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔

(تاریخ بغداد الخطیبؒ ص ۴۴: ج ۱)

کربلا میں دوسرے مزارات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عباس اور صاحبزادے علی اکبرؓ وغیرہ ہیں۔ یہاں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور سانحہ کربلا کے دلگداز واقعات ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آتے رہے۔ اس وقت دریائے فرات یہیں قریب ہی بہتا ہوگا۔ اب یہاں سے کچھ دور چلا گیا ہے، خانوادۂ رسول ﷺ کے ان عالی مقام افراد نے مدینہ طیبہ چھوڑ کر اس دشت کربلا میں جان دینے کو یقیناً کسی دنیا طلبی کی خاطر گوارا نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بغداد میں آخری رات:

کربلا سے واپس بغداد پہنچے تو مغرب کا وقت قریب تھا۔ یہ بغداد میں ہمارے قیام کی آخری رات تھی۔ کچھ دیر ہوٹل میں آرام کے بعد رات کو ہم دجلہ کنارے جا نکلے۔ موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور دجلہ پوری آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اس تاریخی دریا میں ایک مچھلی مقامی زبان میں ''بُنّی'' کہلاتی ہے، جو بڑی لذیذ اور بو سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ بغداد میں اسے پکانے کا بھی ایک منفرد طریقہ رائج ہے۔ اسے بیچ سے چیر کر اسے تنور پر تقریباً بیس منٹ سینکا جاتا ہے اور وہ ایک مختصر وقت میں تیار ہو جاتی ہے۔ اسے ''سمک مزکوف'' کہتے ہیں۔ دجلہ کے کنارے ''سمک مزکوف'' تیار کرنے والے ریسٹورنٹ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس روز بغداد کے اس مخصوص کھانے کا لطف اٹھایا۔ اس کے بعد میں اور محترم قاری بشیر احمد صاحب مدظلہم دیر تک دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر بنی ہوئی شاندار عمارتوں کی روشنیاں پانی میں منعکس ہو کر عجیب و غریب رنگ پیدا کر رہی تھی، یہ وہی دجلہ تھا جس کے کنارے کبھی عباسی خلفاء کے شاندار محلات ہوا کرتے تھے، یہی وہ دجلہ تھا جو تاتاری حملے کے دوران کبھی خونِ مسلم سے سرخ ہوا اور کبھی کتابوں کی روشنائی سے سیاہ۔ اس نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کتنی داستانیں دیکھیں ہیں، تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنی لہروں میں چھپائے یہ آج بھی اسی آب و تاب سے بہہ رہا ہے لیکن اس دریا کے کنارے مسلمانوں کی جو تابناک تہذیب دنیا کو عطا کی تھی، اس کا تصور کرنے کے لئے آنکھیں بند کرنے پڑتی ہیں اور دماغ پر زور ڈال کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تُو

.....☆.....☆.....☆.....

www.freepdfpost.blogspot.com

مصر اور الجزائر
میں چند روز

ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ جولائی ۱۹۸۵ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
www.freepdfpost.blogspot.com

سُنی نہ مِصر و جزائر میں وہ اذاں مَیں نے
دِیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

(۲)

مِصر اور الجزائر
میں چند روز

الحمد اللہ و کفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفی

جمہوریہ الجزائر کی وزارتِ مذہبی امور پچھلے انیس سال سے ہر سال عالمِ اسلام کے علماء اور مفکرین کا ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کرتی ہے، جس کا نام ''ملتقی الفکر الاسلامی'' ہے۔ ہر سال اس اجتماع کا ایک مرکزی موضوع متعین کر دیا جاتا ہے، اور تمام مقالہ نگار اس موضوع پر اپنے مقالات پیش کرتے ہیں۔ دو سال پہلے یہ اجتماع ''اجتہاد'' کے موضوع پر منعقد ہوا تھا، اور اس میں راقم الحروف کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی میں نے اپنا مقالہ تو اس اجتماع میں بھیج دیا تھا جو وہاں شائع ہو کر تقسیم ہوا اور بعد میں اسلام آباد کے مجلّہ ''الدراسات الاسلامیہ'' نے بھی اسے نقل کیا۔ لیکن میں خود اپنی مصروفیات کی وجہ سے الجزائر نہ جا سکا۔

امسال رمضان المبارک کے دوران پھر اس اجتماع کے لئے دعوت موصول ہوئی رفتہ رفتہ مختلف تجربات کی روشنی میں میں اب بین الاقوامی کانفرنسوں سے دل اُکتانے لگا ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر ان کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے صرف کانفرنس کی شرکت کے لئے اب کسی سفر پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ البتہ چونکہ اب تک مغربی اسلامی ملکوں میں سے کہیں جانا نہیں ہوا۔ اور اس پوری سرزمین سے اسلام کے درخشاں دور کی بڑی عظیم یادیں وابستہ ہیں، اس لئے الجزائر دیکھنے اور وہاں کے مسلمانوں سے ملنے کا شوق مدت سے تھا، اور اس مرتبہ اس اجتماع کی تاریخیں بھی ایسی

www.freepdfpost.blogspot.com

تھیں کہ شرکت میں کوئی دوسری اہم مصروفیات مانع نہ تھی۔ اس لئے بنامِ خدا تعالیٰ اس سفر کا ارادہ کرلیا۔

پاکستان سے الجزائر کے لئے چونکہ کوئی براہ راست فضائی سروس موجود نہیں ہے۔ اس لئے کسی دوسرے ملک کے واسطے سے پڑا، اور ان پروازوں کا باہمی تعلق کچھ اس قسم کا تھا کہ میرے لئے اجتماع کے شروع میں پہنچنا ممکن نہ تھا۔ یہ اجتماع پیر ۸۔ جولائی سے ۱۶، جولائی تک جاری رہنا تھا اور میں سہ شنبہ ۹ جولائی کی شب ڈھائی بجے پی آئی اے کے طیارے سے قاہرہ کے لئے روانہ ہوا، اور بیچ میں ایک گھنٹے کے لئے دبئی رکتا ہوا مصری وقت کے مطابق صبح ۶½ بجے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ یہاں ہوائی اڈے پر استقبال کے لئے کوئی موجود نہ تھا، جن حضرات کو میں نے اطلاع کی تھی غالباً ان کو اطلاع نہیں مل سکی۔ لیکن پی آئی اے کے عملے بالخصوص قاہرہ کے اسٹیشن منیجر فاروق احمد صاحب نے بڑی محبت اور اخلاق کا معاملہ کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ ہوائی اڈے کے تمام مراحل سے بآسانی گذار کر نہایت آرام سے ہوٹل پہنچا دیا۔ مجھے الجزائر کے طیارے کے انتظار میں یہاں دو دن ایک رات ٹھہرنا تھا۔ آج کل مصر میں پاکستان کے سفیر ہمارے سابق وزیر اطلاعات راجہ ظفر الحق صاحب ہیں۔ ہوٹل سے میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے احقر کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور تھوڑے آرام کے بعد ہوٹل میں گاڑی بھیج دی گئی جس کے ذریعے پاکستانی سفارت خانے جانا ہوا۔

راجہ صاحب ماشاءاللہ بڑی محبوب اور دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی وزارت کے زمانے میں بھی بڑا کام لیا، اور جب وہ مصر میں سفیر بن کر پہنچے تو انہوں نے یہاں کے عملی و دینی حلقوں کے دل بھی موہ لیے ہیں۔ ان سے دلچسپ ملاقات رہی اور مصر کے حالات معلوم ہوئے۔

قاہرہ کے پچھلے سفر میں اہرام مصر نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ عام شہر سے ذرا فاصلے پر واقع ہیں، راجہ صاحب نے خود اپنی گاڑی فراہم کر کے اہرام تک جانا آسان کر دیا چنانچہ اس مرتبہ یہ تاریخی عبرت گاہ بھی اطمینان کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔

اہرام مصر

عہد قدیم میں دنیا کے جو سات عجائب مشہور تھے، ان میں سے اہرام مصر ہی تنہا وہ عجوبہ ہے جو آج تک باقی چلا آتا ہے ۷ ہزار سال قبل مسیح (علیہ السلام) بنی ہوئی یہ حیرت انگیز عمارتیں آج بھی انجینئرنگ کی تاریخ کا عجوبہ سمجھی جاتی ہیں اور آج جب کہ انجینئرنگ اپنے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہے "الھرم الأکبر" اس دور میں بھی اپنے طول و عرض اور اونچائی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔

یہ عمارت کس نے اور کیوں بنائی تھی؟ اس کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مصر کے مشہور مؤرخ علامہ مقریزیؒ لکھتے ہیں۔

وقد اختلف الناس فی وقت بناء ھا م واسم بانیھا، و السبب فی بنا ئھا ،وقالوا فی ذلک أقوالا متبا ینة أ کثر ھا غیر صحیح،

لوگوں کے درمیان اہرام کی تاریخ تعمیر، اس کے بانی کے نام.....اور تعمیر کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے، اور اس سلسلے میں متضاد واقوال ہیں جن میں سے اکثر صحیح نہیں۔ (الخطط المقریزیۃ ص ۱۹۸ ج ۱)

لیکن قدیم عربی مآخذ میں اس سلسلے میں جو روایات زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان سے پہلے مصر کے ایک بادشاہ سوریدؔ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بعض کاہنوں اور نجومیوں نے یہ دی ہے کہ دنیا پر ایک عالمگیر مصیبت آنے والی ہے۔ سوریدؔ نے اس موقع پر اہرام کی تعمیر کا حکم دیا اور اس کے اندر کچھ ایسی سرنگیں بنائی تھیں جن سے دریائے نیل کا پانی داخل ہو کر کسی خاص جگہ تک جا سکے، نیز اس عمارت میں ہر طرح کے عجائب بھی شامل کئے تھے، اور اس وقت اہل مصر سائنس اور حساب سے لے کر طب اور سحر تک جتنے علوم سے واقف تھے، ان کو اس عمارت کی دیواروں، چھتوں اور ستونوں پر لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ بعد میں اسی عمارت کو بادشاہوں

www.freepdfpost.blogspot.com

کے مقبرے کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ (حسن المحاضرہ للسیوطی، ص ۳۳ تا ۳۵)

ایک روایات یہ ہے کہ اہرام کا بانی قوم عاد کا ایک بادشاہ شدّاد تھا اور بعض روایتوں میں حضرت ادریس علیہ السلام کو ان کا بانی قرار دیا گیا ہے (الخطط المقریزیۃ، ص ۱۲۰، ج ۱)

ان عمارتوں کے بارے میں طرح طرح طلسماتی کہانیاں بھی مشہور رہی ہیں جو علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

لیکن عہد جدید میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے مختلف کھدائیوں اور دریافت شدہ تحریروں کی تحقیق کے بعد جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ اہرام مصر دراصل عہد قدیم میں بادشاہوں کے مقبرے کے طور پر تعمیر کئے گئے تھے۔ اس دور میں بادشاہوں کے مقبرے اسی مخروطی شکل میں تعمیر کئے جاتے تھے اور فراعنہ کے چوتھے سے لے کر سترھویں خاندان تک مقبرے کا یہی اسلوب مقبول عام رہا، چنانچہ مصر کے مختلف حصوں میں بہت سے اہرام تعمیر کئے گئے۔ چنانچہ تقریباً اسی، اہرام کے آثار دریائے نیل کے مغربی علاقے اور مصر کے زیریں اور سطی خطوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اہرام زیادہ تر معمولی سائز کے تھے، اور انہیں مخروطی شکل دینے کے لئے سیڑھیوں کا انداز اختیار کیا گیا تھا، ان کو "الاہرام الصادقۃ (True Pyramids) کہا جاتا ہے۔ ان اہرام میں سے قدیم ترین مقبرے شہر صقرۃ سے چند میل دور جنوب میں واقع ہے، اور کہا جاتا ہے۔ کہ شاہ اسنفر نے ۱۶۰۰ ق م میں تعمیر کیا تھا، جو فراعنہ کے چوتھے شاہی خاندان کا ایک بادشاہ تھا۔

(Encyc I Opaedia Intenational Lexican 1982 V .15p . 194)

لیکن یہ اہرام اپنی قدامت کے باوجود فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے کوئی عجوبہ قرار نہیں دئے گئے۔ بعد میں تین اہرام قاہرہ کے قریب جیزہ کے علاقے میں (جو اب قاہرہ ہی کا حصہ بن گیا ہے) تعمیر کئے گئے۔ یہ اپنے سائز کے اعتبار سے بھی غیر معمولی تھے، اور ان کا مخروطی شکل دینے کے لئے سیڑھیوں کا سا انداز بھی اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ نیچے سے اوپر تک سطح کو سپاٹ رکھتے ہوئے انہیں مخروطی شکل دی گئی۔ یہی تین اہرام دنیا کے عجائب میں شمار ہوتے ہیں اور آج بھی دنیا کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق یہ تین اہرام حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے فراعنہ کے چوتھے خاندان کے بادشاہ خوفو اور اس کے بیٹوں خفرے اور منکارہ نے تعمیر کئے تھے۔ ان میں سب سے بڑی عمارت "الھرم الأکبر" کہلاتی ہے اور وہ خوفو نے تعمیر کی تھی۔ زمین پر اس کا مجموعی رقبہ ۱۳ء۱ (تیرہ اعشاریہ ایک) ایکڑ ہے۔ اور صرف ایک سمت سے زمین پر اس کا طول ۷۵۶ فٹ ہے۔ تیار ہونے کے بعد اس کی اونچائی ۴۸۱ء۴ فٹ تھی، بعد میں کچھ بالائی حصہ کم ہوگیا تو اونچائی ۱۳ فٹ کم ہوگئی۔ اس کی تعمیر میں بیس لاکھ سے زیادہ پتھر کے بلاک استعمال ہوئے ہیں، جن میں سے ہر کوئی پتھر ۲ ٹن سے کم نہیں ہے، بعض پتھر ۱۵ ٹن وزنی بھی ہیں، لیکن اوسطاً پتھروں کا وزن ڈھائی ٹن ہے، لیکن ان پتھروں کو ایسی فنکاری کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ ان کی درمیان جھری باہر سے نظر نہیں آتی اور دور سے پوری عمارت ایک ہی دیوہیکل مخروطی پتھر معلوم ہوتی ہے۔

ایک امریکی ماہر آثار قدیمہ ڈیسمنڈ اسٹیورٹ نے اہرام مصر پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتا ہے:

> "دنیا بھر میں پتھر کی سب سے بڑی تعمیر تیرہ ایکڑ کے رقبے میں کھڑی ہے، جو بیس لاکھ سے بھی زائد بلاکوں پر مشتمل ہے، اور یہ بلاک اوسطاً ڈھائی ٹن وزنی ہیں..... اس کی ہر سمت ۷۵۵ فٹ طویل ہے، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تمام کونے مکمل طور پر بالکل صحیح زاویہ بناتے ہیں اور سامنے کے پتھر اتنے ٹھیک ٹھیک نصب کئے گئے ہیں کہ ان کے درمیان جوڑ نظر نہیں آتے۔"

(Desmond Stewart, Tha pyramid And Sprinx new york 1978 , P , 166)

ہم "الھرم الأکبر" کے نیچے پہنچے تو اس کے تقریباً بیچوں بیچ زمین سے ذرا بلندی پر ایک غار نما دروازہ نظر آیا جو ایک سرنگ میں کھلتا ہے، یہ سرنگ اندر ہی اندر ہرم کی

www.freepdfpost.blogspot.com

چوٹی تک چڑھتی ہوئی گئی ہے۔ عربی تاریخوں کے مطابق یہ ہرم کا باقاعدہ دروازہ نہیں ہے بلکہ خلیفہ مامون رشید نے اپنے عہد حکومت میں اہرام مصر کے اندرونی راز معلوم کرنے کے لئے اہرامِ اکبر کے بیچ سے کھدائی کا حکم دیا تھا، اور اس دور میں صرف اتنے حصے کی کھدائی پر بڑی دولت صرف کی گئی تھی، اور اس کے لئے آگ اور سرکے سے لے کر منجیقوں تک کو استعمال کیا تھا۔ کھدائی سے معلوم ہوا کہ دیوار کا اندرونی حجم بیس ہاتھ ہے، چنانچہ بیس ہاتھ کی کھدائی مکمل ہوئی تو اتفاق سے یہ وہی جگہ تھی جہاں سے سرنگ اوپر کی طرف جارہی تھی وہاں زبرجد کی ایک سلیچی بھی رکھی ہوئی ملی جس میں ایک ہزار دینار رکھے تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن ایک اوقیہ تھا۔ بعد میں جب مامون رشید نے کھدائی کے مجموعی خرچ کا حساب لگایا تو اتنے ہی دینار کے برابر تھا۔ (الخطط المقریزیہ ص ۲۰۱۔ ج ا و حسن المحاضرہ للسیوطی ص ۳۴ و ۳۵)

اس سرنگ کی چڑھائی کافی دشوار گذار ہے، چڑھائی کی مشقت اور گرمی کی شدت سے لوگ اوپر پہنچتے پہنچتے پسینے سے شرابور ہو جاتے ہیں۔ اور اس سرنگ کی انتہا ایک وسیع وعریض ہال پر ہوتی ہے، جس کی تمام تر دیواریں پتھر کی ہیں اور اس کے شمالی مغربی کونے میں پتھر کا ایک حوض بنا ہوا ہے۔ اس حوض میں بادشاہ کی لاش رکھی جاتی تھی، تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہرم کی دیواروں پر عجیب وغریب رسم الخط کی عبارتیں تحریر تھیں جو مرورِ زمانہ سے مٹ گئی ہیں۔ نیز دیواروں کو طرح طرح کے نقوش اور لعل وجواہر سے مزین کیا گیا تھا اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

ہرم اکبر کے بعد دوسرے نمبر پر ''ہرم اوسط'' ہے، نیچے کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ زیادہ بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقۃً ہرم اکبر چھوٹا ہے، یہ تعمیر کے وقت ۴۷۱ فٹ بلند تھا، اور اب اس کی اونچائی ۴۴۷ فٹ ہے۔ یہ خوفو کے بیٹے خفرے کا بنایا ہوا ہے جو شیفرن (Chephren) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

تیسرا ''ہرم اصغر'' ہے یہ تعمیر کے وقت ۲۱۸ فٹ بلند تھا اور اب ۲۰۴ فٹ بلند ہے اور یہ خفرے جانشین منکارہ کا تعمیر کردہ ہے جو مائی سرینوس کے نام سے معروف

ہے۔ یہ تینوں اہرام چونکہ قاہرہ کی عام سطح زمین سے کافی بلند ہیں، اس لئے یہاں سے شہر قاہرہ کا منظر بھی بڑا خوشنما ہے اور یہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ فقیہ عمارۃ الیمنیؒ نے اہرام مصر کے بارے میں کہا ہے۔

خلیلی ماتحت السماء بنیة — مماثل فی اتقانها هرمی مصر
بناء یخاف الدهر منه وکل ما — علی ظاهر الدنیا یخاف من الدهر
تنزه طرفی فی بدیع بناء ها — ولم تینزه فی المراد بها فکری

میرے خیال میں اہرام مصر جیسے عجوبے پر اس سے بہتر اور متوازن تبصرہ نہیں ہو سکتا[1]

ابوالہول:

اہرام جیزہ کے مشرقی جانب میں شہرہ آفاق ''ابو الہول'' واقع ہے، یہ دراصل ہرمِ اوسط کے بانی خفیرے کا مجسمہ ہے جو اس نے خود اپنی زندگی میں بنوایا تھا مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ اس کا قدیم نام ''بیلیبیب'' تھا، عربوں نے اس کا نام ''ابوالہول'' رکھ دیا۔ مقریزیؒ زمانے میں اس مجسمے کا سر اور گردن سطح زمین پر نظر آتی تھی، اور لوگوں کا قیاس نہ تھا کہ باقی جسم زمین میں مدفون ہے۔ چنانچہ بعد میں کسی وقت زمین کھودی گئی تو قیاس درست نکلا، اب اس کے چاروں طرف زمین کھدی ہوئی ہے اور پورا مجسمہ نظر آتا ہے، البتہ چہرے کے نمایاں نقوش مٹے ہوئے ہیں۔ اور مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں ایک صوفی بزرگ شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ہمیشہ روزے سے رہتے تھے، انہوں نے نظر میں بہت سے منکرات کے ازالے کے لئے ایک مہم

[1] اشعار کا ترجمہ یہ ہے: ''دوستو! آسمان کے نیچے کوئی عمارت ایسی نہیں جو اپنے استحکام میں مصر کے دو ہرموں کے مشابہ ہو۔ یہ ایسی عمارت ہے جس سے زمانہ بھی ڈرتا ہے۔ حالانکہ رُوئے زمین کی دوسری چیزیں زمانے سے ڈرتی ہیں، میری آنکھ اس عجیب وغریب عمارت کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے، لیکن یہ عمارت جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اس کے تصور سے میرا ذہن محظوظ نہیں ہوتا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

شروع کی، اور اسی مہم کے دوران انہوں نے ابولہول کے چہرے کو اس طرح بگاڑ دیا کہ چہرے کے نقوش نظر نہ آئیں۔ (الخطط ص ۲۱۷ ص ۱)

بہر کیف! یہ مجسمہ ۲۴۰ فٹ لمبا اور ۶۶ فٹ اونچا ہے، اس کی ناک قد آدم سے اور ہونٹ ۷ فٹ سے زائد لمبے ہیں[1]۔ چہرہ مردانہ ہے لیکن دھڑ شیر جیسا ہے، اور یہ پورا مجسمہ ایک ہی پتھر کا بنوا ہوا ہے۔

تاریخی روایات اس بات پر متفق ہے کہ اہرام اور ابولہول کے لئے پتھر اسوان کے علاقے سے لائے گئے تھے، جہاں آج کل اسوان بند تعمیر کیا گیا ہے۔

ابوالہول کے دائیں جانب ایک زیر زمین قلعہ نما عمارت کے کھنڈر ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرعونوں کے زمانے میں شہزادیوں کے کمرے تھے۔

جامع عمر بن العاصؓ

اہرام سے فارغ ہو کر ہم وسط شہر میں "جامع عمر بن العاصؓ" پہنچے جو نہ صرف مصر بلکہ پورے افریقہ کی قدیم ترین مسجد ہے، حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا تو یہاں سب سے پہلے ایک بڑی مسجد کی بنیاد ڈالنی چاہی، اس وقت یہاں انگور وغیرہ کے باغات تھے، حضرت عمرو بن عاصؓ کے حکم پر زمین ہموار کی گئی مسجد کا قبلہ متعین کرنے میں اسی صحابہ کرامؓ شامل تھے، جن میں حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت ابن صامتؓ، حضرت ابوالدرداؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے اسماء گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مسجد کے سب سے پہلے امام خود حضرت عمرو بن عاصؓ تھے اور مؤذن ایک دوسرے صحابی حضرت ابومسلم یافعیؓ تھے۔

بعد میں حضرت مسلم بن مخلد انصاریؓ نے (جو حضرت معاویہؓ کی طرف سے مصر کے حاکم تھے) اس مسجد میں توسیع کی اور اس میں مینار بنایا، اور کہا جاتا ہے کہ کہ مصر میں مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ پھر ۷۷ھ میں عبدالعزیز بن مروان نے

1 Tha Pyramid And Sprinx , by Desmend Stewrt p 44

یہ مسجد از سر نو تعمیر کی اور ان کے بعد ولید بن عبدالملک کے حکم سے اسے منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا، اس وقت اس پر نقش و نگار کا اضافہ ہوا، اور اس کے ستونوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا۔ (حسن المحاضرہ للسیوطیؒ ص ۷۳ ج ۱)

اس مسجد میں بڑے جلیل القدر بزرگان دین علماء کرام اولیاء و اتقیاء نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں یہی مسجد مجلس قضاء کا کام بھی دیتی تھی، اور بعد میں یہاں بڑے عظیم الشان حلقہ ہائے درس بھی قائم ہوئے۔ علامہ ابن ضائغ حنفی کا کہنا ہے کہ "میں نے ۴۹۷ھ سے پہلے اس مسجد میں چالیس سے زائد علمی حلقے شمار کئے ہیں۔" نیز کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت یہاں اٹھارہ ہزار چراغ روشن ہوتے تھے اور روزانہ گیارہ قنطار تیل خرچ ہوتا تھا۔ (حسن المحاضرہ للسیوطیؒ ص ۱۵۲، ج ۲)

اس مسجد کی پوری تاریخ علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرۃ میں بیان فرمائی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین اسلام اور علماء و فضلاء کو اس مسجد کے ساتھ کتنا شغف رہا ہے۔

یہ مسجد پچھلے دنوں بہت بوسیدہ ہو گئی تھی، اب اس کی از سر نو تعمیر کی گئی ہے اور اس میں بہت توسیع ہوئی ہے۔ آج بھی یہ قاہرہ کی ممتاز ترین مسجد ہے۔ احقر نے نماز عصر اسی مبارک مسجد میں ادا کی۔ نماز عصر کے بعد صف اوّل میں کافی لوگ تلاوت کرتے نظر آئے، کہیں اکا دکا طالب علم بھی دکھائی دئے لیکن محسوس یہ ہوا کہ ؎

میں تب پہنچا کہ جب اس بزم سے رخصت کا ساماں تھا

جامع عمرو بن العاصؓ سے باہر نکلے تو واپس ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی۔ کئی راتوں سے نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس روز عشاء اور رات کے کھانے کے بعد جلد ہی نیند آ گئی۔

اگلے دن چار بجے شام تک قاہرہ میں مزید رکنا تھا، میں نے اس وقت کو کار آمد کرنے کے لئے قاہرہ کے مختلف کتب خانوں کی سیر کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ صبح نو بجے سے دن کے دو بجے تک مختلف کتب خانوں میں پھر کر دستیاب کتب کا جائزہ لیتا رہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سفر الجزائر

شام کو پانچ بجے الجزائر جانے کے لیے ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز چار گھنٹے لیٹ ہے، یہ وقت ایئر پورٹ پر ہی گذارا رات کو ساڑھے گیارہ بجے الجزائر ایئر لائنز کے طیارے پر سوار ہوئے چار گھنٹے کا راستہ تھا، لیکن وقت کے ایک گھنٹے کے فرق کی وجہ سے الجزئر کے وقت کے مطابق رات کو ڈیڑھ بجے جہاز الجزائر کے حواری بومدین ایئر پورٹ پر اترا۔ یہاں وزارۃ الشؤن الدینیہ کے افسران استقبال کے لئے موجود تھے، رات کو ڈھائی بجے فندق السفیر پہنچ کر سو گئے۔

الجزائر کے دور الحکومت کا نام بھی الجزائر ہی ہے، لیکن کانفرنس دار الحکومت سے تقریباً ۲۶۰ کیلو میٹر دور یہاں کے مشہور تاریخی شہر بجایہ میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس لئے صبح آٹھ بجے ہوٹل سے کار کے ذریعے بجایہ روانہ ہوئے۔ تیونس کے مشہور عالم شیخ محمد الشاذلی المنیفر اور سعودی عرب کے ڈاکٹر محمد بھی اسی کار میں رفیق سفر بنے۔ الجزئر شہر سے نکلتے ہی دائیں طرف متوسط بلندی کے سرسبز و شاداب پہاڑ اور بائیں طرف بحر متوسط کے خوبصورت مناظر شروع ہو گئے۔ یہ سارا سفر افریقہ کے شمال مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شمالی افریقہ کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے، تصور کی نگاہیں ان حسین پہاڑوں اور سرسبز وادیوں میں ان خدامست مجاہدوں کے مقدس قافلے دیکھ رہی تھیں جنہوں نے عقبہ بن نافع کی سرکردگی میں ہزار ہا میل کا پُر خطر سفر طے کر کے یہاں اللہ کا کلمہ بلند کیا، اور اس بربری علاقے کو نہ صرف اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے کلام سے معمور کر دیا، بلکہ اس کی زبان تک بدل ڈالی۔

بجایہ میں

شہر بجایہ الجزائر کے دار الحکومت (الجزائر العاصمۃ) سے مغرب میں ۲۸۵ کیلو میٹر

کے فاصلے پر واقع ہے، یہ مغرب اوسط کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جو بحرِ متوسط کے کنارے اور جبل قواریہ کے دامن میں پھیلا ہوا ہے۔ جبل قواریہ سطح سمندر سے ۶۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور اس کے ڈھلان ساحلِ سمندر تک چلے گئے ہیں، قدیم شہر بجایہ انہی ڈھلوانوں پر آباد ہے اور ساحل سمندر سے جبلِ قواریہ کو دیکھیں تو درمیان میں شہر کی عمارتیں ایک زینے کی طرح پہاڑ پر چڑھتی نظر آتی ہیں۔

ابن خلدونؒ نے (جو ایک عرصے تک اس شہر میں وزیر اور قاضی رہے ہیں) لکھا ہے کہ بجایہ ایک بربری قبیلے کا نام تھا جو زمانہ قدیم سے یہاں رہتا تھا۔ اسی کے نام پر بستی کا نام بجایہ مشہور ہو گیا۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی جس کے آس پاس اس بربری قبیلے کے کچھ مکانات تھے، کوئی قابل ذکر شہر نہ تھا، تقریباً ۴۵۵ھ میں حمادی خاندان کے ناصر بن علناس نے مرکز سے بغاوت کر کے اسے ایک شہر کی حیثیت دی اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ (معجم البلدان للحموی، ص ۲۳۹، ج ۱)

منصور حمادی کے عہد حکومت ۴۸۱ھ تا ۴۹۸ھ میں بجایہ ایک ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا منصور نے یہاں ایک شاندار محل تعمیر کیا، ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی، جس کا مینار ۶۶ فٹ بلند تھا اور اس میں ۷ ابر آمدے تھے۔ اسی کے دور میں پانی کی سپلائی کے لئے جبل قواریہ سے شہر تک معلق پُل تعمیر کئے گئے جن کے ذریعے پہاڑی چشموں کا پانی شہر تک پہنچایا جاتا تھا یہ شہر مغرب اوسط کا ایک عظیم تجارتی مرکز بن گیا، یہاں کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں موجود تھیں، اس لئے یہاں سے لوہا دور دور تک برآمد ہوتا تھا۔ سمندر کے قرب اور پہاڑوں اور سبزاروں کی وجہ سے یہ شہر بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا، موسم معتدل اور آب و ہوا صحت بخش تھی، اس لئے لوگ دُور دُور سے یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ یہاں ایک اسلامی علوم کی بڑی درسگاہیں بھی قائم ہیں، اور بڑے بڑے علماء یہاں سے پیدا ہوئے۔

بجایہ بحر متوسط کے جس کنارے پر واقع ہے، اس کے بالمقابل دوسرے کنارے پر اندلس پھیلا ہوا ہے، چنانچہ اندلس کے لوگ جب مشرقی ممالک کا سفر کرتے تو بجایہ ان کی

www.freepdfpost.blogspot.com

اہم منزل ہوتی۔ پھر جب اندلس میں طوائف الملوک دور آیا تو سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور اس کے اثرات بد سے عاجز آ کر بہت سے اہل علم نے اندلس سے ہجرت کی تو بجایہ کو اپنا مستقر بنایا۔ بعد میں جب مراکش کے یوسف تاشفین نے اندلس پر موحدین کی حکومت قائم کی تو اندلس کے بہت سے علماء وفضلاء کا رابطہ شمالی افریقہ کے ممالک سے بڑھ گیا اس دور میں بھی بہت سے علماء اندلس سے آ کر بجایہ میں مقیم ہوئے۔

اور آخر میں جب اندلس میں مسلمانوں کے پرچم بالکل ہی سرنگوں ہو گئے، تو غرناطہ کے سقوط کے بعد مراکش اور الجزائر ہی مسلمانوں کی پناہ گاہ بنے اس دور میں بھی بجایہ مہاجرین اندلس کا ایک اہم مرکز ثابت ہوا۔

بجایہ میں ساتویں صدی ہجری میں جو مشہور علماء گذرے ہیں ان کے تذکرے پر علامہ ابوالعباس غبرینیؒ (متوفی ۷۰۴ھ) نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔

''عنوان الدرایۃ فیمن عرف من العلماء فی المائۃ السابعۃ ببجایۃ'' یہ کتاب استاذ رابح بونار کی تحقیق کے ساتھ ہی الجزائر ہی سے شائع ہوگئی ہے۔

.....☆.....☆.....☆.....

بجایہ میں ہمارے قیام ''فندق الحمادیین'' میں ہوا۔ یہ ہوٹل شہر بجایہ سے تقریباً پانچ میل دور بحر متوسط کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ بجایہ کی چھوٹی سی بندرگاہ جس ساحل پر واقع ہے وہاں سے یہ ساحل جنوب مغرب کی طرف ایک ہلالی نیم دائرہ بناتا ہوا چلا گیا ہے اور پھر جنوب کی طرف مڑ کر سیدھا ہوگیا ہے۔ اس ساحل کے ساتھ ساتھ ایک ساحلی سڑک (Marine Drive) حد نظر تک چلی گئی ہے۔ جس کے مغرب میں سرسبز وشاداب پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور مشرق میں بحر متوسط پوری آب وتاب کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ فندق الحمادیین اسی ساحلی سڑک پر واقع ہے، اس کے کمروں کی کھڑکیاں سمندر کے کنارے کھلتی ہیں، اور کمرے کی اندرونی فضا ہر وقت موجوں کے

دلآویز ترنم سے معمور رہتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے مشرقی دروازے سے جو ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا ہے، بحیرہ روم کا حسین منظر سامنے تھا، حد نظر تک بحیرۂ روم کی نیلگوں موجیں کروٹیں لیتی دکھائی دے رہی تھیں، خیال آیا کہ یہاں سے بالکل سامنے انہی موجوں کے اس پار اندلس کا ساحل پھیلا ہوا ہے اور، اس سمندر نے صدیوں اندلس کے مسلمانوں کو مشرقی ممالک سے ملانے کا فریضہ انجام دیا ہے، اور یہیں پر برسوں اُن فاتحین کی تگ وتاز جاری رہی ہے۔ جن کے نعرے ہائے تکبیر کی گونج سے اس فضا کا ہر ذرہ معمور تھا، اس تصور سے اقبالؔ مرحوم کے یہ اشعار یاد آ گئے۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرانشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھی جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

کانفرنس

مندوبین کا قیام اس فندق الحمادیین میں تھا، لیکن کانفرنس یہاں سے تقریباً چھ میل دور شہر بجایہ کے ٹاؤن ہال میں ہو رہی تھی۔ یہ کانفرنس الجزائر کی وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام ہر سال منعقد کی جاتی ہے اور اس کا مستقل نام ''ملتقی الفکر الاسلامی'' ہے۔ امسال اس کے لئے موضوع تھا ''الاسلام والغزو الثقافی''، یعنی اسلام اور ثقافتی جنگ۔''

اس موضوع پر مختلف گوشوں پر اظہار خیال کے لئے عالم اسلام سے معروف اہل علم اور اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس مسلسل آٹھ روز جاری رہی۔ سامعین میں یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا، ہر مقالہ کے بعد طلبہ اس مقالے سے متعلق سوالات کرتے اور مقالہ نگاران کا جواب دیتا تھا۔ احقر نے اس کانفرنس کے لئے ''ثقافتی جنگ بذریعۂ نظام تعلیم'' کے زیر عنوان ایک مقالہ لکھا تھا لیکن جب میرے مقالے کا وقت آیا

www.freepdfpost.blogspot.com

تو میں نے چند وجوہ مقالے کے بجائے فی البدیہہ تقریر مناسب سمجھی۔

اوّل تو مقالہ پورا پیش کرنے کا موقع نہیں تھا، ہر مقالہ نگار کو بمشکل دس دس منٹ دئے جارہے تھے، اس لئے اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں تھا، دوسرے مقالے چھپ چھپ کر حاضرین میں تقسیم ہورہے تھے، اس لئے جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ طبع ہوکر سب کے پاس پہنچ ہی جاتی۔ تیسرے میں نے دیکھا کہ حاضرین پاکستان کے حالات جاننے کے لئے بہت مشتاق تھے، اور مختلف نشستوں کے درمیان گفتگو سے احقر نے محسوس کیا کہ نہ صرف الجزائر کے لوگ بلکہ دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی پاکستان کے قیام اور یہاں نفاذِ شریعت کی کوششوں سے بہت کم واقف ہیں، اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بڑی حیرت اور اشتیاق کے ساتھ سنتے ہیں، اس کے علاوہ ہر نشست کے بعد طلبہ ملتے تو پاکستان کے حالات دریافت کرتے اور بعض طلبہ نے تو صراحۃً فرمائش بھی کی کہ آپ کا خطاب پاکستان کے بارے میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ الجزائر میں نفاذِ شریعت کے لئے ایک خاموش تحریک کام کررہی ہے، اور وہاں ابھی تک وہ مسائل موضوع بحث ہیں جن سے بفضلہٖ تعالیٰ ہم پاکستان میں فارغ ہوچکے ہیں، مثلاً یہ کہ موجودہ معاشرے میں شراب بندی ممکن اور مناسب ہے؟ الجزائر پر ابھی تک فرانسیسی استعمار کے اثرات باقی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہاں حکومتی سطح پر اسلام کے نفاذ سے زیادہ اشتراکیت کے قیام پر توجہ دی گئی۔ اب رفتہ رفتہ حالات کچھ بہتر ہورہے ہیں۔ لیکن ماضی کے اثرات کا عالم ہے کہ بڑے شہروں میں قدم قدم پر شراب خانے موجود ہیں جن میں کھلم کھلا شراب نوشی ہوتی ہے، ایسے ماحول میں اگر کہیں اس ام الخبائث کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اسے ناقابل عمل سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح ابھی تک وہاں اس قسم کے مسائل بھی زیر بحث رہتے ہیں کہ کیا اس دور میں حدود شرعیہ کا نفاذ ممکن یا مناسب ہے؟ کیا بینک کا سود اربٰو ہے یا نہیں؟ قابل شکر بات یہ ہے کہ نوجوانوں میں غیر معمولی دینی شعور بیدار ہورہا ہے، اور وہ بہت سی

رکاوٹوں کے باوجود لادینی رجحانات کا جم مقالہ کررہے ہیں، لہٰذا پاکستان میں نفاذ شریعت کی طرف جو تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے، وہ ہماری نظر میں کم سہی، لیکن الجزائر کے حالات کے پیش نظر بہت قابل لحاظ ہیں، اور احقر نے محسوس کیا کہ اس ماحول میں پاکستان کے عملی تجربات کا تذکرہ انشاء اللہ زیادہ مفیدہ اور اہمیت افزائی کا موجب ہوگا، اور یہاں کے دینی حلقوں کے ہاتھ مضبوط کرے گا۔

چنانچہ احقر نے پاکستان میں مختصراً ہندوستان میں انگریزی استعمار کی تاریخ اس کے اثرات کے خلاف تحفظ دین کے لئے علماء کرام کی جدوجہد قیام پاکستان اور اس کے مقاصد کی تاریخ کی بیان کی، اس کے بعد یہاں نفاذ شریعت کے داعیوں اور سیکولر نظام کے داعیوں کے درمیان جو کشمکش رہی، اس کے حالات بیان کئے اور پھر ۱۹۷۷ء کے بعد سے ملک میں نفاذ شریعت کے سلسلے میں جو کام ہوئے ہیں، ان کی تفصیل بتائی۔

ان تمام حالات کو سن کر حاضرین بالخصوص طلبہ کا جوش وخروش قابل دید تھا۔

بات بات پر اپنی تحسین وآفرین کا اظہار کرتے، یہاں تک کہ جب میں نے پاکستان میں شراب بندی اور پی آئی اے کی پروازوں میں شراب کی ممانعت کا ذکر کیا، اور یہ بتایا کہ اس ممانعت سے قبل ہی بعض حلقوں کی طرف سے اعداد وشمار پیش کرکے ڈرایا جارہا تھا کہ اس قانون کے نتیجے میں ملکی آمدنی کتنی کم ہوجائے گی؟ اور ائیر لائنز کو کس قدر خسارہ ہوگا؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے یہ قدم اٹھالیا گیا تو یہ سارے اوہام ہوا میں اڑ گئے اور بحمد اللہ ائیر لائنز کا خسارے کے بجائے پہلے سے زیادہ نفع ہوا، تو طلباء جوش مسرت میں اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے اور دیر تک ہال تالیوں اور نعروں سے گونجتا رہا۔

تقریب کے بعد کانفرنس کے مندوبین اور طلبہ دونوں ہی بڑے اشتیاق کے ساتھ ملتے رہے۔ اور اب تک پاکستان کے حالات سے ناواقف ہونے پر اپنے افسوس کا بھی اظہار کرتے رہے۔ اگرچہ احقر نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہمیں اعتراض ہے کہ ہم نے اس طویل مدت میں نفاذ شریعت کی سمت میں جتنا سفر طے کیا ہے وہ باقیماندہ سفر کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، لیکن ان حضرات کی نظر میں یہ

www.freepdfpost.blogspot.com

تھوڑا سا سفر بھی بہت حوصلہ افزا تھا۔ بہت سے لوگ دعائیں دیتے رہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تمام دشمنوں سے محفوظ رکھے، اور نفاذ شریعت کے راستے میں اسے عالم اسلام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

میں سوچ رہا تھا کہ اسلام کے نام پر ان تھوڑے سے اقدامات کے نتیجے میں عالم اسلام کے مسلمانوں کی پاکستان سے محبت کا یہ عالم ہے تو اگر ہم واقعتہً پورے طور پر اپنے نظام زندگی کو اسلام سانچے میں ڈھال لیں تو پاکستان کے ساتھ ان مسلمانوں کی والہیت کا کیا عالم ہوگا؟

اس اجتماع میں طلبہ کے علاوہ طالبات بھی آیا کرتی تھیں، جن کے لئے الگ الگ جگہ مقرر تھی، تمام طالبات خاصی حد تک حجاب کی رعایت کے ساتھ آئیں، ان کا پورا جسم ایک ڈھیلی عبا میں چھپا ہوا ہوتا، اور سر اور گلے پر اوڑھنی اوڑھے ہوئے ہوتیں۔ جو عموماً سروں سے باہر جھکی ہوتی تھیں اور ان سے سر کا کوئی بال بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چہروں پر نقاب نہیں ہوتا تھا، اس طریقے سے شرعی پردے کی مکمل پابندی تو نہیں ہوتی لیکن الجزائر جن حالات سے گذرا ہے، ان میں جدید تعلیمی اداروں کی طالبات کا اتنا اہتمام کر لینا بھی بسا غنیمت تھا۔

احقر کی تقریر کے بعد ایک نشست میں ایک طالبہ نے پرچہ میرے پاس بھجوایا۔ اس پرچہ میں اس نے پاکستان کے ساتھ اپنی محبت اور اس کے حالات معلوم ہونے پر مسرت کا اظہار کیا تھا، اور افغانستان کے جہاد سے متعلق چند سوالات کئے تھے۔ طلبہ نے لکھا تھا کہ ہمارے بہت سے بعض بہن بھائی اس جہاد میں شریک ہونا چاہتے ہیں اس کا کیا راستہ ممکن ہے؟ نیز ہم میں سے بہن بھائیوں نے مجاہدین افغانستان کے لئے کچھ رقم جمع کی ہے جسے بھیجنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں، اس کا کوئی راستہ بتایئے۔ اس کے علاوہ مجاہدین کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کے اظہار کا ہمارے پاس کوئی طریقہ تو نہیں تھا، اس لئے ہم نے ان کو داد شجاعت دینے کے لئے کچھ ترانے کہے، اور انہیں چھوٹے بچوں سے پڑھوا کر ان کے کیسٹ تیار کئے ہیں جو ہم اپنے مجاہد بھائیوں

بھیجنا چاہتے ہیں، تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ ان کے دینی بھائی بہن ہزار ہا میل کے فاصلے پر رہ کر بھی ان کے لئے دعا گو ہیں، ان کیسٹوں کو وہاں تک پہنچانے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ اور آخر میں یہ کہ ہم نے سنا ہے کہ افغانستان کے محاذ پر جنگ کے دوران بہت سی کرامتیں بھی ظاہر ہو رہی ہیں، ان کرامتوں کے کچھ واقعات ہمیں سنایئے۔

طلبہ کے اس معصوم جذبے سے طبیعت بہت متاثر ہوئی، اور ان سوالات کا جواب بھی میں نے انہیں تحریری طور پر دے دیا جس میں ان کی ہمت افزائی اور کچھ دینی نصائح بھی تھیں تاہم میرا خیال تھا کہ شاید نوعمر طلبہ کا وقتی جوش ہو۔ لیکن پاکستان میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ محض وقتی جذبہ نہیں تھا، ان طلبہ نے میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق مجاہدین کی امداد و حمایت کا ہر ممکن طریقہ جاری رکھا۔

قدیم شہر بجایہ میں

کانفرنس کے پروگرام اس قدر مسلسل تھے کہ شہر بجایہ کے اندر جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا، مجھے چونکہ یہاں تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق تھا، اس لئے ایک دن شام کی نشست کی حاضری کے مؤخر کر کے ایک الجزائری دوست کے ساتھ قدیم شہر کے اندر جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے پر واقع ہے، اور اس کی عمارتیں سطح سمندر سے سطح کوہ تک بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہیں۔ بیشتر سڑکیں بھی ڈھلوان ہیں اور بعض جگہ چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ چلنے والوں کے سہارے کے لئے سڑکوں کے کنارے پر پائپ لگائے ہوئے ہیں۔

ہم سب سے پہلے بجایہ کے قدیم دروازے پر پہنچے جو ''القصبۃ'' کہلاتا ہے۔ اس کے دروازے کے ساتھ ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر یہ عبارت تحریر ہے۔

القصبۃ، اسسھا المو حدون 1145-1160 وھی قلعۃ حکومیۃ

[1] یہ ہندسے جنہیں آج ہم انگریزی ہندسے کہتے ہیں، دراصل قدیم عربی ہندسے ہیں، مغرب کے عرب ممالک، بالخصوص الجزائر میں انہی ہندسوں کا رواج ہے اور ان کو عربی ہندسوں کی حیثیت سے اپنایا گیا ہے

www.freepdfpost.blogspot.com

منیعہ ، و بدا خلھا مسجد یعتبر معھد ادر اسیا عظیما علم فیہ فطا حل العلماء، ومن بینھم عبدالرحمن ابن خلدون.

''قلعۂ قصبہ جسے مواحدین کے شاہی خاندان نے ۱۱۴۵ء سے ۱۱۶۰ء عیسوی تک (ساتویں صدی ہجری میں) کے درمیانی حصے میں تعمیر کیا۔ اس قلعے کے اندر ایک مسجد ہے جو ایک عظیم درس گاہ رہ چکی ہے۔ جس میں بڑے بڑے علماء نے درس دیا ہے، جن میں علامہ ابن خلدونؒ بھی شامل ہیں۔''

قلعے کے اندر داخل ہوئے تو ایک شکستہ اور بوسیدہ عمارت نظر آئی جو قدیم طرز کے تعمیر کا نمونہ تھی، قلعہ کا بیشتر حصہ کھنڈر ہو چکا ہے، صرف چند عمارتیں باقی ہیں اور وہ بھی مائل بہ فنا نظر آتی ہیں، جو تھوڑے بہت آثار باقی ہیں ان میں چند بالا خانے ہیں، ایک کشادہ لان ہے جس میں حمام کے طرز کے کچھ کمرے بنے ہیں، اسی میں ایک کنواں بھی ہے اور قلعے کی فصیل ہے جہاں سے ساحل سمندر تک کا منظر سامنے ہے۔

لیکن قلعے کے بیچوں بیچ جو عمارت اپنی قدیم بنیادوں پر قائم ہے وہ قلعے کی وہی مسجد ہے جس کی نشاندہی مذکورہ بالا کتبے میں کی گئی ہے۔ مسجد کا ہال کافی کشادہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ علامہ ابن خلدونؒ کے وقت سے اس عمارت میں کوئی رد بدل نہیں کیا گیا، مسجد کے درمیان ستون بھی اسی دور کے ہیں، یہاں تک کہ اب یہ عمارت اس قدر مخدوش ہوگئی ہے کہ اسے زائروں اور سیاحوں کے لئے کھولا بھی نہیں جاتا۔ اتفاق سے آثار کے ایک افسر میرے الجزائری دوست سلیم کلامی صاحب کو مل گئے تھے انہوں نے مسجد کو خاص طور پر کھلوایا۔

یہ عظیم الشان مسجد آج غیر آباد تھی، اس کے ستونوں نے اس کی چھت کا بوجھ بمشکل سنبھالا ہوا تھا، لیکن اس کے در و دیوار پر عہد ماضی کے دھندلے دھندلے آثار عہد رفتہ کی عظمتوں کی داستاں سنا رہے تھے۔ انہوں نے یہاں ابن خلدونؒ جیسی بالغۂ روزگار ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود دیکھا تھا، اور تاریخ اسلام کے اس عظیم مفکر کی باتیں سنی

تھیں جس کی نظیر کہیں صدیوں میں خال خال پیدا ہوئی ہے۔ ابن خلدونؒ بجایہ میں وزیر بھی رہے قاضی بھی، خطیب بھی اور استاذ بھی۔

جامع مسجد اور باب البنود

''قصبہ'' کے قلعے سے نکل کر ہم کافی چڑھائی چڑھنے کے بعد شہر کے بیچوں بیچ یہاں کی جامع مسجد میں پہنچے، یہ شہر کی قدیم جامع مسجد ہے جس میں بیشمار علمائے سلف نے نمازیں پڑھیں اور خطبے دئے ہیں اور درس دیئے ہیں جن میں شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ، علامہ عبدالحق اشبیلیؒ (صاحب ''الاحکام'') علامہ ابن سید الناسؒ (شارح ترمذی، و صاحب ''عیون الأثر'') (متوفی ۶۵۹ھ) حافظ ابن الأبار القضاعیؒ (صاحب ''مسند الشہاب'' و ''التکملۃ للصلۃ''، (متوفی ۶۵۸ھ)، علامہ ابو بکر ابن محرزؒ (متوفی ۶۵۵ھ) جیسے جلیل القدر علماء شامل تھے۔

یہ مسجد بحمد اللہ آج بھی آباد ہے، اس کے صحن کے دونوں طرف بنے ہوئے کمرے زمانۂ قدیم سے چلے آرہے ہیں یہ علماء کی درس گاہ اور طلبہ کی اقامت گاہیں تھیں، اب بھی یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تو ہے ملیکن سرکاری تحویل اور انتظام میں۔

مسجد کا ایک بغلی زینہ پہاڑ کی اونچائی سے ایک زیریں سڑک پر اترتا ہے یہ سڑک شہر پناہ پر جا کر ختم ہوئی ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے شہر کی فصیل کا ایک دروازہ بنا ہوا ہے۔ جسے باب البنود کہتے ہیں۔ اوپر خوبصورت برج اب بھی باقی ہیں۔ اس دروازے کی بیرونی دیوار پر یہ عبارت تحریر ہے۔

باب البنود الفوقة

کام یعتبر المدخل الرئیسی للمدینة ، وبه بناء جمیل یختصنن مجلس السلطان الحمادی الذی کان یشرف منه علی تنظیم الحفلات و استقبال القوافل،

''یہ بابا البنود الفوقہ'' ہے، جو شہر کا صدر دروازہ سمجھا جاتا تھا، اس کے

www.freepdfpost.blogspot.com

اس کے اوپر ایک خوبصورت عمارت ہے جس میں حمادی کی وہ نشست گاہ بھی ہے جس پر بیٹھ کر وہ اجتماعات کے انتظامات کی نگرانی اور آنے والے قافلوں کا استقبال کرتے تھے۔

علامہ عبدالحق اشبیلیؒ کے مزار پر

اتنا تو احقر کو معمول تھا کہ بجایہ میں مشہور محدث علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، علم حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے علامہ عبدالحق اشبیلیؒ محتاج تعارف نہیں، ان کی مشہور کتاب ''الاحکام'' کے شرح حدیث میں جا بجا ملتے ہیں، خاص طور پر حافظ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''نصب الرایہ'' میں ان کے بہ کثرت دیتے ہیں۔ علامہ ابن القطانؒ کی مشہور کتاب ''الوھم والایھام'' انہی کی کتاب پر تنقید ہے۔ ان کی یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن پیر جھنڈو کے کتب خانے میں احقر نے اس کا قلمی نسخہ دیکھا ہے۔ بہرصورت وہ ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ ہیں اور بجایہ آنے کے بعد ان کے مزار پر حاضری کا اشتیاق تھا، لیکن کوئی مناسب رہنما نہیں مل رہا تھا۔

اس وقت بھی احقر کے رہنما سلیم کلال صاحب خود بجایہ کے باشندے نہ ہونے کی بنا پر مزار سے واقف نہ تھے، بالآخر ہم پوچھتے پوچھتے وہاں تک پہنچ ہی گئے۔ باب البنود کسی وقت شہر کی آخری حد تھی، لیکن اب شہر اس سے کافی آگے پہنچ گیا ہے، چنانچہ باب البنود سے نکلنے کے بعد کافی آگے چل کر ایک گنجان سی سڑک پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اس مسجد کے اندر علامہ عبدالحق کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا احاطہ بنوا ہوا ہے۔ جس میں قبر کا ابھرا ہوا نشان بھی موجود ہے۔ یہاں یہ عظیم محدث آرام فرما ہے۔

علامہ عبدالحق اشبیلیؒ ۵۱۰ھ میں اندلس کے مشہور شہر شبیلیہ میں پیدا ہوئے تھے عمر کا ابتدائی حصہ اندلس میں گذارا، لیکن وہاں کے سیاسی انتشار کی بنا پر وہاں سے ہجرت کر کے بجایہ آگئے تھے، اور اسی کو وطن بنا لیا۔ اسی لئے بعض اوقات انہیں، عبدالحق البجائی'' بھی کہا جاتا ہے، حافظ ذھبیؒ جیسے مرد، شناس بزرگ ان کے بارے میں

ابن ابارؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

کا فقیھاً، حافظا عالما بالحدیث و علله، عارفاً بالرجال، موصوفاً بالخیر والصلاح والزھد والودع، ولزرم السنة و التقلل من الدنیا الخ

(سیر اعلام النبلاء ص ۱۹۹ ج ۲۱)

وہ فقیہ اور حافظ حدیث تھے، حدیث اور اس کی علتوں کے علام تھے، رجال حدیث کو پہچانتے تھے، زاہد تقویٰ، خیر وصلاح اتباع سنت اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ متصف تھے۔

بجایہ میں قیام کے دوران جامع مسجد کے خطیب بھی رہے، مدرس بھی، اور کچھ عرصہ کے لئے قاضی بھی، زندگی نظم وضبط کا پابند تھی، علامہ ابن عمیر ضبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں بیٹھ کر چاشت کے وقت تک طلبہ کو پڑھاتے، پھر چاشت کی آٹھ رکعتیں پڑھتے، اور گھر جا کر ظہر تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے۔ ظہر کی نماز کے بعد عدالتی کام کرتے، اور اس وقت میں بعض اوقات پڑھاتے بھی تھے، عصر کے بعد لوگوں کی ضروریات پوری کرنے اور خدمت خلق کے لئے گھر سے نکل جاتے۔

(بغیۃ الملتمس للضبی ص ۳۷۸)

یہ تو دن کے معمولات تھے، اور رات کے بارے میں علامہ ابوالعباس غبرینیؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی رات کے تین حصے کر رکھے تھے ایک تہائی رات پڑھنے میں گذارتے، ایک تہائی عبادت میں اور ایک تہائی سونے میں۔

(عنوان الدرایہ للغبرینیؒ ص ۴۲)

گھر والوں کے لئے بڑے شفیق اور مہربان بھی تھے، اور جوش طبع بھی اکثر اپنی بیٹھک میں فقہاء کے ساتھ بیٹھے ہوتے، اندر سے کوئی کنیز آ کر گھر کے کسی کام کے لئے پیسے مانگتی تو چھوٹی سی چیز کے لئے بھی ضرورت سے بہت زیادہ پیسے دے دیتے۔ ایک مرتبہ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ جتنے پیسے آپ دے رہے ہیں، وہ ان کی مطلوب مقدار سے بہت

www.freepdfpost.blogspot.com

زائد ہیں جواب میں آپ نے فرمایا:

لا أجمع على أهل المنزل ثلاث شيغات: شيخ ،واشبيلي وشحيح.

(عنوان الدرایہ ص ۴۴)

میں اپنے گھر والوں پر تین شین (ش) جمع نہیں کرتا، میں شیخ اور اشبیلی تو ہوں، لہٰذا مجھ میں دو شین موجود ہیں) شحیح (یعنی بخیل) بننا نہیں چاہتا۔

افسوس ہے کہ ان کی تصانیف طبع نہیں ہوئیں ورنہ، کتاب ''الاحکام'' کے علاوہ ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ''الحاوی'' کے نام سے ایک لغت اٹھارہ جلدوں میں لکھی تھی، اس کے علاوہ صحاح ستہ کا مجموعہ ''الجامع الکبیر'' کے نام سے لکھا تھا، اور احوال آخرت پر ایک کتاب ''العاقبۃ'' کے نام سے تحریر فرمائی تھی۔ نیز ''کتاب التہجد'' کتاب الرقاق'' اور اختصار الرشاطی'' بھی ان کی تصانیف میں شمار کی گئی ہیں۔

اتنی بات تو علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ ان کی وفات حاکمِ وقت کے ظلم وتشدد کے نتیجے میں ہوئی، لیکن اس واقعے کی کوئی تفصیل کسی نے بیان نہیں کیا..... مگر ان کے مزار پر ایک عمر رسید مجاور تھا، اس نے بتایا کہ ہمارے آباؤ وجداد سے یہ واقعہ مشہور چلا آتا ہے کہ علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ عیہ کا بجایہ کے حاکم سے کسی مسئلے پر شدید اختلاف ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں اس نے انہیں سزائے موت دی، اور ان کو اسی ''باب البنود'' پر سولی دی گئی جس کا ذکر پیچھے آیا ہے، پھر ان کی لاش اس دروازے کے بیرونی حصے میں تین روز تک لٹکتی رہی۔

اس وقت ''باب البنود'' شہر کی آخری حد تھی اور غروب آفتاب کے بعد یہ دروازے بند کردیا جاتا تھا، لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے چوکی دار یہ آواز لگایا کرتا تھا کہ ''اگر شہر کا کوئی آدمی دروازے سے باہر ہے تو اندر آجائے دروازہ بند ہورہا ہے۔''

مذکورہ مجاور کا کہنا تھا کہ جس روز علامہ عبدالحقؒ کو سولی پر لٹکایا گیا، اس روز شام کو چوکیدار نے حسب معمول یہ آواز لگائی تو جنگل کی طرف سے آواز آئی ''ٹھہرو ابھی عبدالحقؒ شہر سے باہر ہیں۔''..... چوکیدار نے اس کو واہمہ سمجھا اور دوبارہ آواز لگائی، تو پھر جواباً وہی

آواز سنائی دی اور یہ واقعہ تین مرتبہ ہوا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

اسی مجاور نے یہ بھی بتایا کہ علامہ عبدالحق اشبیلی کی وفات کے بعد بجایہ کے بچے بچے کی زبان پر یہ جملہ تھا۔

الشيخ عبد الحق، قتل بغير حقّ.

وہ شیخ جو حق کا بندہ تھا، حق کے بغیر قتل ہوا۔

یہاں تک کہ اس علاقے میں یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔

الحمد اللہ، شیخ کے مزار پر سلام عرض کرنے اور فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کے اس برگزیدہ بندے نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ حق، خدمت دین اور خدمت خلق میں صرف کیا اور حق ہی کی خاطر مظلومیت کی لرزہ خیز موت کو سینے سے لگا کر زندگی جاوید ہوگئے۔ وہ حاکم جس نے انہیں سولی پر لٹکایا تھا اسے آج کوئی نہیں جانتا، مجھے اس دور کے تذکروں میں اس کا نام تک نہیں مل سکا، لیکن علامہ عبدالحقؒ کا نام زندہ جاوید ہے اور جب تک دنیا میں حق کے نام لیوا باقی ہیں ان پر عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کئے جاتے رہے گے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة.

وادیٔ صوم میں

بجایہ کے قیام کے دوران ایک جمعہ آیا تو کانفرنس کے منتظمین تمام مندوبین کا بجایہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلے پر وادی صوم ام لے گئے۔ یہ سرسبز وشاداب پہاڑوں میں گھری ہوئی بڑی حسین وادی ہے، یہاں کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اس گاؤں کے ایک کچے مکان میں فرانسیسی استعمار کے زمانے میں الجزائر کے مختلف خطوں کے مسلمان مجاہدین کا ایک کنونشن منعقد ہوا تھا جس میں تمام علاقوں کے لوگوں نے ایک متحد پلٹ فارم بنا کر فرانس سے آزاد ہونے کی جدوجہد شروع کی تھی۔ حکومت الجزائر نے آزادی کے بعد اس مکان کو محفوظ رکھا ہے، اور اس کے آس پاس متعدد یادگاریں بنادی ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ہماری گاڑی خطرناک پہاڑی کو عبور کر کے اس گاؤں میں پہنچی اور ہم اتر کر پیدل چلے تو ایک طرف دیہاتی مکانات کی قطار تھی جن کے دروازوں پر دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں، جب ہمارا قافلہ مکانات کے قریب سے گذرا تو ان خواتین نے مسلسل چیخوں کے سے انداز میں منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالنی شروع کیں جو جنگل کے سناٹے میں دور رتک پھیلتی چلی گئیں۔ ان چیخوں میں خوف کے بجائے طربیت کا اندازہ نمایاں تھا۔ میں نے اس طرح کی آوازیں پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس لئے حیران تھا، میرے ساتھ تونس کے مفتی شیخ مختار السلامی تھے، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ شمالی افریقہ کے علاقے میں یہ رواج ہے کہ خواتین خوشی کے مواقع پر یا کسی مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لئے یہ آوازیں نکالتی ہیں، ان کو ''زغاریہ'' کہا جاتا ہے۔[1] اور یہ آوازیں خواتین ہی نکالتی سکتی ہیں یہ مردوں کے بس کا کام نہیں۔ ان آوازوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بظاہر ان کے لئے اردو میں ''چیخ'' کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کے انداز میں خوف یا رنج کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، بلکہ لہروں کے معمولی اتار چڑھاؤ سے ان میں طربیت کا اندازہ پیدا ہوجاتا ہے، شیخ سلامی نے بتایا کہ ''زغاریہ'' بہت سی عورتیں مل کر نکالتی ہیں، اس لئے ان کا منہ ہلکا سا کھلتا ہے، لیکن دیکھنے والا عموماً یہ محسوس نہیں کرتا کہ یہ آواز اس منے سے نکل رہی ہے، اور یہ اتنے تسلسل کے ساتھ نکالی جاتی ہیں کہ سانس ٹوٹنے نہیں پاتا۔

یہ ''زغاریہ'' کو سننے کا میرا پہلا تجربہ تھا، بعد میں ''الجزائر شہر اور قاہرہ میں بھی دیکھا کہ شادی کی تقریبات میں گھروں سے بار بار یہ آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

---

[1] زغاریہ: زغردۃ کی جمع ہے، یہ لفظ زغد سے نکلا ہے جو اونٹ کی مسلسل بڑبڑاہٹ کو کہتے ہیں۔ (لسان العرب ۳:۱۹۴) لسان العرب میں ''زغردۃ'' کا ذکر نہیں ہے لیکن آخر دور کی لغات میں یہ موجود ہے اور ان میں کہا گیا ہے کہ ''خوشی کے مواقع پر عورتوں کے آواز'' نکالنے'' کو کہا جاتا ہے۔

(اقرب الموارد ج ۱ ص ۴۶۶ والمنجد ص ۳۰۰)

بہر کیف! ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں دیہاتی انداز کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں الجزائر کے آزادی کے رہنماؤں کا یہ تاریخی اجتماع منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع سے پہلے اگرچہ فرانسیسی استعمار کے خلاف ملک کے مختلف حصوں میں تحریک آزادی شروع ہوگئی تھی، لیکن ان کے درمیان نہ کوئی رابطہ تھا اور نہ کسی مشترک منصوبہ بندی کا کوئی تصور تھا، چنانچہ فرانسیسی حکومت ان تحریکوں کو ''تخریب کاری'' اور ''قتل وغارت گری'' کا نام دیتی تھی۔ دوسری طرف اس نے تحریکیوں کے رہنماؤں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے تمام راستے مسدود کئے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں ان رہنماؤں کا باہم ملنا موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا۔ لیکن کچھ لوگوں نے جان پر کھیل کر اس دور افتادہ پہاڑو کی چوٹی پر اس خفیہ اجتماع کا انتظام کیا۔ اس اجتماع کے بعد یہ متفرق تحریکیں ایک مربوطہ اور متحد جہادِ آزادی کی شکل اختیار کرگئیں اور غیر ملکی طاقتوں کو بھی حریت پسندوں کی اس منظم طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس مکان کے نیچے ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹے سے جنگی طیارے کا تباہ ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فرانسیسی فوج کا وہ طیارہ ہے جو آزادی کی جدوجہد کے دوران حریت پسندوں نے پہلی بار گرایا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے جس میں تحریک آزادی کی مختلف یادگاریں اور اس دور کے بہت سے اخبارات محفوظ ہیں۔

الجزائر واپسی

بجایہ میں ایک ہفتے قیام کے بعد تمام مندوبین کو ایک چارٹرڈ فوکر طیارے کے ذریعے الجزائر لے جایا گیا۔ صبح آٹھ بجے ہم طیارے میں سوار ہوئے طیارے چونکہ چھوٹا تھا، اس لئے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ نیچی پرواز کر رہا تھا، اس کے ایک طرف الجزائر کے ساحلی سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے اور دوسری طرف بحر متوسط ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شمالی افریقہ کی اسی ساحلی پٹی پر ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عقبہ بن نافع کی

www.freepdfpost.blogspot.com

سرکردگی میں مجاہدین اسلام کے قافلے گذرے تھے۔

یہ مجاہد گھوڑوں اور اونٹوں پر مصر، لیبیا اور تیونس ہوتے ہوئے یہاں پہنچے تھے اور انہوں نے مراکش کی آخری حدود تک اسلام کا پرچم لہرا کر دم لیا۔ میرے ایک الجزئری دوست نے بتایا کہ میں ایک مرتبہ کار کے ذریعے قاہرہ تک گیا تھا، تقریباً پانچ ہزار کیلومیٹر کا یہ سفر میں نے مختلف شہروں میں آرام دہ ہوٹلوں میں رُک رُک کر کیا۔ لیکن جب قاہرہ پہنچا ہو تو تھکن کی وجہ سے لب دم آچکا تھا اور مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں پر بلکہ بعض مرتبہ پیدل بھی ان لق و دق صحراؤں اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگلوں کو قطع کرتے ہوئے اور قدم قدم پر دشمن کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے، شمالی افریقہ کی فضاؤں میں ان خدا مست بزرگوں کے عزم اور حوصلے کی نہ جانے کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں، اللہ اکبر!

عقبہ بن نافعؓ اور ان کی فتوحات:

اس علاقے کی فتح کا اصل کا سہرا حضرت عقبہ بن نافعؓ کے سر ہے، جو صحابی تو نہ تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کی ولادت سے ایک سال قبل پیدا ہوئے تھے، مصر کی فتوحات میں یہ حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد حکومت میں انہیں شمالی افریقہ کے باقی ماندہ حصے کی فتح کی مہم سونپ دی تھی، یہ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ مصر سے نکل کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے تیونس تک پہنچ گئے۔[1] اور یہاں قیروان کا مشہور شہر بسایا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جس جگہ آج قیروان آباد ہے وہاں بہت گھنا جنگل تھا، جو درندوں سے بھرا ہوا تھا۔

حضرت عقبہ بن نافعؓ نے بربریوں کے شہروں میں رہنے کے بجائے مسلمانوں

[1] سیر اعلام النبلاء ص ۵۳۳، ج ۳۔

کے لئے الگ شہر بسانے کے لئے یہ جگہ منتخب کی، تاکہ یہاں مسلمان مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی قوت بڑھا سکیں، ان کے ساتھیوں نے کہا کہ جنگل تو درندوں اور حشرات الارض سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن حضرت عقبہؓ کے نزدیک شہر بسانے کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، اس لئے انہوں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا اور لشکر میں جتنے صحابۂ کرامؓ تھے، ان کو جمع کیا، یہ کل اٹھارہ صحابہ تھے، ان کے ساتھ مل کر حضرت عقبہؓ نے دعا کی اور اس کے بعد یہ آواز لگائی:

أيتها السباع والحشرات نحن أصحاب رسول الله ﷺ ارحلوا عنا، فانا نازلون، فمن وجدناه بعد قتلناه.[1]

’اے درندے اور کیڑو! ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں، ہم یہاں بسنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے کوچ کر جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو کوئی یہاں نظر آئے گا، ہم اسے قتل کر دیں گے۔‘‘

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا؟ امام ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں۔

فلم يبق منها شيئ إلا خرج هاربا حتى إن السباع تحمل أولادها.

’’ان جانوروں میں سے کوئی نہیں بچا جو بھاگ نہ گیا ہو، یہاں تک کہ درندے اپنے بچوں کو اٹھائے لے جا رہے تھے۔‘‘

اور مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ (متوفی ۶۸۲ھ) لکھتے ہیں۔

فرأى الناس ذلك اليوم عجبا لم يروه قبل ذلك وكان السبع يحمل أشباله، والذئب أجراءه والحية اولادها، وهي خارجة سربا سربا، فحمل ذلك كثير امن البربر على الاسلام.[2]

[1] الکامل لابن الاثیر، ص ۱۸۴، ج ۳، وتاریخ الطبری، ص ۱۷۸، ج ۴۔ احوال ۵۰ھ

[2] آثار البلاد للقزوینی ص ۲۴۲۔ القیروان

www.freepdfpost.blogspot.com

''اس روز لوگوں نے ایک ایسا عجیب نظارہ دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا کہ درندہ اپنے بچوں کو اٹھائے لے جارہا ہیں، بھیڑیا اپنے بچوں کو اور سانپ اپنے بچوں کو، یہ سب ٹولیوں کی شکل میں نکلے جارہے تھے، یہ منظر دیکھ کر بہت سے بربری مسلمان ہوگئے۔''

اس کے بعد عقبہ بن نافعؓ اور ان کے ساتھیوں نے جنگل کاٹ کر یہاں شہر قیروان آباد کیا، وہاں جامع مسجد بنائی اور اسے شمالی افریقہ میں اپنا مستقر قرار دیا۔ حضرت معاویہؓ ہی کے دور میں عقبہ بن نافعؓ افریقہ کی امارات سے معزول ہوکر شام میں آباد ہوگئے تھے، آخر میں حضرت معاویہؓ نے انہیں دوبارہ وہاں بھیجنا چاہا، لیکن آپ کی وفات ہوگئی، بعد میں یزید نے اپنے عہد حکومت میں انہیں دوبارہ افریقہ کا گورنر بنایا، اس موقع پر انہوں نے قیروان سے مغرب کی طرف اپنی پیشقدمی پھر سے شروع کی اور روانگی سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا۔:

انّی قد بعت نفسی من اللہ عزّوجلّ، فلا أزال أجاهد من کفر باللہ.

''میں اپنی جان اللہ تعالیٰ کو فروخت کر چکا ہوں لہٰذا اب (مرتے دم تک) اللہ کا انکار کرنے والوں سے جہاد کرتا رہوں گا۔''

اس کے بعد انہیں وصیتیں فرمائیں اور روانہ ہوگئے[1] اسی زمانے میں انہوں نے الجزائر کے متعدد علاقے تلمسان وغیرہ فتح کئے۔ یہاں تک کہ مراکش میں داخل ہوکر اس کے بہت سے علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرایا اور بالآخر اسفی کے مقام پر، جو افریقہ کا انتہائی مغربی ساحل ہے۔ بحر ظلمات (اٹلانٹک) نظر آنے لگا۔ اس عظیم سمندر پر پہنچ کر ہی حضرت عقبہؓ نے وہ تاریخی جملہ کہا کہ:

یا ربّ لولا هذا البحر لمضیت فی البلاد مجاهد افی سبیلک

[1] کامل ابن اثیر ص ۴۲، ج ۴۔ احوال ۲۶ھ

''پروردگار! اگر سمندر حائل نہ ہوتا تو آپ کے راستے میں جہاد کرتا ہوا اپنا سفر جاری رکھتا۔''[1]

اور:

اللّٰهم اشهد انّی قد بلغت المجهود، ولو هذا البحر لمضیت فی البلاد آقاتل من کفر بک، حتی لایعبد آحد دونک.

''یا اللہ گواہ رہئے کہ میں نے اپنی کوشش کی انتہا کردی ہے اور اگر یہ سمندر بیچ میں نہ آ گیا ہوتا تو جو لوگ آپ کی توحید کا انکار کرتے ہیں میں ان سے لڑتا ہوا اور آگے جاتا، یہاں تک کہ آپ کے سوا روئے زمین پر کسی کی عبادت نہ کی جاتی۔''[2]

اس کے بعد آپ نے اپنے گھوڑے کے اگلے پاؤں اٹلانٹک کی موجوں میں ڈالے، اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ، ساتھیوں نے ہاتھ اٹھادئے۔ تو عقبہ بن نافعؓ نے یہ اثر انگیز دعا فرمائی۔

اللّٰهم انّی لم آخرج بطراء ولا آشرا، وإنکَ تعلم انما نطلب السبب الذی طلبه عبدک ذوالقرنین، وهو أن تعبد، ولا یشرک بک شیئی، اللّٰهم اننا مدافعون عن دین اسلام فکن لنا، ولا تکن علینا یاذالجلال والاکرام.[3]

''یا اللہ! میں غرور اور تکبر کے جذبے سے نہیں نکلا اور تو جانتا ہے کہ ہم اسی ''سبب'' کی تلاش میں ہیں جس کی آپ کے بندے ذوالقرنین نے

[1] کامل ابن اثیر۔ ص ۴۲، ج ۴
[2] قادۃ فتح المغرب۔ ص ۱۰۵، ج، بحوالہ ریاض النفوس ص ۲۵ ج ۱
[3] دائرۃ معارف القرن۔ فرید وجدی۔ ص ۶۵۴، ج ۸، مقالہ ''مراکش''

www.freepdfpost.blogspot.com

جستجو کی تھی اور وہ یہ کہ بس دنیا میں تیری عبادت ہو اور تیرے ساتھ کسی کو
شریک نہ کیا جائے۔ اے اللہ! ہم دین اسلام کا دفاع کرنے والے
ہیں، تو ہمارا ہو جا، اور ہمارے خلاف نہ ہو، یاذا الجلال والاکرام۔''

اٹلانٹک کے کنارے سے حضرت عقبہ قیروان جانے کے لئے واپس ہوئے، راستہ میں ایک جگہ ایسی آئی جہاں پانی کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ سارا لشکر پیاس سے بیتاب تھا، حضرت عقبہؓ نے دو رکعتیں پڑھ کر دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کے گھوڑے نے اپنے کھروں سے زمین کھودنی شروع کی، دیکھا تو ایک پتھر نظر آیا، اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلا۔

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہاں سے آگے بڑھ کر حضرت عقبہؓ نے یہ سوچ کر کہ یہ راستہ بے خطر ہے، اپنے لشکر کے بیشتر حصے کو جلد قیروان پہنچنے کے لئے آگے بھیج دیا اور خود چند سو سواروں کے ساتھ راستے کے ایک قلعے تہوذا پر یلغار کے لئے روانہ ہو گئے، خیال تھا کہ یہ مختصر نفری اس قلعے کو فتح کرنے کے لئے کافی ہوگی، لیکن قلعے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس پر ستم یہ ہوا کہ حضرت عقبہؓ کے لشکر میں کسیلہ نامی ایک بربری شخص جو بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عقبہؓ کا دشمن تھا، وہ دشمن سے مل گیا، اور لشکر کے راز دشمن پر ظاہر کر دیئے، جس کے نتیجے میں مسلمان چاروں طرف سے گھر گئے۔ حضرت عقبہؓ نے اس موقع پر اپنے ایک ساتھی ابوالمہاجر کو، جو قید میں تھے، رہا کر کے ان سے کہا کہ ''تم نے دوسرے مسلمانوں سے جا ملو اور ان کی قیادت کرو، کیونکہ میں شہادت کے لئے اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں سمجھتا۔'' لیکن ابوالمہاجر نے کہا کہ ''مجھے بھی شہادت کی تمنا ہے۔'' اور یہ دونوں اپنے ساتھیوں سمیت دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

(کامل ابن اثیر ص ۴۳، ج ۴)

چنانچہ عقبہ بن نافعؓ کا مزار الجزائر میں جنوب کی طرف کافی اندر واقع ہے،

اور وہ جگہ بھی انہی کے نام پر ''سید عقبہ'' کہلاتی ہے۔

جتنی دیر جہاز پرواز کرتا رہا، میں ان تاریخی واقعات کے تصور میں گم رہا، یہاں تک کہ شہر الجزائر نظر آنے لگا، اور چند ہی لمحوں میں جہاز بومدین ایئرپورٹ پر اتر گیا۔

مجھے جہاز کے انتظار میں دو دن ''الجزائر شہر میں رکنا پڑا۔ یہ دو روز شہر ''الجزائر'' کے مختلف مقامات کے سیاحت اور کتب خانوں کی سیر میں گذرے۔

''الجزائر'' شہر بحرِ متوسط کے کنارے فرانسیسی طرز کا شہر ہے، جدید متمدن شہروں میں اسے بہت نمایاں حیثیت تو حاصل نہیں، لیکن کافی خوبصورت اور صاف ستھرا شہر، جو جدید تمدن کی سہولت سے آراستہ بھی ہے، اور ساحل سمندر، چھوٹی پہاڑیوں اور کسی قدر سبزے کی وجہ سے قدرتی حسن سے بھی بہرہ یاب ہے، اسی شہر کے نام پر پورے ملک کو الجزائر'' کہا جاتا ہے۔ نام سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی جزائر کا مجموعہ ہوگا لیکن درحقیقت اس کی وجہ تسمیہ بعض الجزیری دوستوں نے یہ بیان کی کہ یہاں ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں چند نہایت چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جو آبادی کے لئے بھی استعمال نہیں ہو سکتے البتہ ان کو تفریح کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے ان جزیروں کی وجہ سے یہ شہر ''الجزائر'' کے نام سے مشہور ہو گیا اور اسی کی بنا طرز پورا ملک ''الجزائر'' کہلانے لگا۔

.....☆.....☆.....☆.....

الجزائر کی مختصر تاریخ

حضرت عقبہ بن نافعؓ کے ہاتھوں میں اس علاقے کی فتح کا حال تو پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت یہ سارا علاقہ مراکش سمیت صوبۂ تیونس کا ایک حصہ تھا جس کا دارالحکومت قیروان سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں سب سے پہلے مراکش میں خود مختار حکومت قائم ہوئی اور موجودہ الجزائر کے کچھ مغربی حصے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ بعد میں یہ مغربی حصے اور

www.freepdfpost.blogspot.com

الجزائر کے باقی ماندہ علاقے بنوحفص کے خاندان کے زیر قیادت متحد ہو گئے اور انہوں نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پھر بنوحفص کی حکومت بھی متحد نہ رہ سکی اور اس کے بھی متعدد ٹکڑے ہوئے۔ یہ وہی زمانے تھا جب یورپ کی عیسائی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف اپنی طاقت مجتمع کر رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے اندلس کو اپنا نشانہ بنایا اور اس پر اپنا قبضہ جمالیا۔ بعد میں افریقہ کے متعدد ساحلوں پر بھی ان کی تگ و تاز شروع ہو گئی اور یہ سارا علاقہ اپنے عدم استحکام کے باعث یورپ کی اس تگ و تاز سے خطرے میں پڑ گیا۔

اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی بڑی قوت ترکی کی خلافتِ عثمانیہ تھی۔ اور جہاں کہیں مسلمانوں کی مدد اور حمایت کی ضرورت پڑتی۔ وہی آگے بڑھ کر مدد کرتی تھی۔ اس غرض کیلئے اس کے بحری بیڑے سمندر میں گشت بھی کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک بیڑے کے قائد خیرالدین بار بروسا تھے۔ جن کے بحری مہمات مشہور معروف ہیں زوال غرناطہ کے بعد انہوں نے اپنا بیڑا الجزائر کے ساحل پر لنگر انداز کیا ہوا تھا، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ سقوطِ غرناطہ کے نتیجے میں اندلس کے مسلمانوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ہیں، اس میں ان کی مدد کی جا سکے۔ چنانچہ ان کے جہازوں نے ستم رسیدہ اندلسی مسلمانوں کو اندلس سے الجزائر منتقل کرنے میں بڑی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔

اس زمانے میں الجزائر کے مسلمان چونکہ عدم استحکام سے پریشان تھے، اندلس کا انجام ان کے سامنے تھا اور ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ یورپ کی عیسائی طاقتیں انہیں بھی نوالۂ تر سمجھ کر ان پر اپنا تسلط جمالیں۔ اس لئے الجزائر کے مسلمانوں نے خیرالدین بار برسا سے درخواست کی کہ الجزائر کو خلافتِ عثمانیہ اپنے زیر انتظام لے آئے۔ خلافتِ عثمانیہ نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ۹۴۵ھ میں اس علاقہ کا انتظام سنبھال لیا اور الجزائر باقاعدہ خلافتِ عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔

عرصہ دراز تک الجزائر میں خلافت عثمانیہ کی حکومت پورے امن و امان اور عوام کی خوشحالی کے ساتھ قائم رہی۔ ترکی حکام کا برتاؤ بحیثیت مجموعی اسلامی تعلیمات کے مطابق رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس دینی فضا میں کمزوری آنی شروع ہوئی۔ بعض متعصب گورنروں نے

سرکاری ملازمتوں میں تعصب سے کام لینا شروع کیا۔ جس سے الجزائر کے باشندے بیزار ہوئے۔ یہ گورنر خود خلافتِ عثمانیہ کے احکام کی بھی پوری پابندی نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف عوام کے دینی طرزِ عمل میں بھی انحطاط آ چکا تھا۔ اسی دور انحطاط میں خلافت عثمانیہ کی طرف سے الجزائر کا آخری گورنر حسین پاشا مقرر ہوا۔ اور اس نے اپنی حماقت اور خودسری سے الجزائر کو فرانس کی غلامی میں دھکیل دیا۔ جس کا واقعہ بھی بڑا عبرت آموز ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ الجزائر کے ایک یہودی تاجر بقری ابو جناح کے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ انہی تجارتی معاملات کے دوران فرانسیسی تاجر اس الجزائری یہودی کے مقروض ہو گئے اور جب ان سے واجب الادا رقوم کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ یہ عذر پیش کرتے کے ہم خسارے کی وجہ سے ادائیگی سے معذور ہیں۔

بقری ابو جناح نے اس سلسلے میں الجزائر کے گورنر حسین پاشا سے مدد طلب کی، حسین پاشے نے فرانس کے سفیر کو بلا کر اصرار کیا کہ رقوم کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے بالآخر گفت و شنید کے نتیجے میں فریقین کے درمیان صلح ہوئی اور طے پایا کہ فرانسیسی تجار بقری ابو جناح کو ایک خطیر رقم بطور صلح ادا کریں گے۔ مشہور یہ ہے کہ اس معاہدے کے دوران حسین پاشا کی نیت شروع سے خراب تھی، اور اس کو اس قضیے سے دلچسپی اس لئے تھی کہ وہ یہ رقم یا اس کا بڑا حصہ خود رکھنا چاہتا تھا اور اس قسم کی بدعنوانیاں اس کا معمول بن چکی تھیں۔

جب معاہدے کی رو سے رقم کی ادائیگی کا وقت آیا تو فرانس کے کچھ اور تاجروں نے بقری ابو جناح پر یہ دعویٰ کر دیا کہ ہماری خطیر رقم اس کے ذمے واجب الادا ہے اور انہوں نے اپنی حکومت کے ذریعے ایک حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ جس کے تحت بقری ابو جناح کے مقروض فرانسیسی تاجروں کو مذکورہ معاہدے کے تحت رقم کی ادائیگی سے روک دیا۔ تاکہ یہ لوگ اپنی رقم فرانس ہی میں وصول کر سکیں۔

حسین پاشا کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے فرانسیسی سفیر کو بلا کر احتجاج کیا۔ اور کہا کہ رقم کی ادائیگی معاہدے کے مطابق ہونی چاہئے۔ اور اگر دوسرے تاجروں کی رقوم

www.freepdfpost.blogspot.com

بقری ابو جناح پر واجب ہیں تو وہ مذکورہ ادائیگی کے بعد اس سے وصول کریں۔ کیونکہ دونوں معاملات الگ الگ ہیں۔ لیکن سفیر اس پر راضی نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ حسین پاشا کی بدعنوانیاں مشہور تھیں اور تاجروں کی رقم بقری ابو جناح پر واجب تھیں، ان کو اندیشہ یہ تھا کہ فرانس سے یہ رقم نکل جانے کے بعد بقری ابو جناح کے پاس نہیں پہنچے گی۔ بلکہ حسین پاشا اسے غصب کر لے گا۔ اور جب ہم بقری سے رقم طلب کریں گے تو اس کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوگا۔

جب سفیر نے حسین پاشا بات ماننے سے انکار کیا تو پاشا نے براہ راست حکومت فرانس کو خط لکھا، حکومت فرانس نے وہ خط سفیر کے پاس بھیج کر اسے جواب دینے کا حکم دیا۔ اسی دوران وہ سفیر کسی اور معاملے کے سلسلے میں حسین پاشا کے پاس آیا تو پاشا نے اس سے کہا کہ مجھے ابھی تک اپنے خط کا جواب نہیں ملا، حالانکہ دیر بہت ہو چکی ہے۔ سفیر نے کہا کہ میری حکومت نے وہ خط مجھے دینے کے لئے کہا ہے۔ حسین پاشا نے اس کی وجہ پوچھی تو سفیر نے کوئی ایسا جملہ کہہ دیا جس سے حسین پاشا کو تحقیر کی بو آئی۔ اس وقت پاشا کے ہاتھ میں پنکھا تھا، اس نے وہ پنکھا فرانسیسی سفیر کے منہ پر دے مارا۔ اور اسے باہر نکلوا دیا۔

حکومت فرانس نے اپنے سفیر کی توہین پر شدید احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ حسین پاشا سفیر سے معذرت کرے، لیکن حسین پاشا نہ مانا۔ اس وقت فرانس کی حکومت اپنے بہت سے داخلی مسائل سے دوچار تھی۔ اور متعدد محاذوں پر اسے بھی جنگ درپیش تھی، اس لئے وہ کوئی نئی جنگ مول لینا نہیں چاہتی تھی، اس لئے بالآخر اس نے یہ تجویز پیش کی کہ حسین پاشا بذات خود سفیر یا حکومت فرانس سے معذرت کے بجائے پیرس میں رہنے والے کسی بھی شخص کو اس کام کے لئے اپنا نمائندہ بنا دے کہ وہ حکومت فرانس سے اس کی جانب سے معذرت کرے۔

خلافتِ عثمانیہ کے مرکز کی طرف سے بھی حسین پاشا کو تاکید کی گئی کہ وہ اس تجویز کو قبول کر کے اس پر عمل کر لے۔ لیکن حسین پاشا اپنے ضد پر اڑا رہا اور اس نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت فرانس جنگ پر آمادہ ہوگئی۔ اور ایک طاقتور بحری بیڑے کے ذریعے اس نے الجزائر پر حملہ کر دیا۔ حسین پاشا اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور حکومت فرانس پورے الجزائر پر قابض ہوگئی اور حسین پاشا کو گرفتار کر کے پیرس بلا لیا گیا۔

بعض مؤرخین نے اس صورتِ حال کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حسین پاشا خود الجزائر کا باشندہ نہیں تھا۔ اس لئے اسے وطن کا کوئی درد نہ تھا اور اس نے ایسے اقدامات کئے جو بالآخر الجزائر کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ لیکن علامہ شیخ محمد بیرم تونسی رحمۃ اللہ علیہ جو آخری دور میں شمالی افریقہ کے بڑے مسلم الثبوت عالم تھے۔ اور علومِ دین کے علاوہ تاریخ سیاست اور جغرافیہ پر بھی ان کی نگاہ بڑی وسیع تھی۔ اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> اسلامی قومیت ایک ہی ہوتی ہے اور مشاہدے سے بھی اس بات کی تردید نہیں ہوتی ہے (کہ باہر سے آنے والے مسلمان حکمرانوں کو وطن کا درد نہیں ہوتا) تاریخ سے یہ بات ثابت ہے اور مشاہدے میں آ چکی ہے کہ باہر سے آنے والے کتنے مسلمان حکمرانوں نے اپنے زیر حکومت علاقے سے پوری وفاداری کی، اس میں حاصل ہونے والی نعمتوں پر شکر گذار رہے۔ اور اسے خوبصورت اور مستحکم بنانے میں امانت و دیانت کا پورا خیال رکھا۔ اس کے برعکس بہت سے ابناء وطن نے بالکل الٹا معاملہ کیا، لہٰذا درحقیقت کسی علاقے سے مسلمانوں کی حکومت زائل ہونے کا سبب حکمرانوں کی قومیت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ اس علاقے کے اکابر کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور اسی فسق و فجور کا ایک شاخسانہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حکومت نااہلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا قول ان کے بارے میں سچا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسے لوگوں کو مسلط فرما دیتے ہیں جو اسے تباہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قوموں کے زوال و

www.freepdfpost.blogspot.com

انحطاط کی تاریخ ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ ملکوں کے حالات پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں وہ ان کے مصائب کے فساد کو اصل سبب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خواہ وہ سبب زمانے کے اعتبار سے کتنا پرانا ہو۔

کسی ملک کا وہ آخری حکمران جس کے ہاتھوں اس ملک کا زوال ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک چھپے ہوئے مزمن مرض کی ظاہری علامت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اللہ اور اس کے بندوں کے سامنے جوابدہ ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مرض کو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اسے کم کرنے کے بجائے اس کے بحران کو بڑھایا یہاں تک کے وہ مرض امت کے لئے صاعقہ آسمانی سے زیادہ شدید ہو گیا۔ اس لئے کہ بیمار جسم ان عوارض سے بھی متاثر ہو جاتا ہے، جن سے صحت مند جسم متاثر ہوتا۔ لہٰذا چونکہ وہ حکمران شر کی علامت ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دنیا و آخرت کی رسوائی کے لئے یہ بات کافی ہے۔

لہٰذا دراصل الجزائر کا مرض اسی دن شروع ہو گیا تھا۔ جب قسطنطنیہ میں (جو خلافت عثمانیہ کا پایۂ تخت تھا) اخلاقی زوال شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں حکومتی ادارے خراب ہوئے۔ حکام میں بگاڑ پیدا ہوا اور حسین پاشا جیسے حکام کی وبا سے صرف الجزائر نہیں، ملک کے بہت سے حصے متاثر ہوئے اور وہاں ظلم و ستم، بدنظمی اور بربادی پھیل گئی۔"

(صفوۃ الاعتبار، بمستوع الأمصار ولأقطار للشیخ محمد بیرم[1] ص ۹ و ۱۰ ج ۳)

[1] صفوۃ الاعتبار شیخ محمد بیرم تونسی کا سفرنامہ ہے جو پانچ اجزاء پر مشتمل ہے اور اس میں افریقہ اور یورپ کے متعدد ممالک کے حالات انہوں نے تحریر فرمائے ہیں۔ (باقی اگلے صفحے پر)

بہرکیف ۱۲۴۶ء میں فرانسیسی استعمار نے الجزائر پر اپنے پنجے گاڑ لئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مزاحمت کی تحریکیں جاری رہیں۔ بالآخر فرانس نے سب پر قابو پا کر اپنی مستحکم حکومت قائم کر لی۔

الجزائر پر فرانس کا استعمار عالم اسلام کا بدترین استعمار ثابت ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے لئے شخصی زندگی میں بھی دین پر عمل کرنا دوبھر بنا دیا گیا۔ بہت سی مسجدیں شہید بھی کر دی گئیں۔ بہت مساجد کلیساں میں تبدیل کر دی گئی، اسلامی علوم تو کجا، عربی زبان کی تعلیم پر بھی پابندی لگائی گئی۔ عربی کے بجائے فرانسیسی زبان کو ملک کی سرکاری زبان قرار دے کر لوگوں کو مجبوری کیا گیا کہ وہ اس زبان کو نہ صرف سیکھیں اپنے تمام معاملات زندگی اسی زبان میں انجام دیں۔ لوگوں کو یہاں وسیع پیمانے پر آباد کیا گیا، یہاں تک کہ شہر الجزائر میں اکثریت عیسائیوں کی ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ کی تمام اخلاقی بیماریاں درآمد کر کے یہاں پھیلائی گئی۔ یہاں تک کہ بڑے شہروں میں مسلمان خواتین کے غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کے بہت سے واقعات ہوئے۔

لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کفیل ہے۔ جبر و تشدد کی اس فضا میں بھی کچھ اللہ کے بندے دینی علوم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے۔ انہوں نے چھپ چھپ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بہت سے لوگوں کو دینی علوم میں کمال حاصل کرنے کے لئے تونس کی جامع زیتونہ اور مصر کی جامع ازہر میں بھیجتے رہے۔

دوسری طرف ملک کے مختلف حصوں میں فرانسیسی استعمار کے خلاف جدوجہد کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہاں تک کہ تقریباً سو سوا سو سال کے بعد یہ جدوجہد ایک

(بقیہ گذشتہ سے پیوستہ:) احقر نے جتنے سفرنامے دیکھے ہیں، ان میں یہ سفرنامہ بڑی انفرادی خصوصیات رکھتا ہے اور اس میں تمام متعلقہ ممالک کے بارے میں اس قدر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی معلومات جمع ہیں۔ جو کسی اور سفرنامے میں احقر نے نہیں دیکھیں۔ الجزائر کی جو مختصر تاریخ احقر نے اوپر بیان کی ہے وہ بھی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

منظم تحریکِ آزادی کی شکل اختیار کرگئی۔اور سالہا سال کی مسلح جدوجہد اور زبردست جانی و مالی قربانیوں کے بعد ملک فرانسیسی سامراج کے تسلط سے آزاد ہوا۔

لیکن عالم اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی استعمار کے طویل زمانے میں فرانسیسی سامراج ملک میں ایسے لوگوں کی پوری ایک نسل تیار کر چکا تھا۔ جو سیاسی طور پر سامراج کے خواہ کتنے خلاف ہوں، لیکن نظری اور عملی لحاظ سے پوری طرح یورپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔اور اسی کے ذہن سے سوچنے کے عادی تھے۔آزادی کی تحریک میں جہاں ایک بہت بڑی تعداد اسلامی ذہن کے مخلص مجاہدین کی تھی۔وہاں ایک بڑا عنصر ایسا بھی تھا جس کی نظر میں آزادی کا مقصد دین کی بالادستی کو واپس لانا نہیں بلکہ صرف وطنی بنیاد پر اپنی قوم کو بیرونی حملہ آوروں سے آزاد کرانا تھا۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس تحریک نے اس حد تک تو کامیابی حاصل کرلی، لیکن آزادی کے بعد جن لوگوں نے عنانِ اقتدار سنبھالی وہ زیادہ تر دوسرے عنصر سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ملک کو ''اشتراکی جمہوریہ'' قرار دینے کا اعلان کردیا۔اور اشتراکی پالیسیوں ہی کی پیروی شروع کردی، جس کے نتیجے میں ان لوگوں کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔جنہوں نے جان و مال کی قربانیاں اس لیے دی تھیں کہ یہاں اسلام کی بالادستی قائم ہو۔

شروع شروع میں دوسری اشتراکی حکومتوں کی طرح یہاں بھی دین کے سلسلے میں قدرے سختی کی پالیسی اختیار کی گئی لیکن عوام کی اصل خواہش کو بہت دنوں تک زیادہ دبایا نہیں جاسکا۔اور رفتہ رفتہ اس معاملے میں نرمی اختیار کرنا پڑی۔اب بحمداللہ قدرے نرمی کی پالیسی پر عمل ہورہا ہے دوسری طرف عوام بالخصوص نوجوانوں میں اسلام کو ہر شعبۂ زندگی میں برسرِ کار لانے کے لئے ایک پُرجوش شعور پیدا ہورہا ہے۔اس شعور کو سختی سے دبانا بھی حکومت کے لیے مشکل ہے۔اور اسے وہ ایک سیاسی خطرہ بھی سمجھتی ہے۔اس لیے ایسی بین بین کی پالیسی پر گامزن ہے۔جس میں عالم اسلام کافی الجملہ نام بھی لیا جاتا رہے۔اور اس کی عملی زندگی کی تحریک کوئی خطرہ بھی نہ بن سکے۔یہی پالیسی عالم اسلام کی تقریباً تمام حکومتوں نے اختیار کی ہوئی ہے۔کہیں کم کہیں زیادہ۔

مجموعی تاثرات

الجزائر میں میرا قیام تقریباً ایک ہفتہ رہا۔اس مختصر مدت میں ملک کے دینی، معاشی اور معاشرتی حالات کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ تو ممکن نہیں تھا۔لیکن سرسری نگاہ میں چند تاثرات ضرور قائم ہوئے۔

(۱) ایسا لگتا ہے کہ سادہ طرزِ معیشت اور ملکی مصنوعات پر انحصار کے لیے کافی محنت کی ہے۔ضرورت سے زیادہ آرائش و زیبائش اور قر تکلفات کی طرف توجہ نہیں ہے۔اس کے بجائے ملکی مصنوعات کی سرپرستی کی پالیسی اختیار کی جارہی ہے۔الجزائر کے ایک عظیم الشان تین منزلہ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں جانا ہوا، تو بیشتر اشیاء ملک کی بنی ہوئی نظر آئیں۔ خواتین کے کپڑوں کی دکانوں پر بھی ملک کا بنا ہوا سادہ کپڑا فروخت ہورہا ہے، جو تمام تر سوتی تھا، اور خواتین اسی کو ذوق و شوق کے ساتھ خرید رہی تھیں۔بچوں کے کھلونوں کی ایک بڑی طویل و عریض دکان میں تمام تر کھلونے ملکی پلاسٹک کے بنے ہوئے بک رہے تھے۔ کوئی غیر ملکی کھلونا مجھے نظر نہیں آیا۔

پورے ملک میں پنکھے کا رواج بہت کم ہے، حالانکہ بعض جگہ گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ جن ہوٹلوں میں ہمارا قیام رہا، ان میں نہ پنکھا تھا، نہ ایئر کنڈیشنر، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ملک میں پنکھا بنانے کی کوئی فیکٹری نہیں ہے، اور غیر ممالک سے درآمد کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ادھر گرمی اتنی ناقابلِ برداشت نہیں ہوتی کہ پنکھے کے بغیر چارہ نہ ہو۔

(۲) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیہات میں ترقیاتی کام کافی ہوا ہے، چنانچہ بجایہ کے راستے میں جو بیسیوں دیہات احقر نے دیکھے، ان کی اندرونی گلیوں میں بھی کوئی مکان کچا نظر نہیں آیا۔تمام مکان پکے تھے اور مکین چہرے مہرے سے کھاتے پیتے نظر آتے تھے۔

(۳) نچلے درجے کے عوام اور زیرِ تعلیم نوجوانوں میں دینی رجحان بہت زیادہ ہے،

www.freepdfpost.blogspot.com

لیکن بڑے شہروں میں قدم قدم پر شراب خانوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ نے فضا بہت خراب کی ہوئی ہے۔ عورتیں تین قسم کی ہیں۔ ایک ٹھیٹھ قدیم انداز کی بُرقع پوش، جن کی صرف ایک آنکھ کھلی ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر عمر رسیدہ خواتین ہیں، اور ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ دوسری ایسی خواتین جن کے ہاتھ اور چہرے کے سوا سارا جسم ڈھیلے گاؤن میں ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر کالجوں کی طالبات ہیں۔ اور تیسرے بالکل مغربی انداز کے لباس اسکرٹ وغیرہ میں نیم برہنہ اور ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

سنا ہے کہ تعلیمی اداروں میں رفتہ رفتہ دوسری قسم کا لباس فروغ پا رہا ہے، اور نوجوانوں میں اپنے قدیم دینی طرزِ زندگی کی طرف لوٹنے کا رجحان کافی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رجحان کو مزید قوت اور ترقی عطا فرمائیں، اور جو لوگ اس راہ میں جدوجہد کر رہے ہیں، ان کو اپنی تائید اور نصرت سے نوازیں۔ آمین ثم آمین

.....☆.....☆.....

دوبارہ قاہرہ میں

دو روز الجزائر العاصمہ میں گزارنے کے بعد شوال ۱۴۰۶ھ کی صبح کو سات بجے الجیرین ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوئے، طیارہ چار گھنٹے شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں پر پرواز کرتا ہوا مصری وقت کے مطابق بارہ بجے کے قریب قاہرہ پہنچا، قاہرہ پہنچنے سے پہلے طیارہ سے نہر سویز اور اہرامِ مصر صاف نظر آئے۔

پاکستانی سفارت خانے کے کچھ حضرات ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے پہنچ گئے تھے، اس لیے بحمد اللہ ہوائی اڈے کے مراحل با آسانی طے ہو گئے۔ اُترنے کے بعد سب سے پہلی فکر یہ تھی کہ کسی طرح نمازِ جمعہ مل جائے، لیکن ہوائی اڈے سے باہر نکلنے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز ختم ہو چکی ہے، یہاں سعودی عرب وغیرہ کی طرح قاعدہ یہ ہے کہ نمازِ جمعہ زوال

کے فوراً بعد پڑھ لیتے ہیں، اور شہر بھر کی تمام مساجد میں تقریباً ایک ہی وقت جمعہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی ایک مسجد میں جمعہ نہ ملے تو پھر کہیں نہیں مل سکتا۔ لہٰذا ظہر پڑھے بغیر چارہ نہیں تھا۔

اس مرتبہ قیام رامسیس ہلٹن میں ہوا۔ یہ چھبیس منزلہ ہوٹل شہر کے وسط میں میدان التحریر کے قریب اور دریائے نیل کے کنارے واقع ہے۔ میرا قیام چوتھی منزل پر تھا، کمرے کا ایک دروازہ ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا۔ اور اس برآمدے سے دریائے نیل کا منظر بالکل سامنے تھا، جہاں ہر وقت کشتی رانی کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور اس کے پیچھے برج القاہرہ کی اَسّی منزلہ عمارت اور قاہرہ کی دیگر سر بفلک عمارتیں دور تک پھیلی نظر آتی تھیں۔

اگرچہ مصر میں پاکستان کے سفیر جناب راجہ ظفر الحق صاحب نے مجھے پیشکش کر دی تھی کہ وہ قاہرہ میں رہنمائی کے لئے سفارت خانے کے کسی افسر کو میرے ساتھ کر دیں گے، لیکن چونکہ احقر کے پیشِ نظر جو کام تھے، ان میں سے کسی صاحبِ ذوق مقامی عالم کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف بحمد اللہ مصر کے متعدد اہل علم سے تعارف تو ہے، لیکن اس کام کے لیے بے تکلفی کی بھی ضرورت تھی، جس کے بغیر کسی سے مدد کے لئے کہنا بھی دل کو گوارا نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر حسن عبد اللطیف شافعی جو جامعہ القاہرہ کے کلیہ دار العلوم کے پروفیسر اور اسلام آباد کی جامعۃ الاسلامیہ کے نائب صدر ہیں، ان دنوں قاہرہ ہی میں تھے، الجزائر جاتے ہوئے جب میں قاہرہ میں ٹھہرا تو وہ شہر سے باہر تھے، اس لے اُن سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، لیکن میں نے اپنا واپسی کا پروگرام اُنہیں بتا دیا تھا، چنانچہ وہ احقر کی واپسی کے منتظر تھے، اور عصر کے قریب وہ ہوٹل تشریف لے آئے، اور اللہ تعالیٰ اُنہیں جزائے خیر عطا فرمائیں کہ وہ اس کے بعد میری قاہرہ سے روانگی تک مسلسل دل و جان سے میرے ساتھ ہی رہے، اور اُن کی رفاقت میں قاہرہ کا قیام نہایت خوشگوار، مفید اور دلچسپ رہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نمازِ عصر کے بعد ان کے ساتھ قاہرہ کے اہم تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے گیا۔

روضہ اور اس کی فتح کا واقعہ

سب سے پہلے ہم روضہ پہنچے جو قاہرہ کا بڑا تاریخی محلّہ تھا، مصر کی فتح سے پہلے، بلکہ بعد بھی اُشیدیوں کے زمانے تک یہ جگہ ''جزیرۃ مصر'' کہلاتی تھی۔ کیونکہ یہ دریائے نیل کے درمیان واقع ہے، اس کے ایک طرف قاہرہ تھا، اور دوسری طرف جیزہ جس میں اہرام مصر واقع ہے، جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہٗ نے مصر کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو قبطی بادشاہ مقوقس نے قلعہ سے نکل کر اِسی جزیرے کے قلعے میں پناہ لی تھی، اور اُس تک پہنچنے کے لئے دریائے نیل پر جو پُل بنا ہوا تھا، وہ توڑ دیا تھا، تاکہ مسلمان دریا عبور کر کے جزیرہ تک نہ پہنچ سکیں، دوسری طرف اُس نے قیصرِ روم سے مدد طلب کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عقب سے اُن پر حملہ کر دے۔

ان حالات میں مقوقس نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس اپنے ایلچیوں کے ذریعے خط بھیجا کہ تم ایک طرف دریائے نیل اور دوسری طرف رومی فوجوں کے درمیان گھر چکے ہو، تمہاری تعداد بھی کم ہے اور اب تمہاری حیثیت ہمارے ہاتھوں میں قیدیوں کی سی ہے، لہٰذا اگر خیریت چاہتے ہو تو صلح کی بات چیت کے لیے اپنے کچھ آدمی میرے پاس بھیج دو۔

جب حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس یہ ایلچی پہنچے تو انہوں نے فوراً کوئی جواب دینے کے بجائے انہیں دو دن دو رات اپنے پاس مہمان رکھا، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے شب و روز کے معمولات اور اُن کے جذبات و خیالات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں، دوسری طرف جب ایلچیوں کو دیر ہوئی تو مقوقس کو خطرہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ایلچیوں کو قتل کرنا جائز نہ سمجھتے ہوں، لیکن دو روز کے بعد ایلچی حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ پیغام لے کر پہنچ گئے کہ ہماری طرف اُنہیں تین باتوں کے علاوہ کوئی چوتھی بات قابل قبول نہ ہوگی۔ (یعنی: اسلام، جزیہ یا جنگ) جو ہم پہلے بھی آپ کو بتا چکے ہیں۔

پیغام وصول کرنے کے بعد مقوقس نے ایلچیوں سے پوچھا کہ تم نے ان مسلمانوں کو کیسے پایا؟ اس کے جواب میں ایلچیوں نے کہا:

رأينا قوما الموت أحب إلى أحد هم من الحياة، والتواضع أحب إليهم من الرفعة، ليس لاحد هم في الدنيا رغبة ولانهمة، وإنما جلوسهم التراب، وأكلهم على رُكبهم، واميرهم كو احد منهم، مايعرف رفيعهم من وضيعهم، ولا السيد من العبد، وإذ حضرت الصلاة لم يتخلف عنها منهم احد، يغسلون اطرافهم بالماء، ويخشعون في صلاتهم.[1]

''ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی ہے جس کے ہر فرد کو موت زندگی سے زیادہ محبوب ہے، وہ لوگ تواضع اور انکسار کو ٹھاٹ باٹ سے زیادہ پسند کرتے ہیں، ان میں سے کسی کے دل میں..... دنیا کی طرف رغبت یا اس کی حرص نہیں ہے، وہ زمین پر بیٹھتے ہیں اور گھٹنوں کے بَل بیٹھ کر کھاتے ہیں، اُن کا امیر اُن کے ایک عام آدمی کی طرح ہے، ان کے درمیان اونچے اور نچلے درجے کے آدمی پہچانے نہیں جاتے، نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں آقا کون ہے اور غلام کون؟ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہتا، وہ اپنے اعضاء کو پانی سے دھوتے ہیں اور نماز بڑے خشوع سے پڑھتے ہیں۔''

کہتے ہیں کہ مقوقس نے یہ سن کر کہہ دیا تھا کہ ''ان لوگوں کے سامنے پہاڑ بھی آ جائیں گے تو یہ اُنہیں ٹلا کر رہیں گے، ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔'' بالآخر باہمی پیغامات کے تبادلے کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہٗ کی قیادت میں

[1] النجوم الزاہرۃ، لابن تغری بردی۔ ص:۱۱، ج:۱

www.freepdfpost.blogspot.com

دس افراد کی ایک سفارت مقوقس کے پاس بھیجی، مقوقس نے ان کو بھی روپے پیسے کا لالچ دینے کی کوشش کی، اوران کی معاشی تنگ حالی کے حوالے سے یہ یقین دلانا چاہا کہ اس کی پیشکش کو قبول کر کے مسلمان خوشحال ہو جائیں گے، لیکن اس کے جواب میں حضرت عبادہ بن صامتؓ نے جو عجیب وغریب تقریر فرمائی وہ صحابہ کرام کے ایمان ویقین، ان کے آہنی عزم وثبات دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر اور شوقِ شہادت کی بڑی اثر انگیز تصویر ہے، اس تصویر کے کچھ حصے یہ ہیں:

لیس غزونا وعدوّا ممن حارب الله لرغبة فی الدنیا، ولا حاجة للاستکثار و منها، وما یبالی أحدنا أکان لهٗ قناطیر من ذهب، أم کان لایملک الادرهما، لأن غایة احدنا من الدنیا أکلة یا کلها، یسدّبها جو عته، لیلته ونهاره و شملة یلتحفها، وان کان احدنا لایملک إلاذلک کفاه، وان کان له قنطار من ذهب أنفقهٗ فی طاعة الله واقتصر علی هذا الذی بیدهٖ ویبلغه ماکان فی الدنیا، لأن نعیم الدنیا لیس بنعیم، ورخاء ها لیس برخاء انما النعیم والرخاء فی الآخرة، بذلک أمرنا الله وامرنا به نبیّنا، وعهد إلینا الاتکون همة أحدنا فی الدنیا الامایمسک جوعته، ویسترعورته، وتکون همته و شغله فی رضاء ربه، وجهاد عدوّه.....

..... أما ماتخوّفنا به من جمع الروم وعدد هم و کثرهم، وأنّا لانقوی علیهم، فلعمری إماهذا بالذی تخوّفنابه، ولابالذی یکسرنا عما نحن فیه، ان کان ماقلتم حقا فذلک والله ارغب مایکون فی قتالهم، واشدّ لحرصنا، علیهم، لان ذلک أعذرلنا عندالله إذا قدمنا علیه إن قتلنا

عن آخرنا کان أمکن لنا من رضوانه وجنته، وما من شیئی أقرّ لأعیننا ولا احبّ إلینا من ذلک ومامنّا رجل إلا وهویدعوربه صباحا ومساء أن یرزقه الشهادة، وألایردّه إلی بلده، ولا إلی أرضه، ولاإلی أهله وولده، ویسر لاحدمنّا هم فیما خلّفه، وقد استودع کل واحد منّاربه اهله، وولده، وانما همنا ماأمامنا.

واماقولک إنا فی ضیق و شدّة من معاشنا وحالنا، فنحن فی اوسع السعة لو کانت الدنیا کلها لنا ماارادنا منها لانفسنا أکثرمما نحن فیه، فانظر الذی ترید، فبینه لنا، فلیس بیننا وبینک خصلة نقبلها منک، ولانجیبک إلیها إلاخصلة من ثلاث! فاختر أیتها شئت، ولا تطمع نفسک بالباطل، بذلک أمرنی الأمین و بها أمره أمیر المومنین، وهو عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم من قبله إلینا.

اللہ کے دشمنوں سے ہماری لڑائی اس بنا پر نہیں کہ ہمیں دنیا کی رغبت ہے، یا ہم زیادہ دنیا سمیٹنا چاہتے ہیں..... ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی شخص کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے پاس سونے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، یا اس کی ملکیت میں ایک درہم کے سوا کچھ نہیں، اس لیے ہم میں سے ہر شخص کو دنیا کی زیادہ سے زیادہ جو مقدار درکار ہے، وہ بس اتنا کھانا ہے جس سے وہ صبح وشام اپنی بھوک مٹا سکے، اور ایک چادر ہے جسے لپیٹ سکے، اگر ہم میں سے کسی کو اس سے زائد دنیا نہ ملے تو بھی اس کے لیے کافی ہے، اور اگر اسے سونے کا کوئی ڈھیر مل بھی جائے تو وہ اسے اللہ کی اطاعت ہی میں خرچ

www.freepdfpost.blogspot.com

کرے گا..... کیونکہ دنیا کی نعمتیں حقیقی نعمتیں نہیں، اور نہ دنیا کی خوشحالی حقیقی خوشحالی ہے، نعمتیں اور خوشحالی تو آخرت میں ہوں گی، اِسی بات کا ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے، یہی بات ہمیں ہمارے نبی (ﷺ) نے سکھائی ہے، اور ہمیں یہ نصیحت کی ہے کہ ہم دنیا کی اس سے زیادہ فکر میں نہ پڑیں کہ ہماری بھوک مٹ جائے اور ستر پوشی ہوجائے، باقی ہماری اصل فکر اور دُھن اپنے رب کو راضی کرنے اور اس کے دشمنوں سے جہاد کرنے کی ہونی چاہئے.....

.....اور یہ جو آپ نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے مقابلے کے لیے رومی فوجیں اکٹھی ہورہی ہیں، اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ چیز ہمیں ڈرانے والی نہیں ہے، اور نہ اس سے ہمارے حوصلے ٹوٹ سکتے ہیں۔ اگر آپ کی یہ بات واقعی درست ہے (کہ روم کا بڑا لشکر ہمارے مقابلے کے لیے آرہا ہے) تو خدا کی قسم اس خبر سے ہمارے شوقِ جہاد میں اور اضافہ ہوگیا ہے، اس لیے کہ اگر ہمارا مقابلہ اتنے بڑے لشکر سے ہوا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری جواب دہی اور آسان ہوجائے گی، اور اگر ہم میں سے ایک ایک فرد ان کا مقابلہ کرتا ہوا قتل ہوگیا تو ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی جنت کا امکان اور مضبوط ہوجائیگا، اور ہمارے لیے کوئی بات اس سے زیادہ محبت اور آنکھیں ٹھنڈی کرنے والی نہیں ہوسکتی..... ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص صبح وشام یہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے شہادت نصیب فرمائے اور اسے اپنے شہر، اپنی زمین اور اپنے اہل وعیال کے پاس واپس نہ جانا پڑے، ہم لوگ اپنے وطن میں جو کچھ چھوڑ کر آئے ہیں، ہمیں اس کی فکر نہیں، کیونکہ

ہم میں سے ہر شخص اپنے اہل وعیال کو اپنے پروردگار کی امان میں دے کر آیا ہے، ہماری فکر تو اپنے آگے پیش آنے والے حالات کے متعلق ہے۔

رہا آپ کا یہ کہنا کہ ہم اپنے معاشی حالات کے لحاظ سے تنگی اور شدت کی زندگی گزار رہے ہیں تو آپ یقین رکھیں کہ ہم اتنی وسعت اور فراخی میں ہیں جس کے برابر کوئی وسعت نہیں ہوسکتی، اگر ساری دنیا ہماری ملکیت میں آجائے تب بھی ہم اپنے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں رکھنا چاہتے جتنا اس وقت ہمارے پاس ہے۔

لہٰذا اب آپ اپنے معاملے پر غور کرکے ہمیں بتادیجئے کہ ہماری پیش کی ہوئی تین باتوں میں سے کون سی بات آپ پسند کرتے ہیں، جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تین باتوں کے علاوہ کسی اور بات پر نہ کبھی راضی ہوں گے، نہ اس کے سوا آپ کی کوئی بات قبول کریں گے، بس آپ ان تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرلیجئے، اور ناحق باتوں کی طمع چھوڑ دیجئے، یہی میرے امیر کا حکم ہے، اِسی بات کا حکم اُنہیں ہمارے امیر المومنین (حضرت عمرؓ) نے دیا ہے، اور یہی وہ عہد ہے جو اللہ کے رسول (ﷺ) نے ہمیں عطا فرمایا تھا۔"[1]

اسکے بعد حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان تین باتوں کی تشریح فرمائی۔ دین اسلام کا مفصل تعارف کرایا، اور مسلمان ہونے کے نتائج واضح فرمائے۔ مقوقس حضرت عبادہؓ کی باتیں سننے کے بعد جزیہ کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن اس کے ساتھیوں نے بات نہ مانی۔ بالآخر جنگ ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

بہرصورت یہ جزیرہ اس طرح فتح ہوا، پھر یہاں مسلمانوں نے بحری جہاز بنانے کا ایک کارخانہ لگالیا تھا، اس لیے اس کو "جزیرۃ الصناعۃ" بھی کہا جانے لگا، یہ کارخانہ مصر میں

[1] النجوم الزاہرۃ۔ ص: ۱۱۴ تا ۱۱۵۔ ج: ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

جہاز سازی کا پہلا کارخانہ تھا، جو ۵۴ھ میں بنایا گیا۔ بعد میں اخشیدیوں کے دور میں یہاں ایک باغ لگا کر اُسے ایک تفریح گاہ بنادیا گیا، اس لیے اُسے روضہ کہا جانے لگا، جو عربی میں باغ کو کہتے ہیں۔[1] بعد میں یہاں بہت سے تغیرات آتے رہے، اور یہ قاہرہ کا ایک محلّہ بن گیا۔ اور میرے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی نے بتایا کہ یہاں اہل علم میں یہ بات مشہور ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی اِسی محلے میں تھا۔

سور العیون

روضہ سے نکلے تو ہم سور العیون کے قریب سے گذرے، یہ ایک فصیل نما دیوار ہے جو دریائے نیل سے نکل کر مشرق میں قلعہ صلاح الدین تک گئی ہے، یہ دیوار سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنائی تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ نیل کا تازہ پانی اس کے ذریعہ قلعہ تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ نیل کے کنارے رہٹ لگائے گئے تھے جن کے ذریعے دریا کا پانی اس دیوار پر چڑھایا جاتا اور دیوار کے اوپر ایک نہر بنائی گئی تھی جس کے ذریعے یہ پانی قلعہ تک پہنچایا جاتا۔ اب آب رسانی کا یہ سلسلہ تو ختم ہوگیا، لیکن دیوار اب تک باقی چلی آتی ہے، اور اسے سور العیون (چشموں کی فصیل) کہا جاتا ہے۔

سلطان صلاح الدین کا قلعہ

اس سور العیون کے ساتھ ساتھ چلیں تو یہ جس قلعے پر جا کر ختم ہوتی ہے، وہ ایک قلعہ ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۷۲ھ میں بنایا تھا، اور اس کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر اختیار کیا تھا، یہ قلعہ چونکہ ایک پہاڑی پر واقع ہے، اس لیے قدیم عربی کتب میں اس کا ذکر ''قلعۃ الجبل'' کے نام سے ملتا ہے۔ اس کی فصیل کی پیمائش ستائیس ہزار تین سو ذراع ذکر کی گئی ہے۔[2] عرصۂ دراز تک یہ قلعہ مصر کے دارالحکومت کے طور پر

[1] روضہ کی پوری تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو: حسن المحاضرہ للسیوطیؒ۔ ص: ۲۲۱ تا ۲۲۸، ج: ۲

[2] النجوم الزاہرۃ۔ ص: ۵۴، ج: ۶۔ احوال ۵۶۷ھ

استعمال ہوتا رہا۔ سرکاری دفاتر اِسی قلعے میں واقع تھے۔ بعد میں محمد علی پاشا نے یہاں ایک شاندار جامع مسجد اور دوسری عمارتیں بنائیں اور یہ قلعہ فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہوتا رہا، اب اِسے سیاحوں کے لیے بھی کھول دیا گیا ہے۔

جبل المقطّم

سلطان صلاح الدینؒ کا یہ قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے، وہ ایک پہاڑ کا ٹکڑا ہے جسے ''جبل المقطّم'' کہا جاتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدس پہاڑ ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے دامن میں عبادت کیا کرتے تھے۔[1] اس کے علاوہ بعض تاریخی روایات میں حضرت لیث بن سعدؒ سے یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ علاقہ فتح کیا تو مصر کے سابق بادشاہ مقوقس نے یہاں پہاڑ ستر ہزار دینار میں خریدنے کی پیشکش کی، اور وجہ یہ بتائی کہ ہماری کتابوں میں اس پہاڑ کے بڑے فضائل مذکور ہیں، اور یہ لکھا ہے کہ اس پہاڑ پر جنت کے درخت اُگیں گے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے بذریعہ خط حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''مسلمان جنت کے درخت کے زیادہ حق دار ہیں، اس لیے یہاں مسلمانوں کا قبرستان بنادو۔'' چنانچہ اِسے قبرستان بنادیا گیا۔[2] لیکن یہ روایت استناد کے اعتبار سے مضبوط نہیں ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

امام شافعیؒ کے مزار پر:

ان تمام مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پہنچے، یہ پورا محلّہ حضرت امامؒ ہی کے نام ''حارۃ الشافعیؒ'' کہلاتا ہے، اور یہاں حضرت امام شافعیؒ کے مزار پر بڑی شاندار عمارت بنی ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک بڑی مسجد

[1] الخطط المقریزیۃ۔ ص: ۲۲۰، ج: ۲

[2] الخطط المقریزیۃ۔ ص: ۲۲۰، ج: ۲ و حسن المحاضرۃ۔ ص: ۶۷، ج: ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

بھی ہے، ہم نے نمازِ مغرب اسی مسجد میں ادا کی، اور اس کے بعد مزار پر حاضر ہوئے، ہم جیسے طالب علموں کو دن رات حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال اور آپ کی فقہی آراء سے جس قدر واسطہ رہتا ہے، اِس کی بنا پر آپ سے عقیدت ومحبت اور تعلق خاطر ایک طبعی امر ہے، عرصہ سے آپ کے مزارِ مبارک پر حاضری کا اشتیاق بھی تھا، جو بحمد للہ آج پورا ہوا۔ مزار کے مواجہہ میں کچھ دیر بیٹھ کر سرور وسکون کا ایک عجیب عالم رہا، یہ اُس فقیہ اُمت کا مزار تھا، جس کی رہنمائی اور ہدایت سے کروڑوں مسلمان فیضیاب ہوئے، اور ہو رہے ہیں، جن کی فقہ نے حنفی فقہ کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ رواج پایا، اور جن کے مقلدین چاردانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آپ یمن کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو نسبی اعتبار سے تو سادات میں سے تھا، لیکن معاشی اعتبار سے غریب تھا، والد ماجد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ چکا تھا، بچپن ہی میں آپ کی والدہ آپ کو مکہ مکرمہ لے آئیں، یہیں آپ پروان چڑھے اور علوم حاصل کئے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ پھر نجران میں آپ کو ایک سرکاری عہدہ ملا، اور وہاں عرصۂ دراز تک پوری دیانت وامانت کے ساتھ مفوضہ خدمات انجام دیتے رہے، لیکن بڑے لوگوں کے ساتھ آزمائشیں بھی زبردست پیش آتی ہیں، خلیفۂ وقت (ہارون الرشید) کو یمن کے کچھ علوی النسب افراد کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ وہ مرکز کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں، نجران کے والی نے دشمنی میں آکر حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں بھی یہ افواہ پھیلا دی کہ ان کا ان علوی افراد کے ساتھ ربط وضبط ہے۔ خلیفہ کو ان پر شبہ ہوگیا، اور اس نے ان افراد کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ کو بھی گرفتار کر کے بغداد بلا لیا۔

اس وقت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا ہارون الرشید کے دربار میں خاصا اثر ورسوخ تھا، امام شافعیؒ جب ہارون الرشید کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے دفاع میں امام محمدؒ کا حوالہ دیا کہ وہ مجھے جانتے ہیں، ہارون الرشید نے امامؒ سے اُن کے بارے

میں معلومات کیں تو امام محمدؒ نے بتایا کہ ''میں اِنہیں جانتا ہوں، وہ بڑے عالم ہیں، اور ان کی طرف جن باتوں کی نسبت کی گئی ہے وہ ان جیسے آدمی سے سرزد نہیں ہوسکتیں، اس پر ہارون الرشید نے امام محمدؒ سے کہا کہ ''انہیں اپنے ساتھ لے جائیے، تاآنکہ میں ان کے بارے میں غور کرسکوں۔'' اس طرح جتنے لوگ بغاوت کے الزام میں یمن سے لائے گئے تھے، ان میں سے صرف حضرت امام شافعیؒ بچ سکے۔

یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے، جب امام شافعیؒ کی عمر ۳۴ سال تھی۔ اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں تھیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نجران کے سرکاری عہدے کے کاموں میں مشغول ہوگئے تھے، اس واقعہ کی بدولت انہیں دوبارہ خالص علم کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ دوسرے امام محمدؒ سے اب تک صرف شناسائی ہی تھی، اب وہ باقاعدہ اُن کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اور ان کے ذریعے اہل عراق کا علم اُن کی طرف منتقل ہوا، اور اس طرح حضرت امام شافعیؒ کو اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کے علوم حاصل ہوئے۔

امام محمدؒ، امام شافعیؒ کی اتنی عزت فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ امام محمدؒ گھوڑے پر سوار ہوکر خلیفہ کے پاس جارہے تھے، راستے میں دیکھا کہ حضرت امام شافعیؒ ان سے ملنے کے لیے آرہے ہیں، یہ دیکھ کر امام محمدؒ گھوڑے سے اُتر گئے۔ اور اپنے غلام سے کہا کہ ''خلیفہ سے جاکر عذر کردو۔'' حضرت امام شافعیؒ نے کہا بھی کہ ''میں پھر کسی وقت آجاؤں گا۔ لیکن امام محمدؒ راضی نہ ہوئے اور انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف واپس ہوگئے۔

اس طرح تقریباً دو سال بغداد میں رہے اور امام محمدؒ سے استفادہ کے بعد امام شافعیؒ پھر مکہ مکرمہ واپس ہوئے اور نو سال وہاں مقیم رہے، اِسی دوران انہوں نے اصولِ فقہ کی تدوین پر سوچنا شروع کیا، پھر ۱۹۵ھ میں دوبارہ بغداد تشریف لے گئے اور وہاں اپنی کتاب ''الرسالہ'' تالیف فرمائی، اور پھر آخر حیات میں مصر کے حکمران کی دعوت پر مصر تشریف لائے اور بالآخر رجب ۲۰۴ھ میں یہیں پر وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام شافعیؒ کو خصوصی مواہب سے نوازا تھا، آپ نے سات سال کی عمر میں پورا قرآنِ شریف حفظ کرلیا تھا، اور دس سال کی عمر میں پوری

www.freepdfpost.blogspot.com

مؤطا امام مالکؒ یاد کرلی تھی۔[1] تیراندازی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، خود فرماتے تھے کہ اگر میں دس تیر ماروں تو دس کے دس ٹھیک نشانے پر لگیں گے۔ قرآنِ کریم پڑھنے کا اندازہ اس قدر سحر آفریں تھا کہ سننے والوں پر رقت طاری ہوجاتی تھی۔ خطیب بغدادیؒ نے امام شافعیؒ کے کسی ہم عصر کا قول نقل کیا ہے کہ ''جب کبھی ہم رونا چاہتے تو ایک دوسرے سے کہتے کہ آؤ، اس مطلبی نوجوان کے پاس چل کر تلاوت کریں، جب ہم اُن کے پاس پہنچتے اور وہ خود تلاوت شروع کردیتے تو لوگ ان کے سامنے گرنے لگتے، روتے روتے ان کی چیخیں نکل جاتیں اس وقت وہ تلاوت روکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ اعلیٰ درجے کی قوتِ بیان بھی عطاء فرمائی تھی، اس لیے اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء سے انہوں نے علمی مسائل میں مناظرے فرمائے، بعض مناظروں کا حال خود ''کتاب الام'' میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اخلاص کا عالم یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

ماناظرتُ أحداً، فأحببت أن اخطئ[2]

میں نے جس شخص سے بھی کبھی مناظرہ کیا، کبھی میری خواہش یہ نہیں ہوئی کہ میرے مدمقابل کی غلطی ثابت ہو۔

امام شافعیؒ کی کتابیں علم فقہ اور علم حدیث کی بنیاد ہیں، اور علم اصول کا تو انہیں بانی کہا جاتا ہے، لیکن فرماتے ہیں کہ:

وددت أن النّاس لو تعلّموا هذه الكتب، ولم ينسبوها الّي.[3]

میری خواہش یہ ہے کہ لوگ ان کتابوں کو پڑھ کر ان سے نفع اُٹھائیں، لیکن انہیں میری طرف منسوب نہ کریں۔

جس شخص کے اخلاص کا یہ عالم ہو، اُس کے علم میں برکت کیوں نہ آئے؟ اور اس کا علم چاردانگ عالم میں کیوں نہ پھیلے؟ چنانچہ بعض حضرات نے انہیں تیسری صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے۔[4] رحمۃ اللہ تعالیٰ ورحمۃ واسعۃ۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ص:۲۷، ج:۹۔ [2] آداب الشافعی ومناقبہ، لابن ابن حاتمؒ۔ص:۳۲۶۔
[3] آداب الشافعی ومناقبہ، لابن ابن حاتمؒ۔ص:۳۲۶۔ [4] تہذیب التہذیب۔ص:۲۷، ج:۹۔

حضرت لیث بن سعدؒ کے مزار پر

مسجد امام شافعیؒ کے احاطے ہی میں امام شافعیؒ کے مزار سے ذرا ہٹ کر حضرت لیث بن سعدؒ کا مزار واقع ہے، حضرت لیث بن سعدؒ بھی اونچے درجے کے ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ:

الليث أفقه من مالك، إلا ان اصحابه لم يقوموا به

لیث بن سعدؒ امام مالک سے زیادہ بڑے فقیہ ہیں، البتہ ان کے شاگردوں نے ان (کی فقہ کو محفوظ رکھنے) کا اہتمام نہیں کیا۔[1]

روایت حدیث میں بھی امام تھے، اور قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ان کے کسی شاگرد نے اُن سے کہا کہ ''ہم بسا اوقات آپ کی زبان سے ایسی احادیث سنتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔'' اس پر حضرت لیث بن سعدؒ نے فرمایا کہ ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے سینے کی تمام حدیثیں اپنی کتابوں میں لکھ لی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جتنی احادیث میرے سینے میں محفوظ ہیں، اگر میں وہ سب لکھنا چاہوں تو یہ سواری ان لکھی ہوئی کتابوں کے لیے کافی نہ ہو۔[2]

اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے ساتھ مال ودولت سے بھی نوازا تھا، کہا جاتا ہے کہ ان کی آمدنی بیس ہزار سے پچیس ہزار دینار سالانہ تک تھی، لیکن فیاضی، سخاوت اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا عالم یہ تھا کہ ساری عمر کبھی ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، بلکہ ان کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ سال کے آخر میں بعض اوقات مقروض ہوجاتے تھے۔[3]

---

[1] تہذیب التہذیب۔ص:۴۶۲، ج:۸ [2] ایضاً
[3] سیر اعلام النبلاء للذہبی۔ص:۱۵۲، ج:۸

www.freepdfpost.blogspot.com

تنبیہ فرماتے ہیں کہ وہ روزانہ تین سو مسکینوں پر صدقہ کیا کرتے تھے۔[1]

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت لیث بن سعدؒ سے کچھ پھل خریدے، خریدنے کے بعد انہیں اس کی قیمت گراں محسوس ہوئی اس لیے وہ واپس کرنے کے لیے آئے۔ حضرت لیث بن سعدؒ نے پھل واپس لے کر قیمت لوٹادی، پھر جب وہ جانے لگے تو اپنے آدمیوں سے کہا کہ انہیں پچاس دینار مزید دے دو۔ اُن کے صاحبزادے نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

اَللّٰھُمَّ غَفْرًا، إنّھم قد کانوا أمّلوا فیھا أملاً، فأحببت أن أعوّضھم من أملھم بھذا.

اللہ مجھے معاف فرمائے، ان لوگوں نے پھلوں کی خریداری میں ایک اُمید قائم کی تھی (جو پوری نہیں ہوئی) اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کی اُمید کے بدلے انہیں کوئی معاوضہ دوں۔

ایک مرتبہ ایک عورت آئی اور کہا کہ میرا بیٹا بیمار ہے، اس کے لیے تھوڑا سا شہد درکار ہے، حضرت لیث بن سعدؒ نے اسے ایک مشک بھر کر شہد دلوادیا جس میں ۱۲۰ رطل (تقریباً ۶۰ سیر) شہد تھا، وہ عورت انکار کرتی رہی کہ مجھے تو تھوڑا سا شہد چاہئے تھا، لیکن حضرت لیث بن سعدؒ نہ مانے، اور مشک اس کے گھر پہنچادی۔

آپ کی قدر و منزلت عوام و خواص میں اتنی زیادہ تھی کہ حکامِ وقت بھی آپ کے سامنے جھکتے، اور آپ کے مشوروں پر عمل کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے آپ کو مصر کی گورنری کی پیشکش کی، لیکن آپ نے عذر فرمادیا۔

آپ روزانہ چار مجلسیں منعقد فرماتے تھے، ایک مجلس، امراء حکام کے لیے ہوتی جس میں وہ لوگ آکر آپ سے اُمورِ سلطنت میں مشورہ کرتے، دوسری مجلس حدیث کے طلباء کے لیے ہوتی، تیسری مجلس فتویٰ کے لیے ہوتی جس میں لوگ آکر آپ سے مسئلے پوچھتے، چوتھی مجلس عوام کی ضروریات میں ان کی مدد کے لیے ہوتی، لوگ آکر اپنی حاجتیں بیان کرتے،

[1] سیر اعلام النبلاء للذہبی۔ ص:۱۵۸، ج:۸

اور آپ انہیں پورا کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔

حضرت لیث بن سعدؒ کی وفات ۱۵ر شعبان ۱۸۰ھ کو ہوئی، نمازِ جنازہ میں اس قدر اژدھام ہوا کہ خالد بن عبدالسلام کہتے ہیں ''میں نے ایسا جنازہ کسی کا نہیں دیکھا۔''[1]

الحمدللہ! اس جلیل القدر محدث، فقیہ اور ولی اللہ کے مزار پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوئی جن کو بعض حضرات نے ابدال میں شمار کیا ہے۔

شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کے مزار پر

حضرت امام شافعیؒ اور امام لیث بن سعدؒ کے مزارات کے آس پاس کا علاقہ ''قرافہ'' کہلاتا تھا، اور یہیں حضرت شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، یہ نویں صدی ہجری کے مشہور محدث، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے، جنہیں اپنی صدی کا مجدد بھی کہا گیا ہے۔ یہ حافظ بن حجرؒ اور علامہ ابن ہمامؒ کے شاگرد ہیں، اور علامہ ابن حجر ہیثمیؒ اور شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ جیسے حضرات کے استاذ، اور ان شخصیتوں میں سے ہیں، جن پر اہل مصر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

انہوں نے مصر میں انتہائی فقر و فاقہ کی حالت میں تعلیم حاصل کی، خود فرماتے ہیں کہ میں جامع ازہر میں علم حاصل کرتا تھا، بعض اوقات فاقے کی شدت کی بنا پر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے کھانے کو کچھ نہ مل سکا تو میں نے وضو خانے کے قریب پڑے ہوئے تربوز کے چھلکے اُٹھائے اور انہیں اچھی طرح دھویا، اور انہیں کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ بعد میں ایک ولی اللہ نے جو ایک چکی پر کام کرتے تھے، میری دیکھ بھال شروع کردی، وہ مجھے کھانے پینے کی ضروریات مہیا کردیا کرتے تھے، اور اسی زمانے میں انہوں نے مجھے بشارت بھی دی تھی کہ تم انشاء اللہ بہت دن زندہ رہو گے، اور شیخ الاسلام بنو گے، اور تمہارے شاگرد بھی تمہاری زندگی ہی میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہوں گے۔[2]

[1] سیر اعلام النبلاء۔ ص:۱۵۰، ج:۸۔ اس سے پہلے کے واقعات بھی اسی کتاب میں مذکور ہیں۔

[2] الکواکب السائرۃ للغزی۔ ص:۹۶، ۱۹۷ ج:۱

www.freepdfpost.blogspot.com

اللہ تعالیٰ نے بعد میں آپ کو واقعۃً بڑا عظیم مرتبہ عطا فرمایا، خدمت دین کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا، جس میں شیخ الاسلام کا حصہ نہ ہو، مال و دولت کا بھی یہ عالم ہوا کہ تین ہزار درہم یومیہ آمدنی ہوتی تھی۔ امام شافعیؒ کے مزار کے ساتھ جو مدرسہ تھا اس میں تدریس کا منصب اس دور میں علمی اعتبار سے سب سے بڑا منصب سمجھا جاتا تھا۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ مدتِ دراز تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس زمانے میں مصر کا حکمران ملک اشرف قاتیبائے تھا، وہ آپ کا بہت معتقد تھا، اس نے آپ کو قاضی القضاء کا عہدہ پیش کیا، آپ نے شروع میں انکار کر دیا، لیکن قاتیبائے نے اصرار کیا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ اُس نے کہا کہ ''اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے سامنے پیدل چل کر آپ کے خچر کو ہنکاتا ہوا آپ کے گھر تک لے جایا کروں۔'' بالآخر شدید اصرار کے بعد آپ نے یہ منصب قبول فرمالیا، اور عرصۂ دراز تک قضاء کی خدمت انجام دی۔

اس دوران بھی آپ قاتیبائے پر جلوت و خلوت میں تنقیدیں فرماتے، خطبہ جمعہ میں اس کی موجودگی میں اس پر نکیر فرماتے، خود فرماتے ہیں کہ ''بعض اوقات خطبے میں میری تنقید اتنی سخت ہو جاتی کہ مجھے خیال ہوتا کہ شاید اب قاتیبائے مجھ سے بات نہیں کرے گا، لیکن نماز کے بعد سب سے پہلے وہ مجھ سے ملتا، میرے ہاتھ پر بوسہ دیتا، اور کہتا ''جزاک اللہ خیراً'' ایک روز میں نے اُسے بہت سخت باتیں کہیں، یہاں تک کہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر میں نے اُس سے کہا:

واللہ یا مولانا إنما أفعل ذلک معک شفقة علیک، وسوف تشکرنی عند ربک، وإنی واللہ لا أحبّ أن یکون جسمک هذا فحمة من فحم النار.[1]

جنابِ والا! خدا کی قسم میں آپ کے ساتھ یہ معاملہ آپ پر شفقت کی بنا پر کرتا ہوں، جب آپ اپنے پروردگار کے پاس پہنچیں گے تو میرا شکر کریں گے، اس لیے کہ خدا کی قسم! مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ کا یہ جسم جہنم کا کوئلہ بنے۔''

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ۔ ص:۱۱۲، ج:۲

آخر میں نابینا ہونے کی بناء پر آپ قضاء کے منصب سے معزول ہو گئے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آخری زمانے میں بادشاہ آپ سے ناراض ہو گیا تھا، اس لیے معزول ہوئے۔ معزولی کے بعد وہ قضا کا منصب قبول کرنے پر افسوس کا اظہار فرمایا کرتے تھے، آپ کے شاگرد شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''قضاء کا منصب قبول کرنا میری غلطی تھی'' اس لیے کہ میں پہلے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا تھا، اس کی وجہ سے لوگوں میں شہرت ہو گئی۔'' اس پر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! میں نے بعض اولیاء سے سنا ہے کہ شیخ کے منصب قضاء نے ان کے حالات پر پردہ ڈال دیا ہے، لوگوں میں اُن کے زہد و ورع اور مکاشفات کی شہرت ہونے لگی تھی۔'' اس پر شیخ نے فرمایا: ''الحمدُ! بیٹے تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔''[1]

آپ نفلی صدقات کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ نہ جانے کتنے حاجت مند افراد کے روزینے مقرر تھے، لیکن صدقہ میں ہمیشہ اخفاء کا اہتمام فرماتے، اگر حاجت مند افراد میں سے کوئی ایسے وقت آ جاتا جب اور لوگ بھی بیٹھے ہوتے تو اس سے فرما دیتے کہ ''پھر آنا'' یہاں تک کہ لوگوں میں مشہور یہ تھا کہ آپ صدقات کم دیتے ہیں۔[2]

حضرت شیخ الاسلامؒ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی، آخر میں نابینا بھی ہو گئے، لیکن آخر وقت تک درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ذکر و عبادت کا سلسلہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ ان کی مدح فرماتے ہیں:

أحد أرکان الطریقین، الفقه والتصوف، وقد خدمته عشرین سنته، فما رأیته قط فی غلة، ولا اشتغال بما لا یعنی، لا لیلا ولا نهارا، وکان رضی اللہ عنه مع کبر سنّه یصلی سنن الفرائض قائما، ویقول: لا أعوّد نفسی الکسل[3]

[1] الطبقات للشعرانیؒ۔ ص:۱۱۲، ج:۲

[2] الکواکب السائرۃ۔ ص:۲۰۲، ج:۱

[3] الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ۔ ص:۱۱۱، ج:۲

www.freepdfpost.blogspot.com

وہ فقہ اور تصوف دونوں طریقوں کے ستون تھے، میں نے بیس سال آپ کی خدمت کی اس پورے عرصے میں میں نے کبھی آپ کو غفلت میں نہیں دیکھا نہ کسی فضول کام میں مشغول پایا، نہ دن میں، نہ رات میں، اور آپ بڑھاپے کے باوجود فرائض کی سنتیں ہمیشہ کھڑے ہو کر ادا کرتے، اور آپ فرماتے کہ میں اپنے نفس کو سُستی کا عادی بنانا نہیں چاہتا۔

کوئی شخص آپ کے پاس آ کر لمبی بات کرتا تو فرماتے! ''جلدی کرو، تم نے ایک زمانہ ضائع کر دیا ہے۔'' اور علامہ شعرانیؒ ہی فرماتے ہیں کہ میں آپ سے کوئی کتاب پڑھتا تو بعض اوقات کتاب کا کوئی لفظ درست کرنے کے لیے بیچ میں ذرا سا وقفہ ہو جاتا، آپ اس وقفے کو بھی ضائع نہ فرماتے، اور اس وقفہ میں آہستہ آہستہ ''اللہ، اللہ'' کے ذکر میں مشغول ہو جاتے۔[1]

آپ نے مختلف علوم وفنون میں چالیس سے زائد عظیم الشان تالیفات چھوڑی ہیں۔ جن میں فقہ شافعیؒ کی ''أسنی المطالب'' اور ''شرح البہجہ'' بہت مشہور ہوئیں اور آج تک فقہ شافعیؒ کا مستند مأخذ شمار ہوتی ہیں۔ حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے معاصرین کی تعریف میں بہت محتاط بزرگ ہیں، لیکن آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بيننا أنسة زائدة، ومحبة من الجانبين تامة، ولا زالت المسرات و اصلةً إلّي من قبله بالدعاء والثناء و إن كان ذلك دأبه مع عموم الناس، فحظى منه أوفر."[2]

ہمارے درمیان جانبین سے بہت محبت اور اُنس ہے، ان کی طرف سے مجھے مسلسل دعا اور تعریف کے کلمات سے مسرت حاصل ہوتی رہتی ہے، اگرچہ ان کا سبھی لوگوں سے معاملہ ایسا ہی ہے۔ لیکن میرا حصہ ان کے یہاں بہت زیادہ ہے۔

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ۔ ص:۱۱۱، ج:۲

[2] الضوء اللامع للسخاویؒ۔ ص:۲۳۷، ج:۳

علامہ ابن العمادؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ تلامذہ اس قدر وسیع تھا کہ ان کے عہد میں کوئی عالم ایسا نہ تھا جس نے آپ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلمذ کا شرف حاصل نہ کیا ہو، بلکہ آپ کی سند چونکہ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عالی تھی، اس لیے لوگ کوشش کر کے آپ سے تلمذ حاصل کرتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے زبانی بلاواسطہ علم حاصل کیا، پھر ایسے لوگوں سے بھی علم حاصل کیا جن کے اور شیخ الاسلامؒ کے درمیان سات واسطے تھے، یہ خصوصیت کسی اور عالم کو حاصل نہیں ہوئی۔[1]

فسطاط کا علاقہ

امام شافعیؒ کے مزار کے پاس مصر کا بڑا عظیم الشان مدرسہ تھا، جس میں بڑے جلیل القدر اہل علم پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں، اب بھی یہاں درس اور ذکر کے کچھ حلقے ہوتے ہیں، لیکن باقاعدہ مدرسہ کی شکل باقی نہیں رہی، جب ہم مزارات سے فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو مسجد میں ذکر بالجہر کا ایک حلقہ ہو رہا تھا، لیکن اب یہ چیزیں رسوم کی حد تک باقی رہ گئی ہیں، اتباعِ سنت کا اہتمام جو ذکر و عبادت کی روح ہے، خال خال ہی کہیں نظر آتا ہے۔ فإلى الله المشتكى۔

ڈاکٹر شافعیؒ نے..... جو احقر کے رہنما تھے۔ بتایا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار بھی واقع ہے، لیکن راستہ ایسا ہے کہ گاڑی وہاں نہیں جا سکتی، پیدل چلنے کے لیے بھی جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں اور اندھیرا بھی ہوگا۔ لیکن اتنے قریب آ چکنے کے بعد ایک جلیل القدر صحابیؓ کے مزار پر حاضر نہ ہونا کفرانِ نعمت تھا، احقر نے وہاں حاضری کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے جامع شافعیؒ سے ایک صاحب کو بطور رہنما ساتھ لیا اور ان کی رہنمائی میں ہم چل پڑے۔ یہ پورا علاقہ آج کل کی تمدنی زبان میں ''پسماندہ'' علاقہ

[1] شذرات الذہب، لابن العمادؒ۔ ص:۱۳۵، ج:۸

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے، مکانات کچے پکے، راستے ٹوٹے پھوٹے، جگہ جگہ تنگ و تاریک گلیاں۔ لیکن مجھے یہ علاقہ وسط شہر کے ترقی یافتہ علاقوں سے زیادہ محبوب معلوم ہوا، اوّل تو اس لئے کہ یہاں لوگوں میں وسط شہر کے مقابلے میں تدین کا زیادہ غلبہ نظر آیا، اور قدیم روایتی اخلاق کی ایک جھلک محسوس ہوئی، دوسرے اس لیے کہ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ قاہرہ کا قدیم ترین علاقہ ہے، اور فسطاط کا شہر اِسی قرب و جوار میں واقع تھا۔

فسطاط کا نام آتے ہی قلب و ذہن میں ماضی کے واقعات کی ایک فلم چلنے لگی، کیونکہ یہ شہر صحابہ کرامؓ کا بسایا ہوا تھا۔

دراصل آج جس جگہ قاہرہ واقع ہے، تاریخ میں یہاں یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان شہر آباد رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں موجودہ قاہرہ کا مغربی علاقہ فرعونوں کا پایۂ تخت تھا، لیکن اس وقت یہ شہر منف کہلاتا تھا اور دریائے نیل کے مغربی کنارے کی طرف آباد تھا۔ اور یہ وہی جگہ ہے جو آج جیزہ کہلاتی ہے، اور جہاں اہرامِ مصر واقع ہے، منف کا یہ شہر صدیوں آباد رہا، لیکن بخت نصر کے حملے میں یہ تاخت و تاراج ہو کر ویران ہو گیا۔

بعد میں سکندر مقدونی نے جب ملک مصر فتح کیا تو اپنا پایۂ تخت اس علاقے کے بجائے بحر روم کے ساحلی علاقے کو بنایا، وہاں ایک نیا شہر بسایا جو آج تک سکندریہ کے نام پر اسکندریہ کہلاتا ہے۔ اسکندریہ بھی صدیوں تک مصر کا پایۂ تخت رہا اور جس وقت حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر پر حملہ کیا، اس وقت تک مقوقس کا دارالحکومت اسکندریہ ہی تھا۔[1] اور جس جگہ آج قاہرہ آباد ہے، وہاں کوئی بڑا شہر موجود نہ تھا، بلکہ ایک فوجی قلعہ تھا۔ جو حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے رفقاء نے مصر کے چند ابتدائی علاقے فتح کرنے کے بعد اس قلعے کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ چھ مہینے جاری رہا، اس پورے عرصے

[1] دیکھئے الخطط المقریزیۃ۔ ص:۲۲۶، ج:۱

میں قلعہ پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہ نکلا، بالآخر چھ ماہ گزرنے کے بعد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے قلعے کے ایک حصے میں پاؤں رکھنے کی کوئی گنجائش دیکھی تو قلعے کے اس حصے پر ایک سیڑھی نصب کر دی، اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

إنّی أهب نفسی للّٰه عزّوجل، فمن شاء ان یتبعنی فلیفعل

میں اپنی جان اللہ کو ہدیہ کرتا ہوں، جو میرے پیچھے آنا چاہے آ جائے۔

یہ کہہ کر حضرت زبیرؓ نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کیا، آپؓ کے پیچھے اور بھی متعدد حضرات سیڑھی پر چڑھنے لگے، یہاں تک کہ سب سے پہلے حضرت زبیرؓ قلعے کی فصیل پر پہنچ گئے، دوسرے حضرات کو حوصلہ ہوا، اور انہوں نے مزید سیڑھیاں لگا کر چڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی اور مقوقس نے بھاگ کر جزیرہ کے قلعے میں پناہ لی، جس کا واقعہ روضہ کے تعارف میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ علامہ حمویؒ نے لکھا ہے کہ یہ سیڑھی جو حضرت زبیرؓ نے قلعے پر چڑھنے کے لیے استعمال فرمائی تھی، ۳۹۰ھ تک سوق وردان کے ایک گھر میں محفوظ تھی، پھر ایک آتشزدگی کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔[1]

اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا خیمہ قلعے کے سامنے نصب فرمایا تھا۔ پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو اس خیمے کو اُکھاڑ کر ساتھ لے جانا چاہا، لیکن جب اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیمے کے اوپر کی جانب ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں، اور ان پر بیٹھی ہے، خیمہ اُکھاڑنے سے یہ انڈے ضائع ہو جاتے، اس لیے حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اس کبوتری نے ہمارے خیمے میں پناہ لی ہے، اس لیے خیمے کو اس وقت تک باقی رکھو، جب تک یہ بچے پیدا ہو کر اُڑنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ خیمہ باقی رکھا گیا، اور حضرت عمرو بن العاصؓ چند افراد کو وہاں چھوڑ کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسکندریہ کی فتح میں بھی چھ مہینے لگے، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی تو حضرت

[1] معجم البلدان للحمویؒ۔ ص:۲۶۲، ج:۴، "فسطاط"

www.freepdfpost.blogspot.com

عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ کو اپنا مستقر بنانے کے لیے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب فرمائی۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جواب میں لکھا کہ ''مسلمانو! کوئی ایسی جگہ اپنا مستقر نہ بناؤ۔ جہاں میرے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی دریا یا سمندر حائل ہو۔'' ظاہر ہے کہ اسکندریہ کو مستقر بنایا جاتا تو بیچ میں دریا حائل ہوتا، اس لیے حضرت عمرو بن عاصؓ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کہ ''ہم کس جگہ کو اپنا مستقر بنائیں؟ اس پر بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ:

نرجع ایها الأمیر إلی فسطاطک، فنکون علی ماء وصحرا

''جناب امیر! ہمیں اِسی جگہ جانا چاہیے، جہاں آپ کا خیمہ نصب ہے، وہاں پانی (دریائے نیل) ہمارے قریب بھی ہوگا اور ہم صحرا میں بھی ہوں گے۔''

چنانچہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس مشورے کو قبول فرمایا، اور اِسی جگہ واپس تشریف لے آئے جہاں خیمہ نصب تھا، اور یہاں مسلمانوں کا ایک شہر آباد کیا، اس وقت تک شہر کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا، اس لیے لوگ چند روز تک پتہ بتانے کے لیے اِسی فسطاط (خیمے) کا حوالہ دیتے رہے کہ ''میری جگہ فسطاط کے دائیں جانب ہے۔'' کوئی کہتا کہ ''میری جگہ فسطاط کے بائیں جانب ہے۔'' ہوتے ہوتے اس شہر کا نام ہی فسطاط مشہور ہوگیا، اور یہ مصر میں مسلمانوں کا پایۂ تخت قرار پایا۔[1] اور صدیوں تک اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بنا رہا۔ یہ شہر دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر آباد تھا۔

پھر ۳۵۸ھ میں اخشیدیوں کے دورِ حکومت میں فاطمی بادشاہ معزلدین اللہ نے اپنے ایک غلام جوہر کے ذریعے فسطاط پر حملہ کیا اور اُسے اپنے زیرنگیں لے آیا، فسطاط کے باشندوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ صلح کی کہ وہ ان کے ساتھ شہر فسطاط میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ جوہر نے اس شرط کی پابندی کرتے ہوئے فسطاط سے باہر نکل کر

[1] معجم البلدان للحموی۔ ص:۲۶۳، ج:۱۴۔ والخطط المقریزیۃ۔ ص:۶۰، ج:۲

قیام کیا، اور وہاں ایک قلعہ بنایا اور اس قلعہ کا نام ''القاہرۃ'' رکھا، یہ قلعہ فاطمیوں کے دور میں سرکاری دفاتر اور اُمراء کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، لیکن عام سکونتی شہر فسطاط ہی تھا، لیکن جب سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومت آئی تو انہوں نے ''قلعہ القاہرۃ'' کو عام سکونت کے لیے کھول دیا اور خود ''قلعہ الجبل'' میں رہنے لگے جس کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، اس وقت سے قاہرہ باقاعدہ سکونتی شہر بن گیا۔[1] یہ شہر فسطاط کے شمال مغرب میں دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر آباد تھا، یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری میں فسطاط کا شہر آتشزدگی وغیرہ کی بنا پر تباہ ہوگیا، اور صرف قاہرہ باقی رہ گیا جو اب تک چلا آتا ہے، اور اب اس نے وسعت اختیار کر کے نہ صرف فسطاط کے علاقے بلکہ جزیرہ، جیزہ اور فرعون کے دور کے منف کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

بہرکیف! حضرت امام شافعیؒ کے مزار سے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار تک جانے کے لیے بیشتر اِسی علاقے سے گذرنا ہوا جہاں کبھی فسطاط آباد تھا، یہاں قدامت کے آثار قدم قدم پر نمایاں ہیں، بہت سے پرانے گھر ویران پڑے ہیں، جگہ جگہ احاطے ہیں، جن میں قبرستان بنے ہوئے ہیں، نہ جانے یہ علاقہ کتنے علماء، فقہاء، محدثین، کیسے کیسے اولیاء اللہ اور مجاہدین کا مرکز رہا ہوگا، میں ان ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چلتا رہا، اور چشم تصور یہاں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ رہنما نے ایک چھوٹی سی مسجد کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا جس کے آس پاس ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اِسی مسجد کے ایک حصے میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، وہاں سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔

[1] الخطط المقریزیۃ۔ ص:۱۴۹، ج:۲

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہٗ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہٗ مشہور صحابہ اکرامؓ میں سے ہیں، آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو انہوں نے آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی، اور اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ ہی میں مقیم ہو گئے، اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزوات میں حصہ لیا۔ آپ کا شمار فقہاء صحابہؓ میں ہے، خاص طور پر میراث کے علم میں مشہور تھے، اور قرآنِ کریم کی تلاوت انتہائی دلکش انداز میں فرمایا کرتے، آپ نے اپنے ہاتھ سے قرآنِ کریم کا ایک نسخہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ اب تک مصر میں موجود ہے، اور اس میں سورتوں کی ترتیب مصحفِ عثمانی کی ترتیب سے مختلف ہے، اور اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے: ''وکتبہ عقبۃ بن عامر بیدہ''

آنحضرت ﷺ کے بعد بھی آپ جہاد میں مشغول رہے، دمشق کی فتح میں بھی شامل تھے، بلکہ حضرت عمرؓ کو فتح دمشق کی خوشخبری انہوں نے ہی سنائی تھی، مشاجراتِ صحابہؓ کے دور میں آپ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے۔ جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ ہی کی طرف سے حصہ لیا۔ بالآخر حضرت معاویہؓ نے آپ کو مصر کا گورنر بنا دیا تھا۔[1]

آپ سے بہت زیادہ حالاتِ زندگی کتابوں میں نہیں ملتے۔ البتہ آپ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ آپ کا مزار جس جگہ واقع ہے، یہ وہی جگہ ہے، جس کے بارے میں ''قلعہ صلاح الدین'' کا تعارف کراتے ہوئے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ ''جبل المقطم'' کا ایک حصہ تھی، اور حضرت عمرؓ نے اسے قبرستان بنانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ یہاں بہت سے صحابہ کرامؓ مدفون ہیں۔

لیکن ان حضرات کے مزارات کا یا تو نام ونشان باقی نہیں رہا، یا انہیں جاننے والے ختم ہو گئے۔[1]

[1] ان حالات کیلئے ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب۔ ص: ۲۴۲، ۲۴۳، ج: ۷۔ واسد الغابہ۔ ص: ۴۱۷، ج: ۳

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہٗ کے مزار کی زیارت کے بعد ہم واپس ہوٹل آ گئے۔ مصر میں پاکستان کے سفیر جناب راجہ ظفر الحق صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا، تھوڑی دیر میں اُن کی گاڑی پہنچ گئی۔ اور اُن کے مکان پر جانا ہوا۔ یہ شاندار مکان جو ماشاء اللہ پاکستان کی ملکیت ہے، اور سفیر پاکستان کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، دریائے نیل کے کنارے شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں واقع ہے جو ''گارڈن سٹی'' کہلاتا ہے۔

راجہ صاحب سے کھانے پر دیر تک گفتگو رہی، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، انہوں نے یہاں آنے کے بعد مختصر مدت میں یہاں کے علمی حلقوں میں بڑی ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کر لی ہے، بہت سے ملکوں میں ہماری سفارت بڑی کمزور ہے، اور اپنے سفارتی مشنوں کی بے عملی دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے، لیکن ماشاء اللہ راجہ صاحب بڑے فعال اور نشیط ہیں، اور ان کی فرضِ شناسی سے بحمد للہ یہاں پاکستان کے تعارف اور اس کے مؤقف کی وضاحت میں بڑی مدد ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ملک وملت کی مزید خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین

دریائے نیل:

راجہ صاحب کے مکان سے واپسی کے بعد طبیعت میں معمولی ثقل سا تھا، اس لئے میں ہوٹل سے اُتر کر چہل قدمی کے لیے دریائے نیل کے کنارے چلا گیا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ دریا کے دونوں طرف بنی ہوئی عمارتوں کی رنگ برنگ روشنیاں نیل کے پانی میں منعکس ہو کر ایسے ایسے رنگ پیدا کر رہی تھیں، جن کے لیے انسانی لغت نے الگ نام وضع نہیں کئے۔ دریا پر بنے ہوئے خوبصورت پل پر کاروں کی مخالف سمتوں سے دوڑتی ہوئی روشنیوں سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے نیل کے دونوں کنارے سونے کی گیندیں ایک دوسری کی طرف پھینک رہے ہوں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ تاریخی دریا قوموں کے عروج و زوال کی نہ جانے کتنی داستانیں اپنی لہروں میں چھپائے ہزار ہا سال سے اِسی طرح بہہ رہا ہے، صحیح احادیث میں اس کو ''جنت کا دریا'' کہا جاتا ہے، اور معراج کی شب جب نبی کریم ﷺ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو آپ نے اُس کی جڑ میں دو کھلے ہوئے اور دو چھپے ہوئے دریا دیکھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے سوال پر بتایا کہ یہ کھلے ہوئے دریا نیل اور فرات ہیں۔[1]

"سیحان، جیحان، والفرات، والنّیل کل من أنهار الجنة."[2]

''سیحان، جیحان، فرات اور نیل جنت کے دریا ہیں۔''

ان دریاؤں کے ''جنت کے دریا'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، علماء کرام نے اس کی متعدد تشریحات کی ہیں۔[3] لیکن الفاظِ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے، اور اکثر علماء نے اُس کی یہی تشریح کی ہے کہ ان دریاؤں کا اصل سرچشمہ جنت ہی کا کوئی دریا ہے، رہی یہ بات کہ جنت کے ساتھ ان دریاؤں کے رابطے کی صورت کیا ہے؟ یہ نہ کوئی جانتا ہے، نہ اِسے حدیث میں بیان کیا گیا، اور نہ اس تحقیق میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہے۔

لیکن اتنی بات واضح رہے کہ دریائے نیل کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جن کی بناء پر وہ دنیا کے دوسرے دریاؤں سے واضح طور پر ممتاز ہے۔

۱۔ یہ اپنے طول کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے، جو چار ہزار میل میں پھیلا ہوا ہے۔[4]

۲۔ اکثر و بیشتر دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں، لیکن یہ دریا جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے۔[5]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، حدیث نمبر ۳۸۸۷

[2] صحیح مسلم، کتاب الجلسہ۔ ص: ۲۸۰، ج: ۴

[3] ملاحظہ ہو: فتح الباری۔ ص: ۲۱۴، ج: ۷، کتاب المناقب

[4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ ص: ۴۵۱، ج: ۱۶، مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ ''NILE''

[5] الخطط المقریزیہ۔ ص: ۱۱۲، ج: ۱

۳۔ یہ بات ہزار ہا سال تک محققین کے لیے ایک معمہ بنی رہی ہے کہ اس کا منبع کہاں ہے؟ علامہ مقریزیؒ نے ''الخطط'' میں اس عنوان پر بارہ صفحات لکھے ہیں، اور اس میں مختلف آراء اور روایات ذکر کی ہیں۔ جن سے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کے منبع کی دریافت کی صدیوں طویل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

بالآخر اب جو نظریہ مقبولِ عام ہے وہ یہ کہ دریا یوگنڈا کی جھیل وکٹوریہ سے نکل رہا ہے۔ لیکن برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ یہ بات اس معنی میں تو درست ہے، کہ وکٹوریہ جھیل پانی کا وہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جہاں سے نیل نے اپنے چار ہزار میل لمبے سفر کا آغاز کیا ہے، لیکن اگر منبع سے مراد سرچشمہ لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وکٹوریہ جھیل کا پانی کہاں سے آ رہا ہے؟ وکٹوریہ کو پانی مہیا کرنے والے ذرائع متعدد ہیں، ان میں سے اب تک کاجیرا کی وادی کو نیل کا آخری سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کے سروے کا کام پوری طرح مکمل نہیں ہو سکا۔ اِسی لیے مقالہ نگار کے الفاظ ہیں:

''جغرافیائی تحقیق کے مسائل میں نیل کے منبع کے مسئلے کے سوا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس نے اتنے طویل عرصے تک انسانی تصورات پر اتنی شدت کے ساتھ اثر ڈالا ہو''[1]

اگر انسان اتنی ہزار سال کی تحقیق اور ریسرچ کے بعد دنیا ہی میں اس دریا کا آخری سرا سو فیصد یقین کے ساتھ دریافت نہیں کر سکا تو صادق و مصدوق ﷺ نے جنت کے ساتھ اس کے جس رابطے کی نشان دہی فرمائی ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک سراغ کون لگا سکتا ہے؟

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ حوالہ بالا۔ ص: ۴۵۵، ج: ۱۶

www.freepdfpost.blogspot.com

اگلے دن صبح کو ڈاکٹر شافعی صاحب کی معیت میں قاہرہ کے مختلف کتب خانوں کی سیر میں وقت گذرا، مصر عربی دینی کتب کی اشاعت کا بڑا عظیم مرکز رہا ہے، اور وہاں سے ہر دینی موضوع پر اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں کے کتب خانے اپنی ماضی کی روایات کھوتے جا رہے ہیں۔ اُن شہرۂ آفاق کتب خانوں میں جانا ہوا جنہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں، لیکن اب ان کی مطبوعات کا ذخیرہ بہت کم ہے، دار المعارف جیسا ادارہ جس نے ماضی میں گرانقدر علمی کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے، اب زیادہ تر ناول اور افسانے شائع کر رہا ہے اور اس کی قدیم مطبوعات نایاب ہو چکی ہیں۔ تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی مصر علمی کتابوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ ''عیسیٰ البابی''، ''مصطفےٰ البابی'' اور ''محمد علی صبیح'' جن کا نام ہمیشہ کتابوں پر پڑھتے آئے تھے، ان کے مراکز میں جانا ہوا، ظاہری اعتبار سے ان کتب خانوں کی حالت اتنی خستہ ہے کہ وہ دیکھنے میں کباڑ خانے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ڈھونڈنے والے کے پاس وقت ہو اور وہ ریت مٹی کی پرواہ کئے بغیر ان کی الماریوں میں گھس جائے تو اسے اب بھی بہت سے گوہر نایاب ہاتھ آ جاتے ہیں۔ چنانچہ بحمد اللہ بہت سی وہ نادر کتابیں جن کی عرصے سے تلاش تھی، ان کتب خانوں سے مل ہی گئیں۔

جامعۃ الازہر میں

دن کے ساڑھے گیارہ بجے شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لیے کتب خانوں کا کام بیچ میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے جامعہ الازہر اور اس سے ملحقہ دفاتر میں جانا پڑا۔

جامعۃ الازہر اب تو ایک بڑی عظیم الشان یونیورسٹی ہے جس کے تحت بہت سے کلیات اور مدارس کام کر رہے ہیں، لیکن اس کا اصل آغاز اُس تاریخی مسجد سے ہوا

تھا جو ازہر یونیورسٹی کے ساتھ ہی واقع ہے اور ''جامع الازہر'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک شاندار مسجد ہے جو ۳۶۱ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ جب معز الدین اللہ کے غلام جواہر الکاتب نے قاہرہ آباد کیا تو اس نے یہ مسجد بنائی تھی، اور یہ مشہور تھا کہ اس کی تعمیر میں کوئی ایسا طلسم رکھا گیا ہے جس کی بنا پر اس عمارت میں کوئی چڑیا، کبوتر اور کوئی پرندہ نہیں رہ سکتا۔ بعد میں حاکم بامر اللہ نے اس عمارت کی تجدید کی اور اس کے لیے بہت سے اوقاف مخصوص کئے۔

(حسن المحاضرۃ السیوطیؒ۔ ص:۱۵۴، ۱۵۵، ج:۱)

بہر کیف! یہ قاہرہ کی (فسطاط کی نہیں) قدیم ترین مسجد ہے، اور چونکہ اس دور میں رواج یہ تھا کہ بڑی بڑی مسجدوں ہی میں حلقہ درس قائم ہوتے تھے، اور باقاعدہ مدرسے کی شکل بن جاتی تھی، اس لیے یہ مسجد صدیوں تک ایک عظیم دینی درس گاہ کی خدمات انجام دیتی رہی، جس میں بڑے بڑے علماء نے علم حاصل کیا، اور درس دیا۔

چنانچہ اس مدرسے کی شہرت کی بناء پر طلبہ اطرافِ عالم سے آنے لگے تھے۔ اس لئے آخری دور میں اِسی مسجد کے قریب الگ عمارتیں تعمیر کر کے اسے بیسویں صدی کی ایک یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی، اب تعلیم ''جامع الازہر'' میں نہیں بلکہ ''جامعۃ الازہر'' میں ہوتی ہے۔ اور ''جامع الازہر'' ایک تاریخی مسجد کی حیثیت میں باقی رہ گئی ہے۔

ازہر نے ماضی میں بڑے جلیل القدر علماء پیدا کئے اور اس صدی کے آغاز تک اس نے بے دینی کے سیلاب پر بند باندھنے میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کا تسلط ہوتا گیا جو مغربی افکار کے سامنے شکست خوردہ اور معذرت خواہانہ طرزِ فکر کے حامل تھے۔ اگرچہ ازہر ہی سے ہمیشہ ایسے متصلب اور راسخ العلم حضرات بھی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس طرزِ فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن پہلے گروہ کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لئے وہ ازہر پر چھاتا گیا، یہاں تک کہ اس درس گاہ کا پختہ دینی رنگ ماند پڑ گیا۔ اس کا اثر سب سے پہلے یہاں کی عام عملی فضاء پر پڑا اور زندگی کے ہر شعبے میں اتباعِ سنت کا وہ اہتمام جو کسی دینی درسگاہ کی سب سے قیمتی متاع ہے، رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا۔ علم و تحقیق میں بھی انحطاط آیا، لیکن اس میدان میں پھر بھی ازہر نے کسی درجہ اپنا معیار باقی

www.freepdfpost.blogspot.com

رکھا ہے، مگر اب یہ علم و تحقیق ایک خشک علم و تحقیق ہے، جس میں جذبہ عمل کی جان شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے، طلبہ اور اساتذہ پر معاملات اور اخلاق میں دین کی عملداری پہلے ہی کم رہ گئی تھی، اس کے بعد عبادات کا اہتمام بھی کمزور پڑا، وضع قطع تبدیل ہونے لگی، چہروں پر سے داڑھیاں گھٹتے گھٹتے بے نشان ہوگئیں، سروں پر عمامے اور جسموں پر جبے باقی رہ گئے تھے بالآخر وہ بھی رخصت ہوگئے۔

آج سے تقریباً سات سال پہلے جب میں پہلی بار قاہرہ آیا تھا تو ازہر کے علماء و طلبہ میں تقریباً چالیس فیصد افراد جبے اور عمامے میں نظر آتے تھے، لیکن اس مرتبہ ازہر کے عام ماحول میں ازہر کے اس مخصوص لباس کو نگاہیں ڈھونڈتی ہی رہیں، تقریباً ناوے فیصد افراد مغربی لباس ہی میں ملبوس نظر آئے، اور اساتذہ و طلبہ کو دیکھ کر ان کے سراپا میں کوئی ایسا امتیاز خوردبین لگا کر بھی نظر نہیں آیا جو ان کو عام لادینی یونیورسٹیوں کے طلبہ سے ممتاز کر سکے۔

بلکہ ایک خوش آئند بات۔ جس کا میں انشاء اللہ آگے قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا یہ ہے کہ مصر کے عام نوجوانوں میں، بالخصوص کالجوں اور یونیورسٹی میں، احیاء دین کا ایک غیر معمولی رجحان تیزی سے جڑ پکڑ رہا ہے، یہ نوجوان دین کی طرف لوٹنا اور قوم کو لوٹانا چاہتے ہیں، اور اکثر ان کے سراپا میں بھی ان کے اس ذوق کا نور چمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہ نوجوان بھی ازہر کی اس فضاء اور طرزِ عمل سے نالاں ہیں۔

بہرصورت! یہ ایک حسرت ناک حقیقت ہے کہ ازہر دینی معاملات میں اپنا پہلے جیسا وقار کھو چکا ہے، علم و تحقیق کے میدان میں بے شک وہاں سے مختلف موضوعات پر صف اوّل کی کتابیں اور مقالے اب بھی نکل رہے ہیں، اور بحمد اللہ اب ایسے مقالے بھی کم نہیں ہیں جن میں ٹھیٹھ دینی فکر کارفرما ہوتی ہے، اور جو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ اندازِ فکر پر کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گئی گذری حالت میں بھی وہاں بعض ایسے علماء موجود ہیں جو عملی دنیا میں طلبہ کے لیے ایک مثال بن سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، اور وہ یہاں کی عام فضا پر اثر انداز نہیں ہیں۔

شیخ الازہر اور وکیل الازہر سے ملاقات:

ساڑھے گیارہ بجے شیخ الازہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک خوش اخلاق اور محبت سے ملے۔ شیخ الازہر کا منصب مصر کے اعلیٰ ترین مناصب میں شمار ہوتا ہے، اور پروٹوکول کی ترتیب میں شیخ الازہر کا نمبر غالباً وزیر اعظم کے بعد سب سے پہلا ہے، اُن کو سرکاری سطح پر جو مراعات حاصل ہیں، وہ بڑے بڑے وزراء کو حاصل نہیں۔ یہ ازہر کی مرتبہ شناسی کی بڑی قدیم روایت ہے جو ابھی تک باقی چلی آتی ہے، ایک زمانے میں ازہر کے شیوخ اپنے اس مرتبے کو دینی مقاصد کے لیے خوب استعمال کرتے تھے، اور حکومت کی طرف سے جب کوئی کام دینی نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہوتا تو شیخ الازہر اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر اس کی اصلاح کراتے تھے، اور حکومت کے لیے ان کے علی الرغم کوئی اقدام کرنا مشکل ہوتا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اثر و رسوخ کی یہ نوعیت گھٹتی چلی گئی۔ اب شیخ الازہر کو رسمی طور پر تو یہ اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے، لیکن کاروبارِ حکومت میں ان کا کوئی عملی دخل باقی نہیں رہا۔ تاہم اگر اس منصب پر کوئی مخلص جرأت مند اور مدبر شخص آ جائے تو وہ بہت سی خرابیوں کے ازالے کے لیے مؤثر کام کر سکتا ہے۔ موجودہ شیخ الازہر (شیخ جاد الحق) پہلے مصر کے مفتی رہے ہیں، اور ان کے بارے میں یہاں شہرت یہ ہے کہ وہ نسبتاً جرأت مند بزرگ ہیں۔ مصر میں نفاذِ شریعت کی جو تحریک چل رہی ہے اس کے طرزِ عمل سے اس کو فی الجملہ تقویت پہنچی ہے۔

احقر نے تقریباً ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں انہیں ذی علم، باوقار، مدبر اور خوش اخلاق پایا۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ احقر نے اپنی تالیف ''تکملہ فی الملہم'' کی پہلی جلد انہیں پیش کی، انہوں نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا، اور ہمت افزائی کے کلمات کہے، ازہر اور مصر کے مجموعی حالات پر بھی گفتگو رہی، واپسی میں وہ دروازے تک چھوڑنے کے لیے تشریف لائے، بہت سی دعائیں دیں اور محبت سے رخصت کیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ان کے بعد وکیل الازہر اور نائب شیخ الازہر شیخ حسینی سے ملاقات ہوئی، یہ ازہر کے انتظامی سربراہ ہیں، اور معروف علمی شخصیت ہیں۔ مسند احمدؒ پر علامہ احمد شاکر نے جو کام ادھورا چھوڑ دیا تھا، انہوں نے اس کی تکمیل شروع کی ہے، ایک جلد آ بھی چکی ہے، انہوں نے بتایا کہ باقی جلدوں پر کام جاری ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد میں

ازہر سے فارغ ہوئے تو نمازِ ظہر میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے اپنے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی سے بہت پہلے کہہ رکھا تھا کہ میں حافظ ابن حجرؒ کے مزار پر بھی حاضر ہونا چاہتا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نماز انہی کی مسجد میں ادا کر لی جائے۔ چنانچہ ازہر سے نکل کر ہم جامع الحسینؓ [1] کے سامنے کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک طویل سڑک پر آ گئے، جو جامع الحاکم پر جا کر ختم ہوئی ہے، یہ بھی پرانے قاہرہ کی سڑک ہے۔ جو اس وقت تو شاہراہ رہی ہوگی، لیکن اب بہت تنگ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے دونوں طرف قدیم طرز کا بازار چلا گیا ہے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک طویل گلی تھی، ڈاکٹر حسن الشافعی خود ایک عرصے کے بعد یہاں آئے تھے، اس لیے انہیں بہت سے لوگوں سے پتہ پوچھنا پڑا۔ بالآخر اس گلی کے آخری سرے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی، یہ ''مسجد الحافظ ابن حجر''

[1] ''جامع الحسینؓ'' شہید کر بلا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، اور یہاں یہ بات مشہور ہے کہ ان کا سرِ مبارک یہاں مدفون ہے، چنانچہ اس مسجد کے اندر ایک مزار بنا ہوا ہے، جس پر اژدھام رہتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ بات مستند نہیں، بظاہر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ حضرت حسینؓ کا سرِ مبارک دمشق کی جامع اُموی میں مدفون ہے، یہاں کے لوگ یہ دلیل پیش کراتے ہیں کہ فاطمی حکمران اپنے عہدِ حکومت میں حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک یہاں لے آئے تھے، لیکن مصر کے مستند مؤرخین جو فاطمی دور کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ مثلاً علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ وغیرہ ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں کرتے، نہ انہوں نے ''جامع الحسینؓ'' کا کوئی ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بہت بعد کی پیداوار ہے۔

تھی۔ پہلے ڈاکٹر شافعی کا خیال یہ تھا کہ حافظ ابن حجرؒ کا مزار اسی مسجد میں واقع ہے، لیکن وہاں کوئی مزار نہیں تھا۔ مسجد کے خدام نے بتایا کہ ان کا مزار یہاں نہیں ہے، لیکن یہ مسجد انہی کی ہے جس میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور درس بھی دیتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا مزار قرافہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے واقع ہے، جہاں ہم کل ہو آئے تھے۔

زمانۂ حال میں حافظ ابن حجرؒ کے ایک تذکرہ نگار ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم لکھتے ہیں:

> ''حافظ ابن حجرؒ کا مزار سید عسل کے قرافہ کے پیچھے واقع ہے، اس کے بالمقابل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، افسوس ہے کہ یہ قبر بے توجہی کا شکار ہے جس پر مٹی جمی ہوئی ہے ..... یہ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے جو مستطیل شکل میں ہے اور زمین سے قدرے بلند ہے، اس کے چاروں گوشوں پر چار بلند ستون ہیں جن کی شکل اوپر جا کر مخروطی ہوگئی ہے۔ قبر کے سرہانے ایک دُھندلا سا کتبہ ہے، جس پر یہ عبارت میں پڑھ سکا:
>
> ''هذا قبر احمد بن علی بن حجر العسقلانی'' [1]

بہرکیف اس مزار پر تو حاضرتی نہیں ہو سکی، لیکن اس مسجد میں نمازِ ظہر پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو اس وقت خستہ حال ہے، لیکن اب اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ جس مسجد کو حافظ ابن حجرؒ جیسے علم کے دریائے ناپیدا کنار نے اپنی فیض رسانی کا مرکز بنایا ہو، اپنے عہدِ شباب میں وہاں تشنگانِ علم کے اژدھام کا کیا عالم ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکان بھی اسی محلے میں کہیں آس پاس واقع تھا۔

یوں تو مشاہیر علمائے سلف کا ہر فرد ہی آفتاب و ماہتاب ہے، لیکن ہم طالب علموں پر

[1] ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنافة. شاکر محمود عبدالمنعم. ص: ۱۹۴

www.freepdfpost.blogspot.com

جن حضرات کے احسانات بے پایاں ہیں، اور جن کا نام آتے ہی قلب میں عقیدت ومحبت کی پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں، حافظ ابن حجرؒ ان میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علم حدیث کی جو خدمت لی ہے، اس کے صحیح مقام کا اندازہ کرنے کے لیے بھی علم کی بھاری مقدار درکار ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حضور سرورِ دو عالم ﷺ کا زندہ معجزہ تھے۔

وہ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ اور ان کی تمام تر پرورش ان کے والد کے ایک تاجر دوست نے کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے آسرا بچے کو اپنے حبیب ﷺ کی سنت کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے چن لیا تھا، وہ تعلیم میں مشغول ہوئے تو خداداد ذہانت وذکاوت اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کی بدولت اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ حدیث میں آپ کے خاص استاذ حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ آپ کے بارے میں فرماتے تھے کہ ''میرے اصحاب میں علم حدیث کا ابن حجرؒ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔''

جب حافظ ابن حجرؒ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو زمزم کا پانی پیتے وقت یہ دعا کی: ''یا اللہ! مجھے حافظ ذہبیؒ جیسا حافظہ عطا فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، بیس سال بعد پھر حاضری ہوئی تو یہ دعا فرمائی کہ ''مزید حافظہ عطا فرما۔'' چنانچہ بعد کے اہل نظر علماء کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس معاملے میں حافظ ذہبیؒ پر بھی فوقیت عطا فرمادی تھی۔[1]

عملی زندگی میں اتباعِ سنت کے اہتمام کا عالم یہ تھا کہ لوگ کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں ان کی ادائیں دیکھ دیکھ کر سنتیں سیکھتے تھے۔[2] ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسا کھانا کھالیا جو مشتبہ تھا، بعد میں جب اس کا ذریعہ معلوم ہوا تو ایک طشت منگایا، اور فرمایا کہ ''ہم وہی کام کریں گے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔'' یہ کہا اور سارا کھانا قے

[1] ذیل طبقات الحفاظ للسیوطیؒ۔ ص:۳۸۱

[2] لحظ الالحاظ، لابن فہد۔ ص:۳۳۶، والضوء اللامع۔ ص:۳۹، ج:۲

کر کے اُگل دیا۔[1]

زندگی نظام الاوقات کی پابند تھی، ہر کام کا وقت مقرر تھا، اور ایک ایک لمحے کو تول تول کر خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ لکھنے کے دوران قلم پر قط رکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اتنی دیر بھی بیکار نہ گذارتے، اس وقفے میں زبان سے ذکر اللہ میں مشغول ہوجاتے تھے۔[2] وقت کی اس قدر دانی ہی کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیا کہ آج اگر ان کی تمام تصانیف کو کوئی شخص صرف نقل ہی کرنا چاہے، شاید عمر بھر میں وہ نقل بھی نہ ہوسکیں۔ اور تصانیف بھی کوئی عامیانہ نہیں، ایسی محققانہ کہ جو بات قلم سے نکلی، وہ سند بن گئی، بلکہ حدیث کے معاملے میں تو حافظؒ کا محض سکوت (یعنی کسی حدیث کو بیان کرکے اس پر بلا تبصرہ گذر جانا) بھی فتح الباری اور تلخیص میں بہت سے علماء کے نزدیک حجت قرار پایا گیا۔[3]

لیکن فتح الباری جیسی بے مثال کتابوں کا مؤلف کسی فخر و ناز میں تو کیا مبتلا ہوتا؟ تواضع کا عالم یہ ہے یکہ خود اپنی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

واکثر ذلک ممالاتساوی نسخة لغیره، لکن جری القلم بذلک

''میری اکثر تصانیف ایسی ہیں کہ دوسرے علماء کی ایک کتاب کے بھی برابر نہیں لیکن بس قلم چل گیا۔''

البتہ اپنی کتابوں میں صرف فتح الباری، ہدی الساری، تغلیق التعلیق، نخبۃ الفکر، المشتبہ التہذیب اور لسان المیزان پر اطمینان کا اظہار فرمایا، اور باقی کتب کے بارے میں لکھا:

أما سائر المجموعات فهی کبیرة العدد، واهیة العدد، ضعیفة القوی.

[1] ابن حجر العسقلانی، للدکتور شاکر، بحوالہ الجواہر والدرر، ورقہ ۲۳۳

[2] ایضاً

[3] لیکن یہ بات اکثری ہے، کلی نہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"باقی تمام مجموعات گنتی میں تو زیادہ ہیں، لیکن مواد کے لحاظ سے کمزور ہیں۔"[1]

اپنی تالیف کے بارے میں یہ اعتراف علم وفضل کی اعلیٰ ترین چوٹیوں کو چھونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ وسعۃ۔

حافظ بُلقینیؒ کے مزار پر:۔

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد سے باہر نکلے تو واپسی پر کچھ دور چل کر اِسی گلی میں دائیں ہاتھ پر ایک اور مسجد نظر آئی، جس کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا تھا، اس بورڈ سے پتہ چلا کہ یہ علامہ عمر بن رسلان البُلقینی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

علامہ عمر بن رسلان البُلقینی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن حجرؒ کے استاذ تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے جن اساتذہ سے خاص تعلق رکھا، اور بہت استفادہ کیا، ان میں حافظ زین الدین عراقیؒ، علامہ بُلقینیؒ اور حافظ ابن المُلقنؒ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ علامہ بُلقینیؒ یوں تو حدیث میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے، لیکن ان کا خصوصی موضوع فقہ تھا، اور حافظ ابن حجرؒ نے فقہ میں ان سے خصوصی استفادہ کیا۔ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ: "میں نے زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے حدیث میں حافظ ابن حجرؒ کا اور فقہ میں علامہ بُلقینیؒ کا مرتبہ عطا فرمادے۔"[2]

علامہ بُلقینیؒ اصلاً شام کے باشندے تھے، لیکن بچپن ہی میں مصر آگئے تھے، اور یہاں کی سکونت اختیار کرلی تھی، پھر ایک عرصہ تک دمشق میں قاضی بھی رہے، لیکن بعد میں پھر مصر لوٹ آئے آخر تک یہیں مقیم رہے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ جب وہ مدرسہ کاملیہ میں داخل ہوئے تو مدرسے کے مہتمم سے رہائش کیلئے ایک کمرے کی فرمائش کی، مہتمم نے انکار کردیا۔ لیکن بعد میں ایک روز ایک شاعر آیا، اور اس نے انہی مہتمم صاحب کی تعریف میں ایک

[1] ابن حجر العسقلانی۔ص:۲۶۴، بحوالہ الجواہر والدرر وق ۱۵۱، ب

[2] حسن المحاضرۃ

طویل قصیدہ سنایا، جب شاعر قصیدہ ختم کرچکا تو علامہ بُلقینیؒ نے کہا کہ "مجھے یہ قصیدہ یاد ہوگیا ہے۔" مہتمم صاحب نے کہا کہ اگر تم قصیدہ زبانی سنادو تو میں تمہیں کمرہ دے دوں گا، انہوں نے قصیدہ از بر سنادیا، اور اس طرح انہیں کمرہ مل گیا۔"[1]

عصر سے لے کر مغرب تک روزانہ فتویٰ لکھنے کا معمول تھا، اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس پورے عرصے میں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ البتہ جس کسی فتویٰ میں ذرا بھی شبہ ہوتا اِسے کتابوں کی مراجعت اور مطالعہ کے انتظار میں روک لیتے، اور جب تک پوری طرح شرح صدر نہ ہوجاتا، جواب نہ لکھتے، خواہ اس میں کتنی ہی دیر ہوجاتی۔

درس وتدریس میں آپ کی شہرت دور دور تک پہلی ہوئی تھی۔ علامہ برہان حلبیؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے "مختصر صحیح مسلم" کے درس میں بارہا حاضر ہوا۔ اس حلقے میں چاروں مذاہب کے فقہاء شریک ہوتے تھے، انہوں نے ایک حدیث پر صبح سویرے بیان شروع کیا تو ظہر کے قریب تک اُسی ایک حدیث کا درس جاری رہا۔

لیکن آپ کا علم تصنیف کے ذریعے زیادہ نہ پھیل سکا، جس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ کوئی کتاب لکھنا شروع کرتے تو تبحر علمی کی بنا پر چھوٹی سے چھوٹی بات کی بہت تفصیل فرماتے، نتیجہ یہ کہ تصنیف مکمل نہ ہوپاتی، پھر دوسری شروع کردیتے، مثلاً صحیح بخاری کی شرح شروع کی تو صرف بیس حدیث میں دو جلدیں ہوگئیں، اس لئے ان کی تصانیف زیادہ نہ ہوسکیں۔[2]

آپ کو بعض حضرات نے نویں صدی کا مجدد بھی قرار دیا ہے، آپ کی وفات ۸۰۵ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کے جلیل القدر شاگرد حافظ ابن حجرؒ حج کو گئے ہوئے تھے، واپسی پر ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو بہت غمگین ہوئے، اور ان کا بڑا پُر درد مرثیہ کہا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

[1] الضوء اللامع للسخاوی۔ص:۸۶، ج:۶

[2] ملاحظہ ہو الضوء اللامع للسخاوی۔ص:۹۰، ج:۶۔ ولحظ الالحاظ، لابن فہد۔ص:۲۰۶، تا ۲۱۷، وشذرات الذہب لابن العماد۔ص:۵۱، و۵۲، ج:۷

www.freepdfpost.blogspot.com

یا عین جودی لفقد البحر بالمطر

واذری الدموع ولاتبقی ولاتذری

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔[1]

جامع الحاکم

قاہرہ کا تو چپہ چپہ تاریخ ہے، بالخصوص شہر کا پرانا علاقہ ایسا ہے کہ کوئی مؤرخ یا ماہر آثار اگر اس کی ہر تاریخی جگہ کی تحقیق کر کے اس کے حالات مرتب کرے تو اس کے لیے سالہا سال چاہئیں۔ ''مسجد الحافظ ابن حجرؒ'' والی گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ کی طرف چلیں تو ایک بڑی طویل و عریض، شاندار اور قلعہ نما مسجد نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ ''جامع الحاکم'' ہے۔ جامع الحاکم ایک ظالم و جابر فاطمی بادشاہ حاکم بامر اللہ کے نام سے منسوب ہے۔ جس کی رعونت، فرعونیت وار بے سروپا احکام اہل مصر کے لئے سالہا سال وبال بنے رہے، اور جس کے بارے میں علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مصر پر فرعون کے بعد اس سے زیادہ بدتر حکمران کوئی نہیں آیا۔ ابتداءً اس کی تعمیر عزیز باللہ نے شروع کی تھی، بعد میں حاکم نے اس کی تکمیل کی۔ اسی لیے جامع الحاکم کہا جاتا ہے۔ اس مسجد میں بھی مذاہب اربعہ کے حلقہ ہائے درس قائم رہے۔[2] لیکن چونکہ یہ فاطمی دور کی عظیم الشان مسجد ہے، اس لیے یہ بوہریوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے، اور بوہری فرقے کے لوگ دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

ابن ہشام نحویؒ

جامع الحاکم لمبائی میں جس جگہ ختم ہوئی ہے، وہاں بائیں ہاتھ پر ایک قدیم فصیل شروع ہوگئی ہے جو کسی وقت شہر پناہ کا کام دیتی تھی، اس فصیل میں ایک دروازہ ابھی تک موجود ہے جس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔ اس دروازے کی بنیاد میں ایک چبوترہ سا بنا ہوا

[1] [2] حسن المحاضرہ للسیوطیؒ۔ ص: ۱۵۵، ج: ۲

ہے۔ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ میں نے اپنے اساتذہ اور آباء واجداد سے سنا ہے کہ یہ چبوترہ مشہور نحوی عالم ابن ہشامؒ کی قبر ہے۔

یہ وہی ابن ہشامؒ ہیں جن کی کتاب ''مغنی اللبیب'' عربی نحو کے مستند ترین ماخذ میں شمار ہوتی ہے۔ اور ان کی کتاب ''قطر المتدی'' ابتدائی نحو کے لئے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان کا پورا نام عبداللہ بن یوسف جمال الدین ابن ہشامؒ ہے، فقہ میں پہلے شافعی تھے، پھر حنبلی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنا خاص موضوع نحو اور ادب کو بنایا اور اپنے زمانے میں نحو کے مسلم الثبوت امام مانے گئے۔ ابن خلدونؒ کا کہنا ہے کہ ہم نے مغرب ہی میں یہ شہرت سن لی تھی کہ مصر میں نحو اور علوم عربیت کا ایک ایسا عالم پیدا ہوا ہے جو نحو میں سیبویہ سے زیادہ ماہر ہے۔ مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ انہوں نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اور ذی القعدہ ۷۶۱ھ میں وفات پائی۔[1]

علامہ عینیؒ کی مسجد

ہم یہاں سے واپس ہوتے ہوئے دوبارہ جامعہ الازہر پہنچے، کیونکہ ہماری گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ جامع الازہر کی پشت پر ایک چھوٹی سی گلی ہے۔ اس گلی میں ایک مسجد کے پاس سے گذرے تو ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے، اور اسی میں ان کا مزار بھی واقع ہے۔

ہم جیسے طالب علموں کے لیے یہاں کچھ دیر رُکنے کے لیے یہ کوشش کم نہ تھی، کہ یہ علامہ عینیؒ کا محلّہ، ان کی مسجد، ان کا مدرسہ اور ان کا مزار تھا۔ وہی علامہ عینیؒ جن کے احسانات سے اُمت مسلمہ، بالخصوص حنفی علماء کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ ان کی شرح بخاری، شرح ہدایہ اور شرح کنز فقہ حنفی کا بہت بڑا ماخذ شمار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر علم وفن میں ان کی تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ حافظ سخاویؒ جیسے مردم شناس (اور علماء کی

[1] الدرر الکامنہ۔ للحافظ ابن حجر۔ ص: ۳۰۸ تا ۳۱۰۔ ج: ۲

www.freepdfpost.blogspot.com

تعریف میں بہت محتاط) بزرگ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ میری معلومات میں ہمارے شیخ (یعنی حافظ ابن حجرؒ) کے بعد علامہ عینیؒ سے زیادہ کثیر التصانیف بزرگ کوئی اور نہیں۔ انہوں نے جامع الازہر کے قریب ہی اپنی مسجد اور مدرسہ اس لیے بنایا تھا کہ وہ جامع الازہر میں نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہ سمجھتے تھے، کیونکہ اسے ایک تبرائی رافضی نے وقف کیا تھا۔[1]

علامہ عینیؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم وفضل، حافظے اور قوتِ تحریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا، جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ سرعت تحریر کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پوری مختصر القدوری ایک رات میں نقل کردی۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ کے درمیان معاصرانہ چشمک مشہور ومعروف ہے۔ اگرچہ علامہ عینیؒ عمر میں حافظ ابن حجرؒ سے بارہ سال بڑے تھے، اور حافظؒ نے ان سے بعض احادیث بھی پڑھی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک دوسرے کے معاصر ہی شمار ہوتے تھے۔ حافظؒ شافعی تھے، اور علامہ عینی حنفی، وہ بھی قاضی رہے، اور یہ بھی۔ انہوں نے بھی بخاری شریف کی شرح لکھی، اور انہوں نے بھی۔ اس لیے دونوں کے درمیان لطیف علمی چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح پہلے لکھنی شروع کی تھی، اور وہ اپنے شاگردوں کو املاء بھی کراتے جاتے تھے، ان شاگردوں میں سے ایک علامہ برہان الدین ابن خضر کا تعلق علامہ عینیؒ سے بھی تھا۔ علامہ عینیؒ نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کاپیاں ان کو مستعار دے دیا کریں۔ علامہ ابن خضر نے حافظؒ سے اجازت لے کر علامہ عینیؒ کو شرح کے حصے مستعار دینے شروع کردیئے اور اس طرح علامہ عینیؒ نے اپنی شرح کی تالیف کے وقت حافظؒ کی شرح کو سامنے رکھا اور جابجا اس پر تنقید بھی فرمائی۔ بعد میں حافظؒ نے عینیؒ کے اعتراضات کے جواب میں مستقل دو کتابیں لکھیں۔

دونوں کی لطیف چوٹوں کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے حکمران

[1] الضوء اللامع للسخاویؒ۔ ص:۳۳، ج:۱۰

''الملک المؤید'' کی سیرت پر علامہ عینیؒ نے ایک طویل قصیدہ کہا تھا، جس میں اس کی بنائی ہوئی جامع مسجد کی بھی تعریف تھی، اتفاق سے کچھ دن بعد اس مسجد کا مینارہ جھک کر گرنے کے قریب ہوگیا، اس پر حافظ ابن حجرؒ نے پرچے پر دو شعر لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے:

لجامع مولانا المويد رونق منارته تزهو على الفخر والزّين
تقول، وقدمالت، على ترفقوا فليس على حسنى أضرّ من العين

(یعنی: جناب مؤید کی جامع مسجد بڑی بارونق ہے، اور اس کا مینارہ فخر وزینت کی وجہ سے بڑا خوشنما، لیکن جب وہ جھکا تو اُس نے کہا کہ: ''مجھ پر رحم کرو، کیونکہ میرے حسن کے لیے ''عین'' (چشم بد) سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں)۔

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ اس میں ''عین'' کو ''عینی'' پڑھا جاتا ہے، جس سے علامہ عینیؒ پر تعریض ہوتی ہے۔

ملک مؤید کو یہ رقعہ ملا تو اُس نے علامہ عینیؒ کے پاس بھیج دیا، اس پر علامہ عینیؒ نے دو شعر لکھ کر واپس بھیجے:

منارة كعروس الحسن قد جليت وهدمها بقضاء الله والقدر
قالوا أصيبت بعين، قلت ذاخطاء وإنما هدمها من خيبة الحجر[1]

یعنی: (یہ مینارہ عروس حسن کی طرح درخشاں ہے، اور اس کا گرنا محض اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر کی وجہ سے ہوا ہے، لوگ کہنے لگے کہ اسے نظر لگ گئی، میں نے کہا: یہ غلط ہے، دراصل وہ اپنے ''حجر'' (پتھر) کے فساد کی بنا پر گرا ہے)۔

علامہ دردیر مالکیؒ:

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد سے ذرا آگے بڑھے تو وہاں مشہور مالکی فقیہ علامہ احمد الدردیر مالکیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا، یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مختصر خلیل کی شرح کو اب

[1] ابن حجر العسقلانی، شاکر محمود عبدالمنعم۔ ص:۱۷۸، بحوالہ الوافیہ، الا...

www.freepdfpost.blogspot.com

فقہ مالکی کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بارہویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، جنہوں نے جامع الازہر میں تعلیم حاصل کی، اور فقہ وتصوف کے امام سمجھے گئے۔ یہاں تک کہ ان کو ''مالک الصغیر'' (چھوٹے امام مالکؒ) کہا جانے لگا۔

اس وقت مغرب (مراکش) کا بادشاہ علماء ازہر کو ہدیہ بھیجا کرتا تھا، ایک مرتبہ (۱۱۹۸ء) میں کچھ ہدیہ علامہ دردیرؒ کی خدمت میں بھی بھیجا، اتفاق سے اِسی سال بادشاہ کا بیٹا حج کو گیا تھا، اور واپسی میں جب مصر پہنچا تو اس کا سفرخرچ ختم ہو چکا تھا، علامہ دردیرؒ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے پاس آئی ہوئی ہدیہ کی رقم ان کو بھجوادی۔ آئندہ سال بادشاہ نے انہیں دس گنا زائد ہدیہ بھیجا، شیخ نے اس رقم سے حج کیا، اور باقی ماندہ رقم سے اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، اور آخر عمر تک اِسی میں تدریس اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۰۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ دردیرؒ کے مزار پر حاضری کے بعد ہم نے ہوٹل واپس آ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر اس روز شام کو اور اگلے دن بارہ بجے تک مختلف کتب خانوں کی سیر اور خریداریٔ کتب میں وقت گزرا۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد وطن واپسی کے لئے ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔

مجموعی تاثرات:

مصر صدیوں علم و دین کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ اور اس سرزمین نے علوم اور دینی اخلاق کے وہ آفتاب و ماہتاب پیدا کئے ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی۔ لیکن جس طرح اس ملک نے مدتوں علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کی قیادت کی ہے، اِسی طرح مغربی افکار کے استیلاء کے بعد اِسی ملک کے بعض ''دانشوروں'' نے مغویت کی نشر و اشاعت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ ''مفتی محمد عبدہ، سیّد رشید رضا'' ان کے بعد ''طٰہٰ حسین'' اور ''احمد امین'' جیسے متجد دین اِسی ملک میں پیدا ہوئے جن کے افکار اور تحریروں نے پورے عالم اسلام کے تجدد پسند حلقے کو اسلحے فراہم کئے، یہاں تک کہ ازہر جیسا علمی مرکز بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

دوسری طرف راسخ العقیدہ اہل علم کی تعداد بھی یہاں کبھی کم نہیں رہی، اور انہوں نے شروع میں ان افکار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اوّل الذکر حلقے کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لیے عملی زندگی میں اس حلقے کے اثرات غالب آتے چلے گئے۔ اس سلسلے کی انتہاء جمال عبدالناصر کے عہد حکومت میں ہوئی، جس نے دین کو نظام حکومت کی بنیاد قرار دینے کی ہر تحریک کو انتہائی تشدد کے ساتھ کچل کے رکھ دیا۔ اخوان المسلمین کے افراد عموماً اخلاص اور دینی جذبے دونوں سے سرشار تھے، اور انہوں نے بڑی زبردست قربانیاں پیش کیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا طریق کار منتخب کرنے میں بھی ہوش و حکمت اور تدبر سے اتنا کام نہیں لیا جتنا جوش سے۔ بہرکیف! جمال ناصر کے عہد میں دین کو عملاً جاری کرنے کی فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا، اور ملک میں عربی قوم پرستی، بے دینی، عریانی اور فحاشی کا سیلاب اُمڈ آیا۔

انور السادات کے عہد میں دینی حلقوں کے ساتھ قدرے نرمی کا معاملہ کیا گیا، اور بظاہر موجودہ حکومت بھی اِسی پالیسی پر گامزن ہے، چنانچہ اس دور میں تبلیغ و دعوت کا کام خاصا آگے بڑھا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں دینی جذبے کی وہ چنگاری جسے زبردستی دبایا گیا تھا۔ اب اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

ایک طرف حکومتوں کی مسلسل مغرب نواز پالیسیوں کا اثر یہ ہے کہ اب بھی عریانی و فحاشی کا بازار گرم ہے، اور بعض علاقوں میں لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ یورپ کا کوئی شہر ہے، یا عالم اسلام کا؟ شراب نوشی کی وباء بھی عام ہے، ذرائع ابلاغ کسی ادنیٰ رُو رعایت کے بغیر علی الاعلان عریانی و فحاشی کی تبلیغ کر رہے ہیں، لیکن دوسری طرف نوجونوں میں دین کی طرف لوٹنے کا ایک غیر معمولی جذبہ بیدار ہو رہا ہے، اور مختلف حلقے اس سمت میں متواتر کام کر رہے ہیں، تبلیغی جماعت کے آثار بھی ماشاء اللہ نمایاں محسوس ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اخوان کے افراد بھی مختلف ذرائع سے نوجوانوں میں اسلام کو عملاً برپا کرنے کا جذبہ پیدا کر رہے ہیں، اس وقت مصر میں نفاذِ شریعت کا آوازہ بلند کرنے میں ایک بڑی مسجد کے خطیب حافظ سلامہ پیش پیش ہیں، لیکن جن دنوں میں وہاں

www.freepdfpost.blogspot.com

تھا، وہ جیل میں تھے۔

پہلے کے مقابلے میں حکومت کی پالیسی کے باوجود نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے دینی رجحان کو حکومت کے حلقوں میں کن نظروں سے دیکھا جا رہا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے کہ ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے پرچوں (Stickers) پر کلمہ طیبہ..... اور صرف کلمہ طیبہ..... لکھ کر لوگوں میں تقسیم کیا تھا، اور یہ اپیل کی تھی کہ یہ پرچے کاروں پر چسپاں کئے جائیں، کچھ ہی عرصے میں یہ پرچے اس قدر عام ہوئے کہ قاہرہ کی تقریباً ہر کار پر چسپاں ہو گئے۔ حکومت نے اس صورتِ حال کا بھی نوٹس لیا، اور فوری طور پر کاروں سے یہ پرچے ہٹانے کا حکم صادر کیا۔

اس اقدام پر نوجوانوں کی برافروختگی کی ایک طبعی امر تھی، چنانچہ میرے دورانِ قیام میں ان کے اور پولیس کے درمیان کشمکش جاری رہی۔

تاہم اگر دینی حلقے اخلاص، حکمت، تدبر اور استقامت کے ساتھ دعوت کا کام جاری رکھیں اور کام کے پہلے ہی مرحلے میں حکومت کو براہِ راست اپنا مدمقابل بنا کر اپنے لیے غیر معمولی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق پر اس دعوت کو سرکاری حلقوں تک وسعت دیں تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ حالات کے رو بہ اصلاح ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اُحد سے قاسیون تک

سعودی عرب، اردن، شام

ربیع الاول ۱۴۰۶ھ جنوری ۱۹۸۶ء

www.freepdfpost.blogspot.com

فرنگیوں کو عطا خاکِ سُوریا نے کیا
نبی عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سُوریا کے لیے
مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

(۳)

اُحد سے قاسیون تک

۱۹۵۶ء میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے شام کا سفر کیا تھا، اُس وقت سے شام دیکھنے کی دل میں شدید خواہش تھی، شام انبیاء علیہم السلام کی سرزمین رہی ہے، قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اُس کے تقدس اور اس کی برکات کی تعریف کی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اُس کے ساتھ اسلامی تاریخ کے ناقابلِ فراموش واقعات وابستہ ہیں۔ جن اہلِ شام سے کبھی ملاقات ہوئی اُنہیں بھی اپنے وطن کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا، اور ان کی صورت و سیرت میں شام کا حسن جھلکتا دکھائی دیا۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ حرمین شریفین کے بعد دنیا کے جس خطے کو دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا، وہ شام کا خطہ تھا۔

اس سال ربیع الاوّل میں ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کا سالانہ اجلاس جدہ میں منعقد ہونا تھا، میں نے پہلے سے ارادہ کیا ہوا تھا کہ اجلاس سے فراغت کے بعد شام کا سفر کروں گا۔ میرے بھانجے مولوی امین اشرف صاحب سلمہٗ (جو مدینہ طیبہ کے ہائی کورٹ میں افسر ہیں) نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ احقر کے ساتھ اس سفر میں ساتھ ہوں گے۔ برادرِ محترم جناب قاری بشیر احمد صاحب پہلے سے اس کے لیے تیار تھے، اور وقت پر میرے بھانجے داماد مولوی عطاء الرحمٰن صاحب بھی (جو سعودی نیشنل ہیں) رفاقت کے لیے تیار ہو گئے، ان سب کی رائے تھی کہ یہ سفر سڑک کے ذریعے کیا جائے اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب

۱؎ قاسیون۔ دمشق کا پہاڑ جس کے دامن میں شہر آباد ہے

www.freepdfpost.blogspot.com

نے ایک نئی کار بھی اسی وقت خریدی تھی۔ اس لیے اسی کار کے ذریعہ سفر کا ارادہ کرلیا گیا، اس طرح ایک چھوٹا سا قافلہ بن گیا۔ جس کے ساتھ سفر بڑا دلچسپ اور پُر لطف گذرا۔

۱۹۸۶ء کا پہلا دن تھا، یعنی جنوری کی پہلی تاریخ، جب ہم صبح ساڑھے ۷½ بجے مدینہ طیبہ سے بذریعہ کار روانہ ہوئے، جبل اُحد کے مغربی جانب سے ہوتے ہوئے ہم شام جانے والی سڑک پر آ گئے، جو مدینہ طیبہ کے شمال میں خیبر، مدائن صالح اور تبوک ہوتی ہوئی اردن کی سرحد تک پہنچتی ہے۔

مدینہ طیبہ سے نکلنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف دور تک پتھریلے ٹیلے پھیلے نظر آتے تھے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے صحرانشینانِ عرب کے قافلے شام کا رُخ کیا کرتے تھے، خود سرکارِ دوعالم ﷺ کم از کم چار مرتبہ اسی راستے سے گذرے ہوں گے، دو مرتبہ بعثت سے پہلے سفر شام کے لیے، ایک مرتبہ خیبر پر حملہ کے لیے، اور ایک مرتبہ غزوۂ تبوک کے موقع پر۔ ان سنگلاخ ٹیلوں نے تاریخ انسانیت کی مقدس ترین ہستیوں کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا ہوگا، انہوں نے سرکارِ دوعالم ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہؓ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی ہوگی۔ تصور کی نگاہیں ان پہاڑیوں اور وادیوں میں انسانیت کے نجات دہندوں کے قافلوں، اور ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کو اُترتے چڑھتے دیکھتی رہیں، اور ان تصورات نے اس سفر میں سیاحت سے زیادہ عقیدت، محبت اور تقدس کا رنگ پیدا کردیا۔

تقریباً تین گھنٹے کے متواتر سفر کے بعد ایک بڑی بستی کے آثار شروع ہوئے۔ رفقاء نے بتایا کہ یہ خیبر ہے۔ خیبر کی جدید بستی تو مین روڈ پر ہی واقع ہے، لیکن خیبر کے قدیم شہر جانے کے لیے مرکزی سڑک سے ذرا ہٹنا پڑتا ہے۔ میرے سوا تمام رفقاء پہلے خیبر آ چکے تھے، اس لیے ان کی معیت میں مطلوبہ مقامات تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ مرکزی شاہراہ سے چند میل ہٹ کر ہم خیبر کی قدیم بستی میں پہنچے، یہ بستی گھنے نخلستانوں کے درمیان آباد ہے، اور اس کی اونچی نیچی گلیاں قدامت کی داستانیں سناتی ہیں، کچے پکے راستوں سے گذرتے ہوئے ہم ایک بوسیدہ قلعے کی فصیل کے نیچے پہنچ گئے۔ یہ قلعہ آنحضرت ﷺ

کے عہد مبارک سے موجود چلا آتا ہے، پہلے لوگ اس کی فصیل پر چڑھ کر اس کے اندر بھی چلے جاتے تھے، لیکن اب یہ انتہائی بوسیدہ ہونے کی بنا پر نہایت مخدوش ہوگیا ہے، اس لیے اب اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

خیبر:

خیبر دراصل کئی قلعوں پر مشتمل ایک وسیع اور زرخیز علاقہ تھا، کہا جاتا ہے کہ اسے عمالقہ کے ایک شخص نے آباد کیا تھا جس کا نام خیبر بن قانیہ تھا، اس لیے یہ علاقہ اسی کے نام سے مشہور ہوگیا۔[1] بعض لوگوں نے کہا کہ "خیبر" عبرانی زبان میں قلعے کو کہتے ہیں، اور چونکہ یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا، اس لیے اس کو خیبر کہنے لگے۔ بعد میں یہاں اور بھی قلعے تعمیر کئے گئے جو ناعم، قموص، نطاۃ، قصارہ، الوطیح اور السلالم کے نام سے مشہور تھے، اور اس لیے اس مجموعی علاقے کو "خیابر" (خیبر کی جمع) بھی کہا جاتا تھا۔[2]

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اس پورے علاقے پر یہودی قابض تھے، اور ان کے مختلف خاندان مختلف قلعوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے بعد سے مسلسل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے، مدینہ طیبہ کے یہودیوں میں سے بنونضیر بھی مدینہ طیبہ سے اپنی بدعہدی کی بنا پر جلاوطن کئے گئے تو وہ بھی یہیں آ کر آباد ہوگئے، اور یہاں بیٹھ کر آنحضرت ﷺ کے خلاف سازشوں کے جال بننے لگے۔ غزوۂ خندق میں عرب کے جو بہت سے قبائل مدینہ طیبہ پر چڑھ کر آئے تھے، اس میں بھی خیبر کے یہودیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اور چونکہ یہ لوگ مالدار تھے، اور دفاعی اعتبار سے خاصے مستحکم بھی، اس لئے خیبر اسلام کا سب سے بڑا حریف بن چکا تھا، جس نے مدینہ طیبہ کے چند در چند خطرات پیدا کردیئے تھے، اور اس کا علاج اس پر ایک کاری وار کے بغیر ممکن نہ تھا۔

[1] معجم ما استعجم للبکری۔ ص: ۵۲۳، ج: ۱

[2] معجم البلدان للحموی۔ ص: ۴۰۹، ج: ۷

www.freepdfpost.blogspot.com

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کو عمرے کی ادائیگی کے بغیر واپس لوٹنا پڑا تو مسلمانوں کے دل اس واقعے سے متاثر تھے۔ اس موقع پر قرآنِ کریم نے بشارت دی تھی کہ (اس صبر و تحمل کے صلے میں) اللہ تعالیٰ انہیں عنقریب ایک اور سرزمین کی فتح سے نوازے گا۔ اس سرزمین سے مراد خیبر ہی کی سرزمین تھی۔

چنانچہ محرم ۷ھ میں حدیبیہ سے واپسی کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہی آنحضرت ﷺ لشکر اسلام کو لے کر خیبر کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ روایات میں ہے کہ جب آپ خیبر کے قریب صہباء کے مقام پر پہنچے تو عصر کا وقت تھا، اور یہاں سے آگے بڑھے تو خیبر کی عمارتیں نظر آنے لگیں، آپ ﷺ نے لشکر کو روک کر یہ دعا فرمائی:

اللّٰھم انا نسألک خیر ھذہ القریة وخیر أھلھا وخیر مافیھا، ونعوذبک من شرّھا وشرّأھلھا وشرّمافیھا.

"یا اللہ! ہم آپ سے اس بستی کی، اس کے رہنے والوں اور اس کی تمام چیزوں کی بھلائی مانگتے ہیں، اور ان کی تمام برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔"

راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا عام معمول یہی تھا کہ جب کسی نئی بستی میں داخل ہوتے تو یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اگلی صبح آنحضرت ﷺ نے خیبر کے قلعے ناعم پر حملہ کیا، اسی حملے میں حضرت محمود بن مسلمہؓ بڑی جانبازی سے لڑے، لیکن ایک موقع پر ایک یہودی نے قلعے کے اوپر سے ان پر ایک چکی کا پاٹ پھینک کر مارا جس سے وہ شہید ہو گئے، لیکن اس کے بعد قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد کئی قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے رہے، لیکن سب سے بڑا معرکہ قلعہ قموص پر ہوا، اور یہی وہ قلعہ تھا جس کے دامن میں ہم کھڑے تھے۔

یہ قلعہ دفاعی اعتبار سے خیبر کا سب سے مستحکم قلعہ سمجھا جاتا تھا، اور دشمن نے اپنی

فوج کا سارا زور بھی اسی پر صرف کر دیا تھا۔ اس قلعے کا محاصرہ تقریباً بیس دن جاری رہا۔ آنحضرت ﷺ نے یکے بعد دیگرے کئی صحابہ کرامؓ کو اس پر حملے کے لیے بھیجا، لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا، اور یہ حضرات فتح کیے بغیر واپس آئے۔ بالآخر ایک دن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور رسول (ﷺ) اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انشاء اللہ اس کے ہاتھ پر قلعہ فتح فرمائیں گے۔

ہر شخص منتظر تھا کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟ صحابہ کرامؓ کی وہ رات اشتیاق و انتظار کے عالم میں بسر ہوئی۔ صبح کے وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر جھنڈا ان کے حوالے فرمایا۔ لوگ اس انتخاب پر اس لیے حیران تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت آشوبِ چشم میں مبتلا تھے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آنکھیں دُکھنے کی وجہ سے اپنے پاؤں کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے اُن کی آنکھوں پر اپنا لعاب مبارک لگایا، اور دعا فرمائی، آنکھیں فوراً اچھی ہو گئیں، اور حضرت علیؓ جھنڈا لے کر آگے بڑھے، اور قلعے کے دامن میں پہنچ کر علم نصب کر دیا۔

مشہور یہودی پہلوان مرحب رجز پڑھتا ہوا مقابلے پر آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مقابلے کے دوران اس کے سر پر تلوار ماری تو اس کے سر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق قلعہ انہی کے ہاتھ پر فتح ہوا۔

یہی وہ قلعہ ہے جس کا دروازہ اُکھاڑنے کی داستان "درِ خیبر" کے نام سے لوگوں میں مشہور ہے، کہ حضرت علیؓ کی ڈھال لڑائی کے دوران گر گئی تھی، اس لیے حضرت علیؓ نے قلعے کے دروازے کو اُکھاڑ کر اسے ڈھال کے طور پر استعمال کیا، لیکن یہ روایت انتہائی ضعیف اور ناقابلِ اعتماد روایت ہے، جس کی محدثین نے سختی سے تردید کی ہے۔

قموص کی فتح کے بعد دشمن کی کمر ٹوٹ گئی، اور اس کے بعد وطیح اور سلالم کے قلعے مقابلے کے بغیر فتح ہو گئے، اور یہودیوں نے ہتھیار ڈال کر صلح کر لی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ قلعہ اس وقت چھوٹے چھوٹے بوسیدہ پتھروں کا بنا ہوا ہے، اور ایک پہاڑی پر واقع ہے، اور اسکی فصیل خم کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی ہے، اوپر کچھ قدیم عمارتیں بھی بنی ہوئی نظر آتی ہیں، اور یہاں کے لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اس کی بناوٹ وغیرہ میں بہت کم تغیر ہوا ہے۔

قلعے کے دامن میں ایک پکا احاطہ سا بنا ہوا ہے، جس میں ایک کھڑکی کے ذریعے جھانکا جاسکتا ہے۔ اس احاطے کے بارے میں یہاں مشہور یہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں گدھوں کا گوشت حرام ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، اور گدھوں کے گوشت کو پکانے کے لیے جو دیگیں صحابہ کرامؓ نے آگ پر چڑھائی تھیں، وہ اس اعلان پر اُلٹ کر ضائع کردی گئی تھیں۔ جس کا مفصل واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔

اگر اس احاطے کے بارے میں یہ بات درست ہو تو اسی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ یہ قلعہ قموص ہی ہے، کیونکہ روایات میں گدھوں کے گوشت کی حرمت اور دیگوں کو اُلٹنے کا واقعہ قلعہ قموص کی فتح کے بعد ہی بیان کیا گیا ہے۔

قلعے کے سامنے کئی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی ہیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کی دیواریں ہیں، یہ نخلستان اب غیر آباد اور ویران سے نظر آتے ہیں، لیکن ان میں کھجور کے درخت اب بھی بہت زیادہ ہیں۔ اور ان کے بیچ میں ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی ہے، جو آگے جا کر ایک بڑے تالاب میں تبدیل ہوگئی ہے، اس تالاب کا نام یہاں ''عین علیؓ'' مشہور ہے، لوگ اس کا پانی ذوق وشوق سے پیتے ہیں، اور پانی واقعۃً بڑا ٹھنڈا، صاف ستھرا اور میٹھا ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کی طرف اس چشمے کی نسبت کی کوئی وجہ احقر کو معلوم نہیں ہوسکی۔ عبداللہ البکریؒ نے مرحب کے قلعے کے قریب ایک چشمے کا ذکر کیا ہے جو ''قسمۃ الملائکۃ'' کہلاتا تھا،[1] لیکن حضرت علیؓ کی طرف اسے منسوب نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

[1] معجم ما استعجم۔ ص: ۵۲۲، ج: ۱

ہم تھوڑی دیر بعد ویران نخلستانوں اور خیبر کی بستی میں رہے، اس کے بعد واپس مین روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ خیبر کی قدیم بستی سے چند کلومیٹر طے کرنے کے بعد دائیں ہاتھ پر ایک پہاڑ تھا، اس پہاڑ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ''سد الصہباء'' ہے یعنی یہ وہ مقام ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے خیبر پر حملے سے پہلے شام کے وقت قیام فرمایا تھا، اور پھر خیبر سے واپس مدینہ طیبہ جاتے ہوئے اسی مقام پر اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ نے نکاح فرمایا۔

حضرت صفیہؓ بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی اور قلعہ قموص کے سردار کنانہ کی بیوی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے خیبر پر حملہ کرنے سے کچھ ہی پہلے انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک چاند یثرب (مدینہ) کی سمت سے چل کر ان کی گود میں آگیا ہے، انہوں نے یہ خواب اپنے شوہر سے بیان کیا تو اس نے ان کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا کہ ''تو شاہِ یثرب کی بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔''[1] اس کے فوراً بعد قلعہ قموص آنحضرت ﷺ نے فتح فرمالیا۔ کنانہ اسی جنگ میں مارا گیا، اور حضرت صفیہؓ جنگی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہوگئیں۔ صحابہ کرامؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یہ ایک سردار کی بیٹی اور ایک سردار کی بیوی ہیں، اس لیے ان کو کسی اور کی کنیز بنانے کے بجائے آپ ﷺ اپنی کنیز بنائیں۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا کہ اگر تم اپنے دین پر قائم رہنا چاہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے، لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اختیار کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس پر حضرت صفیہؓ نے اسلام قبول کرلیا۔[2] آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو تمہیں آزاد کرکے تمہارے اہل خاندان کے پاس بھیج دیا جائے، کہ انہی کے ساتھ رہو، اور اگر چاہو تو میں تمہیں آزاد کرکے تم سے نکاح کرلو۔ حضرت صفیہؓ نے دوسری صورت اختیار فرمائی اور اس طرح انہیں

[1] الروض الانف للسہیلی۔ ص: ۲۴۰، ج: ۲ مطبوعہ ملتان۔
[2] مغازی الواقدی۔ ص: ۲۷۴، ج: ۲
[3] مسند احمد بن حنبل۔ جلد ۳۔ ص: ۱۳۸۔ مرویات انسؓ۔ بذیل قصۂ حجاج بن علاط و تاریخ الخمیس للدیار بکریؒ۔ ص: ۵۷۔ ج: ۲

www.freepdfpost.blogspot.com

آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

آنحضرت ﷺ صہباء کے اس مقام پر تین دن قیام پذیر رہے، اِسی جگہ پر حضرت صفیہؓ کے ساتھ نکاح کی دعوتِ ولیمہ بھی منعقد ہوئی۔ ولیمہ کی شان بھی عجیب تھی، چمڑے کا ایک دسترخوان بچھا دیا گیا، اور حضرت انسؓ کو حکم ہوا کہ اعلان کردو کہ جس کے پاس جو کچھ ہو لے آئے، کوئی کھجور لایا، کوئی پنیر، کوئی ستو لایا، کوئی گھی، جب اس طرح کچھ سامان جمع ہوگیا، تو سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھالیا، نہ گوشت تھا، نہ روٹی۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

صہباء سے گذر کر ہم پھر اس سڑک پر روانہ ہوئے جو شام جانے والی شاہراہ سے جاملتی ہے۔ راستے میں ایک چڑھائی کے دائیں جانب ایک وسیع احاطہ بنا ہوا نظر آیا۔ رفقاء نے بتایا کہ یہ شہداء خیبر کے مزارات ہیں۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے اُترے اور ان شہداء باوفا کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر میں تقریباً بیس صحابہ کرامؓ شہید ہوئے تھے۔

انہی شہداء میں ایک اسود راعی رضی اللہ عنہ بھی تھے، جنہوں نے اسلام لانے کے بعد کبھی ایک نماز بھی نہیں پڑھی، لیکن نبی کریم ﷺ کی بشارت کے مطابق وہ سیدھے جنت میں پہنچے۔ ان کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ وہ خیبر کے ایک چرواہے تھے، اور اُجرت پر بکریاں چراتے تھے، جب آنحضرت ﷺ نے خیبر کا محاصرہ فرمایا تو ایک دن انہوں نے قلعہ والوں سے جنگی تیاریوں کا سبب پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مدعی نبوت سے مقابلہ ہے، ان کے دل میں خیال ہوا کہ ان سے ملنا چاہیے، چنانچہ وہ ایک دن بکریاں چرانے کے لیے قلعے سے باہر نکلے، سامنے نبی کریم ﷺ کا لشکر فروکش تھا، سیدھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اور آپ ﷺ سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں، آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ فرمایا۔ اُن کے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہوگئی، انہوں نے پوچھا کہ اگر میں اسلام لے آؤں تو صلہ کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت! انہوں نے کہا کہ میں سیاہ فام اور بدشکل ہوں،

اور میرے جسم سے بدبو آرہی ہے، کیا پھر بھی اسلام لانے سے جنت کا مستحق ہوجاؤں گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اللہ تعالیٰ تمہیں حسن عطا فرمادے گا، اور تمہارے جسم کی بُو خوشبو سے تبدیل ہوجائے گی۔

یہ سن کر اسود راعیؓ اسلام لے آئے، اور عرض کیا کہ یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، ان کا کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو قلعے کی طرف ہنکادو، چنانچہ انہوں نے بکریاں قلعے کی طرف ہنکادیں، اور وہ سب قلعے میں میں چلی گئیں، اس کے بعد اسود راعیؓ جہادِ خیبر میں شریک ہوئے، جنگ کے بعد شہداء آنحضرت ﷺ کے سامنے لائے گئے تو ان میں اسود راعیؓ کی لاش بھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے منہ پھیر لیا، صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہ اس وقت جنت کی دو حوروں کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے کو حسین بنادیا ہے، اور جسم کو خوشبو سے مہکادیا ہے۔ صحابہ کرامؓ ان کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ یہ وہ جنتی ہیں جس نے اللہ کے لیے کوئی نماز نہیں پڑھی۔ لیکن سیدھا جنت میں پہنچا ہے۔[1]

شہداء کرامؓ کے مزارات پر حاضری کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا اور کچھ دیر بعد تبوک اور شام جانے والی مرکزی شاہراہ پر پہنچ گئے۔ خیبر تک سڑک کے دونوں طرف پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے نظر آتے رہے تھے، لیکن یہاں سے آگے بڑھے تو دونوں طرف افق و دق صحراء تھا، حدِ نظر تک نہ کوئی آبادی نظر آتی تھی، نہ کوئی ٹیلہ، نہ درخت، نہ جھاڑی، نہ سبزہ، نہ پانی، بس چٹیل میدان تھا جس میں زندگی کے آثار دور دور نظر نہیں آتے تھے، یہ اسی انداز کا صحرا خیبر سے تبوک تک، بلکہ اس سے بھی آگے اردن کی سرحد کے کئی سو کلومیٹر اندر تک اسی طرح چلا ہے، اور تقریباً آٹھ نو سو کلومیٹر لمبا ہوگا۔ اسے ''صحرا النفود'' کہتے ہیں، اور اتنا طویل صحرا کار کے ذریعے میں نے پہلے کبھی قطع نہیں کیا۔

[1] عیون الاثر۔ لابن سید الناسؒ۔ ص:۱۸۴، ج:۳

www.freepdfpost.blogspot.com

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا یہ سفر سردی کے خوشگوار موسم میں ہو رہا ہے۔ سفر کے لیے نئی نویلی آرام دہ اور مکیف (ایئر کنڈیشنڈ) کار میسر ہے، بحمد للہ زادِ راہ وافر ہے، شاندار پختہ سڑک ہے، اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب ۱۲۰ سے ۱۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار کو دوڑا رہے ہیں، پھر بھی کہیں ہلکا سا جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا، اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ اطمینانِ خاطر میسر ہے، کہ انشاء اللہ شام تک تبوک پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہی لق و دق اور دل اُلٹ دینے والا صحرا تھا، سنبلہ کی قیامت خیز گرمی تھی جس میں آسمان آگ برساتا اور زمین شعلے اُگلتی ہے، نہ سڑک تھی، نہ کاریں، نہ گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام۔ ایسی گرمی کے عالم میں سرکارِ دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار صحابہؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر متواتر دو ہفتے سے زیادہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے اس وحشت ناک صحراء کو قطع فرمایا تھا، جہاں دور دور تک کسی جھاڑی کی کوئی پتی بھی نظر نہیں آتی۔ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تو اس غزوے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے لشکر کے نکل جانے کے بعد تن تنہا پیدل روانہ ہو گئے تھے۔

اللہ اکبر! آج ان حضرات کے عزم، حوصلے اور تن فراموشی کے تصور ہی سے پسینہ آتا ہے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

اس شاہراہ پر کچھ دیر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ایک موڑ آیا، معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک سڑک مدائن صالح علیہ السلام کی طرف جا رہی ہے، اور وہ یہاں سے صرف چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی بستی تھی۔ جہاں قومِ ثمود اپنے تعمیری عجائبات کے ساتھ آباد رہی ہے، اور پھر حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب اور متواتر نافرمانیوں کی پاداش میں اُن پر لرزہ خیز عذاب نازل ہوا۔ اُن کی بستی کے آثارِ قدیمہ اب تک یہاں نظر آتے ہیں اور ہمارے رفقاء میں سے قاری بشیر احمد صاحب اور عطاء الرحمٰن صاحب انہیں دیکھ چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ پہاڑوں میں بنے ہوئے مکانات کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں، ایک خیال یہ تھا کہ یہ بستی بھی دیکھ کر جانی چاہیے

لیکن عذاب الٰہی کی اس جگہ کو باقاعدہ مقصود بنا کر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ روایات میں پڑھا تھا کہ جب تبوک جاتے ہوئے آنحضرت ﷺ اس بستی کے قریب سے گذرے تو آپ ﷺ نے چہرے پر کپڑا لٹکایا، ناقہ کو تیز فرمادیا، اور صحابہ کرامؓ کو تاکید فرمائی کہ کوئی شخص ان کے کسی مکان میں نہ داخل ہو، نہ یہاں کا پانی پیے، نہ اس سے وضو کرے، اور جن حضرات نے غلطی یا لاعلمی سے پانی لے لیا تھا، اس سے آٹا گوندھ لیا تھا، ان کو حکم ہوا کہ وہ پانی گرادیں، اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلادیں، اور وہاں سے سرنگوں ہوتے ہوئے گذر جائیں۔

(صحیح بخاری وفتح الباری۔ ص:۲۶۸، ج:۶)

آنحضرت ﷺ کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کے نزول کے مقامات سے بحالتِ استغفار گزرنا چاہیے، خدا جانے ان مقامات میں روحانی طور پر کیسے زہریلے اثرات ہوتے ہوں گے، جن سے بچانے کے لیے آپ ﷺ نے اس طرزِ عمل کی تاکید فرمائی۔

تیماء میں:

بہرکیف! ہم اس معذب بستی کی طرف نہیں مُڑے۔ اور تبوک کی شاہراہ پر سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو ڈھائی بجے سہ پہر تک مسلسل سفر کرنے کے بعد تیماء کا شہر آیا، اور ہم نے یہاں رُک کر نمازِ ظہر ادا کی، اور ایک ترکی ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔

تیماء کا شہر بھی قدیم شہر ہے، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے، یہاں بھی یہودی کافی تعداد میں آباد تھے، جب آنحضرت ﷺ نے خیبر اور وادی القریٰ فتح فرمالیا تو یہاں کے لوگوں نے خود آکر جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تھی، اور اس طرح یہ علاقہ بھی صلحاً آپ ﷺ کے زیرِ نگیں آگیا تھا، اور آپ ﷺ نے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو یہاں کا گورنر مقرر فرمادیا تھا۔[1] عرب کا مشہور قبیلہ بنو طی

[1] عیون الاثر۔ ص:۱۸۸، ج:۲

www.freepdfpost.blogspot.com

(جس کے حاتم طائی مشہور ہیں)، تیماء سے کچھ ہی فاصلے پر آباد تھا۔[1] یہاں مشہور یہودی سردار سموئل بن عادیا کا قلعہ بھی واقع تھا۔[2] جس کے اشعار دیوانِ حماسہ میں آئے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے خیبر کی فتح کے بعد وہاں کے یہودیوں کی یہ درخواست قبول فرمالی تھی کہ خیبر کی زمینیں انہی یہودیوں کو بٹائی پر دے دی جائیں، چنانچہ وہاں کی زمینیں یہودی ہی کاشت کرتے رہے، اور آمدنی کا نصف حصہ مسلمانوں کے پاس جاتا رہا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں بھی خیبر کے یہودیوں سے یہی معاملہ برقرار رہا۔ لیکن ان کی فطری شرارتیں مختلف اوقات میں اپنا رنگ دکھاتی رہیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے خیبر گئے تو یہاں کے یہودیوں نے اُن پر رات کے وقت حملہ کیا جس سے ان کے ہاتھوں پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے ان یہودیوں کے ساتھ بٹائی کا معاملہ ختم فرما کر ان کو خیبر سے نکال دیا۔ اُس وقت یہ لوگ تیماء میں آ کر آباد ہو گئے۔[3]

تیماء میں سردی خاصی شدید تھی، کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے عصر کا وقت قریب آ گیا، چنانچہ عصر کی نماز یہیں کی ایک مسجد میں ادا کی، لیکن وضو کیا تو پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔

نمازِ عصر کے بعد پھر سفر شروع ہوا، پھر وہی حد نظر تک پھیلا ہوا، صحرا سامنے تھا، اب گاڑی مولوی امین اشرف سلمہٗ چلا رہے تھے، اور اس کوشش میں تھے کہ مغرب تک کسی طرح تبوک پہنچ جائیں، سڑک صاف تھی، اس لیے تیز رفتاری میں زیادہ دشواری بھی نہ تھی، چنانچہ سورج غروب ہوتا دکھائی دیا تو ساتھ ہی شہر تبوک کے آثار نظر آنے لگے، اور بفضلہٖ تعالیٰ نمازِ مغرب ہم نے تبوک پہنچ کر ہی ادا کی۔

---

[1] فتح الباری۔ ص: ۴۴۰، ج: ۵

[2] معجم البلدان للحموی۔ ص: ۶۷، ج: ۲

[3] صحیح بخاری، کتاب الشروط مع فتح الباری۔ ص: ۴۴۰، ج: ۵

(۳)

تبوک میں ایک رات

ہم مغرب کے وقت تبوک پہنچے تھے، اور وہ رات ہمیں تبوک ہی میں گذارنی تھی۔ ہمارے رفیق سفر جناب قاری بشیر احمد صاحب نے یہاں کے مرکزی بازار میں ایک صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ دن بھر کے سفر سے تھکن اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، لہٰذا ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر بڑی راحت محسوس ہوئی، لیکن تصور یہ بندھا ہوا تھا کہ ہم اتنے آرام و راحت کے ساتھ شاندار کار میں صرف دن بھر کا سفر طے کر کے اتنے تھک گئے، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء نے یہ لق و دق صحرا شدید گرمی کے موسم میں اونٹوں پر طے فرمایا تھا۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہاں سردی مدینہ منورہ سے کافی زیادہ تھی، عشاء کے وقت گرم پانی سے وضو کر کے ہم اُس مقدس مسجد کی طرف روانہ ہوئے جو آنحضرت ﷺ کی خیمہ گاہ پر بنائی گئی ہے، یہ مسجد ہوٹل سے کچھ فاصلے پر تھی، اس لیے کار میں جانا پڑا۔ نمازِ عشاء الحمدللہ اسی مسجد میں ادا کی، اس وقت تو مسجد بڑی طویل و عریض اور شاندار ہے، لیکن اس کے ہال کے بیچوں بیچ چھت میں ایک مربع نشان بنا ہوا ہے، جو اس بات کی علامت ہے، کہ تبوک کے مقام کے دوران آنحضرت ﷺ کا خیمۂ مبارک اس جگہ پر نصب تھا۔

تبوک اس وقت تو ایک جدید انداز کا شہر ہے، جو چھوٹا ہونے کے باوجود بڑا خوبصورت، بارونق اور جدید تمدنی سہولیات سے آراستہ ہے، لیکن عہد رسالت ﷺ میں یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، اور یہاں پانی کا ایک چشمہ تبوک کہلاتا تھا، اسی کے نام پر بستی تبوک کے نام سے مشہور ہو گئی۔ غزوۂ تبوک کا سفر آنحضرت ﷺ کے تمام سفروں میں غالباً سب سے زیادہ پُر مشقت سفر تھا۔ اور اس کی وجہ یہ پیش آئی تھی کہ ۹ ھ میں عرب کے

www.freepdfpost.blogspot.com

عیسائیوں نے روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس یہ لکھ بھیجا تھا کہ حضرت محمد (ﷺ) کا (معاذ اللہ) انتقال ہوگیا ہے، لوگ قحط زدہ ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں، لہٰذا عرب پر حملہ کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا۔ ہرقل نے یہ سن کر فوراً تیاری کا حکم دے دیا، اور چالیس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر جرار حملے کے لیے تیار ہوگیا۔[1]

دوسری طرف شام کے کچھ نبطی سوداگر زیتون فروخت کرنے کے لیے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ ہرقل نے آپ پر حملے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار کیا ہے، جس کا ہراول دستہ بلقاء تک پہنچ چکا ہے، اور ہرقل نے اپنی فوج کو سال بھر کی تنخواہیں بھی تقسیم کردی ہیں۔[2] آنحضرت ﷺ نے یہ خبر سن کر بہ نفس نفیس تبوک تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمایا، اور صحابہ کرامؓ کو تیاری کا حکم دے دیا۔

وہ وقت صحابہ کرام کے لیے شدید آزمائش کا وقت تھا، روم جیسی اُس دور کی سپر پاور سے مقابلہ، صحرائے عرب میں گرمی کے شباب کا وہ زمانہ جس میں آسمان شعلے برساتا اور زمین آگ اُگلتی ہے، تقریباً آٹھ سو کلومیٹر کا فاصلہ جو وحشت ناک صحراؤں سے گذرتا تھا، سواریوں کی قلت، معاشی خستہ حالی اور مدینہ منورہ میں کھجوریں پکنے کا موسم، گویا سال بھر کی سخت محنت کا پھل اِسی زمانے میں کھجوروں کی شکل میں سامنے آنے والا تھا، جس پر سال بھر کی معیشت کا دارومدار تھا، ایسی حالت میں مدینہ منورہ سے سفر اختیار کرنا مزید معاشی مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

لیکن یہ سرکارِ دوعالم ﷺ اور آپ ﷺ کے فداکار صحابہ کرامؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ ان تمام مشکلات کو عبور کرکے اس صبر آزما سفر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے بہت سے معجزات ظاہر ہوئے، بالآخر تبوک میں اسی جگہ قیام فرمایا جہاں آج یہ مسجد بنی ہوئی ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد۔ ص:۱۹۱، ج:۶۔ بحوالہ معجم طبرانی، وفتح الباری۔ ص:۸۵، ج:۸۔

[2] طبقات ابن سعد۔ ص:۱۱۹، ج:۲

آنحضرت ﷺ نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا، لیکن ہرقل کی طرف سے کوئی مقابلہ پر نہیں آیا۔ بظاہر جنگ نہیں ہوئی، لیکن آپ ﷺ کے اتنی قربانیاں دے کر یہاں تشریف لانے سے اسلامی فتوحات کے سلسلے میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ دشمنوں پر مسلمانوں کا رعب طاری ہوا، اور آس پاس کے قبائل خود حاضر ہوکر مطیع ہوئے، شام ہی کے علاقوں جرباء، اِذرح اور ایلہ کے حکمرانوں نے خود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر صلح کی، اور جزیہ ادا کرنے پر راضی ہوئے۔ آپ ﷺ نے انہیں صلح نامہ لکھ کر دیا۔

یہیں سے آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہٗ کو چار سو سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل روانہ فرمایا۔ دومۃ الجندل بھی ہرقل کے زیر نگیں تھا، اور اس کا فرماں روا اکیدر شاہِ روم کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خالدؓ کو بھیجتے وقت ان سے فرمایا تھا کہ جب تم دومۃ الجندل پہنچوگے تو اس کا حاکم اکیدر تمہیں شکار کرتا ہوا ملے گا، تم اسے قتل کرنے کے بجائے گرفتار کرکے میرے پاس لے آنا، چنانچہ جب حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کے قلعے کے قریب پہنچے تو اکیدر گرمیوں کی چاندنی رات میں قلعے کی فصیل پر بیٹھا گانے سن رہا تھا، اچانک اُس نے دیکھا کہ ایک نیل گائے قلعہ کے پھاٹک سے ٹکر مار رہی ہے، اکیدر فوراً اپنے بھائی وغیرہ کے ہمراہ اس کے شکار کے لئے قلعے سے اُترا، اور گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے پیچھے دوڑا، اُدھر سے حضرت خالد بن ولیدؓ آپہنچے، اکیدر کا بھائی حسان مارا گیا، اور حضرت خالدؓ اکیدر کو گرفتار کرکے آنحضرت ﷺ کے پاس لے آئے۔ اکیدر نے آنحضرت ﷺ سے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں، اور چار سو نیزے دینے کا معاہدہ کرکے صلح کی۔[1] اور جزیہ ادا کرکے اسلامی ریاست کے تابع بننا منظور کیا۔

تبوک کی اس مسجد میں جسے وہاں مسجد النبی ﷺ کہا جاتا ہے۔ پہنچنے

---

[1] عیون الاثر۔ لابن سید الناس۔ ص:۲۸۲ و ۲۸۳

www.freepdfpost.blogspot.com

کے بعد غزوۂ تبوک کے یہ تمام واقعات بزمِ خیال پر چھائے رہے، اور ان کے تصور سے ایک عجیب کیف و سرور محسوس ہوتا رہا۔ **اللّٰھم صلّیٰ علیٰ سیّدنا و مولانا محمد النبی الأمی و علیٰ آلہٖ واصحابہٖ و بارک وسلم.**

نمازِ عشاء کے بعد ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، تبوک سے کچھ فاصلے پر سعودی فوج کی چھاؤنی ہے، اور پاکستانی فوج کی ایک خاصی تعداد وہاں مدت سے مقیم ہے، اس لیے تبوک میں پاکستانیوں کی آمد و رفت کافی رہتی ہے۔ چنانچہ یہاں پاکستانی ریسٹورنٹ بھی کافی ہیں۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک بھی پاکستانی تھے، ہمارے رفیقِ سفر قاری بشیر احمد صاحب کے دوست۔ رات کا کھانا انہی کی طرف سے تھا، اور انہوں نے بڑی محبت سے خاص پاکستانی کھانے تیار کرائے تھے، جو دن بھر کی تھکن کے بعد بڑی رغبت سے کھائے گئے۔

کھانے کے بعد مختصر سی چہل قدمی کر کے ہم لوگ جلد ہی سو گئے۔

اگلی صبح (۲؍ جنوری ۱۹۸۶ء) فجر پڑھتے ہی ہم نے مختصر سا ناشتہ کیا اور اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سے اُردن کی سرحد تقریباً سو کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ مولوی عطاء الرحمٰن صاحب نے اپنی تازہ دم ڈرائیونگ کے ذریعے یہ فاصلہ بہت جلد طے کر لیا۔ اس سمت میں سعودی عرب کی سرحدی بستی حالۃ عمار تھی۔ وہاں کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کی چوکیاں بنی ہوئی ہیں، صبح سویرے یہاں ہجوم زیادہ نہ تھا، اس لیے یہ مراحل جلد ہی طے ہو گئے۔ دوبارہ گاڑی میں سوار ہوئے تو چند لمحوں میں ہم سعودی عرب سے نکل کر اُردن کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے، اردن کی سرحدی چوکی مدوّرہ پر دوبارہ کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے گزرنا پڑا، یہاں قدرے دیر لگی۔ اور جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تو دس بج چکے تھے۔

چند گز کا فاصلہ طے کرنے پر دنیا بدلی ہوئی تھی، لوگوں کا لباس، طرزِ گفتگو، سڑکوں اور عمارتوں کا انداز، غرض ہر چیز میں فرق نمایاں تھا۔ مدینہ منورہ سے حالۃ عمار تک کی سڑک اگرچہ چوڑی زیادہ نہیں تھی، لیکن نہایت ہموار اور شاندار تھی، جس پر گاڑی تیرتی

چلی آئی، لیکن اردن میں داخل ہونے کے بعد سڑک کی حالت خستہ تھی اس لیے سفر کی رفتار بھی سُست ہو گئی، ارسفر نسبتاً پُر مشقت بھی ہو گیا، جگہ جگہ سڑک کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لیے بار بار نیم پختہ راستوں پر اُترنا پڑتا تھا۔ سرحد سے عمان تقریباً دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اور یہ سارا راستہ خشک صحراؤں اور چٹانوں سے بھرپور ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایسی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں جن سے فاسفورس یا سفید پتھر نکل رہا ہے، لیکن اس راستے پر سبزہ نام کو بھی نظر نہیں آتا۔ تقریباً تین گھنٹے اسی سڑک پر سفر جاری رہا۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی بستیاں اور شہر گذرتے رہے۔ بالآخر تقریباً ایک بجے اردن کے دارالحکومت عمان کے آثار نظر آنے شروع ہوئے۔

عمان میں:

عمان میں داخل ہو کر راستوں کا تو کچھ علم نہ تھا، بعض راہگیروں سے پوچھ پوچھ کر ایک ہوٹل میں پہنچے اور وہیں قیام کیا سردیوں کا چھوٹا دن تھا، نمازِ ظہر اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو عصر ہو چکی تھی، نمازِ عصر کے بعد یہاں کے ایک مشہور کتب خانے ''دارالبشیر'' جانے کا خیال تھا، وہاں سے بعض احباب کا پتہ بھی معلوم کرنا تھا، نیچے اُتر کر پتہ پوچھتے پوچھتے ''دارالبشیر'' پہنچ گئے۔ یہ کتب خانہ عمان کے ایک بارونق علاقے ''عبدلی'' میں واقع ہے۔ اور عربی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا بڑا عظیم الشان مرکز ہے۔ یہاں سے شام کے ایک عالم شیخ وہبی سلیمان کا پتہ بھی معلوم ہوا۔ کتب خانے سے ایک صاحب رہنمائی کے لیے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے شیخ وہبی سلیمان تک پہنچا دیا۔ ان سے تقریباً نصف گھنٹہ ملاقات رہی، اور بعض اُمور پر تبادلہ خیال ہوا۔

یہاں سے ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ اردن میں پاکستان کے سفیر اُس وقت ڈاکٹر احسان رشید صاحب تھے، جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، عصر کے وقت ان سے فون پر بات ہوئی اور ان کی خواہش پر رات کا کھانا ان کے یہاں طے ہو گیا تھا، چنانچہ انہوں نے ساڑھے ۷ بجے گاڑی بھیج دی، اور ہم آٹھ بجے کے قریب ان کے گھر پہنچ گئے۔ کھانے

www.freepdfpost.blogspot.com

کے بعد رات گئے تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اردن کے بہت سے حالات معلوم ہوئے اور رات گیارہ بجے کے قریب ہوٹل واپسی ہوئی۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ اس دن ہم عمان اور اس کے مضافات کے خاص خاص مقامات کی زیارت کریں۔ سفیر پاکستان ڈاکٹر احسان رشید صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں کہ انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری ملک افضل صاحب کو رہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ کر دیا، چنانچہ وہ صبح سویرے ہمارے پاس پہنچ گئے۔

رومی اسٹیڈیم

ہوٹل سے نیچے اُترے تو میرے بھانجے مولوی امین اشرف سلمہٗ نے توجہ دلائی کہ ہوٹل کے بالکل برابر میں ایک قدیم اسٹیڈیم بنا ہوا ہے، قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ عہد رسالت ﷺ سے بھی پرانی عمارت کا کھنڈر ہے، جو ٹھیک اسی طرز پر بنی ہوئی ہے، جیسے آج کل کھیلوں کے اسٹیڈیم بنائے جاتے ہیں۔ ملک افضل صاحب نے بتایا کہ یہ رومی دور کا بنا ہوا اسٹیڈیم ہے جو اُس وقت کے مشہور اولمپک کھیلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسٹیڈیم بنانے کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا ہے۔ درحقیقت ''اسٹیڈیم'' ایک یونانی لفظ کی لاطینی ترمیم ہے۔ لاطینی زبان میں اسٹیڈ (STADE) ایک مسافر کا پیمانہ تھا۔ جو تقریباً ۶۰۶ فیٹ کے برابر ہوتی تھی۔ اس دور میں پیدل دوڑ کے جو مقابلے ہوتے تھے، اس کے لیے یہ معیاری مسافت سمجھی جاتی تھی، اور چونکہ دوڑ کے لیے جو میدان بنایا جاتا تھا، وہ ایک اسٹیڈ کی مسافت کا ہوتا تھا، اس لیے اس کا نام ''اسٹیڈیم'' (STADIUM) رکھا گیا۔ شروع میں یہ نام صرف دوڑ کے میدان کے لیے استعمال ہوا۔ لیکن اس دور میں چونکہ دوسرے کھیلوں کے بھی مقابلے ہوتے تھے، اس لیے بعد میں تو سعاً ہر ہر قسم کے کھیلوں کے اسٹیڈیم کہا جانے لگا،[1] اور اس کے ساتھ تماشائیوں کی سہولت کے

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ ص:۲۷۲، ج:۱۲۔ مقالہ ''STADIUM''

لیے سیڑھیوں کے انداز کی نشیبی نشستیں بھی بنائی جانے لگیں۔

یہ اسٹیڈیم جو ہمارے سامنے تھا، اسی انداز پر بنا ہوا تھا، اس میں بنی ہوئی نشیبی نشستیں اب تک باقی ہیں، اور شاہی خاندان کے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے الگ نشستوں کا بھی انتظام ہے۔ اگرچہ عمارت اب ویران پڑی ہے، اور اسے محکمہ آثارِ قدیمہ نے محض سیاحوں کی دلچسپی کے لیے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ ویران کھنڈر بھی رومی دور کے عیش و عشرت کی داستان سناتے ہیں، اور دیدۂ عبرت ہو تو اس کی ایک ایک اینٹ پر ''کل من علیھا فان'' کی ناقابلِ انکار حقیقت کندہ نظر آتی ہے۔ نہ جانے شان و شوکت کے کتنے مجسمے یہاں کتنی مدت تک دادِ عیش دیتے رہے، لیکن عیش و تنعم کی وہ ساعتیں کتنی مختصر تھیں، اور ان کے مقابلے میں فنا و عدم کا زمانہ جواب تک گذرا ہے، وہ کتنا طویل ہے، اور آگے بھی اس کی کوئی انتہاء نہیں۔

بس نامور کہ زیرِ زمیں دفن کردہ اند
خاکش چناں بخورد کمزو استخواں نماند
خیرے کن اے فلان و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

یہاں سے ہم ملک افضل صاحب کی رہنمائی میں روانہ ہوئے، ذہن میں پروگرام یہ تھا کہ عمان کے مضافات میں بعض انبیاء علیہم السلام اور صحابہ اکرامؓ کی بستیاں اور ان کے مزارات ہیں، نیز متعدد تاریخی مقامات واقع ہیں، ان کی زیارت کریں گے۔

گاڑی عمان کی مختلف خوبصورت سڑکوں سے گزرتی رہی، عمان اردن کا دارالحکومت ہے، اور ایک درجن سے زائد پہاڑوں پر اور ان کے دامن میں واقع ہے۔ ان میں سے سات پہاڑ زیادہ بڑے اور نمایاں ہیں، اور شہر کو سات بڑے محلوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہاڑوں اور ان کی وادیوں میں آباد ہونے کی بنا پر شہر میں نشیب و فراز بہت زیادہ ہیں، اور ان کی بنا پر شہر میں ایک منفرد حسن پیدا ہو گیا ہے۔ شہر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شہر کی تقریباً تمام عمارتیں ایک ہی رنگ کے پتھر کی بنی ہوئی ہیں، یہ ایک ہلکا سرمئی

www.freepdfpost.blogspot.com

مائل سفید پتھر ہے جو اردن ہی سے نکلتا ہے، اور بیشتر تعمیرات میں وہی استعمال ہوتا ہے، اس طرح شہر کی عمارتوں میں ایک دلآویز یک رنگی نظر آتی ہے۔

عمان ہزاروں سال پرانا شہر ہے، کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ لوط علیہ السلام کے زمانے تک پہنچتی ہے، اور اُس وقت سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ جس علاقے میں عمان آباد ہے، اُسے بلقاء کہا جاتا تھا، یہ رومی سلطنت کا ایک ڈویژن جیسا تھا جس کا صدر مقام عمان تھا۔ اسی لئے اُسے ''عمان البلقاء'' بھی کہا جاتا ہے، اور حدیث میں اس شہر کا یہی نام آیا ہے۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ عمان بڑا سرسبز و شاداب شہر ہے لیکن اس وقت شہر کو تو زیادہ سرسبز نہیں پایا، البتہ اس کے مضافاتی علاقے کافی زرخیز اور شاداب ہیں۔

حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار پر

عمان شہر سے نکلنے کے بعد ہم سب سے پہلے ایک انتہائی خوبصورت وادی سے ہوتے ہوئے ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے جو اس علاقے میں سب سے بلند چوٹی نظر آتی تھی، اور وہاں سے دور تک پھیلی ہوئی سبز پوش وادیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑ کے کنارے پر ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ ملک افضل صاحب نے بتایا کہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزار اسی مسجد کے ایک کمرے میں واقع ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے تو اس کے ایک کمرے میں ایک نہایت طویل قبر بنی ہوئی تھی، اس کی لمبائی بارہ سے پندرہ گز کے درمیان ہوگی۔ اسی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزارِ مبارک ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادمِ خاص تھے، ان کا اسم گرامی تو اگرچہ قرآن کریم میں مذکور نہیں ہے، لیکن ان کا نام لیے بغیر ان کے متعدد واقعات قرآنِ کریم میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے پر آمادہ کرنا چاہا، اور پوری قوم نے انتہائی سرکشی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کو رد کر دیا تو حضرت یوشع علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو ہمت

دلانے کی کوشش کی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا جو واقعہ سورۂ الکہف میں بیان ہوا ہے، اس میں جو نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق یہی حضرت یوشع علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کو نبوت عطا فرمائی گئی اور بنی اسرائیل کی سربراہی بھی انہی کو عطاء ہوئی، اور فلسطین کے عمالقہ سے جہاد کا جو مشن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ میں تشنۂ تکمیل رہ گیا تھا، وہ آپ ہی کے ہاتھوں پورا ہوا، آپ نے بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین پر قابض جابر و ظالم قوم عمالقہ سے جہاد کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطاء فرمائی اور آپ پوری ارضِ مقدس پر قابض ہو گئے۔ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

اب اس بات کی سو فیصد تحقیق تو قریب قریب ناممکن ہے کہ یہ واقعۃً حضرت یوشع علیہ السلام کی قبر ہے یا نہیں؟ البتہ یہ تمام علاقہ اِسی ارضِ مقدس کا حصہ ہے جسے حضرت یوشع علیہ السلام نے فتح فرمایا تھا، اس لیے یہ بات جو یہاں کے لوگوں میں مشہور چلی آتی ہے، کچھ بعید بھی نہیں۔ قبر کی غیر معمولی لمبائی ہمارے لیے حیران کن تھی۔ لیکن بعد میں اُردن اور شام کے اندر جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مزارات دیکھے، وہاں بھی یہی صورت نظر آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کسی مقدس شخصیت کی تعظیم کے خیال سے اس کی قبر بہت لمبی بنائی جاتی تھی۔ واللہ اعلم۔

بہرصورت! ایک جلیل القدر پیغمبر کے مزار پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، احقر کے لیے سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضۂ اقدس کے بعد کسی پیغمبر کے مزار پر حاضری کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

مسجد سے باہر نکلے تو سردی ناقابلِ برداشت حد تک شدید تھی۔ زبردست برفانی ہوائیں چل رہی تھیں، اور عجب نہیں کہ یہاں درجہ حرارت نقطہ انجماد تک پہنچا ہوا ہو۔ اس لیے باہر زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہ تھا، ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

وادیٔ شعیبؑ میں:

یہاں سے نکل کر ہماری اگلی منزل وادیٔ شعیب تھی، یہ ایک انتہائی خوبصورت وادی ہے، یہاں تک پہنچنے کے لئے کئی پہاڑی راستے طے کرنے پڑتے ہیں، سڑک ایک سرسبز پہاڑ کا طواف کرتی ہوئی چوٹی تک پہنچتی ہے، اس سڑک کے دونوں طرف انجیر اور زیتون کے خوشنما درختوں کی قطاریں سڑک پر سایہ کئے ہوئے ہیں، اور دھوپ چھن چھن کر سڑک تک پہنچتی ہے۔ بالکل اوپر پہنچنے کے بعد یہ وادی شروع ہوتی ہے۔ اِسی وادی میں حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ہے۔

جس جگہ یہ مزارِ مبارک واقع ہے، وہ آج کل ایک فوجی مرکز کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، اور ممنوعہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن ملک افضل صاحب خصوصی طور پر اجازت لے کر ہمیں اندر لے گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑے تو ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی، اس مسجد کے اندر حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ہے۔ یہاں حاضر ہو کر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ قبر کی لمبائی یہاں بھی حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار کی طرح غیر معمولی تھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے مصر سے روپوش ہو کر آپؑ ہی کے گھر میں پناہ لی تھی، اور آپؑ کی صاحبزادی سے نکاح کیا تھا جس کا مفصل واقعہ قرآن کریم نے سورۂ القصص میں بیان فرمایا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اُسے قرآنِ کریم میں کہیں ''مدین'' اور کہیں ''اصحاب الأیکہ'' کہا گیا ہے، بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ قومیں تھیں، اور آپؑ پہلے مدین اور پھر اصحاب الأیکہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی ہے کہ اور ان کا رجحان اس طرف ہے کہ مدین اردن کی حدود میں واقع ہے، اور ایکہ تبوک کا دوسرا نام ہے۔[1] اور بعض مفسرین کا کہنا یہ

[1] ارض القرآن۔ ص: ۲۶۶، ج: ۲

ہے کہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں، مدین اس قوم کا نسبی نام ہے، کیونکہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک صاحبزادے تھے، اور یہ قوم انہی کی نسل سے تھی، اور ''اصحاب الایکہ'' (بن والے) ان کا جغرافیائی نام تھا۔ یہ لوگ جس جگہ آباد تھے، وہاں نہایت گھنا جنگل تھا، اسی لئے ان کو ''اصحاب الایکہ'' کہتے تھے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اِسی طرف ہے۔[1]

حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف اس مزار کی نسبت کس حد تک درست ہے؟ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یمن کے شہر حضرموت کے قریب شبام کے مقام پر بھی ایک قبر حضرت شعیب علیہ السلام سے منسوب بتائی جاتی ہے، لیکن عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں اس نسبت کو مشتبہ قرار دیا ہے۔[2]

قیاس کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر یمن میں نہیں اردن یا شام کے کسی علاقے میں ہونی چاہیے، کیونکہ مدین اور ایکہ خواہ ایک ہی جگہ کے دو نام ہوں، یا الگ الگ مقامات ہوں، بہرصورت! ان کا محل وقوع عرب کے شمال مغربی حصے اور اردن و فلسطین کے درمیان ہی بتایا گیا ہے۔ لہٰذا یمن کا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں مقامی طور پر مشہور یہ ہے کہ جس جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار واقع ہے، یہ مدین ہی کا علاقہ ہے، بلکہ جب ہم حضرت شعیب علیہ السلام کے مزار سے باہر نکلے تو ہمیں افضل ملک صاحب نے ایک چھوٹا سا کنواں دکھایا جو من کے بغیر تھا، اور اس پر ایک لوہے کا ڈھکن اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ وہ اوپر سے ایک گٹر معلوم ہوتا تھا، ملک صاحب نے بتایا کہ یہاں مشہور یہ ہے کہ یہ مدین کا وہی کنواں ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ''وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ'' کے نام سے آیا ہے، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں پانی بھرنا چاہ رہی تھیں، اور ہجوم کی وجہ سے بھر نہیں

[1] قصص القرآن۔ ص: ۳۴۵، ج: ۱

[2] قصص الانبیاء۔ عبدالوہاب نجار۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سکتی تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پانی بھر کر دیا، اور یہیں سے حضرت شعیب علیہ السلام کے خاندان کے ساتھ ان کے تعارف کی ابتداء ہوئی۔

کیا یہ کنواں واقعی وہی کنواں ہے؟ اس کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کا کوئی راستہ نہیں، لیکن قرائن سے یہ بات کافی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کے انداز سے مترشح یہ ہوتا ہے کہ وہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کی رہائش گاہ سے قابل ذکر فاصلے پر واقع تھا، مگر یہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کے مزار سے تقریباً پچیس تیس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہاں اس کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ آپ کا مزار آپ کی اس رہائش گاہ میں نہ ہو جس میں آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مقیم تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

بہرکیف! ہم نیاز مندوں کے لیے یہ متحمل نسبت ہی کیا کم تھی؟ یہ پوری سرزمین انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے، اور یہاں پہنچ کر دیدہ و دل کو حاصل ہونے والا کیف و سرور لفظ و بیان کی حدود سے ماوراتھا، اور دل کا تقاضا وہ یہ کہ ؎

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

اغوار میں:

اردن کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ اس کے مغرب میں فلسطین اور بیت المقدس واقع ہیں جو آج کل ہماری شامتِ اعمال سے اسرائیل کے قبضے میں ہیں، اور دریائے اردن کے مغربی کنارے کے پیچھے تمام تر پہاڑی علاقہ ہے، دوسری طرف مشرق میں بھی پہاڑی علاقے ہیں، ان دونوں پہاڑی علاقوں کے درمیان ایک درمیانی علاقہ شمالاً جنوباً چلا گیا ہے۔ جو دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، اور بڑا زرخیز علاقہ ہے، اس علاقے کو اغوار (نشیبی علاقہ) کہا جاتا ہے، اور یہاں متعدد صحابہ کرامؓ کے مزارات اور تاریخی مقامات واقع ہیں۔

وادیٔ شعیب علیہ السلام سے نکل کر ہم اغوار کی طرف روانہ ہوئے اور سب سے پہلے اس علاقے کے ایک چھوٹے شہر ''الشونۃ الجنوبیۃ'' پہنچے، یہاں سے ایک سیدھی سڑک

شمال کی طرف گئی ہے۔ جس کے دائیں طرف (مشرق میں) چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے، اور بائیں طرف (مغرب میں) چند کلومیٹر تک میدانی علاقہ ہے، جس میں دور تک کھیتوں اور باغات کے سلسلے نظر آتے ہیں، ان کھیتوں اور باغات کی انتہاء دریائے اردن پر ہوتی ہے جس کے مغربی سرے پر فلسطین اور نابلس کے سربفلک پہاڑ نظر آتے رہتے ہیں جو اس وقت اسرائیل کے قبضے میں ہیں۔

ہم الشونۃ الجنوبیہ سے ذرا آگے بڑھے تو ایک چھوٹی سی بستی کے کنارے ایک چھوٹی سی خستہ حال مسجد نظر آئی جس کے مینار پر گولیوں کے نشانات ہیں، معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے کہ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلی فوجیں یہاں تک گھس آئی تھیں، اس علاقے کو اسرائیلی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اردن کی افواج نے جان کی بازی لگادی تھی، اور بالآخر بہت سے جانبازوں نے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے اسے اسرائیل سے آزاد کرالیا، اور اسرائیلی فوجیں دریائے اردن کے اس پار پسپا ہوگئیں۔

جمعہ کا دن تھا، اور ہم جمعہ کی نماز ''مسجد ابوعبیدہؓ'' میں پڑھنا چاہتے تھے جس میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا مزار واقع ہے، اس لیے تیزی سے سفر کرتے ہوئے ہم تقریباً پونے بارہ بجے دوپہر ''مسجد ابوعبیدہؓ'' پہنچ گئے۔

.....☆.....☆.....

(۳)

نمازِ جمعہ ہم نے اسی مسجد میں ادا کی جو ''مسجد ابی عبیدۃ بن الجراحؓ'' کے نام سے مشہور ہے، اور جس کے ایک حصے میں امین اُمت حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ آرام فرما ہیں۔

یہ مسجد کافی کشادہ ہے، اور خطبہ جمعہ میں نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ مسجد بھر گئی، امام صاحب خطبے میں جہاد کے فضائل اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی پستی کے

www.freepdfpost.blogspot.com

اسباب بڑے مؤثر انداز میں بیان فرمارہے تھے، لیکن نماز کا جو وقت مقرر تھا، اِسی پر خطبہ ختم کر کے نماز شروع کر دی۔

نماز کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں دائیں جانب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہٗ کے مزار پر حاضری کی سعادت ملی۔ نبی کریم سرورِ دوعالم ﷺ کے اس جاں نثار صحابیؓ کے مزار پر حاضری کے وقت دل کی جو کیفیت تھی وہ ناقابلِ بیان ہے، عہدِ رسالت ﷺ اور اس کے بعد کے کتنے واقعات ذہن کے دریچوں کو روشن کر رہے تھے۔ ایک انمول تاریخ تھی جس کے اوراق چند لمحوں میں نگاہوں کے سامنے اُلٹتے چلے گئے، اور دل میں عقیدت و کتب کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔

حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ:

حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہٗ آنحضرت ﷺ کے اُن جلیل القدر صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کی ذاتِ گرامی اُس دور کے تمام اعلیٰ فضائل و مناقب کا مجموعہ تھی۔ آپ سابقین اوّلین میں سے ہیں، اور اس وقت اسلام لے آئے تھے جب مسلمانوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ آپؓ اُن دس خوش نصیب صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے، اور جن کو خود سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔ آپؓ کا شمار اُن صحابہ کرامؓ میں بھی ہے جنہیں دو مرتبہ ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار آپؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور دوسری بار مدینہ منورہ کی طرف۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ، آپ ﷺ کے غزوات میں ہمیشہ نہ صرف شامل رہے، بلکہ ہر موقع پر اپنی جانبازی، عشقِ رسول ﷺ اور اطاعت و اتباع کے اَنمٹ نقش قائم فرمائے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر ان کے والد کفارِ مکہ کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے، اور جنگ کے دوران اپنے بیٹے (حضرت ابوعبیدہؓ) کو نہ صرف تلاش کرتے تھے

بلکہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اُن کا آمنا سامنا ہو جائے، حضرت ابوعبیدہؓ اگرچہ اپنے والد کے کفر سے بے زار تھے، لیکن یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اُن پر اپنے ہاتھ سے تلوار اُٹھانی پڑے، اس لیے جب کبھی وہ سامنے آ کر مقابلہ کرنا چاہتے تو یہ کترا جاتے، لیکن باپ نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا، اور بالآخر انہیں مقابلہ کرنا ہی پڑا، اور جب مقابلہ سر پر آ ہی گیا تو اللہ تعالیٰ سے جو رشتہ قائم تھا، اس کی راہ میں حائل ہونے والا ہر رشتہ ٹوٹ چکا تھا، باپ بیٹے کے درمیان تلوار چلی، اور ایمان کفر پر غالب آ گیا۔ باپ بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔[1]

غزوۂ اُحد کے موقع پر جب کفار کے ناگہانی حملے میں سرکارِ دوعالم ﷺ کے مغفر کے دو حلقے آپ ﷺ کے رُخسارِ مبارک میں اندر گھس گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے انہیں اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا، یہاں تک کہ اس کشمکش میں حضرت ابوعبیدہؓ کے سامنے کے دو دانت گر گئے۔ دانت گر جانے سے چہرے کی خوشنمائی میں فرق آ جانا چاہیے تھا، لیکن دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کے دانتوں کے گرنے سے حضرت ابوعبیدہؓ کے حسن میں کمی آنے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ کوئی شخص جس کے سامنے کے دانت گرے ہوئے ہوں حضرت ابوعبیدہؓ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گیا۔[2]

جب یمن کے لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے اپنے درمیان کوئی معلم بھیجنے کی درخواست کی تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "**هذا أمين هذه الأمة**" (یہ اس اُمت کے امین ہیں)[3]، اور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد تو صحیحین میں مروی ہے کہ:

---

[1] الاصابہ للحافظ ابن حجرؒ۔ ص: ۲۴۴، ج: ۳

[2] مستدرک الحاکم۔ ص: ۲۶۶، ج: ۳، وطبقات ابن سعد، ص: ۲۹۸، ج: ۳

[3] الاصابہ۔ ص: ۲۴۳، ج: ۲۔ بحوالہ مسند احمد

www.freepdfpost.blogspot.com

لكل أمّة أمين، وأمين هذه الامة أبو عبيدة ابن الجراح

''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس اُمت کے امین ابوعبیدہ ابن جراح ہیں۔''

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ ''آنحضرت ﷺ کو اپنے صحابہؓ میں سب سے زیادہ محبوب کون تھے؟'' حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ''ابوبکرؓ'' پوچھا گیا کہ ''ان کے بعد کون؟'' فرمایا: ''عمرؓ'' پھر پوچھا گیا کہ ''ان کے بعد کون؟'' اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''ابوعبیدہ ابن جراحؓ''۔[1]

حضرت حسن بصریؒ (مرسلاً روایت) فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مامنكم من أحد إلالو شئت لأخذت عليه بعض خلقه، إلّا أباعبيدة،

تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ میں چاہوں تو اس کے اخلاق میں کسی نہ کسی بات کو میں قابل اعتراض قرار دے سکتا ہوں، سوائے ابوعبیدہؓ کے۔[2]

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں صحابہ کرامؓ کا اجتماع ہوا، اور خلافت کی بات چلی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے دو نام پیش فرمائے، ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اور دوسرے حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کا، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ کی موجودگی میں کسی اور پر اتفاق ہونے کا سوال ہی نہ تھا، مسلمان آپؓ ہی پر متفق ہوئے، لیکن اس موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ کا نام صدیق اکبرؓ کی طرف سے پیش ہونا واضح کرتا ہے کہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی نگاہ میں آپ کا مقام کیا تھا؟

حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد خلافت میں شام کی مہمات حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ ہی کے سپرد فرمائی تھیں، چنانچہ اردن اور شام کا بیشتر علاقہ آپؓ ہی کے مبارک

[1] جامع الترمذی، ابواب المناقب، حدیث نمبر ۳۶۵۷ و سنن ابن ماجہ، مقدمہ، حدیث نمبر ۱۰۲

[2] مستدرک الحاکم۔ص: ۲۶۶، ج: ۳۔ والاصابہ للحافظ۔ص: ۲۴۴، ج: ۲

ہاتھوں پر فتح ہوا۔ بیچ میں جب غزوۂ یرموک کے موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو عراق سے شام بھیجا تو اس وقت حضرت خالدؓ کو شام کی مہمات کا امیر بنا دیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت کے آغاز ہی میں حضرت خالدؓ کو امارت سے معزول کر کے آپؓ کو امیر بنا دیا، اور پھر سارا شام آپ کی سرکردگی میں فتح ہوا، اور حضرت خالدؓ آپ کی ماتحتی میں شریک جہاد رہے۔[1] اور آپ نے حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے گورنر کے فرائض انجام دیئے۔

شام کا خطہ اپنی زرخیزی، آب وہوا، اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے عرب کے صحرانشینوں کے لیے ایک جنت ارضی سے کم نہ تھا، دوسری طرف یہاں اس وقت کے لحاظ سے انتہائی متمدن تہذیب یعنی رومی تہذیب کا دور دورہ تھا، لیکن ان صحابہ کرامؓ نے سرکار دو عالم ﷺ کے فیض صحبت سے جو انمٹ رنگ اپنے قلب ودماغ پر چڑھا لیا تھا، اس میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ شام کی رنگینیاں اُن کے زہد وقناعت، دنیا بیزاری اور آخرت کی ہمہ وقتی فکر پر ذرّہ برابر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ اس بات کا اندازہ حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے سے ہوگا۔

جب حضرت ابوعبیدہؓ شام کے گورنر تھے، تو اِسی زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لائے، ایک دن حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ ''مجھے اپنے گھر لے چلئے۔''[2]

حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب دیا: ''آپ میرے گھر میں کیا کریں گے؟ وہاں آپ کو شاید میری حالت پر آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو؟''

لیکن جب حضرت عمرؓ نے اصرار فرمایا تو حضرت عمرؓ کو اپنے گھر لے گئے، حضرت عمرؓ

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ص: ۹۴، ج: ۷۔

[2] حضرت عمرؓ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی تھی کہ کہیں ان کے گورنر بیرونی تہذیبوں سے متاثر ہو کر زیادہ عیش وعشرت میں نہ پڑ گئے ہوں، اس لیے شاید حضرت ابوعبیدہ کا گھر دیکھنے کے پیچھے یہی فکر کارفرما ہو۔

www.freepdfpost.blogspot.com

گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی سامان ہی نظر نہ آیا، گھر ہم قسم کے سامان سے خالی تھا۔
حضرت عمرؓ نے حیران ہو کر پوچھا:

''آپ کا سامان کہاں ہے؟ یہاں تک بس ایک نمدہ، ایک پیالہ، ایک مشکیزہ نظر آ رہا ہے، آپ امیر شام ہیں، آپ کے پاس کھانے کی بھی کوئی چیز ہے؟''

یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ ایک طاق کی طرف بڑھے، اور وہاں سے روٹی کے کچھ ٹکڑے اُٹھا لائے، حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو رو پڑے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا:

''امیر المومنین! میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ میری حالت پر آنکھیں نچوڑیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کے لیے اتنا اثاثہ کافی ہے جو اُسے اپنی خواب گاہ (قبر) تک پہنچا دے۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ابوعبیدہؓ! دنیا نے ہم سب کو بدل دیا، مگر تمہیں نہیں بدل سکی۔''[1]

اللہ اکبر! وہ ابوعبیدہؓ جس کے نام سے قیصر روم کی عظیم طاقت لرزہ براندام تھی، جس کے ہاتھوں روم کے عظیم الشان قلعے فتح ہو رہے تھے، اور جس کے قدموں پر روزانہ رومی مال و دولت کے خزانے ڈھیر ہوتے تھے، وہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر زندگی بسر کر رہا تھا[1] دنیا کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر اُسے اتنا ذلیل و رسوا کسی نے کیا تو وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے یہی جاں نثار تھے۔

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی

حضرت ابوعبیدہؓ اُن خوش نصیب حضرات میں سے تھے جو نبی صادق و مصدوق ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنے جنت میں جانے کی بشارت سن چکے تھے، اور آنحضرت ﷺ کی کسی خبر پر ادنیٰ تردّد کا بھی ان کے یہاں کوئی سوال نہ تھا۔

---

[1] سیر اعلام النبلاء، للذہبیؒ۔ ص: ۱۷، ج: ۱۔ بحوالہ سنن ابی داؤد بروایت ابن الاعرابی۔ اس واقعے کا اختصار امام ابونعیمؒ کی حلیۃ الاولیاء۔ ص: ۱۰۱ و ۱۰۲، ج: ۱۔ مصنف عبدالرزاق (حدیث نمبر ۲۰۶۲۸) اور امام احمدؒ کی کتاب الزہد ص: ۱۸۴ میں بھی مروی ہے۔

اس کے باوجود خشیت الٰہی کا عالم یہ تھا کہ بعض اوقات فرماتے تھے کہ:

وددت انی کنت کبشاء فبذ بحنی أهلی، فیأکلون لحمی، ویحسون مرقی،[1]

''کاش کہ میں ایک مینڈھا ہوتا، میرے گھر والے مجھے ذبح کر کے میرا گوشت کھاتے اور میرا شوربا پیتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اتنے قدر دان تھے کہ ایک مرتبہ جب اپنے بعد خلیفہ کے تقرر کا سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ: ''اگر ابوعبیدہؓ کی زندگی میں میرا وقت آ گیا تو مجھے کسی سے مشورے کی بھی ضرورت نہیں، میں ان کو اپنے بعد خلیفہ بنانے کے لیے نامزد کر جاؤں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس نامزدگی کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں عرض کر سکوں گا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہر اُمت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس امت کے امین ابوعبیدہؓ ابن الجراح ہیں۔''[2]

جب اردن اور شام میں وہ تاریخی طاعون پھیلا جس میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

سلام علیک، أما بعد، فإنه قد عرضت لی إلیک حاجة أرید أن أشافهک بها فعزمت علیک إذا نظرت فی کتابی هذا أن لا تضعه من یدک حتی تقبل الیّ،

''سلام کے بعد! مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی ہے جس کے بارے میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا میں پوری تاکید کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ جونہی آپ میرا یہ خط دیکھیں تو اُسے اپنے ہاتھ سے رکھتے ہی فوراً میری طرف روانہ ہو جائیں۔''

---

[1] سیر اعلام النبلاء۔ ص: ۱۸، ج: ۱۔ و طبقات ابن سعد۔ ص: ۳۰۰، ج: ۳

[2] مسند احمد۔ ص: ۱۸، ج: ۱ و مستدرک حاکم۔ ص: ۲۶۸، ج: ۳

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت ابوعبیدہؓ اطاعت امیر کے ساری زندگی پابند رہے، لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ حضرت عمرؓ کی یہ شدید ضرورت (جس کے لیے مجھے مدینہ منورہ بلایا ہے) صرف یہ ہے کہ وہ مجھے اس طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں، چنانچہ یہ خط پڑھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

عرفت حاجة أمير المؤمنين، إنه يريد أن يستبقى من ليس بباق.

میں امیر المومنین کی ضرورت سمجھ گیا، وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کو یہ جواب لکھا:

ياأمير المومنين، إني قدعرفت حاجتک إلي، وإني في جند من المسلمين لاأجد بنفسي رغبة عنهم، فلست أريد فراقهم حتى يقضى الله في وفيهم أمره وقضاءه فخلّني من عزيمتک ياامير المومنين، ودعني في جندي،

امیر المومنین! آپ نے مجھے جس ضرورت کے لئے بلایا ہے، وہ مجھے معلوم ہے، لیکن میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے دل میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا، لہٰذا میں ان لوگوں کو چھوڑ کر اس وقت تک آنا نہیں چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنی تقدیر کا حتمی فیصلہ نہیں فرمادیتا۔ لہٰذا امیر المومنین! مجھے اپنے اس تاکیدی حکم سے معاف فرمادیجئے اور اپنے لشکر ہی میں رہنے دیجئے۔''

حضرت عمرؓ نے خطبہ پڑھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جو لوگ پاس بیٹھے تھے، وہ جانتے تھے کہ خط شام سے آیا ہے، حضرت عمرؓ کو آبدیدہ دیکھ کر انہوں نے پوچھا: ''کیا ابوعبیدہؓ کی وفات ہوگئی؟'' حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ہوئی تو نہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہونے والی ہے۔'' اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرا خط لکھا:

سلام عليک، أما بعد، فإنک أنزلت الناس أرضا عميقة فارفعهم إلى أرض مرتفعة نزهة.

''سلام کے بعد! آپ نے لوگوں کو ایسی زمین میں رکھا ہوا ہے، جو نشیب میں ہیں، اب انہیں کسی بلند جگہ پر لے جایئے جس کی ہوا صاف ستھری ہو۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت ابوعبیدہؓ کو پہنچا تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ امیر المومنین کا یہ خط آیا ہے، اب آپ ایسی جگہ تلاش کیجئے جہاں لے جا کر لشکر کو ٹھہرایا جاسکے، میں جگہ کی تلاش میں نکلنے کے لیے پہلے گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری اہلیہ طاعون میں مبتلا ہوچکی ہیں، میں نے واپس آکر حضرت ابوعبیدہؓ کو بتایا۔ اس پر انہوں نے خود تلاش میں جانے کا ارادہ کیا، اور اپنے اونٹ پر کجاوہ کسوایا، ابھی آپ نے اس کی رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ آپ پر بھی طاعون کا حملہ ہوگیا، اور اسی طاعون کے مرض میں آپ نے وفات پائی۔[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کا یہ مزار مسجد کی دائیں دیوار کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے، اس کمرے میں کچھ پرانے کتبات بھی رکھے ہیں، جو اس جگہ سے برآمد ہوئے تھے، لیکن ان کی عبارتیں صاف پڑھی نہیں جاتیں۔

مسجد سے باہر نکلیں تو دائیں طرف ایک بڑا وسیع وعریض قبرستان ہے جس میں قدیم اور بوسیدہ قبروں کے نشانات دور تک نظر آتے ہیں، یہاں کے مقامی لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ اس میں بہت سے صحابہ کرامؓ اور طاعونِ عمواس کے بہت سے شہداء مدفون ہیں۔ یہاں اجتماعی اور اجمالی طور پر تمام اہل قبور کو سلام عرض کرنے اور ان پر فاتحانہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

---

[1] اس پورے واقعے کے لیے ملاحظہ ہو، البدایۃ والنہایۃ۔ ص:۷۸، ج:۷۔ و سیر اعلام النبلاء ص:۱۸، ۱۹، ج:۱۔ و مستدرک الحاکم۔ ص:۲۶۳، ج:۳

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت ضرار بن ازورؓ:

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کی مسجد سے نکل کر ہم نے شمال کو جانے والی سڑک پر دوبارہ سفر شروع کیا تو ذرا چلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار تھا۔ یہ بھی اُن مجاہد صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کی شجاعت و بسالت کی داستانوں سے شام کی فتوحات کی تاریخ بھری پڑی ہے، واقدی کی فتوح الشام کے تو حضرت ضرار ہیرو ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے خاص ساتھی جن کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ جنگ کے وقت نہ صرف یہ کہ وہ سینے پر زرہ نہیں پہنے تھے، بلکہ قمیص بھی اُتار دیتے تھے، اور ننگے بدن لڑا کرتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک ہے کہ اُن کی وفات کہاں اور کس زمانے میں واقع ہوئی؟ حافظ ابن حجرؒ نے اس بارے میں مؤرخین کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے۔ بعض سے پتہ چلتا ہے کہ جنگِ اجنادین میں ان کی شہادت ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ وہ جنگ یرموک میں شامل تھے اور اس کے بعد دمشق میں ان کا انتقال ہوا[1] واللہ سبحانہ اعلم۔

حضرت شُرحبیل بن حسنہؓ کا مزار:

یہاں سے شمال کی طرف شاید دو تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بائیں ہاتھ پر ایک عمارت نظر آئی، یہ عمارت سرسبز کھیتوں اور باغات کے درمیان واقع ہے، اور اس میں فاتح اُردن حضرت شُرحبیل بن حسنہؓ کا مزار ہے۔

حضرت شُرحبیل[2] بن حسنہؓ اپنی والدہ کی طرف منسوب ہیں جن کا نام حسنہ تھا۔ یہ بھی اوّل دور کے مسلمانوں میں سے ہیں جنہوں نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور بعد میں

---

[1] ملاحظہ ہو۔ الاصابہ۔ ص: ۲۰۰، ج: ۲

[2] شین پر پیش، راء پر زبر، حاء ساکن اور با مکسور ہے۔ بہت سے پڑھا لکھے لوگوں تک کو ان کا نام "شرجیل" (جیم سے) لیتے ہوئے سنا، جو بالکل غلط ہے۔

مدینہ منورہ کی طرف بھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شام کی فتح کے لیے چار مختلف سمتوں سے چار لشکر روانہ فرمائے تھے، ان میں سے ایک لشکر کے سربراہ حضرت شُرحبیل بن حسنہؓ تھے، اور اردن کا بہت بڑا علاقہ آپ ہی کے ہاتھ پر فتح ہوا، آپ کو ایک زمانے میں فلسطین کا گورنر بھی بنا دیا گیا تھا۔ شام کی فتوحات میں آپؓ کی شجاعت و جانبازی اور حسن تدبیر کے واقعات تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، عمواس کا وہ زبردست طاعون جس کا پیچھے ذکر آ چکا ہے، اسی میں حضرت شُرحبیل بن حسنہؓ بھی شہید ہوئے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آپؓ کی وفات بھی ٹھیک اُسی دن واقع ہوئی جس دن حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا[1]

.....☆.....☆.....

(۴)

حضرت شُرحبیل بن حسنہؓ کے مزار سے جنوب کی طرف اور آگے چلیں تو تقریباً ۲۷ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہر "شونہ شمالیہ" سے ذرا پہلے حضرت معاذ بن جبلؓ کا مزار مبارک واقع ہے، ہمیں یہاں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یہ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جس کا فرش اُس وقت بارش کی وجہ سے بھیگا ہوا تھا، اسی مسجد کے شمالی حصے میں حضرت معاذؓ کا مزار ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ وہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے "اعلمهم بالحلال والحرام" (صحابہ کرامؓ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم) قرار دیا۔[2] آپؓ مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، اور ہجرت سے پہلے جب ستر انصارِ مدینہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عقبہ میں بیعت کی تو اُن میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ص: ۹۳ و ۹۴۔ ج: ۷، والاصابہ۔ ص: ۱۴۱، ج: ۲

[2] جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذؓ، حدیث نمبر ۳۷۹۳، و سنن ابن ماجہ، مقدمہ، باب فضائل خبابؓ۔

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت معاذؓ بھی شامل تھے، اُس وقت آپؓ اتنے کمسن تھے کہ داڑھی بھی نہیں نکلی تھی۔ غزوۂ بدر میں آپ بیس سال کے تھے، اور تقریباً تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ البتہ غزوۂ حنین کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو اہل مکہ کی تعلیم کیلئے مکہ مکرمہ چھوڑ دیا تھا۔[1]

آنحضرت ﷺ کو حضرت معاذؓ سے بہت محبت تھی، اور آپ وہ خوش نصیب صحابی ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے آپؓ سے فرمایا: ''اے معاذ! میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے تم سے اللہ کیلئے محبت ہے۔'' حضرت معاذؓ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم یارسول اللہ! مجھے بھی آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو تم ہر نماز کے بعد کہا کرو: ''رَبِّ أَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ۔''[2]

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نعم الرجال أبوبکر، نعم الرجل عمر، نعم الرجل معاذ بن جبل'' یعنی ''ابوبکر اچھے آدمی ہیں، عمر اچھے آدمی ہیں، معاذ بن جبل اچھے آدمی ہیں۔''[3]

آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخر میں حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا، اور آپ ہی سے قضاءِ شرعی کے بارے میں وہ مشہور سوالات فرمائے تھے کہ ''کس طرح فیصلہ کرو گے؟'' حضرت معاذؓ نے فرمایا: ''کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق۔'' آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ: ''اگر رسول کے فیصلے میں بھی کچھ نہ ملے تو کیا کرو گے؟'' حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ: ''اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور حق تک پہنچنے کی کوشش میں کوتاہی نہ کروں گا۔'' آنحضرت ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی کے مطابق ہے۔[4]

---

[1] مستدرک الحاکم۔ص: ۲۷۰، ج:۳، و سیر اعلام النبلاء۔ص: ۴۵۹، ج:۱

[2] سنن النسائی، کتاب الصلوٰۃ فی السہو، نوع آخر من الدعاء، وسنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستغفار، حدیث نمبر ۱۵۲۲

[3] جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ، حدیث نمبر ۳۷۹۷

[4] جامع الترمذی، ابواب الاحکام، حدیث نمبر ۱۳۲۷ و ۱۳۲۸۔

پھر یہی نہیں، جب حضرت معاذؓ کی روانگی کا وقت آیا تو آنحضرت ﷺ انہیں الوداع کہنے کے لیے خود تشریف لے گئے، یہاں تک کہ حضرت معاذؓ کو اپنے سامنے اونٹنی پر سوار کرایا، پھر اسی پر بس نہیں کیا، جب ان کی اونٹنی روانہ ہوگئی تو آپ ﷺ کافی دیر تک ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، آنحضرت ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ اپنے محبوب فدا کار سے میری آخری ملاقات ہے، اور وہ بہت دور جا رہے ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ سے جذبات کا اظہار بہت کم مواقع پر ثابت ہے۔ لیکن یہ حضرت معاذؓ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کا کرشمہ ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کچھ ایسے الفاظ صادر ہوئے جو ایک آنکھوں سے دور ہوتے ہوئے محبوب کو جدا کرتے وقت آپ کے دلی جذبات کے آئینہ دار تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یامعاذ! انک عسی أن لاتلقانی بعد عامی هذا، أولعلک أن تمرّ بمسجدی أوقبری.

معاذ! بہت ممکن ہے کہ شاید اس سال کے بعد مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہو، یا شاید اب تم میری مسجد یا میری قبر کے پاس سے گزرو۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو نہ جانے کب سے اپنے جذبات کو ضبط کئے ہوئے ہوں گے، یہ فقرہ سنتے ہی پھوٹ پڑے۔ شاید پہلے دل کو یہ تسلی دیتے رہے ہوں گے کہ یہ ایک ڈیڑھ سال کی جدائی ہوگی، لیکن جب سرکار ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سنا تو یقین ہوگیا کہ یہ جلوۂ جہاں تاب اب جیتے ہی نظر آنے والا نہیں ہے، اُن کے منہ سے آہ نکلی، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ سرکار ﷺ نے فرمایا: ''معاذ! روؤ نہیں۔۔۔'' اور یہ فرما کر آپ ﷺ نے خود اپنا رُخ بھی موڑ کر مدینہ منورہ کی طرف کرلیا۔ اور پھر فرمایا:

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیَ الْمُتَّقُوْنَ، مَنْ کَانُوْا وَحَیْثُ کَانُوْا۔[1]

''مجھ سے قریب ترین لوگ وہ ہیں جو متقی ہوں، خواہ وہ کوئی ہوں اور

---

[1] مسند احمد۔ص: ۲۳۵، ج:۵۔ و سیر اعلام النبلاء۔ص: ۴۴۸، ج:۱

www.freepdfpost.blogspot.com

کہیں ہوں۔"

چنانچہ اس کے بعد حضرت معاذؓ یمن چلے گئے، اور جب واپس آئے تو سرکارِ دوعالم ﷺ اپنے محبوبِ حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے۔۔۔اس کے بعد حضرت معاذؓ مدینہ منورہ میں نہیں رہے، شام جانے کا ارادہ کرلیا، پیش نظر غالباً یہ تھا کہ وہاں جہاد میں حصہ لیں گے، یہاں تک کہ شہادت کی منزل حاصل ہوجائے، حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ان کو مدینہ منورہ ہی میں روک لیجئے، لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، لیکن حضرت صدیقؓ نے جواب دیا کہ "انہوں نے ایک راستے کا انتخاب کرلیا ہے، (یعنی شہادت کا) لہٰذا میں انہیں روک نہیں سکتا۔[1] چنانچہ حضرت معاذؓ شام چلے آئے۔ یہاں آپ نے جہاد میں بھی حصہ لیا۔ تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کے دست راست بنے رہے۔

حضرت عمرؓ کو بھی حضرت معاذؓ سے بہت تعلق تھا، وہ فرماتے تھے کہ:

عجزت النساء آن یلدن مثل معاذؓ.[2]

"عورتیں معاذؓ! جیسا شخص پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک غلام کو چار سو دینار دے کر کہا کہ یہ ابوعبیدہؓ کے پاس لے جاؤ، پھر تھوڑی دیر ان کے گھر میں ٹھہر کر دیکھو کہ وہ ان کا کیا کرتے ہیں؟ غلام وہ دینار حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس لے گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے دینار لے کر حضرت عمرؓ کو دعائیں دیں کہ "اللہ تعالیٰ ان کو اس کا صلہ دے۔[3] اور ان پر رحم فرمائے۔" پھر اپنی کنیز سے کہا کہ: "یہ سات دینار فلاں کے پاس لے جاؤ، یہ پانچ فلاں کے پاس۔" یہاں تک کہ وہ سارے دینار اسی وقت تقسیم کرڈالے۔ غلام حضرت عمرؓ کے پاس لوٹ آیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اتنے ہی دینار اُسے

[1] سیر اعلام النبلاء۔ص:۴۵۲، ج:۱

[2] ایضاً۔ ص:۴۵۲، ج:۱

[3] طبقات ابن سعد۔ص:۳۰۱، ج:۳۔ وحلیۃ الاولیاء لابی نعیم۔ص:۲۳۷، وسیر اعلام النبلاء۔ص:۴۵۶، ج:

دوبارہ دیئے کہ "اب یہ معاذ بن جبلؓ کے پاس لے جاؤ، اور اسی طرح دیکھو کہ وہ کیا کرتے ہیں۔" وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے بھی وہی معاملہ کیا، جب سارے دینار ختم ہونے لگے تو اندر سے ان کی اہلیہ نے آواز دی کہ "ہم بھی نادار ہیں، کچھ ہمیں بھی دے دیجئے۔" اس وقت تھیلی میں دو دینار باقی تھے، حضرت معاذؓ نے وہ دو دینار اہلیہ کی طرف لڑھکا دیئے۔ غلام نے لوٹ کر حضرت عمرؓ کو یہ واقعہ بتایا تو حضرت عمرؓ نے خوش ہوکر فرمایا کہ "یہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک جیسے ہیں۔"[1]

حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ جب طاعون میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنے بعد شام کی حکومت کے لیے نامزد فرمایا۔ اس زمانے میں طاعون انتہائی تیز رفتاری سے پھیل رہا تھا، اس موقع پر حضرت معاذ بن جبلؓ نے لوگوں کو سنایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم لوگ شام کی طرف ہجرت کروگے، وہ تمہارے ہاتھ پر فتح بھی ہوگا، اور وہاں ایک ایسی بیماری ظاہر ہوگی جو پھوڑے یا گٹھلی کی طرح ہوگی..... اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت بخشیں گے اور تمہارے اعمال کا تزکیہ فرمائیں گے۔"

اس کے بعد حضرت معاذؓ نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! اگر معاذؓ نے واقعۃً یہ ارشاد رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے تو اُسے اور اس کے گھر والوں کو بھی اس فضیلت سے وافر حصہ عطا فرما۔ چنانچہ طاعون ان کے گھر میں بھی داخل ہوگیا، حضرت معاذؓ کے گھر کا کوئی فرد اس سے نہیں بچا، حضرت معاذؓ کو طاعون کی گٹھلی شہادت کی میں نکلی، آپؓ اِسے دیکھ کر فرماتے:

"اگر کوئی اس کے بدلے مجھے سرخ اونٹ بھی دے تو وہ مجھے پسند نہیں۔"[2]

حضرت معاذؓ کو طاعون میں مبتلا دیکھ کر ایک صاحب رونے لگے۔ حضرت معاذؓ

[1] طبقات ابن سعد۔ص:۳۰۱، ج:۳۔ وحلیۃ الاولیاء لابی نعیم۔ص:۲۳۷، ج:۱۔
و سیر اعلام النبلاء۔ص:۴۵۶، ج:۱

[2] مجمع الزوائد للہیثمی۔ص:۳۱۱، ج:۲۔ رواہ احمد، وقال الہیثمی: "اسمٰعیل بن عبداللہ لم یدرک معاذاً۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

نے پوچھا: کیوں روتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''میں اس وجہ سے نہیں روتا کہ مجھے آپ کے ذریعے کوئی دُنیوی دولت ملتی تھی، بلکہ اس علم پر رو رہا ہوں، جو میں آپ سے حاصل کرتا تھا۔'' حضرت معاذؓ نے فرمایا: ''علم کو بھی نہ روؤ۔ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسی زمین میں پیدا ہوئے تھے جہاں کوئی علم نہیں تھا، اللہ نے انہی کو علم عطا فرما دیا۔ لہٰذا میرے مرنے کے بعد چار افراد کے پاس علم تلاش کرنا: ''عبداللہ بن مسعودؓ، سلمان فارسیؓ، عبداللہ بن سلامؓ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم۔''[1]

بہرکیف! ان کی دعا قبول ہوئی اور اِسی طاعون میں (۱۸ھ میں) آپ نے وفات پائی جبکہ آپ کی عمر ۳۳، ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔

عقیدت و محبت کے ناقابل بیان جذبات کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے اس خوش نصیب صحابی کے مزار پر حاضری دے کر جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ مغرب کی جانب میدانی علاقہ کے اُس پار جو پہاڑی سلسلہ شروع ہے ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے، وہ یہاں پہنچ کر بہت قریب آ گیا ہے۔ ہمارے رہنماء نے بتایا کہ یہاں سے دریائے اردن کل ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اور اس کے مغربی سرے سے اسرائیل کا مقبوضہ علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ حضرت معاذؓ کے مزارِ مبارک کے مجاور نے بتایا کہ یہ پہاڑ جو مغربی سمت نظر آ رہے ہیں، نابلس کے پہاڑی سلسلے کا ایک حصہ ہیں، اور ہمارے بالکل سامنے جو پہاڑی ہے، اسے ''کواکب الہواء'' کہا جاتا ہے، ان پہاڑوں پر بہت سی بستیاں ہیں جن میں بعض فلسطینی بھی آباد ہیں، لیکن بہت سا حصہ صیہونی قابضین کے تسلط میں ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اغوار کے اس مشرقی علاقے میں شمالاً جنوباً سڑک کی جو پٹی ہے، اُس پر تمام تر وہ صحابہ کرامؓ آرام فرما ہیں جنہوں نے اپنے خون پسینے سے اُردن، فلسطین اور شام کو رومی سلطنت کے جور و استبداد سے آزاد کرایا تھا، جنہوں نے اس علاقے کو

[1] سیر اعلام النبلاء، ص: ۴۵۹، التاریخ الصغیر للبخاری، ص: ۷۳، ۷۴۔
مصنف عبدالرزاق (حدیث نمبر ۲۰۱۶۴)

کلمۂ توحید کے انوار سے منور کرنے کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، جنگ کی سختیاں برداشت کیں، دنیا کی عظیم ترین فوجی طاقت سے ٹکر لی، اور بالآخر یہ عظیم ترین طاقت جو اپنے سونے اور لوہے پر مغرور تھی، ان بے سروسامان صحرانشینوں کے عزم و استقامت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی، یہ خدامست مجاہدین اپنے مشن کی تکمیل کے بعد پوری طرح سرخ رو ہو کر اس علاقے میں آسودہ ہو گئے۔ لیکن آج ان کے مزارات سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر اسرائیل نے اپنے غاصبانہ تسلط کے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں، ہم جو انہی صحابہ کرامؓ کے ناخلف نام لیوا ہیں، اس سرزمین مقدس کو ان دشمنانِ خدا سے محفوظ بھی نہ رکھ سکے اور ہزار چیخ و پکار کے باوجود اب بھی اس کے ہاتھوں اتنے بے بس ہیں کہ وہ ہمارے علاقوں کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور ہمارے پاس اس کی جارحیت کا جواب غم و غصے کی قراردادوں کے سوا کچھ نہیں۔۔۔ کیا اس حالت میں ہم ان جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو اپنا منہ دکھانے کے قابل ہیں؟ اس تصور سے جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی، کاش! کہ ایسی جھرجھریوں میں ہمارے عمل کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی لا کر ہمارے دن پھیرنے کی صلاحیت ہوتی۔ لیکن ؎

وصل کی ہوتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

غم و حسرت اور ندامت کے یہ جذبات جو یہاں پہنچ کر پیدا ہوئے تھے، وہ دیر تک قلب و دماغ پر چھائے رہے۔ لیکن ہماری گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی شمال کی طرف پسپا ہو گئی۔

بحرمیّت کے کنارے:

یہاں سے خاصا طویل فاصلہ طے کر کے ہماری اگلی منزل اردن کا معروف سمندر بحرمیّت تھی، یہ چھوٹا سا سمندر اپنی تاریخی اور جغرافیائی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ جب شام و فلسطین کے دورے پر تشریف لائے تھے تو یہاں سے بھی گذرے تھے، اور ان کی زبانی ہم نے بچپن ہی سے اس کے کچھ

www.freepdfpost.blogspot.com

حالات سن رکھے تھے۔ ہمارے ساتھی بھی یہ سمندر دیکھنے کے شائق تھے، چنانچہ ہم عصر کے وقت اس کے کنارے پہنچ گئے۔

یہ چھوٹا سا سمندر کل ۵۰ میل لمبا اور ۱۱ میل چوڑا ہے، اس کی سطح کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے، زیادہ سے زیادہ گہرائی ۱۳۰۰ فٹ ہے۔ ۱۹۶۷ء سے پہلے اس کا نصف شمالی حصہ مکمل طور پر اردن میں تھا، اور نصف جنوبی حصہ اردن اور اسرائیل کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی فوجیں پورے مغربی ساحل پر قابض ہوگئی ہیں۔ اور اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اپنے طول وعرض کے لحاظ سے اس کو ایک ''جھیل'' کہنا زیادہ موزوں ہوگا، لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے، بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزاء عام سمندروں سے زیادہ ہیں اس لیے اس کو ''بحر'' یا ''بحیرہ'' ہی کہا جاتا ہے۔

اس سمندر کی دوسری جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے، یہاں سے قریب ترین سمندر، بحر متوسط (یا بحر روم) کی خلیج عقبہ ہے، لیکن بحر میّت اس کی سطح سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے واقع ہے، اور اسی طرح یہ کرہ زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے۔ دریائے اردن اسی سمندر میں آ کر گرتا ہے، اور آس پاس کی پہاڑی ندیاں بھی اسی میں آ کر شامل ہوتی ہیں۔

اب بہت سے جدید محققین کا کہنا یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی وہ قوم جس پر بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوا، اور جس کی بستیوں کا نام بائیبل اور تاریخی روایات میں سدوم اور عمورہ ذکر کیا گیا ہے، اسی بحر میّت کے آس پاس کہیں واقع تھی۔

اگرچہ قدیم مسلمان جغرافیہ نگاروں اور مؤرخین مثلاً علامہ حمویؒ، اور بکریؒ وغیرہ نے سدوم اور عمورہ کے حالات بیان کرتے ہوئے بحر میّت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ علامہ قزوینیؒ نے اپنی کتاب ''آثار البلاد واخبار العباد'' میں سدوم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ''آج اس بستی کی جگہ پر سیاہ پتھر ہی پتھر نظر آتے ہیں۔'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یا تو خود اس جگہ کا مشاہدہ کیا ہے، یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے اس کے حالات سنے ہیں، اس کے

باوجود انہوں نے یہ اشارہ تک نہیں دیا کہ اس کے آس پاس ''بحر میّت'' کے نام سے کوئی سمندر واقع ہے۔

لیکن مشہور یہودی مؤرخ جوزیفس (Josephus) نے، جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں گزرا ہے، اپنی تاریخ میں یہی لکھا تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں سدوم اور عمورہ ''بحر میّت'' کے کنارے میں واقع تھیں۔ غالباً اسی بنیاد پر ۱۹۲۴ء میں مستشرقین کی ایک جماعت قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کی تحقیق کیلئے نکلی تھی، اور اس نے پورے علاقے کا سروے کر کے یہ حتمی رائے دی تھی کہ ان بستیوں میں سے سدوم، عمورہ اور ذعر بحر میّت کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع تھیں اور باقی بستیاں سمندر کے نیچے آ گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سمندر کے جنوب مشرقی کنارے پر ہی کھدائی کی گئی تو وہاں سے ان بستیوں کے کچھ آثار بھی برآمد ہوئے۔ اسی بنیاد پر آخری دور کے مصری محقق عبدالوہاب النجار نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ یہ سمندر پیدا ہی اس طرح ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا، اُن کی بستیاں اُلٹی گئیں تو یہاں سمندر کا پانی نکل آیا۔[2] ورنہ حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے یہاں کوئی سمندر موجود نہیں تھا۔

اس رائے کی تائید مندرجہ ذیل دلائل وقرائن سے ہوتی ہے۔

(۱) قرآنِ کریم نے قومِ لوطؑ کی بستیوں کا ذکر فرماتے ہوئے اہل عرب کو یہ یاد دلایا ہے کہ یہ بستیاں اس سڑک پر واقع ہیں جس کے ذریعے تم شام جاتے آتے رہتے ہو، ارشاد ہے:

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ

اور بلاشبہ یہ بستیاں سیدھے راستے پر واقع ہیں۔

ایک اور جگہ حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دونوں کی بستیوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانکا مطبوعہ ۱۹۸۸ء، ص: ۱۰۰، ج: ۷۔ مقالہ "DEAD SEA"

[2] قصص الانبیا بالعبد الوہاب النجار، ص: ۱۱۳، مطبوعہ بیروت

www.freepdfpost.blogspot.com

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ.

اور بلاشبہ یہ دونوں قومیں واضح راستے پر واقع ہیں۔

لہٰذا ان بستیوں کا محل وقوع اسی علاقے میں کہیں ہونا چاہئے۔

(۲) عبدالوہاب النجار کی یہ رائے کہ یہ سمندر پیدا ہی ان بستیوں کے اُلٹنے سے ہوا، اس لحاظ سے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اس سمندر کا کوئی رابطہ کسی بڑے سمندر سے نہیں ہے، اس لئے کوئی غیر معمولی واقعہ ہی اس سمندر کے ظہور کا سبب ہوسکتا ہے۔

(۳) اس سمندر کا پانی عام سمندروں کے مقابلے میں بہت بھاری ہے، اور اس میں نمکیات بہت زیادہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عام بڑے بڑے سمندروں میں چار سے چھ فیصد تک نمکیات ہوتے ہیں، لیکن بحرمیّت کے پانی میں نمکیات کا تناسب ۲۳ فیصد سے ۲۵ فیصد تک ہے۔[1] چنانچہ جو لوگ اس سمندر میں دیر تک غسل کرلیتے ہیں ان کو اپنے جسم سے ان کیمیاوی اجزاء کی چپکاہٹ چھڑانے کیلئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے، اور عام پانی سے ایک آدھ مرتبہ نہا کر آسانی سے یہ اجزاء جسم سے نہیں چھوٹتے۔

(۴) اس سمندر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مچھلی سمیت کوئی جانور زندہ نہیں رہتا، اور نہ کوئی پودا اُگ سکتا ہے، حد یہ ہے کہ جب دریائے اُردن یا دوسرے چشمے اس سمندر میں گرتے ہیں تو بعض اوقات اپنے ساتھ مچھلیاں بہا کر لے آتے ہیں، لیکن یہ مچھلیاں سمندر میں گرتے ہی فوراً مرجاتی ہیں۔[2] سائنسی طور پر اس کی توجیہ عموماً یہ کی جاتی ہے کہ یہ اس سمندر کی غیر معمولی نمکیات کا اثر ہے، اور ظاہری طور پر شاید یہی سبب ہو، لیکن باطنی طور پر یہ اس عبرت ناک عذاب کے اثرات

[1] برٹانیکا ۱۹۵۰ء۔ ص:۹۹، ج:۷

[2] برٹانیکا، مِیکرو پیڈیا مطبوعہ ۱۹۸۱ء۔ ص:۵۲۵، ج:۵، کالم نمبر ۲

ہوں تو بعید نہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر نازل ہوا تھا۔

سمندر کی اسی خصوصی کی بنا پر اس سمندر کو ''بحرمیّت'' کہا جاتا ہے، اور اس کا یہ نام یونانی دور سے چلا آتا ہے۔ اہل عرب اس کو ''بحیرۂ لوط'' بھی کہتے رہے ہیں۔

(۵) جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، بحرمیّت کا علاقہ دنیا کا سب سے پست علاقہ ہے، بحرمیّت کی سطح عام سطح سمندر سے ۱۳۰۰ فیٹ نیچے ہے۔ دنیا بھر میں سطح سمندر سے اتنا نیچا علاقہ کوئی نہیں ہے، مجھے جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ذہن فوراً قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط علیہ السلام کی بستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو زمین کا پست علاقہ بنادیا۔

عام طور سے اس آیت کا مفہوم یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ بستی اُلٹی گئی تو چھتیں زمین بوس ہوگئیں، لیکن قرآنِ کریم کا یہ معجزہ بیان شاید اس طرف بھی اشارہ کررہا ہے کہ صرف بستی کی عمارتیں ہی پست نہیں ہوئیں، بلکہ ان بستیوں کا پورا علاقہ روئے زمین کا پست ترین خطہ بنادیا گیا۔ چنانچہ بحرمیّت کے شمال اور مشرق کی جانب کے علاقے تو ہم نے بھی دیکھے کہ وہاں میلوں دور سے زمین کی سطح بتدریج پست ہوتی گئی ہے، زمین کا جو حصہ سطح سمندر کے مساوی ہے، وہاں علامت کے طور پر بورڈ لگادیا گیا ہے، اس کے بعد ہر تھوڑے فاصلے پر سطح کی پستی کی مقدار بتانے کیلئے جگہ جگہ بورڈ لگے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ پست ترین سطح بحرمیّت پہنچ کر آتی ہے۔

اللہ اکبر! اس سے ایک طرف قرآنِ کریم کا یہ اعجاز سامنے آتا ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے ایک ایسی جغرافیائی حقیقت کو واضح فرمارہا ہے جو صدیوں کے بعد ماہرین پر منکشف ہوئی، اور بیان بھی اس طرح فرمارہا ہے کہ اُس دور کے لوگوں کو بھی اس بیان کے صاف اور سادہ معنی سمجھنے میں کوئی دشوار نہیں ہوتی۔

اور دوسری طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس قوم پر عذابِ الٰہی کا یہ پہلو ایسا

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے کہ قیامِ قیامت تک دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلئے سامانِ عبرت بنا رہے گا۔ بستیاں اُلٹ گئیں، آبادی بے نشان ہوگئی، ایک عجوبۂ روزگار سمندر اُبل آیا، اور قیامت تک کے لیے یہ زمین دنیا کی پست ترین زمین بن کر رہ گئی:

فَتِلْکَ مَسَاکِنُھُمْ لَمْ تُسْکَنْ مِّنْ بَعْدِھِمْ اِلَّا قَلِیْلاً وَّکُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِیْنَ،

پس یہ ہیں ان کے رہنے کے مقامات جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث تھے۔

ہزارہا سال پہلے حضرت لوط علیہ السلام نے اسی سرزمین پر کوہِ استقامت بن کر اپنی اس بے ہنگم قوم کی اصلاح کی کوشش فرمائی تھی جو انسانیت کی ہر قدر کو نوچ کر اپنی کمینگی پر مگن تھی۔ یہ قوم اپنے غیر فطری جنسی عمل میں تو دنیا بھر میں بدنام ہے، یہاں تک کہ اس گھناؤنے فعل کا نام ہی اس قوم سے منسوب ہوگیا، لیکن قرآنِ کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ قوم رہزنی کی لت میں بھی مبتلا تھی، اور کوئی اجنبی مسافر ان کے یہاں آ جائے تو اس کی جان، مال اور آبرو تینوں خطرے میں پڑ جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی اس اخلاقی گراوٹ اور پستی کو قیامت تک کیلئے یہاں ایک محسوس شکل دے دی گئی ہے کہ یہ علاقہ دنیا کا سب سے پست علاقہ بنا دیا گیا ہے۔

یہ جگہ بڑی عبرت کی جگہ ہے، لیکن یہ دیکھ کر دل لرزتا ہے کہ اسے ایک سمندری تفریحی گاہ بنا لیا گیا ہے، ریسٹورنٹ کی حد تک تو شاید بات اتنی ناگوار نہ تھی، لیکن سیاحت کی ہمت افزائی نے یہاں وہ فضا پیدا کر دی ہے، جو یورپ کی ساحلی تفریح گاہوں پر عام ہے، خاص طور مغربی سیاحوں کے ہجوم اور اُن کو حکومت کی طرف سے ملی ہوئی بے روک ٹوک آزادی نے اُسے بے حیائی کا ایک مرکز بنا دیا ہے۔ اور دیکھ کر دل دُکھتا ہی رہا کہ جو جگہ فحاشی کے خلاف ذہن تیار کرنے کے لیے عبرت کا بہترین پیغام تھی، وہیں پر بے حیائی کے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ شرافت منہ چھپا کر رہ جائے۔

ہم یہاں پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، بلکہ تنگ ہونے کے قریب تھا۔ تلاش کے

بعد ایک ''جائے عافیت'' دریافت کر کے جماعت سے نماز ادا کی، نماز کے بعد سمندر کے کنارے تک پہنچے، بلاشبہ منظر بڑا حسین تھا، سمندر کی نیلگوں موجوں کے اُس پار فلسطین کے پہاڑ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ یہ منظر کے حسن سے لطف لینے سے زیادہ ڈرنے، خوف کھانے اور عبرت حاصل کرنے کی جگہ ہے۔

البتہ یہاں کھڑے ہونے کی کشش ایک اور وجہ سے تھی۔ ملک افضل صاحب نے بتایا تھا کہ مغرب میں سمندر کے پار فلسطین کے جو پہاڑ یہاں کھڑے ہو کر نظر آتے ہیں، انہی میں بیت المقدس واقع ہے، جو یہاں سے ۱۲۔۱۵ میل سے زیادہ دور نہیں ہے، چنانچہ اگر مطلع صاف ہو تو بعض اوقات انہی پہاڑوں کے کسی درمیانی خلا سے مسجد اقصیٰ کے مینارے بھی نظر آ جاتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی ایک جھلک..... دور ہی سے سہی..... دیکھنے کے شوق نے دیر تک یہاں کھڑا رکھا۔ لیکن مغرب کی طرف کے پہاڑ دھند کی ہلکی ہلکی تہہ میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس لیے بہت سے زاویے بدلنے کے باوجود منارے نظر نہیں آ سکے۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ مقدس منارے نہ جانے کب سے اُمت مسلمہ کو فریاد کیلئے بلاتے رہے ہیں، لیکن جب کوئی ایوبی آگے نہ بڑھ سکا تو وہ روٹھ کر روپوش ہو گئے۔ اب ہم جیسے گفتار کے غازیوں کو وہ اپنے چہرے کی ایک جھلک دکھانے کیلئے بھی تیار نہیں۔

اس تصور سے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ کیا نوے کروڑ مسلمانوں پر مشتمل یہ عالم اسلام اپنے قبلۂ اوّل سے مستقل طور پر صرفِ نظر کر لے گا؟ کیا محض غم اور غصے کی قراردادوں سے قبلۂ اوّل کا حق ادا ہو جائے گا؟ کیا ہماری صفوں سے اب کوئی صلاح الدین ایوبی نہیں اُٹھ سکے گا؟ کیا صیہونی استعمار کا اژدھا ہمیں ایک ایک کر کے اسی طرح نگلتا رہے گا؟ جواب تو ان سارے سوالات کا ایک ہی تھا، اور وہ یہ کہ ؎

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ دشمن کے جبڑوں میں بیٹھ کر بھی ہمیں ''فضائے بدر'' کے بجائے ''شانزالیزے''

www.freepdfpost.blogspot.com

کی فضا پیدا کرنے کا شوق کھائے جا رہا ہے۔

اِسی سوال و جواب کی پُر درد اُدھیڑ بُن میں سامنے کے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہوگیا، ہم نے مغرب کی نماز اِسی ساحل پر ادا کی، اور واپس عمان کیلئے روانہ ہو گئے۔

طویل فاصلہ طے کر کے جب عمان کے پہاڑوں کے قریب پہنچے تو موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ گاڑی کو یکے بعد دیگرے کئی پہاڑ طے کرنے تھے، باہر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، کار کی ہیڈ لائٹس کے سامنے بھی بارش کے پردے حائل ہو گئے تھے، پُرخطر پہاڑی راستوں پر بارش کی وجہ سے راستہ دیکھنا دشوار ہو رہا تھا، اور اگر کچھ نظر آئے بھی تو ہم جیسے اجنبیوں کیلئے راستے کا سمجھنا ناممکن تھا، ایک موقع پر پہنچ کر کم از کم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم بالکل غلط رُخ پر جا رہے ہیں، لیکن بحمد اللہ ملک افضل صاب راستوں کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف تھے، انہیں ٹوک کر اپنا اجتہاد چلانا حماقت کی بات تھی اس لیے چپ ہو کر رہ گیا، چنانچہ وہ اندھیری رات اور پُرشور بارش میں بھی اعتماد و اطمینان سے راستہ بتاتے رہے، اور عطاء الرحمٰن صاحب ان پُرخطر راستوں پر بڑی احتیاط اور مہارت سے مناسب رفتار کے ساتھ گاڑی چلاتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ بحمد اللہ رات کے نو بجے ہم، بعافیت تمام اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ سبق یہ ملا کہ رہنماء نشیب و فراز سے واقف اور ڈرائیور ماہر محتاط ہو تو تاریک سے تاریک رات میں پُرخطر راستہ بھی اطمینان سے طے ہو جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ انسان ایسے میں اپنی عقل لڑانے کی بجائے اپنے آپ کو ایسے رہنماء اور ایسے ڈرائیور کے حوالے کر دے۔ بات تو سیدھی اور صاف ہے، لیکن یہی بات علماءِ فقہ اور مشائخ طریقت کہتے ہیں تو آج کل اُن پر جمود، اندھی تقلید اور شخصیت پرستی کے طعنوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے۔

☆☆☆

(۵)

اگلی صبح ہم مزید دو مقامات پر جانا چاہتے تھے، ایک اصحابِ کہف کے غار پر، اور دوسرے غزوۂ موتہ کے میدانِ جنگ تک۔ خیال یہ تھا کہ ان دو مقامات کی زیارت کے بعد ہم وہیں سے سیدھے دمشق روانہ ہو جائیں گے۔

اصحابِ کہف کے غار میں:

چنانچہ صبح آٹھ بجے کے قریب ہم ملک افضل صاحب کی رہنمائی میں پہلے اصحابِ کہف کے مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مسئلے میں علماء اور محققین کی آراء بہت مختلف رہی ہیں کہ اصحابِ کہف کا وہ غار جس میں وہ تین سو سال سے زیادہ سوتے رہے، کس جگہ واقع ہے؟ بعض حضرات نے اس کی جگہ ترکی کے شہر افسس میں بتائی ہے۔ بعض نے اُندلس کے ایک غار کو اصحابِ کہف کا غار قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اردن میں واقع ہے، بعض کا کہنا ہے کہ شام میں ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یمن میں ہے، لیکن اردن کے ایک محقق محمد تیسیر ظبیان صاحب، جو وہاں کے رسالے ''الشریعۃ'' کے ایڈیٹر تھے، ۱۹۷۶ء میں پاکستان تشریف لائے تو حضرت والد ماجد قدس سرہٗ سے ملاقات کیلئے دارالعلوم بھی تشریف لائے۔ اُس وقت انہوں نے بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ بتایا کہ یہ غار حال ہی میں عمان کے قریب ایک پہاڑ پر دریافت ہو گیا ہے، انہوں نے ذکر کیا کہ میں نے اس کی تحقیق کے لیے ایک مقالہ بھی لکھا ہے، جو دلائل و قرائن اُس وقت انہوں نے ذکر کئے، ان کے پیشِ نظر یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی تھی، کہ غالباً اصحابِ کہف کا یہ غار وہی ہوگا۔

اُس وقت سے اس مقام کو دیکھنے کی خواہش تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دس سال بعد آج پوری ہوئی۔ تیسیر ظبیان صاحب کا تو اَب انتقال ہو چکا تھا، لیکن وہ اپنی تحقیق کے نتائج ایک مفصل کتاب میں محفوظ کر گئے ہیں جو موقع ''اصحابِ کہف'' کے

www.freepdfpost.blogspot.com

نام سے دارالاعتصام نے شائع کردی ہے۔

''اصحابِ کہف'' کا واقعہ قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے، اور اِسی واقعے کی وجہ سے قرآنِ کریم کی ایک پوری سورت کا نام ''سورت الکہف'' ہے۔ ''کہف'' عربی زبان میں غار کو کہتے ہیں، اور واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بُت پرست بادشاہ کے زمانے میں کچھ نوجوان دین توحید پر ایمان لے آئے تھے، اور شرک و بُت پرستی سے بے زار تھے۔ بُت پرست بادشاہ اور اس کے کارندوں نے ان پر ظلم و ستم توڑنے شروع کئے۔ لہٰذا یہ لوگ بستی سے فرار ہوکر ایک غار میں مقیم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گہری نیند مسلط فرمادی اور یہ سالوں تک پڑے سوتے رہے، غار کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ سورج کی روشنی اور ہوا تو بقدرِ ضرورت اندر پہنچتی تھی، لیکن دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی تھی، کئی سال گذرنے کے بعد بت پرست بادشاہ کی حکومت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ ایک موحد اور صحیح العقیدہ نیک بادشاہ برسرِاقتدار آ گیا۔ اُس کے زمانے میں یہ لوگ اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ بھوک لگی ہوئی تھی، انہوں نے اپنے میں سے ایک ساتھی کو سکّے دے کر شہر بھیجا، اور یہ تاکید کی کہ خفیہ طریقے پر جا کر کوئی حلال کھانا خرید لائے، وہ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ابھی تک اُسی بت پرست بادشاہ کا زمانہ ہے، اس لیے خطرہ تھا کہ اگر ان لوگوں کا اتہ پتہ انہیں معلوم ہوگیا تو وہ ظلم و ستم میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں گے۔ چنانچہ یہ صاحب چھپتے چھپاتے بستی میں پہنچے اور ایک نانبائی کی دکان سے کھانا خریدنا چاہا، لیکن جب سکہ اس کے حوالے کیا تو وہ بہت پرانے زمانے کا تھا، جس سے سارا راز کھل گیا، انہیں یہ معلوم ہوکر اطمینان ہوا کہ حکومت بدل چکی ہے، شدہ شدہ بادشاہِ وقت کو بھی اطلاع پہنچی، اور ان صاحب نے اپنے ساتھیوں کو بھی نئے حالات کی اطلاع دے دی۔

قرآنِ کریم نے اجمالی طور پر مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اُس دور کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی قدردانی کے طور پر ان کے اوپر ایک مسجد بھی تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

قرآنِ کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق اس واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی

تفصیلات بیان نہیں فرمائیں کہ یہ واقعہ کس دور میں اور کہاں پیش آیا؟ چنانچہ تاریخی روایات کی بنیاد پر مفسرین اور مؤرخین نے اس سلسلے میں مختلف آراء ظاہر کی ہیں۔ زیادہ تر محققین کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروجِ آسمان کے کچھ ہی عرصہ بعد، یعنی پہلی سے تیسری صدی عیسوی تک کا ہے۔ اُس وقت اس علاقے پر نبطی بُت پرست بادشاہ کی حکمرانی تھی، لیکن رفتہ رفتہ دینِ عیسوی جو فلسطین کے علاقے میں ظاہر ہوا تھا، اس کے اثرات یہاں تک پہنچ رہے تھے، انہی کی بنا پر یہ نوجوان اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے پھر جس زمانے میں یہ سعید روحیں غار میں محوِ خواب تھیں، اس دور میں رفتہ رفتہ دینِ عیسوی کے پیروکار اس علاقے کو نبطی حکمرانوں سے آزاد کرا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور یہاں کے باشندوں نے بھی دینِ عیسوی قبول کرلیا۔

پھر جب نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان حضرات کو بدلے ہوئے حالات معلوم ہوئے تو اگرچہ انہیں دینِ برحق کی نشر و اشاعت سے خوشی ہوئی، لیکن انہوں نے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ اسی غار میں اپنی باقی زندگی گزار دیں، لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اب شہر میں آ جائیں، لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے، اور اپنی باقی زندگی اِسی غار میں گزار دی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ وقت ان کا حال معلوم کر کے ان کی زیارت کے لیے غار میں پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن دوسری روایات ان کی وفات کے بارے میں خاموش ہیں۔

مسیحی مصادر میں بھی یہی قصہ معمولی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس واقعے کی تفصیلات ۵۲۱ھ میں ساروغ (عراق) کے ایک کاہن نے جس کا نام یعقوب (یا جیمس) تھا، ایک مفصل مقالے میں لکھی تھیں۔ یہ مقالہ سریانی زبان میں تھا، پھر اس کے یونانی اور لاطینی ترجمے ہوتے رہے، اس کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۲۵۰ء میں ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں پیش آیا تھا، ان نوجوانوں کی تعداد سات تھی، اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا پیغام دنیا کو سنا کر دوبارہ اسی غار میں سو گئے۔ [1]

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔ ص ۳۸۳، ج ۲۰۔ مقالہ "SEVEN SLEEPERS"

www.freepdfpost.blogspot.com

چونکہ یعقوب سارونغی نے ان کے بارے میں ''دوبارہ سونے'' کا لفظ استعمال کیا تھا، اس لیے بہت سے لوگوں کا اعتقاد یہ بھی رہا کہ اصحابِ کہف ابھی تک زندہ ہیں، اور قیامت کے قریب دوبارہ اُٹھیں گے۔

مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر اَفسس کے قریب پیش آیا تھا۔ (جس کا اسلامی نام طرسوس ہے) اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے، شاید انہی مسیحی روایات کے زیرِ اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مؤرخین نے بھی اصحابِ کہف کا محلِ وقوع اَفسس ہی کو بتایا ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تفسیر ابن جریرؒ میں مروی ہے۔ جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحابِ کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب (یعنی اردن میں) واقع ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر آخر دور کے بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ غار اردن میں واقع ہے، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ نے قصص القرآن میں اس موضوع پر بہت مفصل بحث کی ہے، اور متعلقہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں اسی کو درست قرار دیا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ارض القرآن میں اردن کے قدیم شہر پیٹرا کو رقیم قرار دیا ہے، والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی تفسیر معارف القرآن میں مفصل بحث کے بعد اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے، کہ یہ غار اردن میں ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے بھی یہی تھی۔

ان تمام حضرات کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر پیٹرا کا اصل نام رقیم تھا۔ جسے رومی حکومت نے بدل کر پیٹرا کر دیا، اور یہ غار اسی کے قریب کہیں واقع تھا۔

لیکن ۱۹۵۳ء میں اردن کے محقق تیسیر ظبیان صاحب کو کسی طرح پتہ چلا کہ عمان کے قریب ایک پہاڑ پر ایک ایسا غار واقع ہے جس میں کچھ قبریں اور مردہ ڈھانچے موجود ہیں، اور اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے، چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس غار کی تلاش میں روانہ ہوئے، یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر واقع تھی، اس لیے کئی کلومیٹر دشوار گذار

راستہ طے کر کے وہ اس غار کے دھانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تیسیر ظبیان صاحب کے الفاظ ہیں:

> ''ہم ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے، جو ایک دور افتادہ جگہ اور ایک چٹیل پہاڑ پر واقع تھا، غار میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمارا اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا، ایک چرواہے نے ہمیں بتایا کہ غار کے اندر کچھ قبریں ہیں اور ان میں بوسیدہ ہڈیاں پڑی ہیں، غار کا دروازہ جنوب کی سمت تھا، اور اس دونوں کناروں پر دو ستون تھے جو چٹان کو کھود کر بنائے گئے تھے، میری نظر اچانک ان ستونوں پر بنے ہوئے نقوش پر پڑی تو اس پر بیزنطی نقوش نظر آ رہے تھے، غار کو ہر طرف سے پتھروں کے ڈھیروں اور ملبے نے چھپایا ہوا تھا۔ اور یہاں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی تھی جس کا نام ''رجیب'' تھا۔''[1]

تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی تحقیق جاری رکھی، محکمہ آثارِ قدیمہ کو متوجہ کیا، بالآخر ایک ماہر اثریات رفیق رجائی صاحب نے ماہرانہ تحقیق کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا، تو اس رائے کی تائید میں بہت سے قرائن و شواہد ملتے چلے گئے، جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیت پوری طرح صادق ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ،

اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھکتا ہوا

[1] موقع اَصحاب الکہف۔ مؤلفہ تیسیر ظبیان۔ ص:۳۹، مطبوعہ قاہرہ

www.freepdfpost.blogspot.com

گذرتا، اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب سے کترا کر
گذرتا، اور یہ لوگ اُس غار کے کشادہ حصے میں تھے۔

اس غار میں صورتِ حال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی، بلکہ طلوع وغروب کے وقت دائیں باتیں سے گذر جاتی ہے۔ اور غار کے اندر ایک کشادہ خلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس غار کے ٹھیک اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے، جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے، ماہرین آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا، اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اُسے مسجد بنا دیا گیا۔

۳۔ عصر حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی، ٹراجان تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک حکمران رہا ہے، اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا، تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ٹراجان نے ۱۰۶ء میں شرقِ اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا، اور اسی نے عمان کا وہ اسٹیڈیم تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے، اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحابِ کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین تھیوڈوسیس بتاتے ہیں جو پانچویں صدی کے آغاز میں گذرا ہے۔

دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں، ان میں سے کچھ ٹراجان کے زمانے کے ہیں (موقع أصحاب الکہف، ص: ۳۵) جس سے اس خیال کو بہت تقویت ملتی ہے کہ یہی اصحابِ کہف کا غار ہے۔

۴۔ قرآن کریم نے اصحابِ کہف کو "أصحاب الکہف الرّقیم" (غار اور رقیم والے)

کہا ہے، رقیم کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح میں مختلف آراء بیان کی جاتی ہیں، لیکن بیشتر محققین کا خیال یہ ہے کہ رقیم اُس بستی کا نام تھا جس میں ابتداً یہ حضرات آباد تھے۔ اب جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے کل سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی "رجیب" کہلاتی ہے۔ رفیق الدجانی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ "رقیم" کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ یہاں کے بدّو اکثر قاف کو جیم اور میم کو باء سے بدل کر بولتے ہیں (موقع أصحاب الکہف۔ ص: ۱۱۸) چنانچہ اب حکومتِ اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر "رقیم" ہی کر دیا ہے، بعض قدیم علماء جغرافیہ نے بھی رقیم کی بستی کو عمان کے قریب بتایا ہے، چنانچہ معروف جغرافیہ نگار ابوعبداللہ البشاری المقدسی اپنی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" میں لکھتے ہیں:

والرقیم بلد فی شرق الأردن بالقرب من عمان، حیث وجدت مغارة فیها عدد من الجثث غیر البالیة.

(موقع أصحاب الکہف۔ ص: ۴۹)

رقیم شرقِ اردن میں عمان کے قریب ایک شہر ہے، جہاں ایک غار بھی پایا گیا ہے جس میں کچھ انسانی ڈھانچے بھی ہیں جو زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے۔

اس کے علاوہ علامہ یاقوت حمویؒ نے بھی رقیم کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

إن بالبلقاء بأرض العرب من نواحی دمشق موضعا یزعمون أنه الکهف والرقیم قرب عمان.

دمشق کے مضافات میں جو عربی سرزمین بلقاء کہلاتی ہے، اس میں شہر عمان کے قریب ایک جگہ ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہی کہف اور رقیم ہے۔[1]

[1] معجم البلدان للحموی۔ ص: ۶۱، ج: ۹

www.freepdfpost.blogspot.com

(۵) تیسیر ظبیان صاحب نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اِسی علاقے کے کسی غار کو اصحابِ کہف کا غار سمجھتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بارے میں مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں بادشاہِ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تو وہ راستے میں شام وحجاز کے راستے پر ایک پہاڑ سے گذرے جس کا نام جبل الرقیم تھا، اس میں ایک غار بھی تھا جس میں کچھ ڈھانچے تھے، اور وہ بوسیدہ نہیں ہوئے تھے۔ نیز تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ وہ اس غار سے گذرے تھے اور اسے اصحابِ کہف کا غار قرار دیا تھا۔ فتوح الشام میں واقدی نے بھی حضرت سعید بن عامرؓ کا ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ وہ شام کی طرف جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور راستہ بھول گئے، بالآخر بھٹکتے بھٹکتے جبل الرقیم کے پاس پہنچے تو اِسے دیکھ کر پہچان گئے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے۔ چنانچہ وہاں نماز پڑھ کر عمان شہر میں داخل ہوئے۔ (موقع أصحاب الکہف۔ص:۴۶و۴۷و۱۰۳)

بہرکیف! اتنے پرانے واقعے کے محل ووقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقامِ اصحابِ کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے، اُن سب میں جتنے زیادہ قرائن وشواہد اس غار کے حق میں ہیں، کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں۔ تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی کتاب میں افسس کے غار سے اس غار کا موازنہ بھی کیا ہے، اس موازنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

یہ غار عمان شہر سے ۷ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے، اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے، اس سے اس کا فاصلہ ۳ کلومیٹر ہے۔ ہم تقریباً نو بجے صبح یہاں پہنچے۔ اب کاروں کیلئے پہاڑ کے اوپر تک جانے کا راستہ بنا دیا گیا ہے۔ کار سے اُتر کر تھوڑا سا اوپر چڑھے تو ایک کشادہ صحن سا ہے جس میں قدیم طرزِ تعمیر کے کچھ ستون وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس صحن کو عبور کر کے غار کا دہانہ ہے۔ دہانہ کے فرش پر ایک خاصی چوڑے پتھر

کی بنی ہوئی ایک چوکھٹ سی ہے۔ اس سے غار کے اندر اُترنے کے لیے تقریباً دو سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر غار تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک حصہ دہانے سے سیدھا شمال تک گیا ہے، دوسرا دائیں ہاتھ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے، اور تیسرا بائیں ہاتھ مغرب کی طرف۔ مشرق اور مغربی حصوں میں آٹھ تابوت نما قبریں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصے کی ایک قبر ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہے۔ اس سوراخ میں جھانک کر دیکھیں تو ایک انسانی ڈھانچہ صاف نظر آتا ہے۔ اگر اندھیرا ہو تو غار کا مجاور موم بتی جلا کر اندر کا منظر دکھا دیتا ہے۔

لیکن غار کا حصہ جنوب سے شمال کی طرف سیدھا گیا ہے، وہ تقریباً سپاٹ ہے، اور اِسی کے بارے میں تیسیر ظبیان صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ ''فجوۃ'' ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ جب ۱۹۶۱ء میں اس غار کی صفائی اور کھدائی کا کام شروع ہوا تو رفیق الدجانی کہتے ہیں کہ غار کی اِسی درمیانی جگہ میں ایک جانور کا جبڑا پڑا ہوا ملا، جس میں ایک نوکیلا دانت اور چار داڑھیں محفوظ تھیں۔ تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ اصحابِ کہف کے کتے کا جبڑا تھا۔ اس کے علاوہ اِسی جگہ پر رومی، اسلامی اور عثمانی دور کے بہت سے سکے، ٹھیکری کے برتن، کوڑیوں کے ہار، پیتل کے کنگن اور انگوٹھیاں بھی پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اب یہ ساری چیزیں ایک الماری میں جمع کر کے غار کی شمالی دیوار میں محفوظ کر دی گئی ہیں جو ہم نے بھی دیکھیں۔

غار کے مشرقی حصے میں ایک اوپر کو بلند ہوتی ہوئی چھوٹی سی سرنگ ہے، جو دھواں نکالنے والی چمنی کی شکل میں ہے، یہ سرنگ غار کی چھت پر جو مسجد بنی ہوئی ہے، اس میں جا کر نکلی ہے، لیکن جب یہ غار دریافت ہوا، اس وقت اس سرنگ کے بالائی دھانے پر ایک پتھر رکھا ہوا ملا تھا۔ اتفاق سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے لشکر کے ایک جرنیل اُسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں بھی ذکر کیا ہے کہ میں تیس شہسواروں کے ساتھ اس غار میں گیا، اور وہاں نماز پڑھی، لیکن وہاں ایک تنگ سرنگ تھی، اس میں داخل نہیں ہوا۔ تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ وہی تنگ سرنگ ہے۔

(موقع أصحاب الکہف۔ص:۴۹)

www.freepdfpost.blogspot.com

غار کو جب صاف کر کے دیکھا گیا تو اس کی دیواروں پر خط کوفی اور خط یونانی میں کچھ عبارتیں بھی لکھی ہوئی تھیں، جو اب پڑھی نہیں جاتیں۔

غار سے باہر نکلے تو سامنے کے صحن میں ایک گول دائرہ بنا نظر آیا، مجاور نے بتایا کہ غار کی دریافت کے وقت یہاں ایک زیتون کے درخت کا تنا برآمد ہوا تھا۔ رفیق الدجانی صاحب نے لکھا ہے کہ زیتون کا یہ درخت بدوی دور کا ہے، اور اس کے قریب ایک مسقّف قبر بھی تھی، اور جب ہم نے پہلے پہل یہاں کھدائی اور صفائی شروع کی تو آس پاس کے معمر لوگوں نے بتایا کہ زیتون کا یہ درخت بیس سال پہلے تک تروتازہ تھا اور ہم اس کا پھل بھی کھایا کرتے تھے۔

غار کے ٹھیک اوپر ایک قدیم مسجد کی دیواریں ایک محراب سمیت چند فٹ تک اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب شروع میں تیسیر ظبیان اور رفیق الدجانی صاحب یہاں پہنچے تھے، اس وقت یہ مسجد نظر نہیں آتی تھی۔ کھدائی اور صفائی کے بعد مسجد برآمد ہوئی۔ یہ مسجد دس میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی ہے۔ اور کھدائی کے دوران اس کے بیچ میں چار گول ستون برآمد ہوئے جو رومی طرز کے ہیں، یہاں سے رومی بادشاہ جسٹن کے عہد (۵۱۷ء۔ ۵۲۷ء) کے کچھ پیتل کے سکے بھی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے۔ ڈیڑھ میٹر کے برابر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی نکلا جس کی چھت کو شاید اذان کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اسی کے قریب کچھ مٹی کے لوٹے بھی پائے گئے جو وضو میں استعمال ہوتے ہوں گے۔ یہیں سے ایک کتبہ بھی برآمد ہوا، جس کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے زمانے (۸۹۵ء) میں اس مسجد کی مرمت کی گئی تھی۔

اس تمام مجموعے سے ماہرین نے جو نتائج نکالے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں یہاں رومیوں نے ایک عبادت گاہ بنائی تھی، عہد اسلام میں (غالباً عبدالملک بن مروان) کے زمانے میں اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کے طول و عرض میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس وقت اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ اور محکمۂ اوقات نے اس غار کے تحفظ اور اس کی

صفائی وغیرہ پر خاص توجہ صرف کی ہے، اس کے قریب ایک نئی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے، زائرین کی سہولت کے لیے راستہ آسان بنا دیا ہے، اور غار کے اندر کتبات لگا دیئے ہیں۔

بہرکیف! عہد حاضر کی اس عظیم قرآنی دریافت کی زیارت زندگی کے یادگار ترین تجربات میں سے ایک تھی۔ اصحابِ کہف کا واقعہ دیدۂ بینا کے لیے عبرتوں کے بیشمار پہلو رکھتا ہے۔ مخدوم مکرم حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے اسی واقعے کے بصائر وعبر پر ایک مستقل کتاب ''معرکۃ الایمان والمادیت'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے، جو واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات سے کہیں زیادہ اہم ہے اور قرآن کریم میں اس واقعے کا ذکر درحقیقت انہی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے آیا ہے۔

☆☆☆

(۶)

موتہ کا سفر:

اصحابِ کہف کے اس غار کے بعد ہمارا ارادہ موتہ جانے کا تھا، اور وہاں سے سیدھے دمشق جانا چاہتے تھے، اس لیے ملک افضل صاحب عمان ہی میں رک گئے اور ہمیں اس سڑک تک لے گئے جو سیدھی موتہ جاتی تھی، انہوں نے بتایا کہ اگرچہ وہ اس راستے سے کبھی موتہ نہیں گئے، لیکن انہیں معلوم ہے کہ یہ سڑک سیدھی موتہ جاتی ہے، اور اندازہ یہ ہے کہ موتہ کا فاصلہ یہاں سے ۵۰۔ ۶۰ کلومیٹر کے قریب ہوگا۔

اِسی اندازے پر اعتماد کرتے ہوئے ہم نے اس سڑک پر سفر شروع کر دیا، خیال یہ تھا کہ دوپہر یا سہ پہر تک ہم وہاں سے فارغ ہو کر دمشق کی طرف روانہ ہو جائیں گے، لیکن جب اس سڑک پر سفر کیا تو یہ سفر لمبا ہوتا چلا گیا، راستے میں بے شمار بستیاں اور قصبے گذرتے رہے، بہت دور چلنے کے بعد ہم نے مقامی حضرات سے راستے کی تصدیق کرنی چاہی تو لوگوں نے بتایا کہ واقعۃً یہ سڑک سیدھی موتہ جا رہی ہے، لیکن فاصلے کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ جب

www.freepdfpost.blogspot.com

کسی شخص سے موتہ اور اس کے قیر بی بستی مزار کے بارے میں پوچھو تو وہ کہتا:

''دُغری''[1] یعنی سیدھے چلتے جاؤ۔

ایک صاحب نے اُس پر یہ بھی اضافہ کیا کہ:

''لاھیک ولاھیک.'' میں یہ جناتی زبان بالکل نہیں سمجھ سکا تو قاری بشیر احمد صاحب نے تشریح کی کہ اس کا مطلب ہے ''لاھکذا لاھکذا'' یعنی ''نہ اِدھر نہ اُدھر، بس سیدھے چلے جاؤ۔''

چنانچہ ہم سیدھے چلتے رہے، لیکن تھوڑی دیر بعد یہ سڑک آباد میدانی علاقوں سے ہٹ کر پہاڑی علاقے میں داخل ہونے لگی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت اونچے پہاڑ پر چڑھنی شروع ہوگئی، یہ پہاڑی راستہ بڑا پیچ دار بھی تھا، اور خطرناک بھی، جگہ جگہ ایسے اندھے موڑ سامنے آتے کہ چند گز کے بعد سڑک نظروں سے غائب ہو جاتی تھی اور ہر موڑ کے بعد گاڑی مزید بلندی پر چڑھ جاتی، یہاں تک کہ جب اللہ اللہ کر کے پہاڑ کی چڑھائی اُترائی ختم ہوئی تو ایک اور اُس سے بھی اونچا سر بفلک پہاڑ سامنے آ گیا، دیکھا کہ ایک درمیانی ندی عبور کرنے کے بعد اب سڑک دوسرے پہاڑ پر چڑھ رہی ہے، یہ دوسری چڑھائی پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھی، اور اوپر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ہم شاید کئی ہزار فٹ اوپر آ چکے ہیں۔ مسلسل پیچ دار چڑھائی عبور کرنے سے عطاء الرحمٰن صاحب کو گاڑی چلاتے ہوئے کچھ چکر سا بھی آنے لگا تھا، اس لیے چوٹی پر پہنچ کر ہم تھوڑی دیر کے لئے رُک گئے، پہاڑ کے دونوں طرف دور تک پھیلی ہوئی وادیوں اور ان کے درمیان بہتے ہوئے چشموں کا بڑا دلکش منظر نظروں کے سامنے تھا۔ وادیوں میں چرتے ہوئے مویشی رینگتی ہوئی چیونٹیوں کی طرح نظر آ رہے تھے، یہاں سردی بھی زیادہ تھی، لیکن کھلی ہوئی دھوپ نے اس خنکی کو بہت خوشگوار بنا دی تھا۔

اس حسین منظر اور پُر کیف فضا سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی دامنگیر تھی کہ نہ جانے موتہ ابھی کتنی دور ہے؟ ان انجانے راستوں پر ابھی اور کونسی گھاٹیاں آنے والی ہیں؟

[1] غالباً یہ ترکی لفظ ہے، جو شام اور اردن کی عوامی زبان میں ''سیدھے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور ہم کب وہاں سے دمشق کے لئے روانہ ہو سکیں گے؟ اگر شام اسی علاقے میں ہوگئی تو رات کو بے وقت دمشق کا سفر مناسب بھی ہوگا یا نہیں؟ ان سوالات کے ساتھ ساتھ ذہن تقریباً چودہ سو سال پیچھے لوٹ گیا۔ تین روز سے ہم جن لق ودق صحراؤں، چٹیل میدانوں اور سر بفلک پہاڑوں کا نظارہ کرتے آ رہے تھے، یہ سب اُن مجاہدین اسلام کے راستے کی منزلیں تھیں، جو ان انجانے راستوں پر ایمان کی مشعلیں روشن کرنے کیلئے نکلے تھے، اور جن کے لیے یہ راستے صرف اجنبی ہی نہ تھے، بلکہ ہر موڑ پر یہ خطرہ بھی تھا کہ یہ دشمن کی کوئی کمین گاہ نہ ہو، لیکن نہ ان کے عزم واستقامت کو کوئی پہاڑ جنبش دے سکا، نہ راستے کی صعوبتیں اُنہیں ڈگمگا سکیں، وہ ہر مشکل سے مشکل راستے پر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے بڑھتے رہے، یہ کٹھن اور سنگلاخ چٹانیں ان کی راہ کا غبار بن کر ان کا منہ تکتی رہ گئیں، اور ان کے عزم ثبات کا قافلہ منزلوں آگے نکل گیا۔

یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اس کوہستان سے کسی طرح باہر نکلے تو پھر میدانی علاقہ شروع ہوگیا، یکے بعد دیگرے بہت سی بستیاں گزرتی رہیں، ہم عمان سے روانہ ہونے کے بعد شاید ڈیڑھ سو کلومیٹر سفر طے کر چکے تھے، اس کے بعد کہیں منزلِ مقصود کے آثار شروع ہوئے، لوگوں نے بتایا کہ اب موتہ قریب ہی ہے۔ راستہ پوچھتے پوچھتے بالآخر ہم موتہ پہنچ ہی گئے۔ آج موتہ کے میدانِ جنگ کے شمال میں ایک شاندار یونیورسٹی ''جامعہ موتہ'' ہی کے نام سے بنی ہوئی ہے، ہم نے گاڑی اس کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑی کی، اور لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے موتہ کے میدان کا راستہ بتا دیا۔ اس میدان کے شمالی کنارے پر کچھ بوسیدہ عمارتوں کے کھنڈر باقی ہیں اور ایک مجاور یہاں زائرین کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ شمال میں حد نظر تک ایک میدان پھیلا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ نشیب وفراز نظر آتے تھے۔ مجاور نے بتایا کہ یہ میدان معرکہ موتہ کے وقت سے آج تک ایک ہی حالت میں ہے، اور یہاں کبھی کوئی انقلابی تغیر نہیں آیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

غزوۂ موتہ:

غزوۂ موتہ ۸ ھ میں پیش آیا، اور اس کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو بصریٰ (شام) کے بادشاہ کے پاس دعوتِ اسلام لینے کے لیے ایک مکتوبِ گرامی دے کر بھیجا تھا۔ ابھی وہ بصریٰ پہنچے بھی نہ تھے کہ راستے میں شرحبیل بن عمرو غسانی نے اُنہیں گرفتار کر کے بصریٰ کے حاکم کے پاس پیش کر دیا، اور اُس نے آپؓ کو قتل کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کے ایلچیوں میں حضرت حارث بن عمیرؓ وہ تنہا ایلچی ہیں جنہیں اِس طرح شہید کیا گیا۔

آنحضرت ﷺ کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ کو شدید صدمہ ہوا، ایلچی کو قتل کرنا اس دور میں بھی بین الاقوامی قوانین اور رسم و رواج کے مطابق بدترین بدعہدی اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت تھی، اور یہ انتہائی پست قسم کا اعلانِ جنگ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اُس وقت مسلمان طرح طرح کے مسائل میں گھرے ہوئے تھے، ابھی مکہ مکرمہ بھی فتح نہیں ہوا تھا، اور ایسے میں شام اور روم کی طاقت سے ٹکر لے کر ایک نیا خطرناک محاذ کھولنا آسان نہ تھا، لیکن ایک صحابی اور وہ بھی ایلچی کو اس طرح بلاوجہ شہید کر دینا بھی ایسی بات نہ تھی جس پر آنحضرت ﷺ خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔

آپ ﷺ نے اس موقع پر صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے انہیں اس حادثے سے باخبر فرمایا۔ اور ساتھ ہی ایک لشکر ترتیب دیا جس کی سربراہی اپنے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر حضرت زید بن حارثہؓ شہید ہو جائیں تو آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو امیر بنایا جائے، اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو امیرِ لشکر قرار دیا جائے۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان باہمی مشورے سے جس کو چاہیں امیر منتخب کر لیں۔

آنحضرت ﷺ کا اس طرح یکے بعد دیگرے تین امیروں کو نامزد فرمانا

ایک غیر معمولی بات تھی، اور اس میں بظاہر یہ اشارہ بھی تھا کہ یہ تینوں بزرگ اس معرکے میں شہادت سے سرفراز ہوں گے، چنانچہ ایک یہودی جو آپ ﷺ کی یہ گفتگو سن رہا تھا، اس نے حضرت زید بن حارثہؓ سے کہا کہ: ''بنی اسرائیل میں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی نبی کسی مہم پر بھیجتے وقت یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کے بارے میں یہ کہے کہ اگر فلاں شہید ہو گیا تو ایسا کرنا تو وہ ضرور شہید ہوتا تھا، لہٰذا اے زید! اگر محمد (ﷺ) واقعی نبی ہیں تو تم اب واپس لوٹ کر اُن کے پاس نہیں آؤ گے۔'' یہودی شاید سمجھتا ہوگا کہ حضرت زیدؓ یہ سن کر خوفزدہ ہوں گے، لیکن حضرت زیدؓ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''تو سن لو! میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ سچے اور پاکباز نبی ہیں۔''[1]

آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے حضرت زید بن حارثہؓ کو جھنڈا عنایت فرمایا، اور تین ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل یہ لشکر اس طرح مدینہ منورہ سے روانہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ بہ نفس نفیس اور مدینہ طیبہ کے باشندوں کا ایک بڑا مجمع اسے الوداع کہنے کیلئے ثنیۃ الوداع تک آیا، جب لشکر وہاں سے روانہ ہوا تو مجمع نے دعا دی:

صحبکم اللہ و دفع عنکم، ورّدکم صالحین غانمین

اللہ تمہارا ساتھی ہو، اللہ تم سے بلائیں دور کرے، اللہ تمہیں صحیح سلامت کامیاب و کامران واپس لائے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ بڑے قادر الکلام شاعر تھے، انہوں نے یہ فقرہ سنا تو یہ اشعار پڑھے:

لکننی أسأل الرحمٰن مغفرة — وضربت ذات فرغ تقذف الزبدا
أو طعنة بیدی حران مُجهزة — بحربة تنفذ الأحشاء والکبدا
حتی یقال إذا مروا علی جدثی — أرشده الله من غازو قد رشدا

[1] مغازی الواقدی، ص: ۷۵۶، ج: ۲

www.freepdfpost.blogspot.com

''لیکن میں تو اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں''

''اور تلوار کی ایسی ضرب کا طالب ہوں جو پھیلتی چلی جائے اور خون کی جھاگ اُبال کر رکھ دے''

''یا پھر کسی حرانی شخص کے ہاتھوں نیزے کے کاری وار کا''

''ایسے نیزے کے ذریعے جو آنتوں اور جگر کے پار ہو جائے''

''یہاں تک کہ جب لوگ میری قبر کے پاس سے گذریں تو کہیں''

''کہ اس غازی کو اللہ نے ہدایت دی تھی، اور وہ ہدایت کی منزل پا گیا۔''[1]

اس شان سے شوقِ شہادت کی اُمنگیں دل میں لیے ہوئے یہ قافلہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ذہن میں یہ تھا کہ بصریٰ کے حاکم سے مقابلہ ہوگا۔ بظاہر اس بات کا امکان نظر نہیں آتا تھا، کہ روم کی وہ زبردست طاقت تین ہزار افراد کے اس انتقامی حملے کو اتنی اہمیت دے گی کہ اپنی پوری فوجی طاقت اس کے مقابلے پر لے آئے۔ لیکن جب صحابہ کرامؓ اردن کے علاقے معان میں پہنچے (یہ علاقہ اب بھی اسی نام سے موجود ہے، اور اردن کا ایک اہم شہر سمجھا جاتا ہے) تو پتہ چلا کہ روم کا بادشاہ ہرقل ایک لاکھ کا لشکر لے کر بذاتِ خود مآب تک پہنچ چکا ہے۔ اور لخم، جذام، قین اور بہراء وغیرہ کے قبائل نے ایک لاکھ افراد مزید ان کی مدد کے لیے فراہم کر دیئے ہیں۔ اس غیر متوقع خبر کا مطلب یہ تھا کہ تین ہزار کا مقابلہ دو لاکھ سے ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال غور اور مشورے کی متقاضی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے معان میں ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا۔ بہت سے حضرات نے یہ رائے دی کہ اس صورت حال کا چونکہ پہلے اندازہ نہیں تھا، اس لیے مناسب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع بھجوائی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ یہ خبر سن کر کچھ کمک روانہ فرمائیں یا کوئی اور حکم دیں۔

بات بظاہر معقول تھی، اور ظاہر اسباب کے تحت جنگی تدابیر کا تقاضا بھی یہی تھا، چنانچہ

[1] سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ص ۲۵۶، ج ۲۔

بہت سے صحابہ کرامؓ اسی رائے پر عمل کرنے کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ لیکن اتنے میں وہی حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کھڑے ہوئے اور یہ ولولہ انگیز تقریر فرمائی:

''اے قوم! جس چیز سے تم اس وقت گھبرانے لگے ہو، خدا کی قسم یہ وہی چیز ہے جس کی تلاش میں تم وطن سے نکلے تھے، اور وہ ہے شہادت! یاد رکھو کہ ہم نے جب بھی کوئی جنگ لڑی ہے تو نہ کثرتِ تعداد کی بنیاد پر لڑی ہے، اور نہ ہتھیاروں اور گھوڑوں کی بنیاد پر، میں بدر میں شریک تھا تو خدا کی قسم! ہمارے پاس صرف دو گھوڑے تھے، میں اُحد میں شامل تھا تو ہمارے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ ہاں ہم نے جس بنیاد پر ہمیشہ جنگ لڑی ہے وہ ہمارا یہ دین ہے جس کا اعزاز اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے، لہٰذا میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ آگے بڑھو، دو سعادتوں میں سے ایک سعادت یقیناً تمہارا مقدر ہے، یا تو تم دشمن پر غالب آ جاؤ گے، اور اس طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا وہ وعدہ پورا ہوگا جو کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا، یا پھر تم شہید ہو کر جنت کے باغات میں اپنے بھائیوں سے جا ملو گے۔''[1]

بس پھر کیا تھا؟ تمام صحابہ کرامؓ شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر جہاد کیلئے کمربستہ ہو گئے، لشکر معان سے روانہ ہو کر پہلے مشارف اور پھر موتہ میں مقیم ہوا، اور پھر موتہ ہی کے اس میدان میں یہ زبردست معرکہ پیش آیا، دونوں لشکر مقابل ہو کر گتھ گئے۔ جنگ کے دوران حضرت

[1] ''یاقوم! واللہ إن التی تکوھون للتی خرجتم تطلبون، الشھادۃ! (ابن ہشام ص:۲۵۷، ج:۲ وعیون الأثر ص:۱۹۹) واللہ ماکنّا نقاتل الناس بکثرۃ عدد، ولا بکثرۃ خیول، إلّا بھذا الدین الذی أکرمنا اللہ بہ، إنطلقوا! واللہ لقدر أیتنا بدر ومامعنا إلا فرسان، ویوم أحد فرس واحد. وإنما ھی إحدی الحسنیین، إما ظھور علیھم فذلک ماوعدنا اللہ ووعدنا نبیّنا، ولیس لوعدہ خلف، وإما الشھادۃ، فنلحق بالإخوان نرافقھم فی الجنان.'' (مغازی الواقدی، ص:۷۶۰، ج:۲)

www.freepdfpost.blogspot.com

زید بن حارثہؓ شہید ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے پرچم اُٹھالیا، گھمسان کے رَن میں چاروں طرف سے نیزوں اور تیروں کی بارش ہورہی تھی، حضرت جعفرؓ کے لیے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہوگیا، نتیجہ یہ کہ وہ گھوڑے سے اُتر پڑے، اور پیدل دشمن کی صفوں میں گھس گئے، کسی نے وار کیا تو دایاں ہاتھ جس میں پرچم سنبھالا ہوا تھا، کٹ کر گر گیا، حضرت جعفرؓ نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا، کسی نے اُس ہاتھ پر بھی وار کیا، اب دونوں ہاتھ کٹ گئے، حضرت جعفرؓ کو جیتے جی اس پرچم کو چھوڑنا گوارا نہ تھا، انہوں نے اُسے کٹے ہوئے بازوؤں میں دبا کر روکے رکھنے کی کوشش کی، لیکن تیسرے وار نے اُنہیں اپنی منزل پر پہنچا دیا، حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ بعد میں ان کی نعش مبارک دیکھی گئی تو ان کے جسم پر نیزے اور تلواروں کے پچاس زخم شمار کیے گئے۔ جن میں سے کوئی ان کی پشت پر نہیں تھا۔[1] رضی اللہ عنہ وارضاہ

آنحضرت ﷺ کی بیان فرمودہ ترتیب کے مطابق اب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی باری تھی، انہوں نے علَم اُٹھایا اور دشمن کی طرف بڑھنے لگے، نہ جانے کب سے کوئی غذا پیٹ میں نہیں گئی تھی، اس لیے چہرے پر شاید بھوک کی نقاہت کے آثار نمایاں ہوں گے، اُن کے ایک چچازاد بھائی نے دیکھا تو گوشت کی چند بوٹیاں کہیں سے لاکر ان کے سامنے پیش کیں کہ ''ان دنوں میں آپ نے بہت محنت اُٹھائی ہے یہ کھالیجئے، تاکہ کم از کم اپنی پیٹھ سیدھی رکھ سکیں۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے گوشت ان کے ہاتھ سے لے کر کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک گوشے سے مسلمانوں پر شدید ہلّے کی آواز سنائی دی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اپنے آپ سے خطاب کر کے فرمایا کہ ''اس حالت میں تم دنیا کے کام میں لگے ہوئے ہو؟'' یہ کہہ کر گوشت چھوڑ دیا، تلوار اُٹھائی اور دشمن کے پروں میں جا گھسے اور وہیں پر لڑتے لڑتے جانِ جاں آفریں کے سپرد کردی۔[2] رضی اللہ عنہ وارضاہ

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی۔ باب ۴۴، حدیث ۴۲۶۰

[2] سیرۃ ابن ہشام۔ ص: ۴۵۸، ج: ۲

ان تینوں بزرگ کے بعد کسی کا نام آنحضرت ﷺ نے تجویز نہیں فرمایا تھا، بلکہ اسے مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ حضرت ثابت بن اقرمؓ نے زمین سے جھنڈا تو اُٹھالیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں سے کہا: ''اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنانے پر متفق ہوجاؤ۔'' لوگوں نے کہا کہ ''بس آپ ہی امیر بن جائیے'' لیکن حضرت ثابت بن اقرمؓ اس پر راضی نہ ہوئے، بالآخر مسلمانوں نے اتفاقِ رائے سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو امیر مقرر کرلیا۔ حضرت ثابتؓ نے پرچم ان کے حوالے کردیا۔ حضرت خالدؓ بے جگری سے لڑے، اور اُس روز ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں۔[1] بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی اور حضرت خالدؓ مسلمانوں کے لشکر کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔[2]

اُدھر مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ اس جنگ کے حالات سے بے خبر نہ تھے، ابھی شام سے کوئی ایلچی جنگ کی خبر لے کر نہیں آیا تھا، کہ ایک روز آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ: ''جھنڈا زیدؓ نے اُٹھایا تھا، وہ شہید ہوگئے، پھر جعفرؓ نے اُٹھایا وہ بھی شہید ہوگئے، پھر ابن رواحہؓ نے اُٹھایا وہ بھی شہید ہوگئے۔'' یہ فرما کر سر کا ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر فرمایا: ''یہاں تک کہ جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالدؓ) نے اُٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمادی۔''[3]

حضرت اسماء بنت عمیسؓ جو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی اہلیہ تھیں، فرماتی ہیں کہ

[1] صحیح البخاری۔ کتاب المغازی، حدیث نمبر ۴۲۶۵

[2] اس جنگ کے انجام کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو مکمل فتح ہوئی تھی، بعض سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان دشمن کے لشکر کے ایک دستے پر فتح پا کر باہر نکل آئے تھے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی کامیابی یہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو بحفاظت واپس لے آئے۔ بہرصورت دو لاکھ افراد سے تین ہزار کے مقابلے کا ان تینوں میں سے جو بھی انجام ہوا ہو، یہ مسلمانوں کی ایک اہم کامیابی تھی۔

[3] صحیح البخاری۔ حدیث ۴۲۶۲

www.freepdfpost.blogspot.com

انہی دنوں میں اپنے گھر میں تھی، اور میں نے اپنے بچوں کو نہلا دُھلا کر تیار کیا تھا، کہ آنحضرت ﷺ میرے گھر میں تشریف لائے، آپ ﷺ نے بچوں کو بلایا، اُنہیں گلے لگا کر پیار کرنے لگے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں، میں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ رو کیوں رہے ہیں؟ کیا جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی خبر آئی ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج وہ شہید ہو گئے۔''

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ یہ سن کر میری چیخ نکل گئی، عورتیں میرے پاس جمع ہونے لگیں، آنحضرت ﷺ باہر تشریف لے گئے اور گھر جا کر فرمایا کہ ''جعفرؓ کے گھر والوں کے لئے کھانا بنا کر بھیج دو۔''[1]

آنحضرت ﷺ نے اسی موقع پر یہ بشارت بھی دی کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جعفرؓ کو ان کے ہاتھوں کے بدلے دو ایسے بازو عطا فرمائے جن کے ذریعے وہ جہاں چاہیں اُڑ کر چلے جاتے ہیں۔[2] اسی لئے حضرت جعفرؓ کا لقب ''طیار'' (اڑنے والا) مشہور ہو گیا۔

میدانِ موتہ:

یہ واقعات کتابوں میں پڑھے ہوئے تھے، اور آج وہی میدان گنہگاروں نگاہوں کے سامنے تھا۔ جہاں صحابہ کرامؓ نے اپنے مقدس خون سے جانبازی اور فداکاری کی یہ تاریخ لکھی تھی۔ تصور کی نگاہیں اس میدان کے مختلف گوشوں میں اس معرکہ رستخیز کے مختلف مناظر دیکھتی رہیں، جس نے ان حضراتِ صحابہؓ کو فرشتوں سے بھی بلند مقام عطا فرمایا ؎

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی، زخاکی بیش ازاں خواہی

[1] سیرت ابن ہشام۔ص:۲۵۹، ج:۲

[2] ایضاً ص:۲۵۸، ج:۲

ابھی ذہن ان تصورات میں گم تھا۔ کہ اس میدان کے مقامی مجاور نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ: ''یہ حضرت زید بن حارثہؓ کا مقامِ شہادت ہے'' یہاں چند فٹ اونچا ایک پتھروں کا بنا ہوا ستون نصب تھا، اور اس پر دھندلے حروف میں لکھی ہوئی یہ عبارت پڑھی جا سکتی تھی کہ: ''ھنا استشھد زید بن حارثہ'' (حضرت زید بن حارثہؓ اس مقام پر شہید ہوئے)۔ اسی سے کچھ فاصلے پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا مقامِ شہادت بیان کیا جاتا ہے۔ وہاں پر بھی اسی قسم کا ایک ستون کھڑا ہوا ہے۔ مجاور نے بتایا کہ یہاں سے جنوب میں تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر میدان کے بیچوں بیچ ایک جگہ ہے، جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ وہاں شہید ہوئے تھے۔ اس جگہ ایک زیر زمین سرنگ بھی بنی ہوئی ہے، مجاور کے کہنے کے مطابق کسی زمانے میں یہاں یہ بات مشہور تھی کہ اس سرنگ سے خوشبو آتی ہے، کوئی شخص اس کی تحقیق کے لیے اندر داخل ہوا، لیکن پھر واپس نہیں آسکا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے مزارات اس میدان سے کافی فاصلے پر ایک بستی میں واقع ہیں، اس بستی کا نام غالباً انہی مزارات کی وجہ سے ''مزار'' مشہور ہے۔ چنانچہ ہم لوگ میدانِ موتہ سے اس بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ صحابۂ کرامؓ میں کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں، تمام صحابہ کرامؓ میں یہ امتیاز اُنہی کو حاصل ہے کہ اُن کا نام قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ (فلما قضی زید منھا وطرا۔ سورۃ الأحزاب) یہ اعزاز کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہے، اسی طرح آپ کی ایک امتیازی سعادت یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپ کا اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا۔ اور اس کا واقعہ بھی

www.freepdfpost.blogspot.com

بڑا عجیب ہے:

حضرت زید بن حارثہؓ کے والد (حارثہ) قبیلۂ بنو کعب سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کی والدہ سُعدیٰ بنو معن کے قبیلے سے۔ حضرت زیدؓ کے لڑکپن کے زمانے میں ان کی والدہ اپنے میکے گئیں تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئیں، بابلیت کا زمانہ تھا، اور قبائل عرب کے درمیان جنگیں چلتی ہی رہتی تھیں، حضرت زیدؓ کی ننھیال پر ایک دشمن قبیلہ حملہ آور ہوا، اور اس زمانے کے دستور کے مطابق وہ حضرت زیدؓ کو قید کر کے لے گیا، اور انہیں غلام بنالیا۔ یہ بے چارے اپنے والدین سے دور غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جب عکاظ میں میلہ لگا تو ان کا آقا انہیں اس میلے میں بیچنے کے لیے لایا، اتفاق سے وہاں اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزامؓ (جو آنحضرت ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے) تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے چار سو درہم میں یہ غلام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خرید لیا۔

اس کے بعد جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح سرکارِ دو عالم ﷺ سے ہوا تو انہوں نے حضرت زید بن حارثہؓ کو بطورِ غلام آنحضرت ﷺ کو ہبہ کر دیا، اور اب وہ آنحضرت ﷺ کی باقاعدہ غلامی میں آ گئے۔

اُدھر حضرت زیدؓ کے والد حارثہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور ان کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تھا، اُنہی کی یاد میں انہوں نے یہ شعر بھی کہا کہ ؎

بکیت علیٰ زید ولم أدرما فعل

أحیّ فیرجی، أم أتی دونہ الأجل

''میں زید پر روتا ہوں، معلوم نہیں کہ اس کا کیا بنا؟''

''پتہ نہیں کہ وہ زندہ ہے کہ کبھی اس سے ملنے کی اُمید کی جائے، یا اس کو موت آ چکی ہے۔''

جب حج کا موسم آیا تو بنو کلب کے کچھ لوگ حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آئے، وہاں انہوں نے حضرت زیدؓ کو دیکھا اور پہچان گئے، اور حضرت زیدؓ نے بھی انہیں پہچان لیا، اور ان سے کہا کہ میرے گھر والوں کو میرا یہ شعر پہنچا دینا۔

أحنّ إلی قومی و إن کنت نائیا

بأنی قطین البیت عند المشاعرِ

یعنی: ''میں اپنی قوم کو اب بھی یاد کرتا ہوں، اگرچہ میں دور ہوں''

''اور مقاماتِ مقدسہ کے پاس بیت اللہ کا مجاور بن چکا ہوں''

یہ لوگ جب واپس پہنچے تو انہوں نے حضرت زیدؓ کے والد کو سارا واقعہ بھی سنایا، اور حضرت زیدؓ کا پتہ بھی دیا۔ حارثہ اور حضرت زیدؓ کے چچا کعب ان کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ پتہ چلا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے غلام بنے ہوئے ہیں، وہ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے، آپ ﷺ اُس وقت مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے آ کر عرض کیا کہ:

''آپ عبدالمطلب کے بیٹے ہیں، وہ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ لوگ حرمِ کعبہ کے پاسبان ہیں، اور آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ غلاموں کو آزاد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہمارا بیٹا آپ کا غلام ہے، ہم اس کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں، آپ ہم پر احسان کیجئے، جو فدیہ بھی آپ طلب کریں، ہم وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں، انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیجئے، وہ غلام زید بن حارثہ ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو کچھ مشکل بات نہیں، میں ابھی ان کو بلا لیتا ہوں، اُن سے اُن کی مرضی معلوم کر لیجئے، اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہیں تو میں کسی فدیہ کے بغیر انہیں آپ کے حوالے کر دوں گا، لیکن اگر انہوں نے خود میرے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تو جو شخص میرے ساتھ رہنا پسند کرے، اسے چھوڑ کر فدیہ لینا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔''

انہوں نے کہا: ''آپ نے ہماری آدھی سے زیادہ مشکل تو حل کر دی۔''

(ان کا خیال تھا کہ حضرت زیدؓ یقیناً اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانا پسند کریں گے۔)

آنحضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بلوا کر اُن کے پوچھا کہ: ''ان دونوں کو پہچانتے ہو؟''

حضرت زیدؓ نے فرمایا: ''جی ہاں! یہ میرے والد ہیں، اور وہ میرے چچا۔''

www.freepdfpost.blogspot.com

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میرے ساتھ ایک مدت تک رہ چکے ہو، اب تمہیں اختیار ہے، چاہو تو میرے ساتھ رہو، اور چاہو تو ان کے ساتھ۔''

حضرت زیدؓ نے جواب دیا: ''میں آپ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، آپ میرے باپ بھی ہیں اور چچا بھی۔''

باپ اور چچا نے یہ سنا تو چیخ پڑے: ''زید! تمہیں کیا ہو گیا؟ تم آزادی پر غلامی کو، اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں پر ایک اجنبی کو ترجیح دے رہے ہو؟''

حضرت زیدؓ نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں نے ان صاحب کے پاس ایک ایسی چیز دیکھی ہے کہ اس کے بعد ان کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔''

آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کی یہ گفتگو سنی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر حطیم کی طرف لے گئے، اور بلند آواز سے فرمایا:

''تمام لوگ گواہ رہیں کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہوگا، اور میں اس کا۔''[1]

حضرت زیدؓ کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی مطمئن ہو گئے، اور خوش دلی سے واپس چلے گئے۔[2] اس کے بعد لوگ تو حضرت زیدؓ کو ''زید بن حارثہ'' کے بجائے ''زید بن محمد (ﷺ)'' کہنے لگے، یہاں تک کہ قرآنِ کریم میں سورۃ الاحزاب کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ حکم دیا گیا کہ متبنیٰ کو بھی اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کر کے پکارنا چاہیے۔

آنحضرت ﷺ نے بہت سی جنگی مہمات کا امیر حضرت زید بن حارثہؓ کو بنایا، اور اس طرح یہ عملی سبق دیا کہ اسلام میں فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے، غلامی اور آزادی نہیں، یہاں تک کہ آخری بار غزوۂ موتہ کی سربراہی انہیں سونپی گئی۔ اور وہ

---

[1] شروع میں منہ بولے بیٹے کو وارث بنایا جا سکتا تھا، بعد میں قرآنِ کریم نے یہ حکم منسوخ فرما دیا۔ اب کوئی منہ بولا بیٹا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ بعد میں یہ حکم بھی آ گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔

[2] یہ پورا واقعہ حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' (ص: ۵۴۵ و ۵۴۶۔ ج ۱) میں نقل فرمایا ہے۔

شخص جس نے نبی کریم ﷺ کی رفاقت و صحبت کی خاطر اپنے باپ، چچا اور پورے خاندان کو چھوڑ دیا تھا، اللہ کے دین کی خاطر آنحضرت ﷺ سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر اس اجنبی سرزمین میں آسودہ ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأرضاہ)

حضرت زید بن حارثہؓ کے مزارِ مبارک کے ساتھ ایک عالیشان مسجد بنی ہوئی ہے، ہم نے نمازِ ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

حضرت جعفر طیارؓ کے مزار پر

یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، وہاں بھی حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت ملی۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے جو عمر میں ان سے دس سال بڑے تھے۔ نبی کریم ﷺ سے شکل و شباہت بہت ملتی تھی، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''أشبهت خَلقی و خُلقی'' (بخاری و مسلم)

''تم صورت میں بھی میرے مشابہ ہو، اور اخلاق میں بھی۔''

حضرت جعفرؓ غریب نواز بہت تھے، غریبوں اور مسکینوں کی بہت مدد کرتے تھے، اس لیے ان کا لقب ''ابو المساکین'' مشہور ہو گیا تھا، اور حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ ''رسول اللہ ﷺ کے بعد جعفر بن ابی طالبؓ تمام لوگوں سے افضل ہیں۔'' آپ نے کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، اور آپ ہی نے نجاشی کے دربار میں وہ پُر اثر تاریخی تقریر فرمائی جس کے نتیجے میں نجاشی مسلمان ہوئے۔ چنانچہ جب آپ حبشہ سے غزوۂ خیبر کے موقع پر واپس تشریف لائے تو آنحضرت ﷺ نے باہر نکل کر آپ کا استقبال فرمایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔[1] یہ ۷ھ کا واقعہ ہے، اور اگلے ہی سال ۸ھ میں غزوۂ موتہ پیش آ گیا، جس میں آپ کی فداکارانہ شجاعت اور شہادت کا واقعہ پیش آ ہی چکا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ:

یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا مزار تھا، وہاں بھی حاضری ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ انصاری صحابی ہیں، اسلام سے پہلے یہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے، اور ان کے اشعار پورے عرب میں پھیلے ہوئے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد باقاعدہ شاعری ترک کر دی تھی، ایک جہاد کے سفر میں آنحضرت ﷺ نے خود ان سے فرمائش کی کہ ''اپنے اشعار سے قافلے کو گرماؤ۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے جواب دیا کہ: ''یارسول اللہ! میں یہ باتیں چھوڑ چکا ہوں۔'' حضرت عمرؓ نے انہیں ٹوکا اور فرمایا کہ ''آنحضرت ﷺ کی بات سن کر اسے ماننا چاہئے۔'' اس پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے موقع کی مناسبت سے یہ اشعار پڑھے:

یارب لولاأنت مااهتدينا ولاتصدقنا ولاصلّينا

فأنزلن سكينة علينا وثبّت الأقدام إن لاقينا

إن الكفار قدبغوا علينا وإن أرادو افتنة أبينا

''اے پروردگار! آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی''

''نہ ہم صدقہ کر سکتے، نہ نمازیں پڑھ سکتے''

''اب آپ ہی ہم پر سکینت نازل فرمائیے''

''اور جب ہم دشمن کے مقابل ہوں تو ہمیں ثابت قدم رکھیئے''

''کفار نے ہمارے خلاف سر اُٹھایا ہوا ہے''

''اگر وہ فتنہ برپا کرنا چاہیں گے تو ہم کرنے نہیں دیں گے۔''

جب آنحضرت ﷺ عمرۃ القضاء کے موقع پر مسجد حرام میں داخل ہوئے اور طواف کے لیے آگے بڑھے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ کے لیے راستہ بناتے ہوئے چل رہے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے آپ کو بھی متعدد جنگی مہمات میں امیر بنایا، اور

آخری بار غزوۂ موتہ میں آپ سربراہِ لشکر بنے، جس میں آپ کے شوقِ شہادت اور جذبۂ سرفروشی کے واقعات پیچھے گزر چکے ہیں۔[1]

غزوۂ موتہ کے میدان اور تینوں بزرگوں کے مزارات پر حاضری اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی سکینت وطمانیت آج کے دن کا وہ عظیم سرمایہ تھی جو زندگی بھر یاد رہے گی۔

.....☆.....☆.....

(۷)

سہ پہر کا تقریباً ڈیڑھ بجا ہوگا جب ہم میدانِ موتہ اور شہدائے موتہ کی زیارت سے فارغ ہوئے۔ اب ہم یہاں سے عمان کے راستے سیدھے دمشق جانا چاہتے تھے، لوگوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ عمان جانے کے لئے ایک اور راستہ نسبتاً مختصر بھی ہے، اور مرکزی شاہراہ ہونے کی وجہ سے زیادہ آباد بھی۔ لیکن اُس مرکزی شاہراہ پر پہنچنے کے لئے کافی دور تک ایک چھوٹی سڑک پر سفر کرنا پڑے گا۔ گاڑی میں پیٹرول کم تھا، اور اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دور چلنے کے بعد پیٹرول پمپ مہیا ہو سکے گا، اس لیے چاہا کہ مزار کی بستی ہی سے پیٹرول ڈلوالیں، یوں بھی اردن کے زمینی راستوں کے نقشے پر یہ ہدایت درج تھی کہ چھوٹے راستوں پر پیٹرول پمپ کم ہیں، اس لیے کسی لمبے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے گاڑی میں پیٹرول کی کافی مقدار کا اطمینان کر لیا کریں۔

لیکن مزار کی بستی میں ایک سرے سے دوسرے تک تلاش کرنے کے باوجود کوئی پیٹرول پمپ نہ ملا۔ بعض مقامی افراد کی رہنمائی سے ایک پیٹرول پمپ تک پہنچے، لیکن وہ بند پڑا تھا، اور مالک کا سراغ نہ مل سکا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رہے سہے پیٹرول کے ساتھ ہی کسی طرح مرکزی شاہراہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، اُس

[1] مذکورہ بالا واقعات کیلئے دیکھئے۔ طبقات ابن سعد۔ ص: ۵۲۵ تا ۵۲۸، ج: ۳

www.freepdfpost.blogspot.com

زمانے میں وہاں ڈھائی پونے تین بجے کے قریب عصر کی اذان ہو جاتی تھی، اس لیے دن ڈھلتا جا رہا تھا، ہم اندھیرے سے پہلے عمان پہنچنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اللہ کے نام پر سفر شروع کیا، لیکن کچھ دور چلنے کے بعد کار کی ایندھن کی سوئی اختتام کے آخری نشان کو چھونے لگی، دوسری طرف ہمارے چاروں طرف ریگستان تھا، اور سڑک اتنی سنسان کہ دور تک کسی گاڑی کا نشان نظر نہیں آتا تھا، کبھی کوئی اِکا دُکا گاڑی آگے پیچھے سے گذر جاتی تھی، اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ مرکزی شاہراہ کتنی دور ہے، کسی بھی وقت گاڑی جواب دے سکتی تھی، اور جواب دے دیتی تو اس لق و دق صحرا میں کوئی مدد ملنی مشکل تھی۔ تمام رفقاء اس تصور سے خاموش بھی تھے اور کسی قدر متفکر بھی۔ انسان کی نگاہیں صبح و شام اسباب ہی پر لگی رہتی ہیں، اور وہ انہی اسباب کی تلاش میں دن رات سرگرداں رہتا ہے، اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سارے اسباب کسی مسبّب کے ہاتھ میں ہیں، وہ مسبّب کے بجائے اسباب ہی سے لَو لگائے رکھتا ہے، لیکن جب کبھی ظاہری اسباب کے تمام راستے بند ہو جائیں، اور کوئی چارہ نہ رہے تو اُس وقت خدا ہی یاد آتا ہے، قرآنِ کریم نے انسان کی اِسی کمزوری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

اور جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اِسی وقت اللہ کو پکارتے ہیں، اور اس وقت بندگی خالص اِسی کے لئے کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ سلامتی کے ساتھ کسی پیٹرول پمپ تک پہنچ جائیں، ایندھن کی سوئی بہت دور سے پیٹرول ختم ہونے کا اشارہ دیتی آ رہی تھی، لیکن گاڑی بفضلہٖ تعالیٰ پوری رفتار سے چلتی رہی، یہاں تک کہ سوئی کے ''اختتام'' کے نشان پر پہنچنے کے بعد معمولی حالات میں جتنا فاصلہ طے ہونے کی توقع ہوتی ہے، وہ بھی طے ہو گیا، لیکن گاڑی نہ رُکی، اب کسی بھی لمحے خطرہ پیش آ سکتا تھا۔ اِسی اُمید و بیم کے عالم میں کافی دیر بعد دور اُفق پر ایک سڑک کی لکیر نظر آئی، جس پر دونوں طرف سے گاڑی دوڑ رہی تھیں۔ یہی وہ مرکزی شاہراہ تھی جس کا پتہ بتایا گیا تھا۔ دعا درود کرتے کرتے بفضلہٖ تعالیٰ ہم اِس شاہراہ پر پہنچ ہی گئے۔

اس شاہراہ پر کچھ دور اور سفر کرنے کے بعد بائیں ہاتھ پر دور ریسٹورنٹ اور ایک پیٹرول پمپ نظر آ گیا۔ نمازِ عصر ادا کی، اس کے بعد بھوک اپنے شباب پر تھی۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اردن اور شام میں کھانوں کی انواع و اقسام بہت سی ہوتی ہیں، اُن میں سے بہت کم اپنے منہ کو لگتی ہیں، لیکن سیخ کے کباب (جنہیں یہاں ''شیش کباب'' کہا جاتا ہے) اور تکے (جنہیں یہاں ''اوصال'' کہتے ہیں) یہ لوگ بہت اچھے بناتے ہیں، وہی منگوائے گئے۔

ایک طویل، پُر مشقت اور پُر خطر سفر کے بعد ایسے صاف ستھرے اور پُر فضا ریسٹورنٹ میں عافیت کے یہ لمحات، اور ایسی بھوک کے عالم میں یہ لذیذ غذا ایک مسافر کیلئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ ہم دن رات ایسی عافیت اور ایسی راحت و لذت سے نہ جانے کتنی مرتبہ بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں، مگر اکثر اِن نعمتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ جب کبھی خطرات سے گذرنے کے بعد یہ چیزیں میسر آتی ہیں، تب ان کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

کھانے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا، جب عمان کے مضافات میں پہنچے تو سورج کا سفینہ کنارے لگ رہا تھا، اور اس کی الوداعی کرنیں رات کی آمد کا پیغام دے رہی تھیں، ہمیں ابھی دمشق جانا تھا، معلوم ہوا کہ ایک سڑک عمان کے باہر ہی باہر دمشق کی طرف جاتی ہے، اور شہر میں داخل ہونا نہیں پڑتا۔ ہم اِسی سڑک پر ہو لئے۔ یہ سڑک عمان کی شمالی جانب میں ایک ہلالی نصف دائرہ بناتی ہوئی اردن کے دوسرے اہم شہر زرقا پہنچ گئی جو عمان کے قریب ہی آباد ہے، بلکہ اب دونوں شہروں کی آبادیاں بڑھتے بڑھتے یک جان ہو گئی ہیں۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد ''مسجد خالد بن ولیدؓ'' میں ہم نے نمازِ مغرب ادا کی، اور سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ رات کے نو بجے کے قریب ہم اردن کی آخری سرحدی بستی رمثاء پہنچے، جس کے بعد شام کا علاقہ شروع ہو رہا ہے۔

دریائے اردن:

یہ واقعہ جنوری ۱۹۸۶ء کا ہے، اس کے بعد اِسی سال اکتوبر میں مجمع الفقہ الاسلامی کا سالانہ اجلاس عمان میں منعقد ہوا۔ اس میں شرکت کے لیے مجھے دوبارہ عمان جانے کا

www.freepdfpost.blogspot.com

موقع ملا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس دوسرے سفر کی چند باتیں بھی ذکر کر دینا مناسب ہے۔

اس مرتبہ عمان میں میرا قیام ایک ہفتہ رہا۔ لیکن مجمع کے اجلاسات کی مصروفیت اتنی تھی کہ کہیں اور جانے کا موقع کم ملا، وہاں کے ایک معروف ہوٹل ریجنسی پیلس میں قیام کا انتظام تھا، اور اسی کے ایک ہال میں اجتماعات ہوتے تھے، لہٰذا صبح و شام ہوٹل ہی میں رہنا ہوتا تھا۔ البتہ اجلاس کے اختتام پر منتظمین نے ایک دن شرکائے اجتماع کیلئے اجتماعی طور پر اردن کے خاص خاص مقامات کی سیاحت کا پروگرام رکھا تھا، میں اگرچہ بیشتر مقامات پہلے دیکھے ہوئے تھا، لیکن یہ قافلہ بہت سے اہل علم پر مشتمل تھا، وزارۃ الاوقاف کے سیکریٹری ڈاکٹر عبدالسلام العبادی (جن کی کتاب ''الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' تین جلدوں میں اپنے موضوع پر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے) بطور رہنما ساتھ تھے۔ اور رفقائے سفر میں ڈاکٹر مصطفےٰ الزرقا، شیخ علی احمد السالوس، شیخ محمد ہشام البرہانی، شیخ عبداللطیف، آلِ سعد اور بہت سے حضرات شامل تھے۔

اس سفر میں ہم اصحابِ کہف کے غار، بحر میت اور اغوار کے علاقے میں گئے۔ ان سب علاقوں کی تفصیل میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں، البتہ اس مرتبہ چند نئے مقامات پر جانا ہوا، ان میں سے پہلا مقام تو دریائے اردن تھا۔ بحر میت کی سیاحت کے بعد ہمیں منتظمین دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر لے گئے۔ جو آج کل اردن اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی لائن کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

دریائے اردن بڑا قدیم دریا ہے، یہ لمبائی میں ۳۱۹ کلومیٹر کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ کنعان اور کچھ فلسطین اور سوریا میں ہے۔ اس کا تذکرہ قدیم ترین کتابوں میں پڑھتے آئے تھے، بائبل کے بہت سے صحیفوں میں جا بجا اس دریا اور اس کے کنارے پیش آنے والے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی کم از کم دو مقامات پر اس دریا کا نام لیے بغیر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پہلا ذکر سورۂ البقرہ میں ہے، جہاں حضرت طالوت کے عمالقہ کے ساتھ جہاد کا واقعہ بیان ہوا ہے، وہاں قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت طالوت نے اپنے رفقاء سے کہا تھا کہ:

اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ

بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک دریا سے آزمائے گا، پس جو شخص اس دریا کا پانی پیئے گا اس کا مجھ سے تعلق نہیں، اور جو اسے نہ چکھے وہ بلاشبہ میری جماعت سے ہے، سوائے اس کے جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے۔''

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے۔

قرآن کریم نے دوسری بار دریائے اردن کی طرف سورۂ روم میں اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی اس جگہ جہاں ایرانی لشکر کے ہاتھوں رومیوں کی شکست کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہے:

الٓمّٓ. غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ،

الٓمّٓ۔ روم کے لوگ نزدیک ترین زمین میں مغلوب ہو گئے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں ''نزدیک ترین زمین'' سے مراد دریائے اردن کی وادی ہے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے لشکر نے روم کے لشکر کو شکستِ فاش دی تھی۔

دریائے اردن کی وادی مختلف اقوام اور تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اسی کے کناروں پر سینکڑوں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، اور تاریخ کے جانے کتنے ابواب لکھے گئے۔ اس کے مغربی کنارے سے فلسطین کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، جسے قرآنِ کریم نے ہر جگہ ''ارضِ مقدسہ''، ''ارضِ مبارکہ'' وغیرہ کے ناموں سے تعبیر فرمایا ہے۔

کتابوں میں دریائے اردن اور اس سے وابستہ تاریخی واقعات کے بارے میں جو کچھ پڑھا لکھا تھا، اس کی بنا پر ذہن میں تاثر یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا سا دریا ہوگا، لیکن یہاں پہنچ کر دیکھا تو یہ چوڑائی میں اتنا چھوٹا ہے کہ اس کے لیے ''دریا'' کے بجائے ''نالے'' کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی ہمارے پاکستان کے دریائے سوات یا دریائے کنہار کے برابر ہوگی۔ اور بہت سی جگہوں پر اس سے بھی کم، اور سردی کے موسم کی وجہ سے اس میں پانی بھی بہت کم تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

دریا پر ایک پل بنا ہوا ہے، جس کے مشرقی حصے پر اردن کی آخری چوکی اور ایک بڑا دفاعی مورچہ بنا ہوا ہے، پُل کا تقریباً دو تہائی حصہ اردن کے قبضے میں ہے، اور باقی ایک تہائی حصہ اسرائیل کے تسلط میں، دونوں حصوں کو ممتاز کرنے کیلئے بیچ میں ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا ہے، ہم اس ڈرم تک گئے۔ اس سے آگے اسرائیل کے فوجی پہرہ دے رہے تھے اور پُل کے مغربی کنارے پر ان کی چوکی نظر آ رہی تھی۔ بیت المقدس یہاں سے بارہ پندرہ میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن بیت المقدس تو کجا، ہمارے لیے اسرائیل کا ممنونِ احسان ہوئے بغیر دریا پار کرنا بھی ممکن نہ تھا..... ہماری بداعمالیوں کی پاداش مغربی کنارے پر اسرائیل کے لہراتے ہوئے پرچم کی صورت میں ہمارے سامنے تھی، دل تھا کہ حسرت و ندامت اور یاس و اضطراب کے جذبات سے پسا جا رہا تھا، لیکن ہمارے پاس اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے سوا اس صورت حال کا کوئی علاج نہ تھا، تمام رفقاء خاموش اور دم بخود تھے، کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا، شاید سب اسی قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے، جب لوٹ کر واپس گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ہمارے ایک رفیق نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:

''یہ جگہ تو سیاحت کیلئے نہیں، جہاد کیلئے آنے کی تھی۔''

ہم سب یہ نشتر بھی سہہ گئے اور تھوڑی دیر میں گاڑی واپس مشرق کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہاں سے ہمارا قافلہ مسجد ابی عبیدہؓ کے لیے روانہ ہوا، راستے ہی میں جمعہ کا وقت ہوگیا۔ بیشتر بلادِ عربیہ میں معمول ہے کہ زوال ہوتے ہی اوّل وقت جمعہ پڑھ لیتے ہیں، اور تمام مسجدوں میں ایک ہی وقت جمعہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر ایک مسجد میں جمعہ نہ ملے تو پھر کہیں نہیں مل سکتا، لہٰذا ہم نے راستے کے ایک شہر میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد ابی عبیدہؓ پہنچے، وہاں منتظمین ہمیں ایک قریبی بستی میں لے گئے، یہاں ایک زمیندار کے گھر میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا، یہ کھانا اردن کے مقامی روایتی انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔ کئی بڑے بڑے تھالوں میں چاول رکھ دیئے گئے، جن میں پہلے سے دہی اور چلغوزے پڑے

ہوئے تھے۔ تھال کے بیچ میں ایک مسلم دُنبے کا گوشت اُبلا ہوا رکھا تھا۔ اردن کے دیہات کی روایت یہ ہے کہ معزز ترین مہمانوں کے سامنے یہ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ چمچوں اور چھری کانٹے کے تکلفات نہ تھے، دس دس بارہ بارہ آدمیوں نے ایک ایک تھال میں ہاتھوں سے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد عمان واپسی کیلئے دوسرا راستہ اختیار کیا گیا، جو انتہائی سرسبز و شاداب پہاڑیوں سے گذرتا تھا، قدم قدم پر کھیت اور باغات، سبزے سے لدے ہوئے پہاڑ، دلکش وادیاں اور پہاڑوں پر چڑھتی اُترتی سڑکیں، غرض پورا راستہ بڑا خوبصورت اور دلآویز تھا۔ راستے میں ایک قلعہ ''الربض'' بھی دیکھا جو اس علاقے کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے تعمیر کیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب بیت المقدس پر عیسائیوں نے قبضہ کرلیا تھا، اور سلطان صلاح الدین ایوبی اُسے عیسائیوں سے واگزار کرانے کیلئے اُٹھے تھے۔ یہ قلعہ پورے علاقہ کا بلند ترین مقام ہے۔ اس کا رخ مغرب کی جانب ہے، اور یہاں کے بُرج سے دور دور تک فلسطین کا نظارہ کیا جاسکتا ہے، یقیناً یہاں کی نصب شدہ منجنیق مغرب میں دشمن پر حملہ کرنے کیلئے انتہائی مؤثر ثابت ہوئی ہوگی۔ یہ قلعہ آج پھر کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں چشم براہ ہے۔

عصر کا وقت ہوگیا تو راستے کے ایک قصبے کی مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے اُترے، دیکھا تو یہ قصبہ عجلون تھا۔ حدیث کی مشہور کتاب ''کشف الخفاء'' کے مصنف علامہ اسمٰعیل بن محمد عجلونیؒ اسی قصبے کی طرف منسوب ہیں۔ جس مسجد میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی، وہ بھی بڑی قدیم مسجد تھی، وہاں لگے ہوئے ایک کتبے کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام عبادی نے بتایا کہ یہ مسجد سلطان ظاہر بیبرس نے تعمیر کی تھی۔

یہاں سے روانہ ہوکر ہم مغرب کے وقت واپس عمان پہنچے۔

مجموعی تاثرات:

اردن ایک چھوٹا سا ملک ہے، اسرائیل کے مقبوضات سمیت اس کا کل رقبہ

www.freepdfpost.blogspot.com

ایک لاکھ آٹھ ہزار مربع کلومیٹر ہے، اور عرب اسرائیل جنگ کے بعد ستانوے ہزار سات سو چالیس کلومیٹر رہ گیا ہے۔ آبادی بارہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ زیادہ تر رقبہ خشک اور غیر آباد ہے۔ البتہ بعض علاقے بڑے زرخیز ہیں، غذائی اجناس اور زیتون یہاں کی خاص پیداوار ہے، فاسفورس بھی نکلتا ہے۔ ترکی خلافت کے زمانے میں یہ اسلامی حکومت کا ایک چھوٹا سا صوبہ، بلکہ ایک ڈویژن تھا، اردن، سوریا، لبنان اور فلسطین جو آج چار خودمختار ملک ہیں، یہ چاروں مل کر شام کہلاتے تھے، جو اسلامی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ مغربی ممالک کی سازشوں سے شام چار حصوں میں تقسیم ہوا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اردن ترکی خلافت سے الگ ہوا، اور ۱۹۴۶ء میں موجودہ شاہی خاندان نے ''المملکۃ الہاشمیۃ الأردنیۃ'' کے نام سے اپنی بادشاہت قائم کی۔

حکومت کے انتظام کے لحاظ سے بلاشبہ اس وقت اردن عالم اسلام کے ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں کا نظم وضبط اور معیارِ زندگی قابل تعریف ہے، اور ملک کو اس معیار تک پہنچانے میں حکمرانوں کی جدوجہد کا بڑا دخل ہے۔ یہاں خواندگی کی شرح ۸۰ فیصد ہے۔ لوگوں میں تہذیب، شائستگی اور خوش اخلاقی نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ صفائی ستھرائی کا معیار بھی عالم اسلام کے دوسرے پسماندہ یا ترقی پذیر ملکوں سے بہتر ہے۔ کہتے ہیں شاہ حسین اور ولی عہد شہزادہ حسن بہت سادگی کے ساتھ لوگوں میں گھلے ملے رہتے ہیں، سڑکوں پر جاتے ہوئے کسی شخص کو کوئی غلط کام کرتے دیکھتے ہیں تو خود کار سے اُتر کر اُسے نرمی سے فہمائش کر دیتے ہیں۔

عوام کو سرکاری دفتروں میں رشوت، بدنظمی یا کام چوری کی شکایت نہیں ہے، جو شخص بھی اپنا کوئی جائز کام دفتروں میں لے کر جائے، وہ بآسانی اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ جرائم بھی بہت کم ہیں، اور بحیثیت مجموعی امن وامان کی فضا نظر آتی ہے۔

لوگوں میں خوش اخلاقی اور نرم خوئی اتنی عام ہے کہ کسی بھی شخص سے بات کر کے دل خوش ہو جاتا ہے، لوگوں میں خوش اخلاقی کا یہ معیارِ بلند احقر کو کسی دوسرے عرب ممالک میں نظر نہیں آیا۔ ایک اجنبی اگر راستے پر جاتے ہوئے کسی جگہ ٹھٹکے تو ہر راہ گیر رُک کر اس

سے دریافت کرتا ہے کہ اُسے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

عوام کی دینی حالت بہت اچھی نہیں تو بہت بُری بھی نہیں ہے، مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد کافی ہوتی ہے، دھوکہ فریب بہت کم ہے۔ البتہ اردن پر امریکی اثرات روز افزوں ہیں، اور ان کی وجہ سے دینی فضا بھی روز بروز خراب ہو رہی ہے، ذرائع ابلاغ سے عریانی و فحاشی کے پرچار پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ انتہائی عریاں اور مخرب اخلاق فلموں کی نمائش ٹی وی کے روزمرہ کے معمول میں داخل ہے۔ اور اس لحاظ سے معاشرہ تیزی سے اخلاقی ابتری کی طرف جا رہا ہے، عریانی وفحاشی اور شراب نوشی کی وبائیں عوام تک تو ابھی نہیں پہنچیں، لیکن ملک کے بااثر پڑھے لکھے اور دولت مند حلقوں میں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

اردن اپنی مختصر آبادی اور اندرونی مسائل کی کمی کی وجہ سے نفاذِ شریعت کے لیے بہترین ملک ہے، جو اگر شریعت کو اپنانے کی مثال قائم کرے تو دنیا بھر کے لیے ایک نمونہ بن سکتا ہے، لیکن نہ حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ ہے، نہ ملک میں اس مقصد کے لیے کسی مؤثر تحریک کا کوئی وجود ہے، نتیجہ یہ کہ یہاں امریکی اثرات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں، اور ان پر روک لگانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

شام کی حدود میں:

اس جملہ معترضہ کے بعد میں پھر جنوری ۱۹۸۶ء کے سفر کی طرف لوٹتا ہوں۔

رمثاء اردن کی آخری بستی تھی، وہاں امیگریشن وغیرہ کی کارروائی کے بعد ہم آگے جانا چاہتے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ شام کی حدود میں داخل ہونے کے لیے شامی حکومت کی طرف سے ایک رہنما گاڑی آتی ہے، اسی کی رہنماء میں سرحد عبور کی جا سکے گی، تنہا کسی گاڑی کو جانے کی اجازت نہیں۔

چنانچہ اس گاڑی کے انتظار میں خاصی دیر لگ گئی، جب چند کاریں جمع ہو گئیں تو شامی گاڑی آئی، اور اس کی رہنمائی میں ہماری کار نے چلنا شروع کیا، رمثاء کی چوکی سے نکل کر شام کی سرحدی چوکی درعہ تک پہنچنے کے لئے تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے،

www.freepdfpost.blogspot.com

یہاں سڑک کے دونوں طرف باڑھ لگی ہوئی ہے۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ باڑھ کے پار کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بس اگلی رہنما گاڑی کی عقبی روشنی کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، یہاں تک کہ شام کی پہلی چوکی درعہ آ گئی۔

یہاں امیگریشن اور کسٹم کی کارروائی میں کافی وقت لگا، میرے ساتھ کچھ کتابوں کا ایک بنڈل تھا جو سعودی عرب اور اردن سے خریدی تھیں، گاڑی کے رُکتے ہی کسٹم کا آدمی کتابوں کا وہ بنڈل اُٹھا کر کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا۔ کسٹم کے کچھ اور لوگوں نے بعد میں کار کے دوسرے سامان کی تلاشی لی، اور گاڑی کو پاس کر دیا۔ انہی سے کتابوں کا اتہ پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک دفتر کا پتہ بتایا کہ وہاں ان کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا، اس کے بعد وہ آپ کو واپس کر دی جائیں گی۔

رات کے دس بج چکے تھے، ابھی تک عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی، امیگریشن کی کارروائی کے بعد ہم نے پہلے نماز پڑھی، اس کے بعد کتابوں کی تلاش میں کافی دیر سرگرداں رہے، بالآخر تلاشِ بسیار کے بعد کتابوں کا بنڈل مل گیا۔ یہاں سے ہمیں دمشق جانا تھا، جو تقریباً سو کلومیٹر دور ہوگا، اس لیے رات کے کھانے کی جگہ تھوڑا سا ناشتہ بھی کیا، اور جب یہاں سے روانہ ہوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

درعہ سے نکلنے کے بعد دمشق جانے والی سڑک پر گھٹا ٹوپ تاریکی میں چلتے رہے، جب کہیں کوئی موڑ آتا تو راستہ معلوم کرنا پڑتا، صبح آٹھ بجے سے ہم مسلسل کار میں سفر کر رہے تھے، اس لیے خواہش یہ تھی کہ جلد از جلد منزل تک پہنچ جائیں، لیکن راستہ تھا کہ لمبا ہوتا جا رہا تھا، جہاں کچھ زیادہ روشنیاں نظر آئیں خیال ہوتا کہ شاید یہی دمشق ہو، لیکن وہ کوئی اور بستی ہوتی اور اس کے پاس سے گذرنے کے بعد پھر وہی اندھیرا چھا جاتا۔ ایک دو مرتبہ راستے کے تعین کے لیے پیچھے بھی لوٹنا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے اُفق پر ایک پہاڑ روشنیوں سے جگمگ کرتا نظر آیا، جس کے دامن میں دور تک قمقمے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ دمشق کا مشہور پہاڑ قاسیون تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے، جب ہم دمشق کی حدود میں داخل ہوئے، آدھی رات

گزر جانے کے باوجود شہر کی چہل پہل برقرار تھی۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ ہوٹل کے انتخاب کیلئے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ عطاء الرحمٰن صاحب پہلے بھی دمشق آ چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مرجہ کے محلے میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں اور بھی ہوٹل موجود ہیں، چنانچہ ہم سیدھے وہیں پہنچ گئے۔ جس ہوٹل کا ذکر عطاء الرحمٰن صاحب نے کیا تھا، اس میں کوئی جگہ خالی نہ تھی، اس لئے مولوی عطاء الرحمٰن صاحب اور مولوی امین اشرف صاحب سلمہٗ کسی دوسرے ہوٹل کی تلاش میں چلے گئے۔ میں اور قاری بشیر صاحب ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے رہے۔

ان لوگوں کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی تو ہم انہیں دیکھنے کیلئے باہر نکلے، کچھ دور چل کر عجیب وحشت خیز منظر آیا۔ کچھ لوگ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے تھڑے لگائے کھڑے تھے، ان تھڑوں پر کچھ بوتلیں رکھی تھیں اور وہ بلند آواز سے پکار رہے تھے: ''وہسکی، وہسکی، وہسکی۔''

دوسری طرف کچھ ناپسندیدہ وضع کے لوگ ان تھڑوں کے اردگرد ہاتھوں میں شراب کیلئے شور وغل کر رہے تھے۔ شراب کی اس طرح خرید وفروخت اور استعمال کا یہ کریہہ منظر میں نے اس سے پہلے کم از کم کسی مسلمان ملک میں نہیں دیکھا تھا۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ اچھے لوگوں کا نہیں ہے، یہاں سے کہیں اور منتقل ہونا چاہیے۔ اتنے میں عطاء الرحمٰن صاحب اور امین اشرف صاحب یہ خبر لے کر آ گئے کہ آس پاس کے تمام اچھے ہوٹل بھرے ہوئے ہیں اور بیشتر ہوٹل ایرانی زائرین نے بک کرا رکھے ہیں، صرف ایک نئے ہوٹل میں ایک کمرہ موجود ہے۔۔۔ اس علاقے سے کراہیت کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہاں سے کسی اور محلے میں جا کر کوئی اچھا ماحول تلاش کریں، لیکن رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا، اور بستر تک پہنچنے کی خواہش اس درجہ غالب تھی کہ کم از کم ایک رات کیلئے اسی کمرے میں رہنا منظور کر لیا۔ شدید تھکن کے بعد بستر میسر آیا تو جلد ہی نیند آ گئی۔

صبح کو بیدار ہونے اور معمولات سے فراغت کے بعد میں نے پاکستانی سفارت خانے فون کیا، قونصل جنرل توحید احمد صاحب سے بات ہوئی، وہ غائبانہ احقر سے واقف تھے۔۔ میں نے اُن سے ذکر کیا کہ ہمیں قیام کیلئے کسی اچھے ہوٹل کی بھی ضرورت ہے، اور ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

رہنماء کی بھی۔ انہوں نے کہا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں خود آپ کے پاس پہنچتا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے ایک اچھے ہوٹل میں ہماری بکنگ بھی کرادی تھی، یہ ایک فوراسٹار ہوٹل فندق البستان تھا، جو دمشق کے بارونق علاقے وکٹوریا پر جبل قاسیون کے سامنے واقع تھا۔ اور ہماری ضروریات کے لئے بہت مناسب۔ چنانچہ ہم اس میں منتقل ہوگئے۔

جامعہ دمشق میں:

اِسی دوران توحید صاحب نے ہمیں دمشق یونیورسٹی لے جانے کا پروگرام بنالیا تھا، چنانچہ ہم ہوٹل سے سیدھے دمشق یونیورسٹی پہنچے، یہاں ''کلیۃ الشریعۃ'' کے سربراہ ڈاکٹر فتحی الدرینی ہمارے منتظر تھے۔ میں درینی صاحب سے غائبانہ ان کی کتابوں کے توسط سے متعارف تھا، انہوں نے اصولِ فقہ اور جدید فقہی مسائل پر متعدد تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب ''المناہج الأصولیۃ'' میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ توحید صاحب نے اُن سے میرا تعارف کرایا، وہ بڑے تپاک سے ملے، اور کلیۃ الشریعۃ کے دوسرے اساتذہ کو بھی جمع کرلیا۔ یہاں دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، ڈاکٹر درینی صاحب نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بھی احقر کو تحفۃً دیا۔

دمشق یونیورسٹی کا کلیۃ الشریعۃ عالم عرب میں علمی اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا رہا ہے، اور شاید جامعۃ الازہر اور جامعۃ الزیتونہ کے بعد اس کی علمی شہرت سب سے زیادہ رہی، لیکن موجودہ لادینی حکومت نے یہاں کے اہل علم و فضل پر جو ستم ڈھائے، ان کی بنا پر یہاں سے بڑے بڑے صاحبانِ علم وفضل ہجرت کر گئے، اور وہ پہلا سا علمی معیار بھی باقی نہیں رہا، اور علمی تدین کے اعتبار سے تو یہاں کی فضا اور بھی گر گئی۔

یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے، لیکن اس کے باوجود متعدد طالبات مکمل برقعے میں ملبوس بھی نظر آئیں۔

دوپہر کے وقت ہم ہوٹل واپس آگئے اور عصر تک آرام کیا۔ توحید صاحب نے سفارت خانے کے سیکنڈ سیکریٹری عنایت صاحب کو ہماری رہنمائی کیلئے متعین کردیا تھا۔ عصر کی نماز کے وقت وہ ہوٹل آگئے، اور ان کی معیت میں ہم دمشق کے مختلف مقامات کی زیارت وسیاحت کیلئے روانہ ہوئے۔

شہر دمشق:

دمشق[1] اس وقت دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد کشتی سے اُتر کر سب سے پہلے دو بستیاں آباد فرمائیں، پہلے حران اور پھر دمشق۔ اس طرح طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے حران اور دمشق آباد ہوئے۔ بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک غلام کا نام دمشق تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہاں بستی بسائی تھی، اس لیے اس کا نام دمشق ہوگیا۔ بعض تاریخوں میں یہ مذکور ہے کہ یہ بستی ذوالقرنین نے بسائی ہوئی ہے، اور بعض نے اس کی تعمیر کو سکندر مقدونی کے ایک غلام کی طرف منسوب کیا ہے۔[2]

ان متعارض تاریخی روایتوں سے نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے، لیکن یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہ شہر ہزاروں سال سے آباد ہے، بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، اور جب سے تاریخ کی تدوین شروع ہوئی۔ اس وقت سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دمشق دنیا کا سب سے پرانا شہر ہے۔ جو اَب تک آباد ہے۔[3]

---

[1] اس کا صحیح تلفظ دِمَشق (دال پر زیر، میم پر زَبر اور شین پر جزم) ہے۔

[2] ان روایات کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ دمشق: ابن عساکر، ومختصر تاریخ دمشق: ابن منظور۔ ص: ۴۳ تا ۴۵، ج: ۱

[3] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ ص: ۱، ج: ۷

www.freepdfpost.blogspot.com

اسلام سے پہلے اس شہر پر بیشمار طاقتیں حکمرانی کرتی رہیں۔ طلوعِ اسلام کے وقت یہ رُوم کی بازنطینی سلطنت کا اہم تجارتی شہر تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فتح ہوا، اور صوبۂ شام کا پایۂ تخت قرار پایا۔ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں حضرت معاویہؓ اس کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے اسے پورے عالم اسلام کا دارالخلافہ قرار دے دیا۔ چنانچہ بنو اُمیہ کے عہد حکومت میں تقریباً ایک صدی تک یہ اُس اسلامی حکومت کا پایۂ تخت رہا جس کی حدود بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) سے بحرِ ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

تقریباً ایک لاکھ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ شام ہی کو اپنا دارالہجرۃ قرار دیا تھا، اس لیے جن انبیاء کرام کے حالات معلوم ہیں، ان میں سے بیشتر شام ہی کے علاقے میں پیدا ہوئے اور دمشق کا پہاڑ قاسیون ان کی تبلیغ و دعوت کا بہت بڑا مستقر بنا رہا۔

مسلمانوں کے ہاتھوں دمشق کی فتح کے بعد جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد یہاں آ کر آباد ہوئی، لہٰذا اس شہر کو انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور اسی بناء پر اس کے چپے چپے سے تاریخ اسلام کی بیشمار یادیں وابستہ ہیں۔

یہ شہر سطح سمندر سے دو ہزار دو سو فیٹ بلند ہے، اس لیے یہاں کا موسم اور آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے، سردی کے موسم میں برف بھی پڑ جاتی ہے، اور شدید گرمی میں بھی راتیں ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوتی ہیں۔ نہر بردہ شہر کے قریب سے گذر جاتی ہے اور اس کے پانی سے نہ صرف شہر کے لوگ سیراب ہوتے ہیں، بلکہ اس کی بناء پر علاقہ کافی سرسبز و شاداب ہو گیا ہے۔

(۸)

غوطہ میں:

عنایت صاحب نے دمشق کے مختلف مقامات کی سیاحت کے لیے سہولت کی خاطر جو ترتیب قائم کی، اُس میں وہ سب سے پہلے ہمیں غوطہ لے گئے۔ غوطہ قدیم زمانے سے دمشق کا وہ مضافاتی علاقہ ہے جو اپنی زرخیزی اور رعنائی و دلکشی کے لیے پوری دنیا میں مشہور بلکہ ضرب المثل تھا۔ مشہور جغرافیہ نگار علامہ حمویؒ لکھتے ہیں:

هي بالإجماع أنزه بلاد الله و أحسنها منظرا، وهي إحدى جنان الأرض الاربع: وهي الصُّغد، والأبلّة، وشعب بوّان والغوطة.[1]

اللہ کے پیدا کئے ہوئے شہروں میں یہ علاقہ باتفاق سب سے زیادہ پاکیزہ اور خوش منظر ہے، اور یہ اُن چار علاقوں میں سے ایک ہے، جنہیں جنت ارضی قرار دیا گیا ہے۔ وہ چار علاقے یہ ہیں: ''صُغد، اُبلّہ، شعبِ بوّان اور غوطہ۔

کسی زمانے میں یہ علاقہ باغات، پہاڑیوں، نہروں اور چشموں سے بھرپور تھا، اور اسی بناء پر اسے دنیا کا حسین ترین خطہ قرار دیا گیا تھا، اب بھی یہاں انجیر اور زیتون کے خوشنما باغات موجود ہیں، لیکن اوّل تو موسم سردی کا تھا، اور باغات پر خزاں کی حکمرانی تھی، دوسرے اب اس علاقے کی تروتازگی بھی اُس درجے کی باقی نہیں رہی، اس لیے کتابوں میں غوطہ کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا، اور اُس سے ذہن پر جو تاثر قائم تھا، یہ علاقہ اُس سے کافی مختلف نظر آیا۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ضرور ہے، لیکن اس وقت دنیا کے حسین مقامات میں شاید وہ کوئی قابل ذکر نمبر حاصل نہ کر سکے۔ دنیا کے

[1] معجم البلدان للحمویؒ۔ ص:۲۱۹، ج:۱۴

www.freepdfpost.blogspot.com

انقلابات وتغیرات کا حال یہی ہے کہ یہاں کسی چیز کی آب وتاب ہمیشہ سلامت نہیں رہتی، ہر جوانی کا انجام بڑھاپا اور ہر وجود کا انجام عدم ہے۔

غوطہ سے ہوتے ہوئے عنایت صاحب ہمیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ سیّدہ زینب بنت علی (رضی اللہ عنہا) کے مزار پر لے گئے۔

حضرت زینب بنت علیؓ آنحضرت ﷺ کی نواسی ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی حقیقی بہن، آپ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں پیدا ہوگئی تھیں، لیکن بہت کمسن تھیں، حضرت علیؓ نے آپؓ کا نکاح اپنے بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کر دیا تھا۔ سانحۂ کربلا کے وقت آپ اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں، اور حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ کو دیگر اہل بیت کے ساتھ دمشق لایا گیا۔ آپ اپنے زمانے میں بڑی عاقلہ اور فصیح و بلیغ خاتون مشہور تھیں۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے آپ کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی وہ تو ظاہر ہے، اُس صدمے کا شرعی حدود میں اظہار بھی ہوا ہوگا، لیکن جن روایتوں میں آپ کی غیر معمولی نوحہ گری بیان کی گئی ہے، وہ غیر مستند بھی ہیں، اور بعید از قیاس بھی۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کی نواسی اُس قسم کے بین اور ماتم سے یقیناً بلند تھیں جو آپ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت زینب بنت علیؓ کا ایک مزار مصر میں بھی مشہور ہے، لیکن کسی مستند روایت سے آپ کا مصر جانا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ سانحۂ کربلا کے بعد دمشق آنا ضرور ثابت ہے۔ لہٰذا دمشق میں آپ کا مدفون ہونا مصر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس ہے، اگرچہ بعض روایات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے آپ اور دوسرے اہل بیت کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ مدینہ طیبہ واپس بھیج دیا تھا، جس کے جواب میں حضرت زینبؓ اور حضرت سکینہؓ نے اپنے ساتھ کچھ زیور یزید کے پاس بھیجے لیکن یزید نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا، وہ کسی دنیوی لالچ کی وجہ سے نہیں، بلکہ آپ کے حق قرابت

[1] طبقات ابن سعد۔ ص: ۴۶۵، ج: ۸۔ الاصابۃ۔ ص: ۳۱۵، ج: ۴

کی بنا پر کیا۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

عراق کے اہل بیت کے مزارات کی طرح حضرت زینبؓ کا یہ مزار بھی بڑی شاندار عمارت میں واقع ہے، جس کے میناروں وغیرہ کا طرزِ تعمیر عراقی مزارات سے ملتا جلتا ہے۔ ہم قبر پر حاضر ہوئے تو وہاں شیعہ زائرین کی مرثیہ خوانی، نوحہ گری اور ماتم کا ایک شور وشیون برپا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، مزار کے قریب تک پہنچنا بھی مشکل تھا، اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ مزار میں داخل ہوتے ہی سلام پڑھوانے والے معلّموں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آیا جو قدم قدم پر اپنی خدمات (باجرت) پیش کرتے تھے، ان سے معذرت کرنا ایک مستقل کام تھا، جو واپسی تک مسلسل جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ حضراتِ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی ارواح پر ابدی رحمتیں نازل فرمائے، اُن کی محبت کے دعوے داروں کی طرف سے وفات کے بعد بھی اُن کی ارواحِ مقدسہ کو تکلیف پہنچانے کا سلسلہ جاری ہے، اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا؟

الباب الصغیر کے قبرستان میں:

یہاں سے عنایت صاحب ہمیں دمشق کے قدیم قبرستان میں لے گئے۔ جو ''الباب الصغیر'' کا قبرستان کہلاتا ہے، اور جس میں بیشمار صحابہؓ وتابعین اور بزرگانِ دین کے مزارات ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے دمشق فتح کیا تو وہ اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے، یہاں بہت سے حضرات شہید ہوئے تو انہیں یہیں پر دفن کیا گیا، بعد میں اسی جگہ کو عام قبرستان بنا لیا گیا۔ اس جگہ کا نام پہلے ''باب توما'' تھا، بعد میں اسے ''الباب الصغیر'' یا ''ظاہر دمشق'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔[2]

جن صحابہ کرامؓ کے مزارات اس قبرستان میں بیان کئے جاتے ہیں، اُن کی فہرست

[1] أعلام النساء۔ ص: ۹۸، ج: ۲

[2] تہذیب تاریخ ابن عساکر۔ ص: ۲۶۴، ج: ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

بہت طویل ہے، لیکن جن حضرات کے مزارات پر سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی، اُن کا مختصر تذکرہ مناسب ہوگا۔

حضرت بلال حبشیؓ:

سب سے پہلے ہم اُس مزار پر حاضر ہوئے جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ اور اسلام کے لیے اُن کی خدمات سے کون مسلمان ناواقف ہے؟ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی آتے ہی عقیدت و محبت کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس نہ کرتا ہو۔ مکہ مکرمہ میں اسلام سے پہلے انہوں نے غلامی کی زندگی گزاری، سرکارِ دوعالم ﷺ کی بعثت کے بعد یہ اُن چند صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو آپ ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ اُس دور میں جب حضرت عمرو بن عبسہؓ نے آنحضرت ﷺ سے تعارف حاصل کرنے کیلئے آپ ﷺ سے پوچھا کہ: ''(توحید کے) اس پیغام میں آپ ﷺ کا ساتھی اور کون ہے؟'' تو آپ ﷺ نے جواب دیا: ''حر وعبد[1]''، یعنی ''ایک آزاد شخص ہے اور ایک غلام''۔ آزاد شخص سے مراد حضرت صدیق اکبرؓ تھے اور غلام سے مراد حضرت بلالؓ۔

اسلام لانے پر ان کے آقا نے ان پر جو ظلم وستم توڑے، اس کے واقعات مشہور ہیں، انہیں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں پر لٹایا جاتا اور لات وعزیٰ کو معبود ماننے پر مجبور کیا جاتا، لیکن ان کے منہ سے ''احد، احد'' کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ بالآخر حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کیا۔

اُس کے بعد سے حضرت بلالؓ سفر وحضر میں سرکارِ دوعالم ﷺ کے ساتھ رہے، اور آپ ﷺ کے باقاعدہ مؤذن قرار پائے۔ ان کی فضیلت کے لیے ایک ہی حدیث کافی ہے جس میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن فجر کی نماز کے بعد

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسہؓ۔

حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ: ''مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ جو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ اُمید افزا ہو کیونکہ میں نے آج رات جنت میں تمہارے پاؤں کی آہٹ اپنے سامنے سنی۔'' حضرت بلالؓ نے عرض کیا کہ: ''میں رات دن کسی بھی وقت جب کبھی وضو کرتا ہوں تو اپنے پروردگار کے لئے جتنی توفیق ہوتی ہے نماز ضرور پڑھتا ہوں۔''[1]

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اُسی مکہ مکرمہ میں جہاں حضرت بلالؓ کو کلمہ طیبہ پڑھنے کی خاطر اذیتیں دی جاتی تھیں، جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں، چنانچہ آپؓ نے پہلی بار مکہ مکرمہ میں کعبے کی چھت سے اذان دی۔[2]

سرکارِ دوعالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ سے مدینہ طیبہ میں نہ رہا گیا، اور وہ جہاد کیلئے شام آ کر مقیم ہوگئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت ہی میں شام آ گئے تھے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں روک لیا تھا، پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ شام کے قیام کے دوران حضرت بلالؓ نے آنحضرت ﷺ کی خواب میں زیارت کی، دیکھا کہ آپ ﷺ ان سے فرما رہے ہیں: ''بلال! ایسی بھی کیا بے مروتی؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم مجھ سے آ کر ملو؟'' یہ بیدار ہوئے تو غمگین تھے، فوراً سواری منگائی اور مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے، وہاں روتے رہے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما وہاں تشریف لے آئے، حضرت بلالؓ نے انہیں گلے سے لگالیا۔ حضرات حسنینؓ نے ان سے فرمائش کی کہ ''ہمارا آپ کی اذان سننے کو دل چاہتا ہے۔'' حضرت بلالؓ نے چھت پر کھڑے ہو کر اذان دینی شروع کی، ابھی ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کہا تھا کہ مدینہ گونج اُٹھا، ''أشهد أن لا إله إلا الله'' کہا تو کہرام مچ گیا، جب ''أشهد أن محمدا رسول الله'' کہا تو پردہ نشین خواتین تک بے تابی کے عالم میں گھروں سے نکل

[1] طبقات ابن سعد۔ ص: ۱۶۷، ج: ۱/۳

[2] تاریخ مکہ للأزرقی

www.freepdfpost.blogspot.com

آئیں اور کہنے لگیں کہ: ''رسول اللہ ﷺ دوبارہ مبعوث ہوگئے۔'' کہتے ہیں کہ لوگ اُس دن سے زیادہ کسی اور دن مدینہ طیبہ میں روتے نہیں دیکھے گئے۔[1]

یہ روایت سنداً کمزور ہے، اس کے مقابلے میں وہ روایت زیادہ مضبوط ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ شام میں پیش آیا، یعنی حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت بلالؓ سے اذان کی فرمائش کی، اور جب انہوں نے اذان دی تو لوگ رونے لگے، اور اُس دن سے زیادہ کسی اور دن روتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔[2]

حضرت بلالؓ کی سیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ آخرت میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کے انتظار سے عبارت تھا۔ چنانچہ جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ بے خودی کے عالم میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

غدًا نلقی الأحبّہ　　محمدا و حزبہ

کل ہماری محبوب شخصیتوں سے ملاقات ہوگی، محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے صحابہؓ سے۔

موت کی شدت دیکھ کر آپ کی اہلیہ نے کہا:

"واویلاہ" (ہائے افسوس!)

لیکن حضرت بلالؓ نے فرمایا:

"وافرحاہ" (واہ رے خوشی!)[3]

حضرت بلالؓ کا مزار شام میں تین جگہ بیان کیا جاتا ہے، ایک یہاں، دوسرے داریا نامی قصبے میں، تیسرے حلب میں۔ لیکن زیادہ تر علماء کا رجحان اسی طرف ہے کہ آپ الباب الصغیر کے اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔

---

[1] أسد الغابہ۔ ص: ۲۴۴ و ۲۴۵۔ ج: ۱

[2] سیر اعلام النبلاء للذہبی۔ ص: ۳۵۷۔ ج: ۱

[3] ایضاً۔ ص: ۳۵۹، ج: ۱

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کے وقت دل کی عجیب کیفیت تھی۔ حضرت بلالؓ کی رشک ملائک زندگی کے واقعات یاد آرہے تھے، سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی نے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ عرب کے وہ قریشی سردار جو پورے جزیرۂ عرب میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور جن کے سامنے غرب کے باعزت خاندانوں کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ تو اسلام سے روگردانی کر کے ذلت و گمنامی کے غار میں جا گرے، آج کوئی احترام کے ساتھ ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا، اور حبشہ کے وہ باشندے جن کی زندگی غلامی میں بسر ہو رہی تھی، اور جنہیں کوئی گلے لگانے کیلئے تیار نہ تھا، سرکار دو عالم ﷺ کے قدموں میں پہنچ کر زندۂ جاوید ہوگئے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے ایک عربی شعر میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے ؎

فداک أبو جهل، أخو الذلّ والعمیٰ

وإن بلالا فاق أحرار حمیرا

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقامِ بلند عطا فرمایا، اُس کے تصور سے اقبال مرحوم کے یہ اشعار ذہن میں گونجنے لگے جو انہوں نے حضرت بلالؓ سے خطاب کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہے ہیں ؎

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا　　حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا

ہوئی اِسی سے ترے غمکدے کی آبادی　　تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کیلئے　　کسی کے عشق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری　　شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا　　ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید　　خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید

www.freepdfpost.blogspot.com

تپش زشعلہ گرفتند بر دلِ توزوند
چہ برقِ جلوہ بخا شاکِ حاصل توزوند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اس کے نظارے کا اِک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

اقبالؒ نے ایک اور نظم میں سکندرِ رومیؔ اور حضرت بلالؓ کا موازنہ کیا ہے۔

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جو لانگہ سکندرِ رومیؔ تھا ایشیا گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومیؔ کے سامنے دعویٰ کیا جو پورسؔ و دارا نے، خام تھا
دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو حیرت سے دیکھتا فلک نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اِسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ، وہ حبشی زادۂ حقیر فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ محکوم اُس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز صدیوں سے سن رہا ہے جس گوشِ چرخِ پیر
اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومیؔ فنا ہوا، حبشیؔ کو دوام ہے

حضرت ابن اُمّ مکتومؓ:

حضرت بلال رضی اللہ عنہٗ کے مزار کے بالکل قریب ایک قبر پر ''حضرت عبداللہ ابن اُمِ مکتومؓ'' کے اسم گرامی کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ یہ آنحضرت ﷺ کے دوسرے

مؤذن تھے، جو عہد رسالت ﷺ میں اکثر فجر کی اذان دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے باشندے تھے، اور اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ماموں زاد بھائی۔ بچپن ہی میں آنکھیں جاتی رہی تھیں اور نابینا ہو گئے تھے۔ پھر جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نبی کریم ﷺ سے پہلے مدینہ طیبہ میں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ قرآنِ کریم کی دو آیتیں آپ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۵ شروع میں اس طرح تھی:

لایستوی القاعدون من المؤمنین. والمجاھدون فی سبیل اللہ.

مہاجرین میں سے جو لوگ جہاد سے بیٹھے ہوئے ہوں (یعنی جہاد نہ کریں) وہ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

اس آیت کے نزول پر حضرت ابن اُمّ مکتومؓ کو تشویش ہوئی کہ وہ اپنی آنکھوں کے عذر کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے اپنی بینائی کا عذر بیان کیا۔ اس پر اسی آیت کا یہ ٹکڑا نازل ہوا۔

غیر اُولی الضّرَر[1]

سوائے ان لوگوں کے جن کو عذر ہو۔

اسی طرح سورۂ ''عبس'' کی ابتدائی آیات بھی آپ ہی کے بارے میں نازل ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ مکہ مکرمہ کے سرداروں کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ حضرت ابن اُمّ مکتومؓ کوئی مسئلہ پوچھنے کیلئے آئے۔ اور نابینا ہونے کی بنا پر یہ نہ دیکھ سکے کہ آپ ﷺ کے پاس کون لوگ بیٹھے ہیں۔ اس لیے بار بار آپ ﷺ کو مخاطب کر کے سوال کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے (یہ سمجھ کر کہ ان سے بے تکلفی ہے) اُن سے رخ پھیر لیا، اور اُس شخص کو تبلیغ کرنے میں مصروف رہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۴۵۹۳، ۴۵۹۴

www.freepdfpost.blogspot.com

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی o اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی o وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰٓی o اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی o اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی o فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی o وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی o وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی o وَهُوَ یَخْشٰی o فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی o

چیں بہ جبیں ہوئے، اور منہ موڑ لیا، اس بات سے کہ اُن کے پاس نابینا آیا، اور آپ کو کیا خبر کہ شاید وہ (آپ کے جواب سے) پاک ہو جاتا، یا نصیحت قبول کرتا، اور نصیحت اس کے لیے نفع بخش ہوتی۔ جو شخص استغناء کا معاملہ کرتا ہے، اس کی تو آپ فکر میں پڑتے ہیں، اور وہ شخص جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے، اور وہ (اللہ سے) ڈرتا بھی ہے، اُس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

ان آیات میں ''نابینا'' سے مراد حضرت ابن اُمّ مکتومؓ ہی ہیں، اور ان کی فضیلت کیلئے یہی کیا کم ہے کہ قرآنِ کریم نے اُن کی خشیتِ الٰہی کی گواہی دی ہے۔

مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد جب آنحضرت ﷺ کسی جہاد وغیرہ کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اکثر حضرت ابن اُمّ مکتومؓ ہی کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب بنا کر تشریف لے جاتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے تیرہ مرتبہ آپؓ کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔[1]

اگرچہ قرآنِ کریم نے آپ کو جہاد کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا، لیکن جہاد کا شوق اس قدر تھا کہ بہت سی لڑائیوں میں شامل ہوتے اور امیرِ لشکر سے یہ مطالبہ فرماتے کہ جھنڈا امیر سے سپرد کر دو، کیونکہ میں نابینا ہونے کی وجہ سے بھاگ نہیں سکتا۔[2]

چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کے ساتھ شہرۂ آفاق جنگِ قادسیہ میں آپ

[1] الاصابہ۔ص:۵۱۶و۵۱۷۔ج:۲

[2] طبقات ابن سعد۔ص:۱۵۴،ج:۴

بھی شامل ہوئے، آپ نے ایک سیاہ رنگ کا جھنڈا اُٹھایا ہوا تھا، اور سینے پر زرہ پہنی ہوئی تھی۔[1]

جنگِ قادسیہ کے بعد آپ کے حالات معلوم نہیں ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ قادسیہ ہی میں شہید ہو گئے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ وہاں سے مدینہ منورہ واپس آ گئے تھے، اور مدینہ طیبہ ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔[2]

کتابوں میں آپ کے شام آنے کا تذکرہ مجھے تلاش کے باوجود نہیں ملا، اس لیے یہ پتہ نہیں لگتا کہ دمشق کے اس قبرستان میں آپ کیسے مدفون ہو سکتے ہیں؟ اور اس قبر کی نسبت آپ کی طرف درست ہے یا نہیں؟

اُم المومنین حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا:

اِسی قبرستان میں ذرا سا چل کر ایک اور مزار ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اُم المومنین حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی آرام گاہ ہے۔

حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام رملہ تھا، آپ آنحضرت ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کے نکاح کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ یہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھی، حضرت ابوسفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے، لیکن اس سے پہلے وہ سرکارِ دوعالم ﷺ کے دشمن تھے، اور جنگ بدر میں ابوجہل وغیرہ کے قتل ہو جانے کے بعد کفارِ مکہ کی سرداری انہی کے حصے میں آئی تھی، اور اِسی لحاظ سے وہ غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق وغیرہ میں آنحضرت ﷺ کے سب سے بڑے مدمقابل تھے۔

حضرت اُمِ حبیبہؓ انہی ابوسفیان کی بیٹی تھیں، اور ابوسفیان نے ان کا نکاح عبیداللہ

[1] طبقات ابن سعد۔ص:۱۵۵،ج:۴

[2] الاصابہ۔ص:۵۱۶،ج:۲ و سیر اعلام النبلاء۔ص:۳۶۵،ج:۱

www.freepdfpost.blogspot.com

بن جحش سے کر دیا تھا۔ ابوسفیان کے گھر میں دن رات مسلمانوں کی مخالفت کے چرچے ہوتے تھے، لیکن یہ اسلام کی حقانیت کی دلکشی تھی کہ ایسے دشمن گھرانے میں ابوسفیان کی یہ بیٹی اور داماد دونوں مسلمان ہوگئے۔ اُس وقت اسلام قبول کرنا انواع واقسام کے مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اور ایسے گھرانے میں اسلام لانا تو اور زیادہ سنگین جرم تھا، جہاں دن رات مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندیاں ہوتی تھیں۔

چنانچہ حضرت اُمِ حبیبہؓ اور ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش دونوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فیصلہ کیا، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس وقت ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھی، یہ دونوں میاں بیوی بھی حبشہ جا کر مقیم ہوگئے۔ وہیں پر ان دونوں کی بیٹی حبیبہ پیدا ہوئیں، جن کی نسبت سے آپ کو اُمِ حبیبہؓ کہا جاتا ہے۔

ایک رات حضرت اُمِ حبیبہؓ سوئیں تو خواب میں دیکھا کہ ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش کا چہرہ بُری طرح مسخ ہوگیا ہے، یہ گھبرا کر اُٹھیں، اور دل میں سوچنے لگیں کہ شاید عبیداللہ بن جحش کی حالت میں کوئی بُرا تغیر آنے والا ہے۔ شوہر سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا: ''میں نے تمام مذاہب پر غور کیا ہے، اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عیسائی مذہب سے بہتر کوئی مذہب نہیں، چنانچہ میں عیسائی ہوگیا ہوں۔''

اندازہ کیجئے کہ یہ الفاظ سن کر حضرت اُمِ حبیبہؓ کو کیسا دھچکا لگا ہوگا؟ انہوں نے جلدی سے عبیداللہ کو اپنا خواب سنا کر ارتداد سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن ہدایت اس کے مقدر میں نہ تھی، اُس نے خواب کی بات کو بے پروائی سے ٹلا دیا، اور شراب نوشی میں مشغول ہوگیا، اور اسی ارتداد کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

اس وقت حضرت اُمِ حبیبہؓ کی بے چارگی اور کسمپرسی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، وہ اسلام کی خاطر اپنے باپ بھائیوں اور پورے خاندان سے کٹ چکی تھیں، انہوں نے اپنے وطن کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا، لے دے کر ایک شوہر اس پردیس میں مونس و غمخوار ہوسکتا تھا، لیکن وہ مرتد بھی ہوگیا اور چند دن میں اُس کا انتقال بھی ہوگیا۔ اب یہ اس دیارِ غربت میں تن تنہا رہ گئی تھیں۔

اس کسمپرسی کی حالت میں ایک رات سوئیں تو خواب میں دیکھا کہ کوئی پکارنے والا انہیں ''اُم المومنین'' کہہ کر پکار رہا ہے، اس خواب کی تعبیر انہوں نے یہ لی کہ آنحضرت ﷺ ان سے نکاح فرمائیں گے۔

ابھی اس خواب کو دیکھے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، دیکھا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشیؓ کی ایک کنیز (ج نکا نام ابرہہ تھا) بادشاہ کا پیغام لے کر آئی ہے، کنیز نے کہا کہ: ''مجھے بادشاہ نے بھیجا ہے، اور کہا ہے کہ میرے پاس رسولِ کریم ﷺ کا خط آیا ہے جس میں آپ ﷺ نے مجھے یہ خدمت سونپی ہے کہ میں آپ سے ان کے نکاح کا انتظام کردوں۔ لہٰذا آپ کسی کو اپنے نکاح کا وکیل بنادیں، تاکہ وہ آپ کی طرف سے نکاح کر سکے۔''

حضرت اُمِ حبیبہؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں، اور اس خوشی میں جو زیور پہنے ہوئے تھیں، وہ سب اُتار کر کنیز کو دے دیا، اور حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ کے پاس پیغام بھیج کر انہیں اپنا وکیل مقرر فرمادیا۔ نجاشی نے آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے مسلمانوں کو جمع کیا، اور خطبہ دیا، اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت اُمِ حبیبہؓ کا مہر چار سو دینار مقرر کر کے اُسی وقت حضرت خالد بن سعیدؓ کے حوالے کر دیا، حضرت خالد بن سعیدؓ نے وکیل کی حیثیت سے نکاح کو قبول کیا۔ نکاح کے بعد جب سب لوگ اُٹھ کر جانے لگے تو نجاشی نے کہا کہ: ''ذرا ٹھہریئے! انبیاء کرام کی سنت یہ ہے کہ نکاح کے بعد ولیمہ بھی کرتے ہیں۔'' چنانچہ کھانا منگوایا گیا، اس کے بعد سب رخصت ہوئے۔

حضرت اُمِ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے مہر میں جو چار سو دینار دیئے گئے تھے، میں نے ان میں سے سو دینار ابرھہ کو مزید انعام کے طور پر دینے چاہے، لیکن اس کنیز نے کہا کہ مجھے بادشاہ نے آپ سے کچھ لینے سے منع کر دیا، اور جو زیور آپ نے دیئے تھے، وہ بھی آپ کو واپس کرنے کی تاکید کی ہے، اس کے بدلے انہوں نے مجھے ازخود بہت انعام دے دیا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نجاشی (رضی اللہ عنہ) نے اس کے بعد حضرت اُمِ حبیبہؓ کی خدمت میں بہت سے تحفے بھیجے جن میں شاہی خوشبوئیں بھی شامل تھیں، اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ آپ کو مدینہ طیبہ بھیجنے کا بندوبست فرمایا۔ جب حضرت اُمِ حبیبہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس مدینہ طیبہ جانے لگیں تو ابرھہ کنیز نے آ کر آپ سے کہا کہ "میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں، اور میری طرف سے سرکارِ دوعالم ﷺ کو سلام عرض کر دیجئے گا۔" حضرت اُمِ حبیبہؓ نے سلام پہنچانے کا وعدہ کیا، اور رخصت ہوگئیں۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر انہوں نے حسب وعدہ ابرھہ کا سلام حضور ﷺ کو پہنچایا۔ آپ ﷺ نے سارا واقعہ سن کر تبسم فرمایا، اور ابرھہ کو دعائیں دیں۔[1]

حضرت اُمِ حبیبہؓ اس واقعے کے بعد آنحضرت ﷺ کی زوجۂ مطہرہ اور اُمّ المومنین بن چکی تھیں، دوسری طرف ان کے والد ابوسفیان بدستور مسلمانوں کے سب سے بڑے مدمقابل بنے ہوئے تھے۔[2] صلح کے موقع پر جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تھا، خود کفارِ مکہ نے اس کی خلاف ورزی کر کے اسے توڑ دیا، صلح ختم ہوگئی اور ابوسفیان کو اندازہ ہوا کہ اب آنحضرت ﷺ کسی وقت مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ جنگ بندی کی مدت میں توسیع کی تجویز لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی تجویز مسترد کر دی۔

اس موقع پر انہیں خیال ہوا کہ اپنی بیٹی (حضرت اُمّ حبیبہؓ) کے پاس جا کر ان سے

---

[1] واقعے کی یہ تفصیل امام ابن سعدؒ نے واقدی کے حوالے سے بیان کی ہے۔

(طبقات ابن سعد، ص: ۹۷، ۹۸، ج: ۸)۔

لیکن اتنی بات سنن ابوداؤد وغیرہ میں بھی مروی ہے کہ حضرت اُمِ حبیبہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح حبشہ میں ہوا، نجاشی کی معرفت ہوا، اور چار سو دینار مہر مقرر ہوا۔ اُمہات المومنینؓ میں سب سے زیادہ مہر آپ ہی کا تھا۔

[2] ان کو اطلاع ملی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کی بیٹی سے نکاح فرما لیا ہے، تو سخت دشمنی کے باوجود انہوں نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں جو جملہ کہا، وہ یہ تھا کہ: "محمد (ﷺ) اُن لوگوں میں سے ہیں جن کا پیغام رد نہیں کیا جا سکتا۔"

سفارش کروائیں، دنیا کے عام قاعدے کے مطابق اُن کی یہ توقع بے جا بھی نہیں تھی کہ بیٹی اپنے شوہر (ﷺ) سے ضرور سفارش کریں گی۔ چنانچہ ابوسفیان حضرت اُمِ حبیبہؓ کے پاس پہنچے۔ ابتدائی ملاقات کے بعد جب وہ بستر پر بیٹھنے لگے تو حضرت اُمِ حبیبہؓ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بستر تہہ کر دیا۔ ابوسفیان نے پوچھا:

"یہ بستر میرے لائق نہیں، یا میں اس بستر کے لائق نہیں ہوں؟"

حضرت اُمِ حبیبہؓ نے جواب دیا: "یہ اللہ کے رسول (ﷺ) کا بستر ہے، اور آپ ابھی تک کفر وشرک کی نجاست میں مبتلا ہیں۔"

ابوسفیان اپنی بیٹی کا یہ جواب سن کر تلملا گئے، اور بولے: "تمہارے اندر مجھ سے جدا ہونے کے بعد کتنا تغیر آ گیا؟"

یہ تھیں حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا! آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد تیس چالیس سال زندہ رہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، آپ کے بھائی تھے، اِسی لئے ان کا لقب "خالُ المومنین" (مسلمانوں کے ماموں) مشہور ہوگیا۔ جب وہ خلیفہ بنے تو حضرت اُمِ حبیبہؓ اُن سے ملاقات کیلئے دمشق تشریف لائیں۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے بہت سے فقہی مسائل حاصل کئے، اور متعدد احادیث اُن سے روایت فرمائیں۔ اتنی بات تو تاریخ سے ثابت ہے۔ پھر بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت اُمِ حبیبہؓ دمشق ہی میں مقیم ہوگئی تھیں، یہیں آپ کا انتقال ہوا، اور "الباب الصغیر" میں تدفین ہوئی۔ حافظ ابن عساکرؒ نے "الباب الصغیر" کی قبروں میں آپ کی قبر کا بھی ذکر فرمایا ہے۔[1] لیکن حافظ ذہبیؒ نے اس کی سختی سے تردید کی ہے، اور فرمایا ہے کہ آپ کی قبر دمشق میں نہیں، مدینہ منورہ میں ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم۔

---

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکرؒ، ص: ۲۶۴، ج: ۱

[2] سیر اعلام النبلاء، ص: ۲۲۰، ج: ۲

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت اسماء بنت یزیدؓ:

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو مزار منسوب ہے، اسی کے قریب ایک اور قبر پر لکھا ہے کہ یہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے، اس سے عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ کا مزار ہے جو سرکارِ دوعالم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے ہمیں یہی بتایا۔ احقر کو یہ بات اس لیے درست معلوم نہیں ہوتی تھی کہ حضرت اُمِ سلمہؓ کا مزار مدینہ منورہ میں بتایا جاتا ہے، اور حضرت اُمِ سلمہؓ کے دمشق میں مدفون ہونے کے کوئی معنی اس لئے نظر نہیں آتے کہ اُن کا دمشق آنا کہیں تواریخ میں مذکور نہیں۔ بعد میں حافظ شمس الدین ذھبیؒ کی کتاب ''سیر أعلام النبلاء'' میں نظر سے گذرا کہ دمشق کے الباب الصغیر میں جو خاتون ''اُمّ سلمہ'' کے نام سے مدفون ہیں، وہ اُم المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ نہیں، بلکہ ایک انصاری صحابیہ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا ہیں[1] ان کی کنیت بھی چونکہ اُم سلمہ تھی، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا، حضرت معاذ بن جبلؓ کی چچا زاد بہن ہیں، یہ بڑے پائے کی مقرر بھی تھیں، اس لیے ان کا لقب ''خطیبۃ النساء'' مشہور ہوگیا تھا۔ انہوں نے متعدد احادیث بھی آنحضرت ﷺ سے روایت فرمائی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں رومؔ کی فوجوں سے یرموکؔ کے مقام پر جو فیصلہ کن معرکہ ہوا، اُس میں یہ دوسری مسلم خواتین کے ساتھ شریک تھیں۔ یہ خواتین اپنے زخمی رشتہ داروں کی مرہم پٹی وغیرہ کے لیے جایا کرتی تھیں، اور جنگ کے سخت موقع پر مسلمانوں کی ہمت بھی بڑھایا کرتی تھیں، لیکن غزوۂ یرموکؔ کے موقع پر ایسے گھمسان کی جنگ ہوئی کہ خواتین کو اپنے دفاع کیلئے دست بدست لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا۔ اس موقع پر حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا

[1] سیر أعلام النبلاء للذھبیؒ ص:۲۲۰، ج:۲ ترجمہ ''اُمّ حبیبہؓ''

نے اپنے خیمے کے ستون سے نو رومی فوجیوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا

حضرت اسماء بن عمیسؓ:

یہیں پر ''اسماء'' نام کی ایک خاتون کا مزار ہے، یعنی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا۔ یہ مشہور صحابیہ ہیں، اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ کی ماں شریک بہن ہیں، اور بالکل ابتداء میں اسلام لے آئیں تھیں، ان کا نکاح حضرت جعفر طیارؓ سے ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت جعفر طیارؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ ان کے ساتھ تھیں، ۷ھ میں اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ سے واپس مدینہ طیبہ آئیں، حضرت جعفرؓ غزوۂ موتہ میں شہید ہوگئے جس کا واقعہ پیچھے گذر چکا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے آپ کا نکاح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کرادیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ کے ساتھ حج کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئیں تو ذوالحلیفہ کے مقام پر ان کے یہاں ولادت ہوئی، اور محمد بن ابی بکرؓ پیدا ہوئے، اس کے باوجود انہوں نے احرام باندھ کر حج کا سفر جاری رکھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مرضِ وفات میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہی ان کی تیمارداری فرماتی تھیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد یہ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں، اور ان سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ایک مرتبہ ان کے دو بیٹوں محمد بن أبی بکرؓ اور محمد بن جعفرؓ کے درمیان بحث ہوگئی۔ محمد بن ابی بکرؓ نے کہا کہ میرے والد (صدیق اکبرؓ) افضل ہیں، اور محمد بن جعفرؓ نے کہا کہ میرے والد (یعنی جعفر طیارؓ)۔ حضرت علیؓ نے حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے کہا کہ ''تم فیصلہ کرو۔'' حضرت اسماءؓ نے جواب دیا: ''میں نے عرب کا کوئی جوان جعفرؓ سے بہتر نہیں دیکھا، اور کوئی اُدھیڑ شخص ابوبکرؓ سے بہتر نہیں پایا۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا: ''تم نے ہمارے لیے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، لیکن تم نے جو جواب دیا

[1] الاصابہ۔ ص:۲۲۹، ج:۴

[2] طبقات ابن سعد۔ ۲۸۵، ج:۸۔ وسیر أعلام النبلاء۔ ص:۲۸۷، ج:۲

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے اگر تم اس کے سوا کچھ اور جواب دیتیں تو میں ناراض ہو جاتا۔'' اس پر حضرت اسماءؓ نے فرمایا: ''کہ یہ تین حضرات جن میں آپ سب سے کمتر ہیں، سبھی اچھے لوگ ہیں۔''[1]

.....☆.....☆.....

(۹)

جامع اُموی دمشق میں:

''الباب الصغیر'' کے قبرستان سے فارغ ہوئے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی، ہم نے قریب ہی کی ایک مسجد میں نمازِ مغرب ادا کی، اور نماز کے بعد دمشق کی شہرۂ آفاق تاریخی مسجد جامع اُموی روانہ ہو گئے۔

یہ عظیم الشان مسجد پرانے شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے، اور اس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے سڑکیں اتنی تنگ اور پُر ہجوم ہیں کہ کار کافی دور کھڑی کرنی پڑتی ہے۔

چنانچہ تنگ گلیوں سے گذرتے ہوئے ہم اس مسجد کے قریب پہنچے، اب مسجد کے آس پاس کے مکانات اور دکانوں کو ہٹا کر مسجد کے سامنے ایک کشادہ چوک سا بنا دیا گیا ہے۔ اس سے گذر کر ہم مسجد میں داخل ہوئے۔

یہ جامع اُموی جو کسی زمانے میں فنِ تعمیر کے عجائب میں شمار ہوتی تھی، بنو اُمیہ کے مشہور خلیفہ ولید بن عبدالملک نے تعمیر کی تھی۔ رومیوں کے عہدِ حکومت میں یہاں عیسائیوں کا ایک کلیسا تھا جو کنیسۃ یوحنا کہلاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے دمشق پر حملہ کیا تو آدھا شہر لڑائی کے ذریعے بزور فتح ہوا، لیکن جب تقریباً آدھا شہر فتح ہو گیا تو اہل شہر نے ہتھیار ڈال کر مسلمانوں سے صلح کر لی، چنانچہ باقی نصف شہر صلح کے ذریعے فتح ہوا۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ دشمن کا جو علاقہ لڑائی کے ذریعے فتح ہوا، اس کے بارے میں اسلامی حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس میں جو تصرف چاہے کرے، لیکن جو علاقہ مصالحت کے ذریعے فتح ہو، اس میں صلح کی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

اتفاق سے اس کلیسا کا نصف حصہ لڑائی سے اور باقی نصف حصہ مصالحت سے فتح ہوا تھا۔ جو حصہ لڑائی سے فتح ہوا تھا، اس میں تو مسلمانوں نے اپنے شرعی اختیار پر عمل کرتے ہوئے مسجد بنالی، لیکن باقی نصف حصہ جو صلحاً فتح ہوا تھا، اس کو معاہدے کی شرائط کے تحت کلیسا ہی برقرار رکھا۔

چنانچہ فتحِ دمشق کے بعد سالہا سال تک یہاں مسجد اور کلیسا برابر قائم رہے، جب ولید بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو نماز پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ مسجد تنگ پڑ گئی، دوسری طرف مسجد کے بالکل برابر کلیسا ہونے کی وجہ سے ایک مستقل بدمزگی شروع سے چلی آتی تھی۔ ولید بن عبدالملک چاہتے تھے کہ کلیسا کا حصہ بھی مسجد میں شامل کر لیا جائے، لیکن معاہدے کی شرائط کے مطابق کلیسا قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے کلیسا کے ذمہ داروں کو بلا کر اُن سے بات چیت کی، اور اس جگہ کے بدلے انہیں چار کلیساؤں کے برابر جگہ دینے، یا اس کے معاوضے کی منہ مانگی رقم پیش کرنے کی پیشکش کی، لیکن وہ یہاں سے کلیسا ہٹانے پر رضامند نہیں ہوئے۔

اس حد تک تو روایات متفق ہیں، اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے انکار کے بعد ولید بن عبدالملک نے زبردستی اس حصے پر قبضہ کر کے وہاں مسجد تعمیر کر دی، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا دور آیا تو عیسائیوں نے ان سے اس زبردستی کی شکایت کی۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان عیسائیوں کے حق میں فیصلہ دیا، اور اس حصے سے مسجد ختم کر کے اسے عیسائیوں کے حوالے کرنے کا ارادہ فرما لیا، لیکن بعد میں دمشق کے حاکم نے عیسائیوں کو منہ مانگا معاوضہ دے کر راضی کر لیا، اور پھر وہ بخوشی اس حصے سے دستبردار ہو گئے۔[1]

اور بعض روایات سے اس کے برخلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے شروع ہی سے عیسائیوں پر کوئی زبردستی نہیں کی تھی، بلکہ یہ کہا تھا کہ اگر وہ یہ کلیسا

[1] فتوح البلدان للبلاذری۔ ص: ۱۴۹۔ اقسم ۱۱۱ اول

www.freepdfpost.blogspot.com

کی زمین مسجد کیلئے دینے پر رضامند ہو جائیں تو دمشق اور اس کے مضافات کا جو حصہ مسلمانوں نے بزور فتح کیا تھا، وہاں کے جن چار کلیساؤں کے انہدام کا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ فیصلہ واپس لے لیا جائے گا اور یہ چاروں کلیسا آپ کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اس پر عیسائیوں نے اپنی رضامندی سے یہ کلیسا مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔[1]

بہرصورت! ولید نے جب کلیسا کو اپنی تحویل میں لے کر اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا تو عیسائیوں نے کہا کہ ہمارے یہاں عقیدہ مشہور ہے کہ جو شخص اس کلیسا کو منہدم کرے گا وہ پاگل ہو جائے گا، لہٰذا آپ اسے منہدم نہ کیجئے۔ لیکن ولید نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اس کا انہدام خود اپنے ہاتھوں سے شروع کروں گا۔ چنانچہ سب سے پہلی کدال ولید نے ماری، اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں نے اسے مسمار کر دیا۔

اب ولید بن عبدالملک نے دونوں حصوں کو ملا کر ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا جو اپنے فن تعمیر کے لحاظ سے اُس دور کی سب سے عالیشان اور سب سے خوبصورت مسجد قرار پائی۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر پر ایک کروڑ بارہ لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔

مسجد کا اندرونی ہال جس میں محراب بنی ہوئی ہے۔ شرقاً غرباً دو سو فٹ لمبا، اور سو فٹ چوڑا تعمیر کیا گیا، اس کے قبلے کی دیوار میں سنگ مرمر کے ساتھ سونا بھی جڑا گیا تھا۔ اس ہال کے اوپر ایک شاندار گنبد تعمیر کیا گیا جسے ''قبۃ النسر'' کہتے ہیں، یہ کسی زمانے میں دمشق کی بلند ترین عمارت تھی، اور اس کا پُرشکوہ منظر دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اُندلس کا مشہور سیاح محمد بن جُبیر ۵۸۷ھ میں یہاں پہنچا تو اس گنبد پر چڑھنے کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> ''ہم نے دنیا میں جو عجیب وغریب مناظر دیکھے ہیں، اور جن پُرشکوہ عمارتوں کا مشاہدہ کیا ہے، ان میں جامع اُموی کے قبے پر چڑھنے کا تجربہ ایک عظیم ترین تجربہ تھا۔[2]

[1] تاریخ ابن عساکر۔ ص:۱۹، ج:۲۔ و البدایۃ النہایۃ۔ ص:۱۴۵، ج:۹

[2] رحلۃ ابن جبیر۔ ص:۳۰

ابن جُبیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ جامع اُموی کے گنبدوں کی یہ خاصیت مشہور ہے کہ ان میں نہ مکڑی جالے بُن سکتی ہے، اور نہ چمگادڑیں ان کو اپنا مسکن بنا سکتی ہیں۔

مسجد کی دیوار قبلہ میں کئی محرابیں ہیں، اور یہ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں مختلف فقہی مذاہب کے علیحدہ علیحدہ مصلّوں کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں، اب بھی جامع اُموی میں حنفی اور شافعی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، لیکن دونوں جماعتوں میں محراب ایک ہی استعمال ہوتی ہے اور اب ان جماعتوں میں، لوگوں کی شرکت کسی مخصوص فقہی مسلک سے وابستگی کی بنیاد پر کم اور اپنی سہولت کی بنیاد پر زیادہ ہوگئی ہے۔ مثلاً تمام اوقات میں شافعی مسلک کی جماعت پہلے ہوتی ہے، اور حنفی مسلک کی بعد میں۔ اب جس شخص کو اپنی مصروفیات کے لحاظ سے جس جماعت میں شرکت کا موقع مل جاتا ہے، وہ اس میں شریک ہو جاتا ہے، خواہ حنفی ہو یا شافعی۔

مسجد کے ہال میں ایک مقبرہ بنا ہوا ہے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر مبارک مدفون ہے۔ حافظ ابن عساکرؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جامع اُموی کی تعمیر کے دوران ایک غار دریافت ہوا، ولید بن عبدالملک کو اس کی خبر کی گئی، ولید بن عبدالملک خود اس غار میں داخل ہوئے تو اس میں ایک صندوق رکھا ہوا ملا۔ اس صندوق میں ایک انسانی سر رکھا ہوا تھا، اور اس پر لکھا تھا کہ ''یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر ہے۔'' زید بن واقد جو اس وقت مسجد کی تعمیر کی نگرانی کر رہے تھے، اُن کا بیان ہے کہ اس سر مبارک کی میں نے زیارت کی، اس کے چہرے بشرے اور بالوں میں ذرا بھی تغیر نہیں آیا تھا۔[1] یہاں اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار کے مغربی جانب میں ایک طویل وعریض شمع لگی ہوئی ہے، یہ موم بتی ہے، لیکن اس کی اونچائی بارہ فٹ اور گولائی تقریباً دو فٹ ہے۔

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکر۔ ص:۱۹۷، ج:۱

www.freepdfpost.blogspot.com

جامع اُموی میں ایسی بہت سی شمعیں رکھی ہوئی تھیں۔ بجلی کی دریافت سے پہلے انہی شمعوں کو روشنی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ رات کے وقت جب شمعیں گُل کی جاتی تھی تو پوری مسجد مشک کی خوشبو سے اس قدر مہک اُٹھتی تھی کہ لوگ اس تیز خوشبو کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور باہر نکل جاتے تھے۔

مسجد کے ہال سے صحن کی طرف جائیں تو درمیان میں ایک کشادہ برآمدہ ہے، جو صحن کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسی برآمدے کے مشرقی حصے میں ایک جگہ ایک اور مزار بنا ہوا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کا سر مبارک مدفون ہے۔ یہ بات آج کل تو بہت مشہور ہوگئی ہے، ایک روایت بھی ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ کا سرِ مبارک یزید کے پاس دمشق لایا گیا تھا، اس روایت کی بنا پر اس خیال کو کچھ تقویت بھی ملتی ہے، کہ شاید بعد میں سر مبارک یہاں دفن کر دیا گیا ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دمشق اور جامع اموی کے قدم مؤرخین میں سے کوئی بھی یہ بات ذکر نہیں کرتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کا سرِ مبارک یہاں دفن کیا گیا۔ حافظ ابن عساکرؒ جو دمشق کے فضائل ومناقب اور اس کے مفاخر کو بیان کرنے کے بڑے حریص ہیں، اور اس سلسلے میں انہوں نے ضعیف، منکر بلکہ موضوع احادیث بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا، وہ کہیں حضرت حسینؓ کے مزار کا تذکرہ نہیں فرماتے۔ علامہ نعیمیؒ جن کی کتاب ''تنبیہ الطالب'' تاریخ دمشق پر ابن عساکرؒ کے بعد سب سے بڑا ماخذ ہے، انہوں نے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا۔

علامہ شہاب الدین ابن فضل اللہ العمری (متوفی ۷۴۹ھ) نے اپنی کتاب ''مسالک الابصار فی ممالک الاّ مصار'' میں جامع دمشق کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس میں بھی حضرت حسینؓ کے مزار کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کا سر مبارک یہاں موجود تھا۔ لیکن بعد میں اُسے قاہرہ منتقل کر دیا گیا۔[1] واللہ سبحانہٗ اعلم۔

[1] الجامع الاموی، بتحقیق محمد مطیع الحافظ۔ ص: ۲۳۳ مطبوعہ دار ابن کثیر دمشق۔

ہم برآمدے کے شمال مشرقی کونے کے پاس پہنچے تو وہاں ایک عجیب وغریب گاڑی رکھی نظر آئی، یہ گاڑی بانسوں اور لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی، اور اس کے نیچے لوہے کے بڑے دیوہیکل پہیئے لگے ہوئے تھے، یہ اتنی بڑی گاڑی تھی کہ اس نے برآمدے کا خاصا بڑا حصہ گھیرا ہوا تھا، رہنماؤں نے بتایا کہ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی بنائی ہوئی منجنیق ہے جو انہوں نے بہت سی جنگوں میں استعمال کی، اب اسے یادگار کے طور پر جامع اموی میں رکھ دیا گیا ہے۔

مسجد کے صحن میں کھڑے ہوں تو چاروں طرف سے مسجد کا نظارہ بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے، قبۃ النسر کے علاوہ مسجد کے تینوں مینار (غربی، شرقی اور منارۃ العروس) یہاں سے نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں صحن کے اندر ایک فوارہ بھی تھا جس کا پانی ایک ہلالی نصف دائرہ بناتا ہوا گرتا تھا، اور اتنا دلکش تھا کہ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے تھے۔ اب یہ فوارہ موجود نہیں ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ جامع اُموی کے صحن کی رونق لوگوں میں ضرب المثل تھی، یہ صحن صدیوں سے علم دین کے طالبوں اور بڑے بڑے اساتذہ ومشائخ کا مرکز رہا ہے، یہاں علم وفضل کے دریا اُمڈے ہیں، نہ جانے کتنی بیشمار کتابیں یہاں بیٹھ کر لکھی گئیں، اور علم ودانش کے نہ جانے کتنے آفتاب وماہتاب یہیں سے طلوع ہوئے، سنا ہے کہ آج بھی یہاں کچھ تدریسی حلقے ہوتے ہیں، لیکن وہ زیادہ تر وعظ وارشاد کی محفلیں ہیں، علومِ اسلامیہ کی درس وتدریس کا وہ نکسالی انداز تو اس ملک سے کبھی کا رخصت ہو چکا۔

اس عظیم تاریخی مسجد نے مسلمانوں کے عروج واقبال کے دن بھی دیکھے ہیں، اس کی زمین پر ان فرشتہ صفت انسانوں نے بھی سجدے کئے ہیں، جو دنیا کے لیے ایک مثال بن کر آئے تھے، اور آج یہی مسجد اسی اُمت کے زوال وانحطاط کا بھی نظارہ کر رہی ہے، اور ہم جیسوں کے بے روح سجدے بھی اسی زمین پر ثبت ہو رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب اُمت کا آخری حصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی کی سرکردگی میں اسی مسجد سے ہمت وعزیمت کا نیا قافلہ لے کر نکلے گا، اس کے ہاتھوں میں

www.freepdfpost.blogspot.com

ہدایت کی وہی مشعلیں ہوں گی جن سے ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی انسانیت پر ایک بار پھر عدل وانصاف اور خدا پرستی کی کرنیں ضیاء بار ہوں گی، اور یہ دنیا جو آج ظلم وجہالت کی تیرگی میں پھنسی ہوئی ہے، اس پر دوبارہ رشد وہدایت کا سویرا طلوع ہو جائے گا۔

نورالدین زنگیؒ کے مزار پر:

جامع اُموی سے نکلے تو مسجد کے بالکل برابر تاریخ اسلام کے بطل جلیل نورالدین زنگیؒ کا مزار تھا، وہاں سلام عرض کرنے اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

نورالدین زنگیؒ تاریخ اسلام کے ان چند فرماں راوا میں سے ہیں، جنہوں نے اپنے عدل وانصاف، رعایا ودوستی، عزم وشجاعت اور حسن انتظام میں خلافت راشدہ کے زمانے کی یادیں تازہ کیں۔ اتابکی خاندان کے اس اوّلوالعزم مجاہد کی پوری زندگی صلیب برداروں کے ساتھ میدانِ جہاد میں گزری۔ اور اُس نے اپنی جانبازی کے ذریعے نہ جانے کتنی بار جرمنی، فرانس اور یورپ کی دوسری طاقتوں کے چھکے چھڑائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلجوقی حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی، عباسی خلافت طرح طرح کے فتنوں کا شکار تھی، اور یورپ کی صلیبی طاقتیں مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر عالم اسلام کو ہضم کرنا چاہتی تھی۔ اس نازک موقع پر سب سے پہلے نورالدین زنگیؒ کے والد عمادالدین زنگیؒ اور ان کے بعد نورالدین زنگیؒ نے اُمت مسلمہ میں ایک نئی بیداری پیدا کی، اور یورپی سازشوں کو ناکام بنا کر چھوڑا۔

نورالدین زنگیؒ کی فتوحات اور کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، یہاں ان کی تفصیلات کا موقع نہیں ہے، لیکن علامہ ابن اثیر جزریؒ جو بڑے پائے کے مؤرخ اور محدث ہیں، اور نورالدین زنگیؒ کے ہمعصر ہیں، انہوں نے اپنی تاریخ میں نورالدین زنگیؒ کے عہد حکومت پر جو مجموعی تبصرہ کیا ہے، وہ یہاں نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ علامہ ابن اثیرؒ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اسلامی عہد کے پہلے کے فرماں رواؤں سے لے کر اس وقت تک تمام بادشاہوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا، مگر خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیزؒ

> کے سوا نورالدین سے بہتر فرماں روا میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس نے عدل وانصاف کی اشاعت، جہاد، اور ظلم وجور کے استیصال، عبادت وریاضت اور احسان وکرم کو مقصدِ زندگی بنالیا تھا۔ اسی میں اس کے لیل ونہار بسر ہوتے تھے، اگر کسی پوری قوم میں بھی اس کے اور اس کے باپ کے جیسے دو فرماں روا گذرے ہوتے تو بھی اس قوم کے فخر کیلئے کافی تھا، نہ کہ ایک گھرانے میں خدا نے دو فرماں روا پیدا کردیئے..... ممالکِ محروسہ میں جس قدر ناجائز ٹیکس تھے سب موقوف کردیئے تھے۔ وہ مظلوم کے ساتھ خواہ وہ کسی درجے کا ہو، پورا انصاف کرتا تھا، مظلوموں کی شکایتیں براہِ راست سنتا تھا۔''
>
> ''ایک مرتبہ ایک شخص نے کسی زمین کے بارے میں اس پر دعویٰ دائر کیا، عدالت کا چپڑاسی عین اُس وقت جبکہ سلطان گوے و چوگان کھیل رہا تھا، پہنچا۔ سلطان فوراً اس کے ہمراہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوگیا۔ تحقیقات سے جائداد مدعی کے بجائے نورالدین کی ثابت ہوئی، اس لیے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ کردیا۔ اس فیصلہ کے بعد نورالدین نے متنازعہ جائیداد اپنی طرف سے مدعی کو ہبہ کردی۔''[1]

اقتدار کی کرسی پر ہزار ہا افراد آئے اور چلے گئے، لیکن بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس کرسی کو اپنی آخرت کی تیاری کے لئے استعمال کیا ہو، اور اپنے کارناموں کی بنا پر زندۂ جاوید ہوگئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نورالدین زنگیؒ کی روح پر اپنی غیر محدود رحمتیں نازل فرمائے، وہ ایسے ہی صاحب اقتدار تھے۔ اُن کے مزار پر حاضری کے وقت عقیدت ومحبت کے جذبات لفظ وبیان سے ماورا تھے۔

[1] کامل ابن اثیر۔ مأخوذ از تاریخ اسلام مولانا معین الدین ندوی۔ ص: ۲۵۲، ۲۵۳، ج: ۴

www.freepdfpost.blogspot.com

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ:

یہیں جامع اُموی کے قریب دوسرا مقبرہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا ہے، وہاں بھی حاضری ہوئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے، وہ نورالدین زنگیؒ کے قابل ترین جرنیلوں میں سے تھے، نورالدینؒ نے انہیں ان کے چچا شیر کوہ کے ساتھ ایک جنگی مہم پر مصر روانہ کیا تھا، وہاں انہوں نے اپنی بہترین جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، فرنگیوں کے متعدد حملے انہوں نے پسپا کئے، بالآخر وہ نورالدین زنگیؒ کی طرف سے مصر کے حکمران بن گئے اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں مصر سے فاطمی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ نورالدین زنگی (جن کا پایۂ تخت شام تھا) کی وفات کے بعد اہل شام نے انہیں شام کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی، اور اس طرح وہ بیک وقت مصر اور شام دونوں کے حکمران بن گئے۔

اپنے عہد حکومت کے دوران انہوں نے ایک طرف بیشمار تعمیری خدمات انجام دیں اور دوسری طرف یہی وہ دور تھا جب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کی پے در پے مہمات شروع کر رکھی تھیں، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ان جنگوں میں یورپ کی طاقتوں کے دانت کھٹے کئے، اسی زمانے میں بیت المقدس پر عیسائی قابض تھے، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ۵۸۳ھ میں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل اُن کے تسلط سے چھڑا کر وہاں اسلام کا پرچم لہرایا، اور شام کے جتنے علاقوں پر اہل صلیب قابض ہوئے تھے، وہ سب اُن سے آزاد کرائے۔

ان کی بھی ساری زندگی میدانِ جہاد میں گذری، وہ بھی عدل و انصاف اور صلاح و تقویٰ میں نورالدین زنگیؒ کے سچے جانشین تھے، انہوں نے مصر میں ۲۴ سال اور شام میں ۱۹ سال حکومت کی، لیکن جب ۵۸۹ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے ترکے میں نہ کوئی زمین جائیداد تھی، نہ کوئی نقدی یا سونا۔[1] رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

[1] الاعلام للزرکلی۔ ص:۲۹۲، ج:۹۔ و وفیات الاعیان۔ ص:۳۷۶، ج:۲

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے، آٹھ سو سال سے زائد ہو چکے ہیں، آج پھر مسلمانوں کا قبلۂ اوّل اُن سے چھین لیا گیا ہے، اور آج پھر امت مسلمہ کسی صلاح الدین کے انتظار میں ہے، اور پورا عالم اسلام زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ ؎

اے سوارِ شہب دوراں، بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں، بیا

☆ ☆

(۱۰)

بازار حمیدیہ میں:

جامع دمشق اور سلطان زنگیؒ اور سلطان ایوبیؒ کے ملحقہ مزارات سے فارغ ہونے کے بعد ہم ذرا آگے چلے تو سوق الحمیدیہ سامنے تھا۔ یہ دمشق کا قدیم ترین بازار ہے، جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ عہد صحابہؓ سے اسی طرح چلا آتا ہے، بلکہ بعض لوگ تو اسے عہد اسلام سے بھی پہلے بازنطینی دور کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ دنیا کے ان چند بازاروں میں سے ہے جو صدیوں سے اپنی قدیم جگہ پر قائم ہیں اور ان کے محل وقوع میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اس پر قدامت کے آثار اب بھی محسوس ہوتے ہیں۔ دکانوں نے جدید تمدن کی تھوڑی بہت ادائیں ضرور سیکھ لی ہیں، لیکن انداز وہی پرانا ہے۔ ایک مستطیل اور مسقف بازار جس کے دونوں طرف انواع و اقسام کی دکانوں کا طویل سلسلہ ہے، سڑک قدیم زمانے کے لحاظ سے خاصی کشادہ ہے، لیکن جتنی دونوں طرف دکانیں ہیں، اتنے ہی دکانوں کے سامنے تھڑے لگے ہوئے ہیں، نتیجہ یہ کہ سڑک پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ شام کی ٹھیٹھ اور نکسالی چیزیں خریدنی ہوں تو وہ اسی بازار اور اس کی ملحقہ گلیوں میں دستیاب ہوں گی، جہاں سے گذرتے ہوئے عہد گذشتہ کی بُو باس قدم قدم پر مشام جان کو متاثر کرتی ہے، اور جس کے در و دیوار پر تاریخی واقعات کے ان دیکھے سائے منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سردی کا موسم تھا، اور شام اور ترکی کے بنے ہوئے سویٹر یہاں بہت اچھے اور بڑے سستے مل رہے تھے، شامی روپیہ لیرا کہلاتا ہے، اور قیمت کے لحاظ سے ہمارے پاکستانی روپے کے تقریباً برابر ہے، تمام ساتھیوں نے یہاں سے سویٹر خریدے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل شام کے مزاج میں نفاست اور لطافت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ان کی ہر چیز میں خوش مذاقی واضح نظر آتی ہے، سادگی کے ساتھ حسن ان کی فطرت میں داخل ہے۔ چنانچہ شام کی مصنوعات میں بھی یہ خوش مذاقی پورے طور پر نمایاں ہے۔

ہماری گاڑی سوق الحمیدیہ کے پیچھے ایک گلی میں کھڑی تھی، بازار سے گزر کر وہاں پہنچے، وہاں سے ہمارے رہنما عنایت صاحب ہمیں جبل قاسیون لے جانا چاہتے تھے، تاکہ وہاں سے رات کے وقت دمشق کا نظارہ کرا سکیں۔ لیکن راستے سے گذرتے ہوئے ایک جگہ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ جگہ ''باب الجابی'' کہلاتی ہے، میں یہ نام سن کر ٹھٹھک گیا، اور وہاں گاڑی رکوائی، دراصل یہ قدیم دمشق کا مشہور مغربی دروازہ تھا، جس کا نام تاریخوں میں ''باب الجابیہ'' مذکور ہے۔

باب الجابیہ:

دراصل ''جابیہ'' دمشق کی ایک مضافاتی بستی کا نام ہے، جو دمشق کے مغرب میں جولان کی سطح مرتفع کے قریب واقع ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، تو انہوں نے دمشق میں داخل ہونے کے بجائے ''جابیہ'' میں قیام فرمایا تھا، اور وہاں ایک بڑا معرکۃ الآراء خطبہ بھی دیا تھا جو ''خطبۃ الجابیہ'' کے نام سے مشہور ہے، اس خطبے کے بہت سے اقتباسات حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں آتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اگر کوئی شخص دمشق سے ''جابیہ'' جانا چاہتا تو اسے شہر کے اس مغربی دروازے سے نکلنا پڑتا تھا، اس لیے اس مغربی دروازے کا نام ''باب الجابیہ'' رکھ دیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اپنی چوکی باب الجابیہ کے سامنے قائم فرمائی تھی، حضرت خالد بن ولیدؓ

اس کے مقابل دمشق کے ''الباب الشرقی'' کے سامنے فروکش تھے۔ محاصرہ کئی مہینے جاری رہا۔ مصالحت کی گفتگو بھی کئی بار چلی اور ناکام ہوئی۔ بالآخر حضرت خالد بن ولیدؓ نے مشرقی جانب سے یلغار کی اور شہر میں داخل ہو گئے، حضرت ابوعبیدہؓ کو حضرت خالدؓ کے حملے کا پتہ نہ چل سکا، اور باب الجابیہ کے لوگوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو حضرت خالدؓ کے حملے کا پتہ نہ چل سکا اور باب الجابیہ کے لوگوں نے حضرت ابوعبیدہؓ سے مصالحت کر کے یہ دروازہ حضرت ابوعبیدہؓ کے لئے کھول دیا اور حضرت ابوعبیدہؓ اسی دروازے سے صلح کی بنیاد پر شہر میں داخل ہوئے، اُدھر سے حضرت خالدؓ بزورِ شمشیر آگے بڑھ رہے تھے، اور ادھر سے حضرت ابوعبیدہؓ پرامن طور پر تشریف لا رہے تھے، شہر کے بیچوں بیچ دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ میں نے شہر کا نصف حصہ تلوار کے زور سے فتح کیا ہے، لہٰذا اس شہر کے لوگوں کے ساتھ مفتوحہ شہروں کا سلوک ہونا چاہیے۔ لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا کہ میں صلح کی بنیاد پر اہل شہر کو امان دے چکا ہوں، اور جب آدھا شہر صلحاً فتح ہوا ہے، تو ہمیں پورے شہر کے ساتھ مصالحت کا سلوک کرنا چاہئے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے باتفاق یہی فیصلہ فرمایا کہ ہمارا مقصد خونریزی نہیں، اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے، اس لیے ہم اس شہر کو صلح سے حاصل شدہ شہر تصور کریں گے۔[1]

آج اس جگہ دروازہ نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ بلکہ یہ وسط شہر کی ایک مصروف سڑک ہے، جس کے دونوں طرف گنجان آبادی ہے، لیکن وہ جگہ ابھی محفوظ ہے جہاں کبھی باب الجابیہ نامی دروازہ ہوا کرتا تھا۔ یہ امین امت حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کی وہ گذرگاہ تھی جہاں سے وہ دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، اُن کے ہاتھوں اس تاریخی شہر سے قیصر روم کے جاہ وجلال کا پرچم ایک مرتبہ اُترا تو دوبارہ نہ لہرا سکا، اُن کے اور ان کے مبارک رفقاء کے ہاتھوں میں ایمان ویقین کی جو قندیلیں تھیں، انہوں نے اس علاقے کو رشد وہدایت سے منور کر دیا، اور ان نفوسِ قدسیہ کے پھیلائے ہوئے نور کے اثرات اہل شام میں آج چودہ سو برس گذرنے کے بعد بھی محسوس ہوتے ہیں، کفر والحاد نے

[1] تاریخ ابن عساکر، ص: ۱۴۸، ج: ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

اس نور کو مٹانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا، یہاں تک کہ اب تو زمامِ اقتدار بھی اسی نے سنبھال لی، لیکن الحمدللہ! عوام کے سینوں میں ایمان کی جو شمعیں آج بھی فروزاں ہیں، انہیں بالکلیہ بجھانے پر ابھی تک قادر نہیں ہوا۔

جبل قاسیون پر:

چند لمحے باب الجابیہ پر ماضی کے تصورات میں محو رہنے کے بعد ہم قاسیوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ پہاڑ شہر دمشق پر ٹھیک اس طرح سایہ کئے ہوئے ہے جیسے اسلام آباد پر مرگلہ۔ اب دمشق کی آبادی بڑھتے بڑھتے اس پہاڑ کے مختلف حصوں تک پھیل گئی ہے، چنانچہ مختلف آبادیوں سے گذرتے ہوئے ہم اس سڑک پر پہنچے جو بل کھاتی ہوئی قاسیون کی چوٹی تک جاتی ہے۔ سڑک سطح زمین سے بتدریج بلند ہوتی گئی اور دیر میں ہم پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے۔

تاریخی اور اسرائیلی روایات کی رو سے قاسیون انبیاء علیہم السلام کا مرکز رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابل نے اپنے بھائی ہابیل کو یہیں پر قتل کیا تھا، پہاڑ پر ایک غار بنا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں خون کا نشان بھی ہے۔ عوام میں مشہور ہے کہ یہ حضرت ہابیل کے خون کا نشان ہے۔

اس پہاڑ پر ایک مسجد ''مسجد ابراہیم'' کہلاتی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے، اسی مسجد کے باہر پہاڑ میں ایک دراڑ ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو واقعہ مذکورہ ہے انہوں نے پہلے ستارے، پھر چاند اور پھر سورج کو (فرضی طور پر) خدا قرار دے کر پھر ان سب خیالات سے برائت کا اظہار فرمایا اور عقیدۂ توحید کی اس لطیف پیرائے میں تبلیغ فرمائی وہ واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت الیاس علیہ السلام اپنے بادشاہ وقت کے مظالم سے تنگ آکر اسی پہاڑ میں روپوش رہے تھے۔[1]

[1] مختصر تاریخ دمشق لابن منظور، ص ۲۷۷ تا ۲۸۰، ج ۱

یہ تمام روایات اسنادی حیثیت سے کمزور ہیں اور ان میں سے بعض تاریخی اعتبار سے بے بنیاد اور غلط بھی ہیں، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ پورا علاقہ انبیاء علیہم السلام کا مرکز رہا ہے۔ اور جبل قاسیون اس علاقہ کا نمایاں ترین پہاڑ ہے، اس لئے اگر مختلف انبیاء علیہم السلام نے اسے اپنا مستقر بنایا ہو تو کچھ بعید نہیں۔

ہماری گاڑی جس جگہ جا کر رکی وہ اس پہاڑ کا ایک تفریحی مقام ہے۔ گاڑی سے اترے تو ایک ایسا دلفریب منظر سامنے تھا جسے بیان کرنے کے لئے لفاظ کو تنگ دامنی کا احساس ہوتا ہے۔ سامنے تینوں اطراف میں حد نظر تک شہر دمشق کی روشنیاں پھیل پڑی تھیں، رنگ برنگے قمقموں کا ایک جہاں آباد تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے زمین نے تاروں بھرے آسمان کی صورت اختیار کرلی ہے۔

زمیں پہ جیسے کوئی کہکشاں اتر آئی

یہاں کچھ ریسٹورنٹ بنے ہوئے ہیں، کچھ بچوں کے کھیلنے کے مراکز ہیں۔ غالباً سخت سردی کی وجہ سے یہاں کوئی چہل پہل نہیں تھی ہم کچھ دیر یہاں حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد واپس روانہ ہوگئے۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ[1]

جبل قاسیون سے اتر کر ہم دمشق کے نئے علاقے میں پہنچے جو ''دمشق الجدید'' کہلاتا ہے اور اپنی کشادہ سڑکوں، وسیع عمارتوں اور خوبصورت بنگلوں کے اعتبار سے جدید تمدن کا بہترین نمونہ ہے۔ عنایت صاحب یہاں سے ہمیں پھر دمشق کے قدیم علاقے کے اس محلے میں لے گئے جو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہیں پر ان کا مزار واقع ہے۔ اس وقت مزار کا دروازہ چونکہ بند ہو چکا تھا، اس لئے

[1] عام طور سے اہل علم قاضی ابوبکر ابن العربی کو ''ابن العربی'' (الف لام کے ساتھ) اور انکو ''ابن عربی'' الف لام کے بغیر لکھتے ہیں، لیکن شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ''طبقات'' میں لکھا ہے کہ ان کی صحیح کنیت ''ابن العربی'' ہی ہے۔ ملاحظہ ہو

www.freepdfpost.blogspot.com

اندر تو حاضری نہ ہو سکی، لیکن باہر ہی سے فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت شیخ محی الحق الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ صوفیاء کرام میں جس مقام بلند کے حامل ہیں وہ کسی پڑھے لکھے شخص سے منفی نہیں، آپ ۵۶۰ھ میں اندلس شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے اشبیلیہ منتقل ہوئے۔ وہاں آپ کسی بادشاہ کے ہاں منشی کا کام کرتے تھے، لیکن پھر زھد کا غلبہ ہوا اور تمام دنیوی مشاغل چھوڑ کر یادِ خدا میں مصروف ہو گئے۔ بادشاہ نے ان کو ایک گھر تحفے مین دیا تھا جس کی قیمت اس وقت ایک لاکھ درہم تھی، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی سائل آ گیا، اسے دینے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا، چنانچہ وہ گھر اسے صدقہ کر دیا۔[1]

اشبیلیہ سے شیخؒ نے رخت سفر باندھا تو حج کے لئے حرمین شریفین حاضر ہوئے، مصر عراق اور شام کا سفر کیا، مصر میں کافی عرصہ مقیم رہے اور بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں، چونکہ ان کی تصانیف میں بہت سی شطحیات بھی موجود ہیں۔ اس لئے مصر کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ اسی سلسلے میں قید بھی ہوئے اور لوگ قتل کے درپے ہو گئے۔ بالآخر علی بن فتح الجبائی نے ان کی خلاصی کرائی اور انہوں نے آخر میں دمشق کو اپنا مستقر بنالیا۔ اور وہیں پر ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔[2]

حضرت شیخ ابن عربیؒ کی شخصیت اہل علم میں متنازعہ ہی رہی ہے۔ ان کی کتابوں میں جو شطحیات پائی جاتی ہیں، ان کی بنا پر بہت سے محدثین اور فقہاء ان سے نالاں اور برگشتہ رہے۔ لیکن دوسرے حضرات نے انہیں معذور قرار دے کر ان کی برائت میں کتابیں لکھی ہیں' علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ان کی براءت پر ایک مستقل رسالہ ''تنبیہ الغبی بتبرئۃ ابن عربی'' کے نام سے لکھا ہے، اس میں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں۔

"والقول الفیصل فی ابن عربی اعتقاد و لایته و تحریم النظر

[1] فوات الوفیات للکتبی، ص ۴۳۶، ج ۳،

[2] الاعلام للزرکلی، ص ۱۷۰، ج ۷،

فی کتبه، فقد نقل عند هو أنه قال، نحن قوم یحرم النظر فی کتبنا..... وذلک لأن الصوفیة تواضعوا علی الفاظ اصطلحوا علیها وأرادوا بها معان غیر المعانی المتعارفة منها، فمن حمل ألفاظهم علی معانیها المتعارفة بین اهل العلم الظاهر کفر، نص علی ذلک الغزلی فی بعض کتبه."[1]

علامہ ابن عربیؒ کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ ان کے بارے میں ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے لیکن ان کی کتابیں دیکھنے کو ناجائز قرار دیا جائے۔ کیونکہ خود انہی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں دیکھنا (مذاق ناشناس لوگوں کے لئے) ناجائز ہے..... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے بعض ایسی اصطلاحات مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ ان کے معروف معانی کے سوا کچھ اور معنیٰ مراد لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، یہ بات امام غزالیؒ نے بھی اپنی کتابوں میں لکھی ہے۔''

یہ شیخ ابن عربیؒ کے بارے میں بڑا معتدل فیصلہ کیا ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے علامہ ابن عربیؒ کی براءت میں ایک رسالہ لکھا ہے جو ''تنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی'' کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں بھی حضرتؒ نے تقریباً یہی مؤقف اختیار فرمایا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ صوفیاء کرام پر جو حالات و کیفیات طاری ہوتی ہیں انہیں کوئی دوسرا شخص جو ان احوال سے نہ گذرا ہو، سمجھ نہیں سکتا لہٰذا ہم جیسوں پر تو یہی بات صادق آتی ہے کہ

تو نہ دیدی گہے سلیماں را
چہ شناسی زبان مرغاں را

[1] شذرات الذھب لابن العماد، ص ۱۹۱، ج ۵

www.freepdfpost.blogspot.com

لہٰذا ان حضرات کے بارے میں کسی بدگمانی کی کوئی گنجائش ہے، کیونکہ ان کی مجموعی زندگی اتباع سنت میں ڈھلی ہوئی تھی اور ان کی ایسی کتابوں کے مطالعے کی کوئی ضرورت ہے، انسان کی اپنی اصلاح کے لئے شریعت وسنت پر مشتمل کتابیں کافی ہیں۔ انہی کا حق ادا کردے تو بہت ہے، اس خاردار کوچے میں داخل ہی کیوں ہو؟

کتب خانے:

شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مزار سے ہم واپس ہوٹل آ گئے اور دن بھر کی تھکن کے بعد جلد ہی نیند آ گئی۔

اگلا دن میں نے کتب خانوں کی سیاحت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا دوسرے رفقاء اپنی دوسری ضروریات کے لئے چلے گئے اور میں دمشق کے مختلف تجارتی کتب خانوں میں گھومتا رہا۔ یہاں کے کتب خانے واقعۃً کتابوں سے مالا مال ہیں۔ بیروت کے قرب کی وجہ سے یہاں کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ بیروت عربی کتابوں کی طباعت کا مرکز ہے اور سالہا سال سے خانہ جنگی کی تباہ کاریوں کا شکار ہونے کے باوجود وہاں اشاعت کتب کا کام روز افزوں ہے۔ گولے بھی دن رات پھٹتے رہتے ہیں اور نئی سی نئی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بیروت یہاں سے بہت قریب ہے، اس لئے کتابیں بڑی تعداد میں آتی رہتی ہیں، بلکہ بیروت کے بہت سے ناشروں نے اپنا ایک ایک شوروم دمشق میں بھی قائم کر رکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں شامی لیرا قیمت میں پاکستانی روپے کے قریب قریب ہے، اس لئے یہاں ہم پاکستانیوں کو یہ کتابیں کافی سستی پڑتی ہیں، مصر عراق اور اردن وغیرہ میں نہ کتابوں کا اتنا ذخیرہ ہے، اور نہ وہ ہمارے لئے اتنی ارزاں پڑتی ہیں، لہٰذا تجربہ یہی ہوا کہ خرید کتب کے لئے عرب ممالک میں یہ جگہ سب سے بہترین ہے۔

چنانچہ دن بھر الماریوں کی خاک چھاننے کے بعد شام تک اپنے مطلب کی کتابوں کا خاصا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جو کئی بڑے بڑے کارٹونوں میں سمایا، اور اسی طرح بفضلہ تعالیٰ سفر کی محنت وصول ہو گئی۔

عشاء سے کچھ پہلے ہوٹل واپسی ہوئی تو وہاں ہمارے دوست شیخ عبداللطیف الفرفور کو منتظر پایا، یہ شام کے ایک مشہور عالم شیخ صالح الفرفور کے صاحبزادے ہیں، خود بھی عالم ہیں علمی ذوق بھی رکھتے ہیں اور دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں بھی خاصے فعال ہیں، جدہ کی مجمع الفقہ الاسلامی میں شام کی نمائندگی کرتے ہیں اور سعودی عرب اور الجزائر وغیرہ میں ان کے ساتھ کافی رفاقت رہی ہے۔ کلیۃ الشریعہ کے بعض حضرات نے انہیں احقر کی آمد کی خبر دی تو وہ ہوٹل پہنچ گئے، اور کافی دیر سے وہاں منتظر تھے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور بدھ کے روز اپنے یہاں کھانے پر مدعو بھی کیا۔

وہ رخصت ہوئے تو پاکستان کے قونصل جنرل جناب توحید صاحب تشریف لے آئے اور دمشق کی بعض اہم شخصیات سے ملاقات کے لئے اپنے ساتھ لے گئے۔ احقر نے رفقاء سے کہہ دیا تھا کہ واپسی شاید دیر میں ہو، اس لئے وہ کھانے پر انتظار نہ کریں۔ توحید صاحب کے ساتھ واقعۃً خاصی دیر ہو گئی۔ لیکن جب ہم فارغ ہوئے تو توحید صاحب نے کہا کہ یہاں قریب میں ایک بڑا اچھا ریسٹورنٹ "مطعم ابوکمال" کے نام سے ہے، یہاں کے کھانے مشہور ہیں، کھانا یہاں کھایا جائے، چنانچہ ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے وہاں دیکھا تو ہمارے رفقاء قاری بشیر احمد صاحب، مولوی امین اشرف سلمہ اور عطاء الرحمٰن سلمہ، پہلے سے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں، حسن اتفاق سے یہ اچانک ملاقات خوب رہی..... شامی کھانے اپنی لذت ولطافت کے لحاظ سے سارے عرب ممالک میں مشہور ہیں، واقعۃً بڑے لذیذ بھی تھے اور ریسٹورنٹ بھی بڑے پر منظر مقام پر واقع تھا، یہاں سے رات گئے واپسی ہوئی۔

داریا میں:

اگلی صبح ہم دمشق کی ایک مضافاتی بستی داریا گئے یہ بھی شام کا ایک تاریخی قصبہ ہے جو دمشق کے میں واقع ہے، یہ قصبہ بھی انبیاء کرامؑ صحابہؓ اور علماء واولیاء کا مرکز رہا ہے اور یہاں سے بڑی جلیل القدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جو لوگ دمشق کی

www.freepdfpost.blogspot.com

سیاحت کے لئے آتے، وہ داریا کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے یہاں بھی جایا کرتے تھے۔[1]

انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار یہیں بتایا جاتا ہے، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا ایک قابل ذکر حصہ اسی بستی میں گذارا اور علامہ حمویؒ نے ان علماء واولیاء کی ایک طویل فہرست ذکر کی ہے جو داریا میں پیدا یا مدفون ہوئے۔[2]

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، سادہ مگر خوبصورت اور سرسبز، ہمارے رہنما نے گاڑی کو مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گذار کر ایک کشادہ گلی میں ایک خوبصورت مسجد کے سامنے رکوایا۔ یہ مشہور ولی اللہ حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ:

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ (جن کا نام عبدالرحمٰن بن احمد بن عطیہ العنسی) ہے۔ تبع تابعین میں سے ہیں، محدث بھی ہیں اور اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے بھی ہیں ولادت شام میں ہوئی تھی۔ پھر کچھ عرصے کے لئے عراق تشریف لے گئے، بعد میں پھر شام میں قیام فرمایا اور یہیں وفات ہوئی۔ آپ اکثر اوقات ذکر وفکر میں مصروف رہتے تھے، دعوت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، امام ابونعیم اصفہانیؒ نے آپ کا تذکرہ چھبیس صفحات میں کیا ہے اور اس میں آپ کے بہت سے ملفوظات ذکر فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) فرمایا کہ: ''دنیا اپنے سے بھاگنے والے کا پیچھا کرتی ہے، اگر وہ بھاگنے والے کو پکڑ لے تو زخمی کر کے چھوڑتی ہے اور اگر طالب دنیا اسے پکڑ لے تو اسے قتل ہی کر ڈالتی ہے۔''

(۲) فرمایا کہ: ''وسوسوں اور خوابوں کی کثرت کمزور آدمی کو ہوتی ہے اگر مکمل اخلاص پیدا ہو جائے تو خواب اور وسوسے دونوں بند ہو جائیں۔'' پھر اپنے بارے میں فرمایا کہ ''بعض اوقات مجھے کئی کئی سال گذر جاتے ہیں اور کوئی خواب نہیں آتا۔''

[1] ملاحظہ ہو الانساب للسمعانی ص (۲۷۱، ج ۵)

[2] معجم البلدان ص ۴۳۱ و ۴۳۲، ج ۷،

(۳) فرمایا کہ: ''اگر تم سے کبھی کوئی نفلی عبادت فوت ہو جائے تو اس کا بھی قضا کر لیا کرو، اس سے امید ہے کہ وہ آئندہ تم سے نہیں چھوٹے گی۔''

(۴) فرمایا کہ: ''بعض اوقات مجھے قرآن کریم کی صرف ایک آیت پر غور کرتے ہوئے پانچ پانچ راتیں گذر جاتی ہیں، اگر میں خود سے اس پر سوچنا چھوڑ دوں تو اس سے آگے نہ بڑھ سکوں۔''

(۵) ایک شاگرد نے ایک مرتبہ آپ سے کہا کہ ''مجھے بنی اسرائیل پر رشک آتا ہے کہ ان کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں اور وہ اتنی عبادت کرتے تھے کہ ان کی کھالیں سکڑ کر پرانے مشکیزے کی طرح ہو جاتی تھی۔'' حضرت دارانیؒ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں چاہتے کہ ہماری کھالیں ہڈیوں پر خشک ہو جائیں، اللہ تعالیٰ ہم سے صدق نیت کے سوا کچھ نہیں چاہتے، اگر ہم سے کوئی شخص دس ہی دن میں یہ صدق پیدا کر لے تو اسے وہ درجہ مل سکتا ہے جو بنی اسرائیل کے کسی شخص نے پوری عمر میں حاصل کیا ہو۔''

(۶) فرمایا کہ: ''یہ نہیں کہ تم تو قدم جوڑے (نماز میں) کھڑے رہو اور کوئی دوسرا شخص تمہارے لئے روٹیاں بناتا رہے، بلکہ اپنی دو روٹی کا انتظام کر لو، پھر عبادت کرو۔''[1]

مسجد میں داخل ہونے کے بعد مسجد کی ایک جانب حضرت دارانیؒ کا مزار تھا وہاں حاضری ہوئی، انہی کے پہلو میں آپ کی اہلیہ اور آپ کے مشہور شاگرد احمد بن ابی الحواریؒ مدفون ہیں، احمد بن ابی الحواریؒ آپ کے وہ خاص شاگرد ہیں جنہوں نے آپ کے بیشتر ملفوظات روایت کئے ہیں محدثین میں بھی ان کا مقام بلند ہے، امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ ان کے شاگرد ہیں۔[2]

[1] حلیۃ الاولیا ملا ابی نعیم۔ ۲۵۴ تا ۲۶۴ ج ۹

[2] تہذیب التہذیب ص ۴۹، ج ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت ابوثعلبۃ الخشنیؓ:

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ کے مقبرے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جہاں دس بارہ قبریں بنی ہوئی ہیں ان قبروں میں سے ایک قبر مشہور صحابی حضرت ابوثعلبۃ الخشنی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ قبیلہ بنوخشین سے تعلق رکھتے تھے، آنحضرت ﷺ جب غزوہ خیبر کے لئے تشریف لے جانے کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت یہ آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر مسلمان ہوئے اور غزوہ خیبر میں شامل ہوئے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت میں بھی شامل تھے۔ حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کی باہمی لڑائی میں یکسو رہے اور کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ داریا میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ موت کے وقت گلا گھٹنے کی جو تکلیف ہوا کرتی ہے وہ مجھے نہیں ہوگی۔ چنانچہ آپؓ ایک دن آخری شب میں نماز تہجد میں مشغول تھے کہ سجدے کی حالت میں ہی آپؓ کی روح پرواز کر گئی ان کی صاحبزادی اس وقت سو رہی تھیں، خواب میں دیکھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر بیدار ہوئیں اور آواز دی کہ ''میرے والد کہاں ہیں؟ کسی نے کہا کہ نماز پڑھ رہے ہیں۔'' انہوں نے آپ کو آواز دی جواب نہ ملا تو ان کے کمرے میں پہنچیں دیکھا کہ وہ سجدے میں ہیں، انہوں نے ہلا جلا کر دیکھا تو آپ گر پڑے۔ تب پتہ چلا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے۔[1]

.....☆.....☆.....☆.....

(۱۱)

حضرت ابوثعبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے مزار کے قریب ایک قبر پر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نام بھی لکھا ہوا ہے، ایک روایت بھی ہے کہ حضرت بلالؓ داریا کے قبرستان میں مدفون ہیں یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت بلالؓ داریا میں مقیم رہے ہیں، لیکن حافظ

[1] الاصابہ ص ۳۰ ج ۴

ابن عساکرؒ وغیرہ کا رجحان اسی طرف ہے کہ ان کا مزار داریا میں نہیں بلکہ دمشق کے ''الباب الصغیر'' کے قبرستان میں ہے۔ جس کا تذکرہ پیچھے کر چکا ہوں اور اسی کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی گذر چکا ہے۔

حضرت ابومسلم خولانیؒ

یہیں حضرت ابومسلم خولانی رضی اللہ عنہ کا مزار بھی مشہور ہے، ان کا نام عبداللہ بن ثوبؓ ہے اور یہ امت محمدیہ (علی صاحبہا السلام) کے وہ جلیل القدر بزرگ ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے آگ کو اسی طرح بے اثر فرما دیا جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے آتش نمرود کو گلزار بنا دیا تھا۔ یہ یمن میں پیدا ہوئے تھے اور سرکار دو عالم ﷺ کے عہد مبارک میں ہی اسلام لا چکے تھے۔ لیکن سرکار ﷺ کی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دور میں یمن میں نبوت کا جھوٹا دعویدار اسود عنسی پیدا ہوا۔ جو لوگوں کو اپنی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کے لئے مجبور کیا کرتا تھا۔

اسی دوران اس نے حضرت ابومسلم خولانیؒ کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلایا اور اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی حضرت ابومسلمؒ نے انکار کیا پھر اس نے پوچھا کہ تم محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہو؟'' حضرت ابومسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

اس پر اسود عنسی نے ایک خوفناک آگ دہکائی اور حضرت ابومسلمؒ کو اس آگ میں ڈال دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آگ کو بے اثر فرما دیا اور وہ اس سے صحیح سلامت نکل آئے۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ اسود عنسی اور اس کے رفقاء پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ اور اسود کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ ان کو جلاوطن کر دو، ورنہ خطرہ ہے کہ ان کی وجہ سے تمہارے پیروؤں کے ایمان میں تزلزل نہ آ جائے، چنانچہ انہیں یمن سے جلاوطن کر دیا گیا۔

یمن سے نکل کر ایک ہی جائے پناہ تھی، یعنی مدینہ منورہ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۲۶۵، ج ۱۔

www.freepdfpost.blogspot.com

کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلے، لیکن جب مدینہ منورہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ آفتاب رسالت ﷺ روپوش ہو چکا ہے۔ آنحضرت ﷺ وصال فرما چکے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن چکے تھے، انہوں نے اپنی اونٹنی مسجد نبوی ﷺ کے دروازے کے پاس بٹھائی اور اندر آ کر ایک ستون کے پیچھے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ وہاں حضرت عمرؓ موجود تھے۔ انہوں نے ایک اجنبی مسافر کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے پاس آئے اور جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے تو ان سے پوچھا:

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''یمن سے۔'' حضرت ابو مسلمؒ نے جواب دیا۔

حضرت عمرؓ نے فوراً پوچھا: ''اللہ کے دشمن (اسودِ عنسی) نے ہمارے ایک دوست کو آگ میں ڈال دیا تھا اور آگ نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا تھا، بعد میں ان صاحب کے ساتھ اسود نے کیا معاملہ کیا؟''

حضرت ابو مسلمؒ نے فرمایا: ''ان کا نام عبداللہ بن ثوب ہے۔''

اتنی دیر میں حضرت عمرؓ کی فراست اپنا کام کر چکی تھی، انہوں نے فوراً فرمایا:

''میں آپ کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ ہی وہ صاحب ہیں؟''

حضرت ابو مسلم خولانیؒ نے جواب دیا۔ ''جی ہاں''!

حضرت عمرؓ نے سن کر فرطِ مسرت و محبت سے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور انہیں لیکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے، انہیں صدیق اکبرؓ کے اور اپنے درمیان بٹھایا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے موت سے پہلے امتِ محمدیہ (ﷺ) کے اس شخص کی زیارت کرا دی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسا معاملہ فرمایا تھا۔''[1]

حضرت ابو مسلم خولانیؒ عبادت و زھد میں مثال آپ تھے خود انہی کا یہ مقولہ ہے کہ:

[1] حلیۃ الاولیا لأبی نعیم ص ۱۲۹، ج ۲ م و تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۳۱۵ ج ۷

''اگر میں جنت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لوں تب بھی میرے پاس مزید کرنے کے لئے کوئی عمل نہیں اور اگر جہنم کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لوں تب بھی۔''[2] جہاد کا بھی بڑا شوق تھا، لیکن جہاد کے سفر میں بھی روزہ رکھتے تھے، کسی نے کہا کہ ''سفر میں روزہ رکھنے سے آپ بہت کمزور ہو جائیں گے۔'' جواب میں آپ نے فرمایا: ''وہی گھوڑے منزل کو پہنچتے ہیں جو چل چل کر دبلے ہو گئے ہوں۔''

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''الحمد اللہ! میں نے قضائے حاجت اور اہلیہ کے ساتھ خلوت کے سوا کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے بارے میں مجھے یہ فکر ہو کہ کہیں کوئی دوسرا نہ دیکھ لے۔

حضرت ابو مسلمؒ غلاموں کو بھی بہت آزاد کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کے پاس صرف ایک کنیز رہ گئی تھی، ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، آپ نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ''آپ کے بیٹے نے مارا ہے۔'' آپ نے بیٹے کو بلایا اور کنیز سے پوچھا کہ: ''اس نے تمہیں کس طرح مارا تھا؟'' کنیز نے کہا ''تھپڑ مارا تھا۔'' آپ نے فرمایا: ''تم بھی اس کو تھپڑ لگاؤ۔'' کنیز بولی: ''میں اپنے آقا کو نہیں مار سکتی۔'' حضرت ابو مسلمؒ نے پوچھا: ''کیا تم نے اسے معاف کر دیا؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں''! آپ نے فرمایا: ''دو گواہوں کے سامنے اقرار کرو۔'' جب دو گواہ آ گئے، اور کنیز نے اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا: ''میں بھی ان گواہوں کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ یہ کنیز اللہ کی رضا جوئی کے لئے آزاد ہے۔'' لوگوں نے کہا کہ آپ نے صرف ایک تھپڑ کی وجہ سے کنیز کو آزاد کر دیا۔ جبکہ آپ کے پاس کوئی دوسری خدمت گار موجود نہیں ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''چھوڑو بھی، کاش! کہ برابر سرابر چھوٹ جائیں، نہ کسی کا حق ہم پر ہو نہ ہمارا کسی پر۔''[2]

عمر کے آخری حصے میں آپ شام میں مقیم ہو گئے تھے، مستقل قیام یہیں داریا کی بستی میں تھا، لیکن اکثر جامع مسجد کی فضیلت کی خاطر نماز پڑھنے دمشق جایا کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ

[1] ابن عساکر، حوالہ مذکورہ

[2] ایضاً ص ۳۱۹

www.freepdfpost.blogspot.com

خلافت کا زمانہ تھا۔ آپ اکثر ان کے پاس پہنچ جاتے اور انہیں نصیحت بھی فرماتے اور بعض اوقات بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ بھی، لیکن حضرت معاویہؓ ان کی ہر بات کی بیحد قدر فرماتے تھے اور لوگوں سے کہہ کر رکھا تھا کہ ''یہ جو کچھ کہیں انہیں نو کا مت کرو''

چونکہ آپ کا قیام داریا میں تھا، اس لئے ایک روایت یہ ہے آپ کی قبر یہیں پر ہے اور یہ قبر جو ہمارے سامنے تھی، اسی روایت کے مطابق ہے لیکن ایک دوسری روایت یہ ہے کہ آپ رومیوں سے جہاد کی غرض سے روم کے علاقے میں تشریف لے گئے تھے، وہیں پر آپ کی وفات ہوئی۔[1] واللہ سبحانہ اعلم۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار:

داریا کے اس چھوٹے سے قبرستان سے کچھ دور ایک مکان کے بیرونی چبوترے پر ایک الگ تھلگ قبر بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں یہاں مشہور ہے کہ یہ مشہور اسرائیلی پیغمبر حضرت حزقیل علیہ السلام کی قبر ہے۔ یہ قبر بھی حضرت شعیب اور حضرت یوشع علیہم السلام کی قبروں کی طرح معمول سے بہت لمبی ہے، یہاں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

تاریخی روایت کے مطابق حضرت حزقیل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیسرے خلیفہ تھے، پہلے خلیفہ حضرت یوشع علیہ السلام تھے، دوسرے حضرت کالب بن یوحنا اور تیسرے حضرت حزقیل علیہ السلام موجود بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں ایک صحیفہ آپ ہی طرف منسوب ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا اسم گرامی مذکور نہیں ہے، لیکن قرآن کریم نے سورۃ البقرہ میں ایک واقعہ بیان فرمایا ہے، جس کے بارے میں بعض تفسیری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ ہی سے متعلق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے بزرگوں سے یہ روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت سے فرمایا کہ فلاں

[1] ابن عساکر، حوالہ، مذکورہ، ص ۳۱۹

دشمن سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، تو وہ لوگ موت کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک دور افتادہ وادی میں یہ سمجھ کر مقیم ہو گئے کہ اب ہم موت سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی اور ان پر موت طاری کر دی گئی، وہ سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ایک ہفتے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کا ان پر گذر ہوا تو آپ نے ان کی حالت پر افسوس کا اظہار فرمایا اور دعا مانگی کہ الٰہ العالمین! ان کو موت کے عذاب سے نجات فرما دے، تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عبرت اور بصیرت کا سامان بن جائے۔ آپ کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ لوگ زندہ ہو کر عبرت اور بصیرت کا سامان بنے۔[1] قرآن کریم نے اس واقعے کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

الم ترالی الذین خرجوا من دیار هم و هم الوف حذر الموت فقال لهم الله موتو اثم احیا هم ان الله لذو فضل علی الناس ولٰکن اکثر الناس لایشکرونo

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ، پھر ان کو زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

مزّہ میں:

داریا کے مختلف مقامات سے فارغ ہونے کے بعد ہم واپس دمشق کے لئے روانہ ہوئے، سردیوں کے دن تھے اور نماز ظہر وہاں ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہو رہی تھی۔ اور عصر کی اذان ڈھائی بجے کے قریب، چنانچہ دمشق میں داخل ہونے کے بعد ہم نے ایک جگہ نماز ظہر ادا کی۔ معلوم ہوا کہ اس محلے کا نام مزّہ[2] ہے اب تو یہ دمشق شہر کی کا ایک محلّہ

[1] قصص القرآن ص ۱۹ و ۲۰، ج ۲، بحوالہ ابن کثیر ص ۱۳۴، ج ۲ و روح المعانی ص ۱۳۰، ج ۲

[2] میم کے نیچے زیر ہے اور زّ پر تشدید۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے لیکن ابتدا میں یہ دمشق سے باہر ایک مستقل بستی تھی جو اپنے حسن و جمال اور شادابی کے لئے مشہور تھی۔ علامہ حموی لکھتے ہیں:۔

وهی قرية كبيرة غناء فی وسط بساتين دمشق، بينها و بين دمشق نصف فرسخ۔[1]

یہ دمشق کے باغات کے بیچوں بیچ ایک بستی ہے جو گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور دمشق سے آدھے کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس بستی میں بہت سے علماء پیدا ہوئے جن میں حافظ ابوالحجاج مزّی رحمۃ اللہ علیہ شاید سب سے زیادہ مشہور ہیں جب کی کتاب ''تہذیب الکمال'' صحاحِ ستہ کے اسماء الرجال پر اس وقت سے سے بڑے مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تلخیص کر کے پہلے ''تہذیب التہذیب'' پھر ''تقریب التہذیب'' تحریر فرمائی ہیں۔ انہی کی کتاب 'تحفۃ الأشراف'' اپنے دور میں صحاحِ ستہ کی جامع ترین انڈیکس ہے۔ حافظ مزّیؒ بڑے بڑے مشہور علماء کے استاذ ہیں جن میں علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ذھبیؒ، حافظ سبکیؒ، حافظ برزالیؒ، علامہ ابن سید الناسؒ اور حافظ ابن کثیرؒ جیسے حضرات داخل ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ تو ان کے داماد بھی تھے۔[2]

پھر مزّہ کی بستی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ، کی بستی کہلاتی تھی اور یہیں پر ان کا مزار بھی واقع ہے، چنانچہ بفضلہ تعالیٰ ان کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔

حضرت دحیہ کلبیؓ:

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ، آنحضرت ﷺ کے ان صحابۂ کرامؓ میں سے تھے جو اپنے حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں حضرت

[1] معجم البلدان للحموی، ص ۱۲۲، ج ۶۔

[2] البدایۃ والنہایۃ ص ۱۹۱ و ۱۹۲، ج ۱۴۔

جبرائیل علیہ السلام کے مشابہ قرار دیا تھا اور حضرت جبریل علیہ السلام جب کبھی انسان کی شکل میں آتے تو عموماً دحیہ کلبیؓ کی صورت اختیار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ حضرت دحیہؓ ایک گھوڑے پر سوار ہیں اور آنحضرت ﷺ اس گھوڑے پر ہاتھ رکھ کر حضرت دحیہؓ سے باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس واقعے کا ذکر آپ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''وہ تو جبرئیلؑ تھے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ آپؓ اتنے حسین و جمیل تھے کہ جب کسی نئے علاقے میں جاتے تو نوجوان لڑکیاں آپ کو دیکھنے کے لئے باہر نکل آیا کرتی تھیں۔[2]

آنحضرت ﷺ نے قیصر روم کو جو تبلیغی مکتوب روانہ فرمایا وہ آپ ہی کے ذریعے روانہ فرمایا تھا۔ اس طرح آپؓ کو آنحضرت ﷺ کا ایلچی بننے کی بھی سعادت حاصل ہے۔ جب آپؓ قیصر کو خط پہنچا کر واپس مدینہ منورہ آئے تو شام سے آنحضرت ﷺ کے لئے کچھ پستہ، کچھ اخروٹ اور کعک[3]، ایک اونی جبہ اور دو چمڑے کے موزے بطور ھدیہ لے کر آئے تھے، آنحضرت ﷺ نے یہ تمام تحفے قبول فرمائے اور موزے تو اتنے پہنے کہ وہ پھٹ گئے۔[4]

حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے پاس مصر کا کچھ باریک سوتی کپڑا آیا جسے قبطیہ کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ایک ٹکڑا حضرت دحیہؓ کو بھی دیا اور فرمایا کہ اس کے دو حصے کر لینا، ایک میں اپنی قمیض بنا لینا اور دوسرا حصہ اپنی اہلیہ کو دے دینا کہ وہ اپنی اوڑھنی بنا لیں۔ حضرت دحیہؓ کپڑا لے کر جانے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں دوبارہ

[1] طبقات ابن سعد ص ۲۵۰، ج ۴ [2] المصباح المضیئ، لابن ابی حدیدہ، ص ۲۶۸، ج ۱

[3] ''کعک'' ایک خاص قسم کے خشک اور گول روٹی ہوتی تھی جس کے بیچ میں حلقے کی طرح خلا ہوتا تھا، شام کی یہ روٹی قدیم زمانے سے مشہور تھی اور بسکٹ یا کیک کی طرح پسند کی جاتی تھی اور لوگ اسے تحفہ میں دیا کرتے تھے۔ (تاج العروس، ص ۱۷۲، ج ۷)

[4] المصباح المضیئ ص ۲۶۸، ج ۱

www.freepdfpost.blogspot.com

بلا کر فرمایا: ''اپنی اہلیہ سے کہنا کہ وہ اس کے پیچھے کوئی استر لگالیں، تاکہ کپڑے سے جسم نہ جھلکے۔[1]

ان تمام واقعات سے آپ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی جس خصوصی شفقت کا پتہ چلتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

آپ غزوۂ بدر کے بعد تقریباً ہر جہاد میں شامل رہے، یرموک کے معرکے میں بھی شریک تھے، بعد میں مزّہ، میں قیام اختیار فرمالیا تھا اور وہیں پر وفات پائی۔

علماء کا اجتماع:

مزّہ سے ہم واپس اپنے ہوٹل آگئے۔ شام کو مجھے بعض کتب خانوں میں جانا تھا، چنانچہ عشاء تک میں مختلف کتب خانوں میں مصروف رہا۔ رات کو توحید صاحب (قونصل جنرل پاکستان) نے اپنے مکان میں احقر سے ملاقات کرانے کے لئے دمشق کے معروف علماء کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ عشاء کے بعد ہم وہاں چلے گئے۔ جو اہل علم وہاں موجود تھے ان میں شیخ سعید رمضان البوطی، ڈاکٹر فتحی الدرینی، شیخ ابراہیم السلقینی، شیخ نورالدین عتر ڈاکٹر مصطفیٰ الزحیلی (جو ڈاکٹر وھبہ الزحیلی کے بھائی ہیں) شیخ عبد اللطیف الفرفور وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ توحید صاحب نے (جو ماشاء اللہ دینی جذبے کے حامل افسر ہیں) یہاں کے تمام اہل علم سے بڑا اچھا رابطہ پیدا کیا ہوا ہے، ہمارے تمام بیرونی سفارت خانوں میں ایسے جذبات کے افسران پہنچ جائیں تو وہ عام شکایت دور ہو جائے جو ہمارے سفارت خانوں کے بارے میں زباں زد ہو چکی ہے۔

بہر کیف! یہ بڑا پر لطف اجتماع رہا، اس میں بہت سے علمی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی یہ سب حضرات پاکستان کے حالات سننے، بالخصوص یہاں نفاذ شریعت کی کوششوں کا حال معلوم کرنے کے بیحد مشتاق تھے، چنانچہ احقر نے مختصر قیام پاکستان کا پس منظر، نفاذ شریعت کے لئے علماء کی جدوجہد اور اس کے نتائج کے روشن اور تاریک پہلو ان حضرات کے سامنے

[1] ابن عساکر ص ۲۱۹ ج ۵ بحوالہ ابوداؤد۔

بیان کئے جنہیں انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا، اور اس تأثر کا اظہار تقریباً ہر شخص نے کیا کہ ہم سب کی نگاہیں پاکستان پر لگی رہتی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہی ایک ایسا ملک ہے جو نفاذ شریعت کی مثال قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے..... کاش کہ ہم پاکستان کے باشندے باہر کے مسلمانوں کے ان جذبات کا پاس کر سکتے، کاش کہ ہمارے پاس ان کے لئے یہ جواب ہوتا کہ انشاء اللہ اہل پاکستان آپ کی ان امیدوں پر پورے اُتریں گے۔ کاش کہ ہم ان سے یہ کہنے کے قابل ہوتے کہ علم اسلام جس روز سعید کے انتظار میں ہے اس کی صبح پاکستان میں طلوع ہو رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف تمناؤں سے تلخ حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایسے سوالات کے جواب میں روشن پہلوؤں کے ساتھ تلخ حقائق بھی بیان کرنے ہی پڑتے ہیں اور خدا جانے کب تک بیان کرنے پڑیں گے۔

شام کی حالت دینی اعتبار سے جیسی کچھ ہے، وہ بھی کو معلوم ہے، اس کا بھی تذکرہ آیا، لیکن یہ حضرات اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں اور پاکستان کے موجودہ حالات کو بھی اپنے ملک کے لحاظ سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شام کے دینی حلقوں کو اس آزمائش سے بعافیت رہائی عطا فرمائیں، آمین۔

عشاء کے بعد سے رات ساڑھے گیارہ بجے تک یہ مجلس جاری رہی۔ اس کے بعد ہوٹل واپس آئے۔

دمشق کا عجائب گھر:

اگلا دن دمشق میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا، صبح ناشتے کے فوراً بعد ہم نے دمشق کے عجائب گھر جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ یہ عجائب گھر ہوٹل کے قریب ہی واقع تھا، اس لئے پیدل ہی روانہ ہوئے۔ وکٹوریہ کی مرکزی شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک گلی سے گذر ہوا۔ یہ گلی اس وقت ہاتھ کے بنے ہوئے فرنیچر اور دستکاری کا مرکز ہے۔ اسی گلی کے بیچ میں ایک تُرکی دور کی بنی ہوئی قدیم عمارت ہے۔ معلوم ہوا کہ تُرکی خلافت کے دور میں یہ ایک بڑا مدرسہ تھا، عمارت اگرچہ پرانی ہو چکی ہے، لیکن اس کا حسن اور شکوہ ابھی تک

www.freepdfpost.blogspot.com

برقرار ہے، اس کے صدر دروازے سے داخل ہوں تو سامنے ایک وسیع صحن ہے اور اس کے دونوں طرف برآمدے اور برآمدے کے اندر کمروں کی قطاریں ہیں، انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمرے طلبہ کی رہائش کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔ پھر صحن کو عبور کر کے کئی بڑے بڑے ہال ہیں جو شاید درس گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔

آج یہ عمارت ویران پڑی ہے، کسی کسی کمرے میں فرنیچر والوں نے اپنا گودام بنا رکھا ہے، لیکن اس کے در و دیوار سے علم کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے، خدا جانے یہاں کتنے عرصے تک کیسے کیسے اہل علم کے فیوض جاری رہے ہیں، لیکن آج کوئی اس مدرسے کا نام اور اس کی تاریخ بتانے والا بھی موجود نہیں ہے۔ ماَ عند کم ینفدو ما عند اللہ باق.

اس مدرسے سے نکل کر ہم مرکزی سڑک کے کنارے پر آ گئے، قریب ہی عجائب گھر کی شاندار عمارت تھی۔ خیال یہ تھا کہ دمشق انتہائی قدیم شہر ہے، لہٰذا یہاں کا عجائب گھر یقیناً قدیم تاریخی اشیاء سے مالا مال ہوگا۔ لیکن اندر جا کر اندازہ ہوا کہ یہ عام شہروں کے روایتی عجائب گھروں سے مختلف نہیں ہے، بنو امیہ کے بعض خلفاء عبدالملک بن مروان اور ھشام بن عبد الملک) کی زرہوں اور تلواروں کے سوا یہاں کوئی خاص دلچسپی کی چیز موجود نہیں تھی۔ عجائب گھر زیادہ تر بازنطینی دور کی یادگاروں سے بھرا ہوا تھا جن سے ہمیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اس روز دوپہر کو ہمارے دوست شیخ عبداللطیف افرفور صاحب نے دوپہر کے کھانے پر ہمیں مدعو کیا ہوا تھا اور دس بجے کے قریب ہی اپنے ایک شاگرد کو ہمارے پاس بھیج دیا تھا، تاکہ وہ شہر کے کاموں میں ہماری مدد بھی کریں اور بعد میں ہمیں کھانے کی جگہ پر بھی لے جائیں۔

حضرت معاویہؓ کے مزار پر:

چنانچہ ان کی معیت میں پہلے ہم نے جامع دمشق اور سوق الحمیدیۃ کے آس پاس کچھ خریداری کی۔ شام کی قدیم طرز کی مٹھائیاں یہاں کی خاص چیز ہیں، جو خشک میوے سے مختلف طریقوں سے بنائی جاتی ہیں، وہ لی گئیں۔ اسی دوران ہمارے رہنما نے بتایا کہ حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ کا مزار بھی اسی علاقے میں ایک مکان کے اندر واقع ہے، چنانچہ وہ ہمیں کئی پیچ در پیچ گلیوں سے گذارتے ہوئے ایک پرانے طرز کے بوسیدہ مکان کے پاس لے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا ہمارے رہنما نے ان سے کہا کہ پاکستان سے کچھ لوگ آئے ہیں، اور مزار کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن خاتون نے جواب دیا کہ اس کے لئے محکمۂ اوقاف سے اجازت نامہ لانا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ اس مزار کو حکومت نے عام زیارت کے لئے بند کر رکھا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض روافض یہاں آ کر شرارت اور مزار کی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لہٰذا محکمۂ اوقاف نے یہ پابندی لگا دی ہے کہ اجازت نامے کے بغیر کسی کو اندر نہ بھیجا جائے۔

لیکن ہمارے ساتھ پاکستانی سفارت خانے کے عنایت صاحب بھی تھے انہوں نے اور ہمارے رہنما نے مل کر خاتون کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور احقر کا تعارف کرایا، اس پر خاتون نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

یہ ایک پرانے طرز کا مکان تھا جس کے لمبوترے صحن سے گذر کر ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا جس میں چند قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک قبر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھی بتائی جاتی ہے۔ یہاں سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا سیاسی موقف چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تھا، اور جمہور اہل سنت کے نزدیک حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ اس لئے ان کے مخالفین بالخصوص روافض کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کا موقع مل گیا اور ان کے خلاف الزامات و اتہامات کا ایک طومار لگا دیا گیا جس میں ان کے فضائل و مناقب چھپ کر رہ گئے۔ ورنہ وہ ایک جلیل القدر صحابی، کاتب وحی اور ایسے اوصاف حمیدہ کے مالک تھے کہ آج ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے جب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا کہ ''حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیزؒ۔'' تو آپ نے جواب دیا کہ: ''حضرت معاویہؓ کی ناک کی خاک بھی عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔'' احقر نے ان کے خلاف لگائے گئے الزامات

www.freepdfpost.blogspot.com

پر اپنی کتاب ''حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق'' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور میرے برادر زادہ عزیز وگرامی مولانا محمود اشرف عثمانی نے حضرت معاویہؓ کی سیرت اور مناقب پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے جو اسی کتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ:

دمشق کے قیام میں جتنے کام پیش نظر تھے، بحمد اللہ وہ تقریباً سب پورے ہو چکے تھے، البتہ ایک خواہش ابھی باقی تھی۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ سے ہم طالب علموں کا تعلق خاطر محتاج بیان نہیں ہوسکتا۔ ان کی کتاب ''ردّ المحتار'' اس وقت حنفی مفتیوں کا سب سے بڑا ماخذ ہے جس سے دن رات استفادہ کی نوبت آتی رہتی ہے، خواہش تھی کہ ان کے مزار پر بھی حاضری ہو، لیکن عنایت صاحب جواب تک ہماری رہنمائی کرتے رہے تھے، ان کے مزار کے محل وقوع سے واقف نہ تھے۔ اب شیخ فرفور کے یہ شاگرد جو آج میسر آئے، انہوں نے بتایا کہ وہ مزار سے واقف ہیں۔

چنانچہ سوق الحمیدیہ سے ہم ایک مرتبہ پھر ''الباب الصغیر'' کے قبرستان کی طرف گئے، وہاں قبرستان کے مرکزی دروازے کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا ہے جس کا دروازہ بھی الگ ہے اس میں علامہ شامیؒ اور ان کے اہل خاندان آرام فرما ہیں۔

سب سے پہلے علامہ شامیؒ کے مزار پر حاضری ہوئی اور محبت وعقیدت کے جذبات کے ساتھ سلام عرض کرنے اور ایصال ثواب کا موقع ملا۔

علامہ شامیؒ کا نام امین ابن عابدینؒ ہے اور ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد تاجر تھے، اور بچپن میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، حفظ کے بعد والدین نے ان کو تجارت کی تربیت کے لئے دکان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ یہ وہاں بیٹھ کر بلند آواز سے تلاوت کرتے رہتے تھے۔ ایک دن بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے کہ ایک اجنبی وہاں سے گذرے، انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے کہا کہ تمہارا اس طرح پڑھنا دو وجہ سے جائز نہیں ہے، اوّل تو اس لئے کہ یہ بازار ہے اور لوگ یہاں آپ کی تلاوت نہیں سن سکتے اور آپ کی وجہ سے

گناہگار ہوں گے جس کا گناہ آپ کو ہوگا، اور دوسرے اس لئے کہ آپ کی تلاوت میں غلطیاں کافی ہیں۔

بس علامہ شامیؒ اسی وقت دکان سے اُٹھے اور اپنے زمانے کے شیخ القرأ شیخ سعید الحمویؒ کے پاس پہنچ گئے، اور ان سے قرأت وتجوید سیکھنے کی درخواست کی، انہوں نے پڑھانا منظور فرما لیا اور انہوں نے نابالغی میں ہی قرأت وتجوید کی اہم کتابیں میدانیہ، جزریہ اور شاطبیہ زبانی یاد کر لیں، اور قرأت وتجوید میں ماہر ہو گئے۔

اس واقعے سے علم کا چسکا تو لگ چکا تھا، چنانچہ بعد میں تمام دینی علوم وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے حاصل کئے اور اس کے بعد تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے۔ اور بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں۔ آپ کا خصوصی موضوع فقہ حنفی تھا۔ اس لئے آپ کی زیادہ تر کتابیں فقہ حنفی پر ہیں۔ جن میں سے ''الدر المختار'' کی شرح ''ردالمحتار'' جو فتاویٰ شامی کے نام سے مشہور ہے، سب سے زیادہ جامع اور مفصل کتاب ہے اور بارہویں صدی ہجری کے بعد تو حنفی مسلک کے مفتیوں کا سب سے بڑا ماخذ بن گئی، اس لئے کہ فقہ حنفی کی تنقیح وتحقیق میں یہ کتاب بے نظیر ہے، اور اس میں علامہ شامیؒ نے ایک ایک مسئلے کی تحقیق میں بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی فرمائی ہے، اور محض متاخرین کی نقل پر اعتماد کرنے کے بجائے اصل مأخذ کی طرف رجوع کر کے ہر مسئلے کی تحقیق کی ہے۔

فقہ وفتویٰ میں تو علامہ شامیؒ اپنے دور کے شاید سب سے بڑے مرجع تھے ہی، عبادات وطاعات اور حسن اخلاق میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے، رمضان شریف میں ہر رات ایک قرآن کریم ختم کرنے کا معمول تھا۔ اپنی تجارت اپنے ایک شریک کے سپرد کر رکھی تھی، وہی آپ کا ذریعہ آمدنی تھا، اور خود علمی اور عملی کاموں میں مصروف رہتے تھے، صدقات وخیرات میں بہت حصہ لیتے رہتے تھے۔ آپ کے علمی رُعب سے حکامِ وقت بھی متاثر تھے، اگر کوئی قاضی خلافِ شرع فیصلہ کر دیتا اور علامہ شامیؒ اپنے فتوے میں اس فیصلے کو خلافِ شرع قرار دے دیتے تو قاضی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑتا تھا۔

علامہ شامیؒ نے کل چوّن سال عمر پائی، اور ۱۲۵۲ھ میں وفات ہوئی۔ وفات سے تقریباً

www.freepdfpost.blogspot.com

بیس دن پہلے انہوں نے اپنی قبر کی جگہ خود منتخب کر لی تھی، کیونکہ اس جگہ ''درمختار'' کے مؤلف علامہ حصکفیؒ مدفون تھے۔ علامہ شامیؒ انہی کے قریب دفن ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق وہیں پر آپ کو دفن کیا گیا۔

آپ کی والدہ آپ کی وفات کے وقت زندہ تھیں، اور دو سال مزید زندہ رہیں۔ وہ نہایت خدا رسیدہ خاتون تھیں، جن کا سلسلۂ نسب مشہور محدث علامہ داؤدیؒ سے ملتا ہے۔ اپنے لائق بیٹے کے انتقال پر عام عورتوں کی طرح انہوں نے جزع فزع بالکل نہیں کیا، لیکن جب تک زندہ رہیں، ہر ہفتے ایک لاکھ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنے محبوب بیٹے کو ایصالِ ثواب کرتی رہیں۔[1]

علامہ شامیؒ کے پوتے مفتی ابوالیُسر ابھی چند سال پہلے تک حیات تھے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ جب دمشق تشریف لے گئے تھے تو ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔

علامہ شامیؒ کے برابر میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' کے مصنف علامہ محمد علاء الدین حصکفی[2] رحمہ اللہ کا مزار ہے جن کی کتاب کی شرح علامہ شامی نے فرمائی ہے، ان کی وفات ۱۰۸۸ھ میں ہوئی تھی۔

انہی کے قریب علامہ شامیؒ کے فاضل صاحبزادے علامہ علاء الدین ابن عابدینؒ کا مزار ہے۔ جو فقہ حنفی میں اپنے والد کے صحیح وارث تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی کتاب ''ردالمحتار'' کا تکملہ بھی لکھا ہے، اور ترکی کی خلافتِ عثمانیہ نے جب عدالتوں کیلئے فقہ حنفی کی بنیاد پر اسلامی قانون کی تدوین کا کام شروع کیا تو علامہ علاء الدین کی سرکردگی میں اس غرض کے لئے علماء کی ایک جماعت بنائی تھی جس نے یہ قانون ''مجلۃ الاحکام العدلیۃ'' کے نام سے مدون کیا، یہ قانون نہ صرف ترکی، بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں میں سالہا سال

[1] علامہ شامیؒ کے یہ تمام حالات ان کے صاحبزادے علامہ علاء الدینؒ نے تکملہ ردالمحتار کے شروع میں بیان فرمائے ہیں۔

[2] یہ ''حصن کیفا'' کی طرف نسبت ہے۔

نافذ رہا۔ کویت اور اردن وغیرہ میں چند سال پہلے تک دیوانی قانون کے طور پر یہی ''مجلۃ'' نافذ تھا۔

علامہ علاء الدین طرابلس (لبنان) کے قاضی بھی رہے، اور دمشق کی مجلس المعارف کے صدر بھی۔ ان کی تالیفات میں نور الایضاح کی ایک شرح معراج النجاح بھی داخل ہے۔[1]

ان تینوں بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم شیخ عبداللطیف الفرفور کے یہاں کھانے پر حاضر ہوئے۔ عرب ممالک میں اہل شام کا ذوق کھانوں کے معاملے میں سب سے بہتر ہے، اور یہاں کے کھانے پورے عرب ممالک میں مشہور اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ فرفور نے شامی کھانوں کا بہترین انتخاب جمع کیا ہوا تھا۔ یہاں کھانے کی محفل بھی بڑی دلچسپ رہی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے عصر ہوگئی اور عصر کے بعد ہم ہوٹل پہنچے۔

ہوٹل پہنچے تو جامعۃ دمشق کے اساتذہ میں سے شیخ نورالدین عتر اور شیخ ابراہیم السلقینی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ الوداعی ملاقات کیلئے تشریف لائے تھے، اور دونوں حضرات اپنی بعض تصانیف بطورِ ہدیہ بھی لے کر آئے تھے۔ مغرب تک ان کے ساتھ گفتگو رہی۔

میں نے رات بارہ بجے دمشق سے کراچی کیلئے ہوائی جہاز کی نشست مخصوص کرا رکھی تھی، دوسرے رفقاء (قاری بشیر احمد صاحب، مولوی امین اشرف صاحب اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب) کو واپس بذریعہ کار مدینہ طیبہ جانا تھا۔ لیکن عشاء کے بعد معلوم ہوا کہ جہاز لیٹ ہے اور متعین وقت رات گئے تک معلوم نہ ہوسکا۔ اس دوران پاکستانی سفارت خانے کے ڈیفنس اٹاچی جو ہمارے دورانِ قیام کام سے دمشق گئے ہوئے تھے۔ واپس آگئے اور ہوٹل ملنے کیلئے تشریف لائے اور بڑے اصرار سے رات کے کھانے کیلئے اپنے گھر لے گئے، وہاں توحید صاحب بھی موجود تھے، رات کے گیارہ بجے وہاں

[1] الاعلام للزرکلی ص ۱۵۲، ج ۷

www.freepdfpost.blogspot.com

سے واپسی ہوئی، بارہ بجے کے قریب پتہ چلا کہ جہاز صبح ۵ بجے جائے گا۔ چنانچہ وہ رات تقریباً جاگتے ہی گذری۔ صبح ۲/۱ ۳ بجے کے قریب عنایت صاحب لینے کیلئے آگئے، اور ہم دمشق ایئرپورٹ پہنچے، صبح ہوتے جہاز روانہ ہوا، اور عمان کے راستے تقریباً ۵ گھنٹے میں الحمدللہ بخیر وعافیت وطن واپسی ہوگئی۔

مجموعی تاثر:

جبل اُحد سے جبل قاسیون تک کا یہ سفر میرے انتہائی یادگار سفروں میں سے ہے جس کا ہر مرحلہ دلچسپ، مفید اور بابرکت ثابت ہوا، اور جس کے ذریعے انبیاءؑ وصحابہؓ کی اس سرزمین کی زیارت کا شوق پورا ہوا۔

شام علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کا اہم ترین خطہ رہا ہے، یہاں علم اور دین کی روایات اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم اور باقی رہی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا حُسنِ اخلاق اسلامی اخلاق کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، ان کی ہر بات میں لطافت ونظافت اور دلکشی تھی۔ یہاں تک کہ استعمار کے دنوں میں بھی شام کی یہ روایات بڑی حد تک باقی ہیں، لیکن جب سے یہاں بعث پارٹی کی..... اور بالخصوص حافظ الأسد کی..... حکومت آئی، اس نے یہاں کے دینی حلقوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا۔ حافظ الأسد عقیدۃً نُصیری ہیں جو روافض کا انتہائی غالی فرقہ ہے، اور سیاسی ومعاشی نظریات میں کمیونزم کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ اس حکومت نے پورے ملک کو ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل کرکے یہاں کے نہایت مقتدر علماء اور مسلمان زعماء کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اور آج شام کی بہت سی اہم شخصیتیں مسلمان ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہیں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد حکومت کو دینی حلقوں کا صفایا کرنے کیلئے ایک دورہ سا پڑتا ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل یا بدترین اذیتوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ حمّی کے شہر میں علماء کا جس طرح قتل عام ہوا، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

ان حالات میں جبکہ سالہا سال سے دینی حلقوں کے گلے گھٹے ہوئے ہیں، اور معاند اسلام قوتیں پوری طاقت سے سرگرمِ عمل ہیں، یہاں کی عام دینی فضا کو بہت متاثر ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ اسلام ہی کا معجزہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دلوں سے ایمان کو کھرچا نہیں جاسکا، اب بھی ماشاءاللہ مسجدیں آباد نظر آتی ہیں، لوگوں میں نماز وروزے ہی کا نہیں، دین کی باتیں سننے اور دینی حلقوں میں بیٹھنے کا ذوق خاصا ہے، حکومت کی طرف سے عورتوں کے ڈوپٹے زبردستی اُتارنے کی تحریک شروع کی گئی، لیکن بڑی حد تک ناکام رہی، اب بھی دمشق کی سڑکوں پر صرف دوپٹے ہی نہیں، باقاعدہ روایتی برقعے بھی خاصی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

جو علماء اب شام میں مقیم ہیں، ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ سیاحت سے بالکل الگ ہوکر خالصۃً تعلیم وتبلیغ میں مشغول ہیں، اور ان حالات میں یہی وہ حکمت عملی ہے جس کے ذریعے یہاں مسلمانوں کے دین وایمان کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ قدیم دینی مدارس سب ختم کردیئے گئے، اور باقاعدہ دینی تعلیم صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اسلامی علوم میں حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن اوّل تو ان اداروں میں بعض اساتذہ بڑے متصلّب اور قوی الاستعداد موجود ہیں، دوسرے مختلف علماء نے اپنی مساجد میں یا گھروں پر انفرادی طور سے دینی تعلیم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے، اس لئے اسلامی علوم کا چرچا بالکلیہ ختم نہیں ہوسکا۔ علماء دینی موضوعات پر کتابیں بھی لکھ رہے ہیں، اور وہ بڑی حد تک آزادی سے چھپ رہی ہیں۔

لہٰذا بحیثیت مجموعی حالات افسوسناک ضرور ہیں، مگر مایوس کن نہیں، باطل کی زور زبردستی ایک نہ ایک دن انشاءاللہ ختم ہوگی، اور عالم اسلام کا یہ جنت نظیر حصہ انشاءاللہ پھر سے اپنی گمشدہ آب وتاب حاصل کرے گا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سُلطان محمّد فاتح
کے شہر میں

(استنبول، ترکی)

رجب ۱۴۰۶ھ مارچ ۱۹۸۶ء

www.freepdfpost.blogspot.com

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیٔ اُمت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صُورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہَوا
تُربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مُسلماں! ملتِ اسلام کا دِل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

(۴)

سُلطان محمّد فاتح
کے شہر میں

مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ترکی کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی بھی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں، ترکوں کی شجاعت کی داستانیں ہماری تاریخ کا وہ سنہرا باب ہیں جن پر ہر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ علاقہ صدیوں تک پورے عالم اسلام کا پایۂ تخت اور اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے علماء، فقہاء اور اولیاء و صوفیاء نے آنے والوں کیلئے اپنے نقوشِ زندگی کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔

کم از کم میرا معاملہ تو یہ رہا ہے، اور شاید دوسرے مسلمانوں کا بھی ہوگا کہ ترکی اور اس کی خلافت کا نام آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کے جذبات اُمڈ آتے ہیں، نہ صرف اس لئے کہ ترکی خلافت کی اسلام کے ساتھ شغف کی تاریخ بڑی تابناک ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ آخر کے گئے گذرے دور میں بھی ترکی خلافت مسلمانوں کے اس مرکز وحدت کا کام کر رہی تھی جس نے ساری دنیا کے مسلمانوں کا شیرازہ کسی نہ کسی حد تک مجتمع کر رکھا تھا، اور اس خلافت کا اِلغاء ہمارے موجودہ سیاسی انحطاط کا نقطۂ آغاز تھا جس کے بعد ابھی تک اُمتِ مسلمہ پنپ نہیں سکی۔ اقبالؔ مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

لہٰذا ترکی کے ساتھ ایک قلبی وابستگی شروع سے تھی، اور طبعی طور پر اُسے دیکھنے کی آرزو بھی۔ لیکن کبھی وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ میں ایک روز میں دارالعلوم کی دورۂ حدیث کی درسگاہ میں جامع ترمذیؒ کا درس دے رہا تھا کہ ایک ڈاکیہ نے ایک تار مجھے پہنچایا۔ یہ تار مسلم ممالک کی تنظیم منظمة المؤتمر الإسلامی (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کے سیکریٹری جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ کے ایک پیغام پر مشتمل تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ لیبیا کی مجلس الدعوۃ الاسلامی اور ترکی کے اسلامی ثقافتی مرکز کے اشتراک سے استنبول میں ''قرآنِ کریم کے تراجم'' کے موضوع پر ایک عالمی مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے، آپ کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

مذاکرے میں شرکت سے زیادہ استنبول دیکھنے کے شوق نے بلاتأمل اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مجمع الفقہ الاسلامی کی ایک ذیلی کمیٹی کا ایک اجلاس جدہ میں ہونے والا تھا جس میں مجھے شرکت کرنی تھی۔ میں نے وہیں سے ترکی جانے کا پروگرام بنالیا۔

جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی کے اجلاس سے فارغ ہو کر میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا، اور تین دن وہاں قیام کرنے کے بعد ۸/رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹/مارچ ۱۹۸۶ء کو مغرب کے بعد جدہ کے لئے روانہ ہوا، رات جدہ میں گذاری۔ اور صبح ۷ بجے ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہو گیا۔

۹/رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۰/مارچ کو نو بجے سعودی ایئرلائنز کے طیارے میں سوار ہوا جو ایتھنز کے راستے استنبول جا رہا تھا۔ یہ پوری پرواز تقریباً چھ سات گھنٹے کی تھی، جہاز بحرِ احمر کو عبور کر کے مصر میں داخل ہوا، جہاز کی بلندی سے نہرِ سویز کا منظر بڑا حسین تھا، پھر قاہرہ شہر پر بھی پرواز ہوئی جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا، اور اس کے مغربی سرے پر تینوں اہرامِ مصر بچوں کے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ قاہرہ اور اہرامِ مصر کا تذکرہ میں مصر کے سفرنامے میں کر چکا ہوں۔

ایتھنز:

تقریباً ۴½ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز یونان کے دارالحکومت ایتھنز (ATHENS)

کے ہوائی اڈے پر اُترا جسے عربی میں ''اثینا'' کہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا قدیم شہر ہے، اور زمانۂ ماقبل تاریخ سے آباد چلا آتا ہے، یہ یونانی فلسفے اور فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں یکے بعد دیگرے یونانی، رومی، بازنطینی اور لاطینی شہنشاہیاں قائم رہی ہیں، اور پندرہویں صدی عیسویں میں اسے مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا، جن کی حکومت یہاں تقریباً چار سو سال رہی۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے سے نکلا، اور یونان کی جدید بادشاہت قائم ہوئی، کچھ عرصہ یہ جرمنی کے زیرنگیں بھی رہا، اور اب یہاں ''جمہوریۂ یونان'' کے نام سے ایک مستقل حکومت قائم ہے۔ لیکن مقامِ حسرت یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے تقریباً چار سو سال حکومت کی، وہاں آج پورے شہر میں ایک بھی باقاعدہ مسجد موجود نہیں ہے، سنا ہے کہ کسی ہوٹل میں ایک نمازگاہ بنائی گئی ہے۔

میں ایک مرتبہ پہلے بھی امریکہ سے واپسی میں اس ایئرپورٹ سے گذرا ہوں، اندر جانے کا تو اتفاق نہیں ہوا، لیکن دونوں مرتبہ جہاز نے پورے شہر کا اوپر ہی سے تفصیلی نظارہ کرا دیا، پہلی بار جب میں نے جہاز سے اس شہر کو دیکھا تھا تو اس کا یہ تاثر آج تک ذہن پر باقی ہے، کہ شہر کی تمام عمارتیں سفید ہیں، مجھے اُس وقت کوئی بھی عمارت کسی دوسرے رنگ کی نظر نہیں آئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے منتظمین نے پورے شہر کو سفید رکھنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اور اس اہتمام سے شہر میں ایک اچھوتا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ دیکھا تو بہت سی عمارتیں دوسرے رنگوں میں بھی نظر آئیں، اور اب وہ اہتمام باقی نہیں رہا۔

یونان کسی زمانے میں دنیا کا دماغ کہلاتا تھا، دنیا کے وہ بڑے بڑے فلسفی اور سائنسدان جن کی تحقیقات سے آج کی ترقی یافتہ سائنس بھی مستغنی نہیں ہے، یہیں پیدا ہوئے تھے، ارسطو، افلاطون، سقراط اور ان سے بھی پہلے حساب کا مؤجد ارشمیدس، جیومیٹری کا مؤجد اقلیدس، جدید فلکیات کا بانی فیثاغورس سب یہیں کی پیداوار تھے، اور اس وقت یونان کی حدودِ مملکت بھی آج کے مقابلے میں بہت وسیع تھیں، لیکن آج یونان کا دنیا کے علوم وفنون میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے۔

اس دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی تہذیب کبھی ہمیشہ سلامت نہیں رہتی، اسی تماشا گاہ

www.freepdfpost.blogspot.com

میں نہ جانے کتنی کروفر کی تہذیبیں اُبھر چکی ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنے وقت میں د
چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیکن عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد وہ صفحۂ ہستی سے ایسی مٹیں کہ انہ
تاریخ میں تلاش کرنے کیلئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کل من علیھا فان و یبقیٰ و
ربک ذوالجلال والاکرام۔

ایتھنز سے دوبارہ پرواز کرنے کے بعد بمشکل ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ جہاز
کی حدود میں داخل ہوگیا، سامنے سرسبز وشاداب جزیروں اور ان کے ساتھ آنکھ مچولی ک
ہوئی سمندری خلیجوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ جہاز کی بلندی بتدریج کم ہوتی گئی دور
چھوٹے نظر آنے والے جزیرے رفتہ رفتہ پھیلتے گئے، اُن میں چھپی ہوئی قدرتی رعنائ
نمایاں ہونے لگیں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بچھا ہوا مسطح سبز رنگ اب اُبھری
جھاڑیوں اور دیوقامت درختوں میں تبدیل ہونے لگا، اور ان کے درمیان بہتے ہو
آبشار نما چشمے آنکھوں کی رسائی میں آگئے۔ ابھی قلب ونظر اسی حسین منظر میں محو تھے
دیکھتے ہی دیکھتے جہاز استنبول کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔

یہ ایک جدید انداز کا خوبصورت اور فیشن ایبل ایئرپورٹ تھا، جہاز سے اُت
امیگریشن اور کسٹم کے مراحل سے فارغ ہونے میں کچھ وقت لگا، اور جب میں کسٹم سے
نکلا تو نکلتے ہی ایک نوجوان نظر آیا، جو ایک بڑے سے کارڈ پر انگریزی حروف میں میر
لیے کھڑا تھا۔ یہ کانفرنس کے منتظمین کا فرستادہ تھا، اُس نے بڑی محبت اور تپاک
استقبال کیا، اور پھر ہم کار میں سوار ہوکر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔

استنبول کا آدھا حصہ ایشیاء میں اور آدھا حصہ یورپ میں واقع ہے، اور یہ دنیا
واحد شہر ہے جو دو بڑے براعظموں کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ دونوں حصوں کے درم
آبنائے باسفورس بہتی ہے۔ ایئرپورٹ اس کے یورپی حصے میں ہے، اور شہر یہاں
خاصے فاصلے پر ہے۔ کچھ دور تک سرسبز وادیوں سے گذرنے کے بعد شہر کی آبادی شر
ہوگئی، ہمارے قیام کا انتظام شہر کے بالکل آخری سرے پر آبنائے باسفورس کے کنار
''طرابیہ ہوٹل'' میں کیا گیا تھا، چنانچہ وہاں تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ گاڑی شہ

جدید وقدیم علاقوں سے گذرتی رہی، اور بالآخر گنجان آبادی کے علاقے ختم ہونے لگے تو
ایک ایسی سڑک آگئی جس کے دونوں طرف انجیر کے درختوں کی قطاریں تھیں، اور جو
بتدریج سطح سمندر کی طرف جھکتی چلی گئی تھی، یہاں تک کہ آبنائے باسفورس کا پانی نظر آنے
لگا، باسفورس کے یورپی ساحل کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ اس میں تقریباً ہر فرلانگ دو فرلانگ
کے فاصلے پر ہلالی شکل کے کٹاؤ پائے جاتے ہیں، جن میں سمندر کا پانی داخل ہوکر چھوٹی
چھوٹی خلیجوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ ان خلیجوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پڑی رہتی ہیں، جو
تفریحی کشتی رانی کے علاوہ شہر کے ایشیائی حصے تک جانے کیلئے بھی استعمال ہوتی ہیں، ایک
ایسی ہی خلیج (خلیج طرابیہ) کے بائیں بازو پر طرابیہ ہوٹل واقع تھا۔ جو یہاں کا مشہور
فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔

جس کمرے میں میرا قیام ہوا اس کی مشرقی دیوار شیشے کی تھی، جہاں سے آبنائے
باسفورس کا نیلگوں سمندر اور اس کے پس منظر میں ایشیائی کنارے کی سبز پوش پہاڑیاں ہر
وقت نظروں کے سامنے تھیں۔۔۔ ایک ایسا ناقابل فراموش حسین منظر جس کی یاد ذہن پر
نقش ہوکر رہ گئی ہے۔

نمازِ عصر کے بعد میں نے چاہا کہ ہوٹل سے نیچے اُتر پر باسفورس کے کنارے کچھ چہل
قدمی کرلی جائے۔ لیکن جب ہوٹل سے باہر نکلا تو شدید برفانی ہوا کے تھپیڑوں نے استقبال
کیا، یہ مارچ کا مہینہ تھا، پاکستان اور سعودی عرب میں اچھی خاصی گرمی تھی جہاں ٹھنڈی
شیروانی بھی بار معلوم ہورہی تھی، اس لئے اتفاق سے میں نے گرم کپڑے اپنے ساتھ نہیں
رکھے تھے، ایک ہلکی سی ٹھنڈی شیروانی کے سوا سردی سے بچاؤ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا، یہ
اندازہ ہی نہ تھا کہ مارچ میں بھی یہاں اتنی سردی ہوگی، ہمت کرکے سمندر کے کنارے
پچاس ساٹھ گز چلا ہوں گا کہ برفانی ہوا نے مزید آگے بڑھنا ناممکن بنادیا، یہاں تک کہ
واپسی کے پچاس ساٹھ گز بھی بمشکل قطع ہوسکے۔ اندازہ ہوا کہ یہاں گرم کپڑوں کے بغیر
گزارہ ممکن نہیں، اور جب تک ان کا انتظام نہ ہو، کمرے کے اندر رہنے میں عافیت ہے، چنانچہ
ہ رات میں نے ہوٹل ہی میں گذاری اور مذاکرے کے دوسرے شرکاء سے ملاقات اور فون

www.freepdfpost.blogspot.com

پر بعض احباب سے گفتگو پر اکتفا کیا۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور اس دن استنبول کے بہت سے تاریخی مقامات کی سیاحت کا مو
ملا، لیکن ان مقامات کے تذکرے کے لئے پہلے استنبول کا مختصر تعارف اور اس کی تاریخ
ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر قارئین اس تذکرے
ٹھیک ٹھیک لطف اندوز نہیں ہوسکیں گے۔

استنبول شہر کا تعارف:

استنبول اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی تہہ در تہہ تاریخ کے لحاظ سے دنیا کا ایک منف
شہر ہے، جو بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس شہر کے نام بھی مختلف زمانوں
بدلتے رہے ہیں، اور شاید دنیا کے کسی اور شہر کے نام نہ رہے ہوں جتنے اس شہر کے ر
ہیں، شاید اس کا سب سے قدیم نام زارغراد تھا، پھر میکلا غارد (Myclagard) ہو
یونانی اور رومی دور کی ابتداء میں اسے بیزنطیہ (Byzantia) کہا گیا، پھر جب تیسر
صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اس کا نام قسطنط
(Constantinople) ہوگیا۔ اسی کو "روم جدید" بھی کہتے تھے، اور عربی تواریخ
اسی کو "مدینۃ الروم" بھی کہا جاتا ہے۔ بازنطینی لوگ اسے "ھی پولس" (He Polis)
کہتے تھے جس کے معنی "شہر" کے ہیں، اور غالباً "مدینۃ الروم" اسی کا ترجمہ تھا۔ جب یہ
مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو بعض لوگ اُسے "استانبول" کہنے لگے، جسے مسلمانوں
بدل کر "اسلامبول" بنادیا، اور خلافتِ عثمانیہ کے بعض کاغذات پر "اسلامبول" بھی لکھا گ
لیکن باقاعدہ سرکاری نام قسطنطنیہ ہی رہا۔ خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں ا
"الآستانۃ"، "دارالسعادۃ" اور "الباب العالی" کے نام بھی دیئے گئے۔ یہاں تک
جب خلافت ختم ہوئی تو ۱۹۳۰ء میں اس کا باقاعدہ سرکاری نام "استنبول" ہوگیا، اور اب یہ
اسی نام سے معروف ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس شہر کو جو اہمیت حاصل رہی ہے، کہا جاتا ہے روم ا

ایتھنز کے سوا کوئی دوسرا شہر اس میں استنبول کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ یہ شہر گیارہ سو سال تک سلطنتِ روما کا پایۂ تخت رہا ہے جو اپنے عہدِ عروج میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی تھی، اور اس کی تہذیب دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ عیسائیوں کے مشرقی کلیسا کا مرکزی شہر بھی یہی تھا، جس کے سربراہ کو بطریرک (Patriarch) کہا جاتا تھا، لہٰذا عیسائی مذہب کی تاریخ میں بھی اس کو بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ سلطنتِ روما کے زوال کے بعد جب یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو خلافتِ عثمانیہ کا دارالحکومت بھی یہی بنا، اور تقریباً پانچ سو سال تک اسے پورے عالم اسلام میں مرکزیت کا مقام حاصل رہا۔

قسطنطنیہ پر حملے:

جب سے رومی بادشاہ قسطنطین نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کرکے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، اُس وقت سے اس کا نام "قسطنطنیہ" ہوگیا تھا، اور یہ بیک وقت بازنطینی سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا، اور اس کی یہی اہمیت تھی جس کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے اس شہر پر جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ اُمِ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی رضاعی رشتہ دار تھیں، ایک روز آپ ﷺ اُن کے گھر میں دوپہر کے وقت سوئے ہوئے تھے کہ اچانک بیدار ہوئے تو آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تبسم تھا، حضرت اُمِ حرامؓ نے تبسم کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خواب میں مجھے اپنی اُمت کے لوگ دکھائے گئے جو جہاد کے لئے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔" حضرت اُمِ حرامؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! دعا فرمادیجئے کہ اللہ تالی مجھے بھی شامل فرمالے۔" آپ ﷺ نے دعا فرمادی، اور دوبارہ محوِ خواب ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر بیدار ہوئے تو دوبارہ چہرۂ مبارک تبسم سے کھلا ہوا تھا، حضرت اُمِ حرامؓ نے دوبارہ وجہ پوچھی

www.freepdfpost.blogspot.com

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا، اس کی مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔" حضرت اُمِ حرامؓ نے دوبارہ دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ اس لشکر میں مجھے بھی شامل فرمالے۔ لیکن اس مرتبہ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ "نہیں! تم پہلے لشکر میں شامل ہو۔"

آنحضرت ﷺ کی یہ دونوں بشارتیں اس طرح پوری ہوئیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت معاویہؓ نے قبرص پر حملہ کیا، یہ تاریخ اسلام میں پہلی بحری مہم تھی، اور اس میں حضرت اُمِ حرامؓ اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوئیں۔ یہ جنگی مہم اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اہل قبرص نے مسلمانوں سے صلح کرلی، اور جب واپس ہونے لگے تو حضرت اُمِ حرامؓ ایک گھوڑے پر سوار ہونا چاہتی تھیں کہ اچانک گھوڑا بدک گیا، اور اس نے آپ کو زمین پر گرادیا، آپ اس زخم سے جان بر نہیں ہوسکیں اور وہیں پر جامِ شہادت نوش کیا۔[1]

اس کے بعد حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آپ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا۔ اس حملے میں بہت سے جلیل القدر صحابۂ کرامؓ شامل تھے، جن میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی داخل ہیں۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ تھا جو کافی مدت جاری رہا، اور حضرت ابوایوب انصاریؓ اسی محاصرے کے دوران بیمار ہوکر وفات پاگئے اور قسطنطنیہ کے دیوار کے نیچے مدفون ہوئے، جس کا واقعہ انشاء اللہ آگے ذکر کروں گا۔ بہرصورت! اس محاصرے میں قسطنطنیہ فتح نہ ہوسکا اور لشکر واپس آگیا۔

اس کے علاوہ حضرت بشر بن سحیم رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے کہ[2]

[1] صحیح البخاری کتاب الجہاد، باب فضل من یصرع فی سبیل اللہ، حدیث نمبر ۲۷۹۹، وباب ما قیل فی قتال الروم حدیث نمبر ۲۹۲۴۔ [2] مسند امام احمد، ص ۳۳۵، ج ۴، احادیث بشر بن سحیمؓ۔

لتفتحن القسطنطنية، فلنعم الامير أميرها ولنعم الجيش ذلك الجيش.

تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرلوگے، پس بہتر امیر اس کا امیر ہوگا، اور بہتر لشکر وہ لشکر ہوگا۔

چنانچہ اس حدیث میں بیان کردہ سعادت کے حصول کیلئے بہت سے مسلمان حکمرانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، ہشام بن عبدالملک، مہدی عباسی، ہارون الرشید وغیرہ شامل ہیں۔

بعض محاصروں میں شہر کے گرد باقاعدہ مکانات بھی تعمیر کرلئے گئے، لیکن شہر فتح نہ ہوسکا۔ اوّل تو اس شہر کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس کے گرد سمندری خلیجوں نے حصار سا قائم کیا ہوا تھا، دوسرے یہ پہاڑی علاقہ تھا، جس میں سردیوں کا موسم خاص طور پر عرب کے صحراء نشینوں کیلئے ناقابل برداشت ہوجاتا تھا، تیسرے اس شہر کے گرد یکے بعد دیگرے تین فصیلیں تھیں، جن میں ایک سو ستر فٹ کے فاصلے سے مضبوط بُرج بنے ہوئے تھے، ہر فصیل انتہائی مستحکم تھی، اور پہلی اور دوسری فصیل کے درمیان ایک ناقابل عبور خندق بنی ہوئی تھی، جو ساٹھ فٹ چوڑی اور سو فٹ گہری تھی، اور اس لحاظ سے یہ قلعہ دُنیا کا سب سے مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا، جو تھے عیسائی دنیا میں قسطنطنیہ کو جو سیاسی اور مذہبی مقام حاصل تھا، اس کے پیش نظر اس پر آنچ آتی دیکھ کر پوری عیسائی دنیا اپنی جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہوجاتی تھی۔

ان وجوہ سے مسلمانوں کے یہ بیشتر محاصرے شہر کو فتح نہ کرسکے، بعض سلاطین کے زمانے میں اہل قسطنطنیہ خراج دینے پر آمادہ ہوگئے، لیکن شہر فتح نہ ہوا۔

سلجوقی ترکوں کے زوال کے بعد جب سلطنت عثمانیہ[1] قائم ہوئی، اور اس نے

[1] خلافت عثمانیہ سلطان غازی عثمان کی طرف منسوب ہے، جو خلافت کا بانی ہے، اس کے والد ارطغرل خوارزم کے باشندے تھے، اور خوارزم پر چنگیزی حملے کے بعد (باقی اگلے صفحے پر)

www.freepdfpost.blogspot.com

یونان اور ایشیائے کوچک کے بہت سے علاقے زیرنگیں کرلیے تو عثمانی سلاطین نے یورپ اور بالخصوص قسطنطنیہ کی طرف توجہ کی۔ سلاطین آلِ عثمان میں سے سب سے پہلے بایزید یلدرم نے آس پاس کی متعدد جنگی مہمات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۴۰۲ء میں قسطنطنیہ کا پوری قوت کے ساتھ محاصرہ کیا۔ بایزید اپنی شجاعت و بسالت اور جنگی تدبیروں کی وجہ سے یورپ کیلئے ایک صاعقۂ آسمانی سے کم نہ تھا، اور اسی وجہ سے اس کا لقب ''یلدرم'' مشہور ہوگیا تھا جس کے معنی ''بجلی'' کے ہیں، چنانچہ اُس میں ظاہری اسباب کے لحاظ سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی، اور قریب تھا کہ وہ اس مہم میں کامیاب ہوجائے، لیکن بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر پیچھے سے تیمور لنگ نے اُس کے علاقے پر حملہ کردیا، اور ایک بیٹے کو بھی قتل کرڈالا، اس لئے بایزید یلدرم کو قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھاکر واپس آنا پڑا۔ اور یہ ایک المیہ ہے کہ رومیوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے بجائے اُسے انقرہ کے مقام پر تیمور لنگ کے ساتھ ایک زبردست معرکہ پیش آگیا، اس معرکے میں تیمور کو فتح ہوئی، اس نے بایزید یلدرم کو گرفتار کرلیا اور اسے ایک آہنی سلاخوں والی پالکی میں قید کرکے لے گیا۔ اور اسی قید میں اس کی وفات ہوگئی، اور اس طرح فتح قسطنطنیہ تقریباً پچاس سال پیچھے چلی گئی۔

بایزید کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں نے بھی اپنے اپنے دور میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، لیکن ان کو بھی عین محاصرے کے دوران عقبی بغاوتوں سے سابقہ پیش آیا۔

(بقیہ گذشتہ سے پیوستہ): وہاں سے ہجرت کرکے دربدر پھر رہے تھے، اتفاق سے وہ اناطولیہ کے علاقے میں ایک ایسی جگہ آنکلے جہاں سلجوقی سلطان علاؤالدین اپنے کسی مدمقابل سے برسرپیکار تھا، ارطغرل نے بہادری سے سلجوقی سلطان کا ساتھ دیا، جس کے نتیجے میں وہ غالب آگیا۔ اس کارنامے کے صلے میں سلجوقی سلطان نے اس کو ایک خطہ زمین بطورِ جاگیر عطا کردیا، جس کا وہ سردار اور نواب سمجھا جاتا تھا، غازی عثمان خان اس کا وارث ہوا، اُسے رومؔ کے عیسائیوں سے جہاد کا شوق تھا، اور اسی شوق نے اس سے سلجوقی سلطنت کے خاتمے پر خلافت عثمانیہ کی بنیاد رکھوائی۔

جن کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

سلطان محمد فاتح:

بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح قسطنطنیہ کی سعادت خاندانِ آلِ عثمان کے ساتویں نوجوان خلیفہ سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھی تھی، اس نوعمر شہزادے نے ۲۲ سال کی عمر میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں سے وہ بہت جلد اپنے پیش روؤں پر سبقت لے گیا۔ اُس نے بڑی باریک بینی سے اُن اسباب کا جائزہ لیا جو اب تک قسطنطنیہ کی فتح میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، اور اپنے تدبر، شجاعت اور اوّلوالعزمی کے ذریعے جنگ کا ایسا نقشہ تیار کیا جو بالآخر فتح پر منتج ہوا۔

اہل قسطنطنیہ کو لڑائی کے وقت عموماً دوسرے اہل یورپ سے جو امداد ملتی تھی، وہ بحیرۂ اسود سے آبنائے باسفورس میں داخل ہوکر قسطنطنیہ پہنچتی تھی، لہٰذا قسطنطنیہ کو اس کے حلیفوں سے کاٹنے کیلئے باسفورس پر مکمل قبضہ ضروری تھا۔ اس غرض کیلئے بایزید یلدرم نے باسفورس کے مشرقی (ایشیائی) ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جو اناضول حصار کے نام سے مشہور ہے اور اب تک موجود ہے۔ لیکن سلطان محمد فاتح نے محسوس کیا کہ صرف ایک کنارے پر واقع یہ قلعہ باسفورس پر مکمل کنٹرول کیلئے کافی نہیں، لہٰذا اُس نے اس قلعے کے بالمقابل یورپی ساحل پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کیا جو ''رومیلی حصار'' کہلاتا ہے، اور جس کا قدرے تفصیلی ذکر میں انشاء اللہ آگے کروں گا۔ اس قلعے کی تعمیر کے بعد باسفورس سے گذرنے والا ہر جہاز عثمانیوں کی دوطرفہ توپوں کی زَد میں آگیا۔

قسطنطنیہ کی دیواریں توڑنے کیلئے معمولی توپیں کافی نہ تھیں، اس لئے محمد فاتح نے پیتل کی ایک ایسی توپ تیار کی جس کے برابر اُس وقت روئے زمین پر کوئی توپ موجود نہ تھی، جس کے ذریعے ڈھائی فٹ قطر کا آٹھ من وزنی گولہ ایک میل تک پھینکا جاسکتا تھا، جب اس توپ کا پہلا تجربہ کیا گیا تو گولہ ایک میل دور

www.freepdfpost.blogspot.com

گر کر زمین میں چھ فٹ نیچے دھنس گیا۔[1]

قسطنطنیہ چونکہ باسفورس، بحیرۂ مرمرا اور شاخِ زرّیں (گولڈن ہارن) نامی سمندروں سے گھرا ہوا ہے، اور اس کے صرف مشرقی جانب خشکی ہے، اس لئے اس پر کامیاب حملے کیلئے ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی ضروری تھا، چنانچہ محمد فاتح نے ایک سو چالیس جنگی کشتیوں پر مشتمل ایک بیڑہ بھی تیار کرلیا۔

ان تیاریوں کے بعد سلطان نے قسطنطنیہ کا اس طرح محاصرہ کیا کہ بری فوج شہر کی مشرقی فصیل کے سامنے پہنچ گئی، اور بحری بیڑہ آبنائے باسفورس میں پھیل گیا۔ قسطنطنیہ کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ باسفورس کی ایک پتلی سی شاخ ایک سینگ کی شکل میں مشرق کی طرف جاتی ہے۔ جو شاخِ زرّیں (گولڈن ہارن[2]) کہلاتی ہے۔ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اسی گولڈن ہارن میں واقع تھی، لہٰذا باسفورس سے بندرگاہ یا شہر کی جنوبی دیوار کے سامنے پہنچنے کیلئے گولڈن ہارن سے گذرنا ضروری تھا۔ لیکن اہل قسطنطنیہ نے اسے گولڈن ہارن اس کے اُس دہانے پر جو باسفورس میں گرتا ہے، لوہے کا ایک بڑا زنجیرہ باندھ دیا تھا، جس کی وجہ سے کوئی جہاز باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا محمد فاتح کے جہاز باسفورس میں محدود ہوگئے تھے، اور جہازوں کے ذریعہ بندرگاہ کا محاصرہ کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ فصیل پر حملہ صرف مشرق کے خشکی کے راستے سے ممکن تھا اور اہل شہر نے بحری سمت کو مکمل محفوظ سمجھ کر اپنی ساری طاقت مشرق کی فصیل پر لگادی تھی۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے قسطنطنیہ اور گرد و پیش کا ایک سرسری سا نقشہ ذہن

[1] تاریخ خاندانِ عثمانیہ از انشاء اللہ، ص: ۳۳، و تاریخ دولت عثمانیہ از محمد عزیر، ص: ۱۰۷ و ۱۰۸، ج: ۱

[2] ''گولڈن ہارن'' کے معنی ہیں ''سنہرا سینگ''، یہ شاخ چونکہ سینگ کی شکل کی ہے، اور دھوپ پڑنے سے اس کا رنگ سنہرا ہوجاتا ہے، اس لئے اس کا نام ''گولڈن ہارن'' مشہور ہوگیا۔ اور آج بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

میں رکھنا ضروری ہے۔

سلطان محمد فاتح کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کے کچھ جہاز آبنائے باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل ہوجائیں، تاکہ بندرگاہ کی سمت سے بھی شہر پر حملہ کیا جاسکے، لیکن گولڈن ہارن کے دہانے پر لوہے کا زنجیرہ بھی نصب تھا، اور اس کے آس پاس توپیں بھی گولہ باری کیلئے موجود تھیں، اور بڑے بڑے بازنطینی جہاز بھی گولڈن ہارن کے اندر سے زنجیرے کی مدافعت کیلئے کھڑے رہتے تھے، اس لئے اس راستے سے کامیابی ممکن نظر نہیں آتی تھی، بہت دن گزر گئے، لیکن گولڈن ہارن میں پہنچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔

خشکی پر جہاز

بالآخر ایک دن سلطان محمد فاتح نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو دنیا کی تاریخ میں اس کی منفرد اور محیر العقول یادگار بن کر رہ گیا۔ اُس کا فیصلہ یہ تھا کہ جہازوں کو گولڈن ہارن میں پہنچانے کیلئے اُنہیں دس میل خشکی پر چلا کر لے جایا جائے گا۔ اور اس غرض کے لیے

www.freepdfpost.blogspot.com

باسفورس کے مغربی ساحل سے جہاز خشکی پر چڑھا کر انہیں ایک ترچھے راستے سے گولڈن ہارن کے بالائی جنوبی کنارے تک پہنچایا جائے گا۔ (جو آج کل قاسم پاشا کہلاتا ہے) اور، وہاں سے انہیں گولڈن ہارن میں ڈال دیا جائے گا۔ خشکی کا یہ درمیانی علاقہ گبن کے بیان کے مطابق تقریباً دس میل لمبا اور سخت ناہموار اور پہاڑی اُتار چڑھاؤ سے معمور تھا۔ لیکن محمد فاتح کی اولوالعزمی نے یہ محیر العقول عجوبہ صرف ایک رات میں کر دکھایا۔ اُس نے خشکی کے اُس راستے پر لکڑی کے تختے بچھوائے۔ اُنہیں چکنا کرنے کیلئے اُن پر چربی ملوائی، پھر ستر جہاز نما کشتیوں کو یکے بعد دیگرے باسفورس سے ان تختوں پر چڑھا دیا۔ ہر کشتی میں دو ملاح سوار تھے اور ہوا کی مدد لینے کیلئے بادبان بھی کھول دیئے گئے تھے، ان کشتیوں کو بیل اور آدمی کھینچتے ہوئے دس میل کی یہ پہاڑی مسافت طے کر کے گولڈن ہارن تک لے گئے۔

ستر کشتیوں کا یہ جلوس رات بھر مشعلوں کی روشنی میں محوِ سفر رہا۔ بازنطینی فوج قسطنطنیہ کی فصیل سے باسفورس کے مغربی ساحل پر مشعلوں کی چہل پہل دیکھتی رہی۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بالآخر جب صبح کے اُجالے نے راز سے پردہ اُٹھایا تو محمد فاتح کی ستر کشتیاں اور بھاری توپ خانہ گولڈن ہارن کے بالائی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔

دس میل خشکی پر جہاز چلانے کا یہ کارنامہ، جو محمد فاتح سے پہلے کسی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا، اس قدر حیرت انگیز ہے کہ مغرب کے متعصب مؤرخین بھی اس پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایڈورڈ گبن جیسے مؤرخ نے بھی اس کو ایک ''معجزہ'' (Miracle) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔[1]

گولڈن ہارن میں عثمانی کشتیوں کے پہنچنے میں ایک فائدہ یہ تھا کہ یہاں سمندر کا پانی اُتھلا تھا، اور زیادہ گہرائی نہ ہونے کی وجہ سے بازنطینی کے بڑے جہاز اس میں آزادی سے نقل

[1] The Decline and Fall of the Roman Empire (abridged) P:689,690

وحرکت نہیں کر سکتے تھے، اس کے برعکس عثمانی کشتیاں نسبتاً چھوٹی تھیں، اس لئے ان کے لئے حسبِ منشاء آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ چنانچہ یہاں کی بحری لڑائی میں عثمانی کشتیوں کو غالب آنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آئی، اور بندرگاہ کی جانب سے بھی شہر کا بحری محاصرہ مکمل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی محمد فاتح نے گولڈن ہارن پر ایک پُل تعمیر کیا اور اس پر اپنا بھاری توپ خانہ نصب کرا دیا۔

مشرق اور جنوب دونوں طرف سے محاصرے کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد عثمانی توپوں نے دونوں طرف سے شہر کی فصیلوں پر زبردست گولہ باری شروع کی، اور سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات سے بڑے بڑے شگاف نمودار ہوگئے اور گبن کے الفاظ میں: ''وہ فصیلیں جو صدیوں سے ہر دشمن کے تشدد کا مقابلہ کر رہی تھیں، عثمانی توپوں نے ہر طرف سے ان کا حلیہ بگاڑ دیا، ان میں بہت سے شگاف پڑ گئے، اور سینٹ رومانوس کے دروازے (جو بعد میں توپ دروازہ یا توپ کاپے کے نام سے مشہور ہوا) کے قریب چار مینارز زمین کی سطح کے برابر ہو گئے۔''

اب سلطان محمد فاتح کو آخری حملے کی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا، لیکن اُس نے حملے سے پہلے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۴۵۳ء کو بازنطینی بادشاہ قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال کر شہر سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، اور موریا کا علاقہ اُسے دے دیا جائے گا۔ لیکن قسطنطین نے یہ پیشکش منظور نہ کی، اور اس طرح پانچ دن بعد سلطان محمد نے آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔

آخری حملہ اور فتح:

چنانچہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کی رات عثمانی فوجوں نے ذکر و تسبیح اور دعاؤں میں گذاری، نمازِ فجر کے بعد محمد فاتح نے عام حملہ کا حکم دے دیا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہم انشاء اللہ ظہر کی نماز آیا صوفیا کے کلیسا میں ادا کریں گے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

حملہ مختلف سمتوں سے جاری رہا، لیکن زیادہ زور سینٹ رومانس کے دروازے پر تھا۔ (جو اَب توپ کاپے کہلاتا ہے) کیونکہ یہاں کی دیوار بہت مجروح ہو چکی تھی، خندق کو اوپر اوپر سے عبور کرنے کیلئے سیڑھیاں او رکمندیں ڈال دی گئی تھیں، دوپہر تک دونوں طرف سے آگ اور خون کا زبردست معرکہ جاری رہا، بازنطینی بھی اُس روز غیر معمولی شجاعت کے ساتھ لڑے، دوپہر تک کوئی ایک سپاہی شہر میں داخل نہ ہوسکا، بالآخر سلطان محمد فاتح خود اپنی خصوصی فوج ینی چری کو لے کر سینٹ رومانس کے دروازے کی طرف بڑھا، اور ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس جانباز ساتھیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً فصیل سے گرادیئے گئے، اور انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا، لیکن بارہ ساتھی دیوار پر جمنے میں کامیاب ہوگئے، اور اس کے بعد دوسرے عثمانی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے، اور اس طرح دیوار قسطنطنیہ پر سرخ ہلالی پرچم لہرادیا گیا۔

بازنطینی بادشاہ قسطنطین جو اَب تک بے جگری سے حالات کا مقابلہ کررہا تھا، اپنے بعض انتہائی بہادر ساتھیوں کے حوصلہ چھوڑ دینے کے بعد مایوس ہوگیا، اور اُس نے پکار کر کہا کہ ''کیا کوئی عیسائی نہیں ہے مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کردے؟'' لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے شاہانِ روم (قیاصرہ) کی خاص پوشاک اُتار کر پھینک دی، اور عثمانی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں گھس کر ایک سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا، اور اس کی موت پر اُس گیارہ سو ۱۱۰۰ سال کی بازنطینی سلطنتِ روما کا خاتمہ ہوگیا، جس کی ابتداء بھی قسطنطین سے ہوئی تھی، اور انتہاء بھی قسطنطین پر ہوئی، اور اس کے بعد ''قیصر'' کا لقب ہی ایک تاریخی داستان بن کر رہ گیا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کا وہ ارشاد پورا ہوا کہ:

إذا هلک قیصر، فلاقیصر بعده

جب قیصر ہلاک ہوگیا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہیں ہوگا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح اپنے وزراء اور سرداروں کے جلو میں شہر کے

سینٹ رومانس کے دروازے سے داخل ہوا، اور سب سے پہلے قسطنطنیہ کے شہرۂ آفاق کلیسا آیا صوفیا کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑے سے اُترا، کلیسا کی دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، اُنہیں مٹا کر دھویا گیا، سلطان کی ہدایت پر یہاں مؤذن نے اذان کہی اور شرک وکفر کے اس مرکز میں پہلی بار ''أشهد أن لا إله الله''، ''أشهد أن محمد رسول الله'' کی زمزمہ بار صدا گونجی۔ سلطان نے نمازِ ظہر یہیں ادا کی، اور اُس وقت سے اس کلیسا کو مسجد میں تبدیل کردیا گیا۔

اس کے بعد سلطان شاہی محلات میں داخل ہوا۔ یہ زرق برق محلات جو صدیوں سے قیاصرہ کی شان وشوکت اور ان کے طمطراق کے مظہر تھے، آج ویران پڑے ہوئے تھے، سلطان محمد فاتح کے دل پر اس عبرتناک منظر کا ایسا اثر ہوا کہ بے ساختہ فردوسی کا یہ شعر اس کی زبان پر آگیا۔

پردہ داری می کند برقصرِ قیصر عنکبوت
پُغد نوبت میزند برگنبد افراسیاب

یہ تھا فتح قسطنطنیہ کا وہ واقعہ جس کے بعد قسطنطنیہ (استنبول) خلافتِ عثمانیہ کا مرکز بنا، اور صدیوں تک اُسے عالم اسلام میں نمایاں مرکزیت حاصل رہی۔

افسوس یہ ہے کہ اس وقت سلاطین آلِ عثمان کی تاریخ کے اہم ترین ماخذ انگریزی میں ہیں، اور اس موضوع کی اور یجنل کتابیں اُن مغربی مؤرخین کی لکھی ہوئی ہیں جن کی تحریریں تعصب کی چھاپ سے خالی نہیں ہوتیں۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخیں یا تو انہی انگریزی مآخذ سے مأخوذ ہیں، یا پھر وہ ترکی زبان میں ہیں جن سے ترکی کے باہر کے مسلمان مستفید نہیں ہوسکتے۔ اس لئے نہ جانے کتنے حقائق ابھی تک پردۂ راز میں ہوں گے، جن تک رسائی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

بہرصورت! یہ ساری تاریخ جو اوپر بیان ہوئی، انہیں مغربی مآخذ اور ان پر مبنی اردو تواریخ کا خلاصہ ہے۔ اس خلاصے کے بعد میں اب اپنے اصل موضوع یعنی سفرنامے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

(۲)

مذاکرے کا افتتاح

اگلا دن (۱۲/ مارچ) جمعہ تھا، اور دس بجے صبح مذاکرے کا افتتاح ہونے والا تھا، چنانچہ ہم ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد اجتماع گاہ میں چلے گئے۔ یہ افتتاحی اجتماع استنبول کے ایک مصروف وسطی علاقے میں ایک مشہور آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔

یہ مذاکرہ دو عالمی تنظیموں کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تنظیم لیبیاء کی جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (ورلڈ اسلامک کال سوسائٹی) ہے۔ یہ جمعیت لیبیا۔۔ کے موجودہ سربراہ کرنل معمر القذافی نے ۱۹۶۹ء میں اپنے برسر اقتدار آنے کے بعد قائم کی تھی، اُس وقت کرنل قذافی اسلام کے نفاذ، اس کی دعوت وتبلیغ اور خدمت کے لئے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہے تھے، اس جمعیت کا قیام بھی اسی جوش وخروش کا ایک حصہ تھا، چنانچہ اس جمعیت کے ذریعے دنیا کے مختلف حصوں میں مساجد کی تعمیر، مدارس اور شفاخانوں کے قیام وغیرہ کے بہت سے کام انجام دیئے گئے، پھر ۱۹۸۲ء میں اس جمعیت کو عالمی تنظیم کی حیثیت دے دی گئی۔ اس کی ایک بین الاقوامی کونسل ہے، جو مختلف ممالک کے چھتیس ارکان پر مشتمل ہے، اور اسکے اغراض ومقاصد میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو ایک تبلیغی ادارے کے اغراض و مقاصد میں ممکن ہوسکتی ہیں۔ اسی جمعیت کے تحت طرابلس میں ایک ''کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ'' بھی ۱۹۷۴ء سے قائم ہے، اس کی ایک شاخ دمشق میں بھی ہے، اس میں مختلف ملکوں کے مسلمان طلباء ''دعوتِ اسلامی'' میں گریجویشن کرتے ہیں۔ اور اب ماسٹر ڈگری شروع کرنا بھی پیش نظر ہے۔ اس کے علاوہ اسی جمعیت نے لندن میں بھی ایک ''دعوتِ اسلامی کالج'' قائم کیا ہے جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو دعوتِ اسلامی کیلئے تیار کرنا پیش نظر ہے۔ اسی جمعیت کے تحت مختلف مسلمان ملکوں میں ''جمعیات الاخوۃ'' بھی قائم ہیں۔

جن میں پاکستان کا ''پاک لیبیا دوستی مرکز'' بھی شامل ہے۔

دوسری تنظیم استنبول کا ''مرکز الأبحاث للتاریخ والثقافۃ والفنون الاسلامیۃ'' ہے جس کا انگریزی نام ''سینٹر آف ریسرچ آن اسلامک ہسٹری، کلچر اینڈ آرٹس'' ہے۔ یہ مرکز مسلمان ملکوں کی تنظیم ''منظمۃ المؤتمر الاسلامی'' (او۔آئی۔سی) کے تحت استنبول میں قائم ہے، اور ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو کی زیر قیادت خاصی سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔

ان دونوں تنظیموں کے اشتراک سے ایک مفید کام حال ہی میں یہ ہوا ہے کہ قرآنِ کریم کے جتنے تراجم دنیا کی جس کسی زبان میں ہوئے ہیں، ان کی ایک مکمل فہرست (Bibliography) تیار کر کے شائع کی گئی ہے۔ یہ فہرست استنبول کے مرکز الأبحاث کے محققین نے تیار کی ہے، اور اسے لیبیا کی جمعیۃ الدعوۃ کے خرچ پر شائع کیا گیا ہے، اور بلاشبہ یہ کتاب اب تک تراجم قرآنِ کریم کی سب سے جامع فہرست ہے۔

اس کتاب کی اشاعت ان دونوں تنظیموں کے بیان کے مطابق ایک بڑے منصوبے کا نقطہ آغاز ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے جو ترجمے ہوئے ہیں، (بالخصوص غیر مسلم ممالک کی زبانوں میں) اُن پر مستشرقین کے تراجم کی گہری چھاپ موجود ہے، مستشرقین کے تراجم میں غلطیاں اور مبالغہ انگیزیاں کوئی راز نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے تراجم پر جو دوسرے تراجم مبنی ہیں، اُن کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ان دونوں تنظیموں کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ ان تمام تراجم کا جائزہ لے کر ان کی غلطیوں کی نشان دہی کریں، اور پھر ہر زبان میں صحیح ترجمہ شائع کرنے کی کوشش کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام جتنا مفید اور ضروری ہے، اتنا ہی مشکل اور وقت طلب بھی ہے، اور اس کے لئے موزوں رجالِ کار، ہر زبان کے ماہرین اور قرآنِ کریم کا علم رکھنے والے حضرات کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے، اور وسائل بھی بہت درکار ہیں۔ چنانچہ دونوں تنظیموں نے مل کر یہ مذاکرہ اس غرض کیلئے رکھا تھا کہ اس میں اس ''فہرست تراجم'' کا تعارف ہو، اور آئندہ کام کے لئے خطوط متعین کئے جائیں۔ چنانچہ مذاکرے میں مختلف ملکوں سے ایسے حضرات کو مدعو کیا گیا تھا جو کسی زبان میں قرآنِ کریم

www.freepdfpost.blogspot.com

کے ترجمے کا کام کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔

مذاکرے کا یہ افتتاحی اجلاس رسمی نوعیت کا تھا، اس میں ترکی کے وزیر اطلاعات کو بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ جناب شریف الدین پیرزادہ، جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے صدر ڈاکٹر محمد شریف اور استنبول کے مرکز الأبحاث کے سربراہ ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو نے اپنی تقاریر میں مذاکرے کے مقاصد بیان کئے، اور اس اعلان کے ساتھ یہ افتتاحی اجلاس ختم ہوگیا کہ مذاکرے کے عملی اجلاس کل سے قصرِ یلدز میں منعقد ہوں گے۔

اجلاس کے بعد شرکاء سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں جب سعودی عرب سے ترکی کیلئے روانہ ہو رہا تھا تو میرے محترم بزرگ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مدظلہم نے استنبول کے دو صاحبان کا تعارف کرایا تھا کہ ان دونوں سے ضرور ملوں، کیونکہ وہ بڑی حد تک ہم مذاق ہونے کی وجہ سے اس سفر میں معاون ہوں گے۔ ان میں سے ایک شیخ امین سراج صاحب تھے اور دوسرے ڈاکٹر یوسف قلیچ۔ احقر نے استنبول پہنچ کر ان حضرات کو فون کر دیا تھا، اور انہوں نے بتایا تھا کہ مذاکرے کے افتتاحی اجلاس میں وہ بھی تشریف لائیں گے، چنانچہ یہاں ان سے بھی ملاقات ہوئی، دونوں حضرات بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے، اور ترکی کے قیام کے دوران اُن سے بہت استفادہ ہوا۔

سلطان احمد کی مسجد میں

افتتاحی اجلاس کے بعد پروگرام یہ تھا کہ تمام مندوبین استنبول کی شاندار مسجد ''سلطان احمد'' میں نمازِ جمعہ ادا کریں گے، چنانچہ یہاں سے ہم سب مسجد کی طرف روانہ ہوگئے، شیخ امین سراج اور ڈاکٹر یوسف قلیچ بھی اس خیال سے ساتھ ہوگئے کہ احقر کو مسجد اور دوسرے تاریخی مقامات دکھانے میں مدد دے سکیں۔ چنانچہ ہم زوالِ آفتاب کے وقت سلطان احمد پہنچ گئے۔

یہ مسجد کیا ہے؟ ترکی فنِ تعمیر کا ایک عجوبہ ہے، اس میں داخل ہوتے ہی انسان اُس کے شکوہ، جاہ و جلال اور حسن و جمال میں محو ہو جاتا ہے۔ اپنے شکوہ، حسن اور مینا کاری کے لحاظ سے یہ مسجد اس قدر عظیم الشان ہے کہ میں نے دنیا میں ایسی کوئی اور مسجد نہیں دیکھی۔ یہ مسجد سترہویں صدی (۱۶۱۶ء) میں سلطان احمد نے تعمیر کرائی تھی۔ اس علاقے میں سب سے نمایاں عمارت عیسائیوں کا مشہور کلیسا ''آیا صوفیا'' تھی، سلطان احمد نے حکم دیا کہ اس عمارت کے بالمقابل ایک ایسی مسجد تعمیر کی جائے جو آیا صوفیا سے زیادہ بلند اور پُرشکوہ ہو، چنانچہ اس مسجد کی عمارت نے واقعتاً ''آیا صوفیا'' کی عمارت کو گرد کر دیا ہے، اور اب استنبول کے اس حصے میں نمایاں ترین تعمیر اسی مسجد کی ہے اور اس کے چھ مینار بحیرۂ مرمر سے بھی استنبول کی بنیادی علامت کے طور پر نظر آتے ہیں۔

بلکہ روایت یہ مشہور ہے۔ خدا جانے کہاں تک صحیح ہے کہ سلطان احمد نے اس مسجد کے معمار سے کہا تھا کہ میں اس مسجد کو ہر لحاظ سے ''آیا صوفیا'' سے کہیں بہتر دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے اس کے مینار سونے کے بنائے جائیں۔ معمار نے بہت سوچا، لیکن سونے کے مینار کی تعمیر کرنا اُسے ناممکن معلوم ہوا، دوسری طرف سلطان کی بات کو رد کرنا بھی اس کیلئے ممکن نہ تھا۔ آخر اس کے ذہن میں بادشاہ کی ناراضگی سے بچنے کی ایک تدبیر آ گئی۔ ترکی زبان میں سونے کو ''اَلطِن'' کہتے ہیں، اسی سے ملتا جلتا ایک لفظ ''اَلطی'' ہے، جس کے معنی ہیں ''چھ''۔ اُس مسجد کے چھ مینار اس خیال سے تعمیر کر دیئے کہ اگر سلطان نے سونے کی بات پوچھی تو یہ جواب دے دوں گا کہ میں نے آپ سے ''اَلطن'' (سونے) کے بجائے ''اَلطی'' (چھ) کا لفظ سنا تھا، اس لئے چھ مینار تعمیر کر دیئے۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اُس وقت تک حرم شریف کے سوا کسی مسجد کے مینار چھ نہیں تھے، چنانچہ شریفِ مکہ نے سلطان احمد کی مسجد میں چھ مینار ہونے پر اعتراض کیا جس کے جواب میں سلطان احمد نے حرم شریف میں ایک مزید مینار تعمیر کر کے حرم شریف کے میناروں کی تعداد سات کر دی۔ واللہ اعلم

مسجد کی عمارت ایک طویل و عریض کرسی دے کر تعمیر کی گئی ہے، اُس کا اندرونی

www.freepdfpost.blogspot.com

ہال چونسٹھ میٹر لمبا اور بہتر میٹر چوڑا ہے، اور چھت کم از کم چار منزل کے برابر بلند ہے۔ پوری چھت خوبصورت گنبدوں سے بھری ہوئی ہے، جنہیں اس ترتیب سے بنایا گیا ہے کہ منبر پر کھڑے ہوئے خطیب کی آواز مسجد کے ہر حصے میں واضح طور پر سنی جاتی ہے۔ چاروں طرف کی دیواروں اور چھتوں پر چینی کے سبز اور نیلے ٹکڑوں سے اس قدر نفیس مینا کاری کی گئی ہے کہ نظر اُس پر بے ساختہ جم کر رہ جاتی ہے۔ روشنی کیلئے اس ہال میں دو سو ساٹھ روشن دان اور کھڑکیاں رکھی گئی ہیں۔ بلندی کی غالباً کوئی سطح ایسی نہیں ہے جس پر کہیں نہ کہیں کوئی روشندان یا کھڑکی موجود نہ ہو، لیکن ان کے درمیان تناسب ایسا ہے کہ موزونیت میں کہیں کوئی فرق نہیں آتا۔ چھت چار سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہے، ان میں سے ہر ستون کی گولائی ۳۳ فٹ ہے اور وہ ایک گز چوڑی اور چار گز لمبی مرمر کی سِلوں سے بنا ہوا ہے۔

ہم مسجد میں داخل ہوئے تو اس کے کچھ دیر بعد اذان ہوئی، دیوارِ قبلہ میں محراب کے ساتھ جو منبر بنا ہوا ہے، وہ بھی ایک منزل بلند ہے، تھوڑی دیر میں خطیب صاحب نمودار ہوئے، اور اس ایک منزلہ منبر کی بلند ترین سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ مؤذن نے نچلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر فصیح و بلیغ عربی میں طویل خطبہ دیا۔ پہلا خطبہ زیادہ طویل تھا، اذان کی خوش الحانی حرم شریف کی قدیم اذانیں یاد دلا رہی تھی، خطبہ بھی بامعنی تھا، اور نماز میں تلاوت بھی تجوید اور لہجے دونوں کے اعتبار سے نہایت عمدہ۔

سنتوں کے بعد ہم نے مسجد کے مختلف حصے دیکھے۔ مسجد کے باہر مدرسوں اور خانقاہوں کے لئے حجرے بنے ہوئے ہیں، اور پائیں باغ میں سلطان احمد اوّل، عثمان ثانی اور مراد رابع کے مزارات بھی واقع ہیں، پوری مسجد میں جو فنِ تعمیر کے ہر شعبے کی اعلیٰ ترین کاریگری کے دلکش نمونے، بلکہ عجوبے نظر سے گذرے۔ سول انجینئرنگ کی ترقی کے اس دور میں بھی اس معیار کی تعمیر کے تصور سے یقیناً بڑے بڑے فنکاروں کو پسینہ آ جائے گا۔

ات میدان

مسجد سے باہر نکلے تو سردی عروج پر تھی، ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے دھوپ بھی مرجھائی ہوئی تھی، اور برفانی ہواؤں سے پورا ماحول ٹھٹھر رہا تھا، لیکن اس وقت تک میں ایک اوورکوٹ کا انتظام کر چکا تھا، اس لئے یہ شدید سردی تکلیف دہ ہونے کے بجائے خوشگوار معلوم ہونے لگی تھی، مسجد سلطان احمد کے بالکل سامنے ایک خوبصورت پارک نما میدان ہے، جو ۳۷۰ میٹر لمبا اور ۱۱۸ میٹر چوڑا ہے، یہ جگہ بازنطینی حکومت کے دور میں گھڑ دوڑ کے میدان کے طور پر استعمال ہوتی تھی، اور ''ہپوڈ روم'' کہلاتی تھی۔ یہ صرف گھڑ دوڑ کا میدان ہی نہ تھا، بلکہ یہیں پر نئے بادشاہ کی تاج پوشی کا اعلان ہوتا یہیں پر فتح مند جرنیل فتح کا جشن مناتے، یہیں پر مجرموں کو پھانسی دی جاتی، اور منحرف عیسائی فرقوں کو زندہ جلایا جاتا، وحشی جانوروں کی نمائش اور جسمانی کرتب کے تماشے منعقد ہوتے۔ تاریخ میں کئی بار حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی اِسی میدان سے شروع ہوئیں، اور یہ میدان نہ جانے کتنی مرتبہ انسانوں کے خون سے لالہ زار ہوا، ترکوں کے زمانے میں اس کا نام ''ہپوڈ روم'' سے بدل کر ''ات میدان'' کر دیا گیا، اور ترکی کی معاشی اور سیاسی تاریخ میں اِسے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ اس میں تین ستون بھی نصب ہیں۔ ایک ستون چوتھی صدی قبل مسیح کا بیان کیا جاتا ہے، دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اور تیسرا دسویں صدی عیسوی کا۔ یہ ستون تین مختلف بادشاہوں نے اپنی یادگار کے طور پر تعمیر کئے تھے، جن میں سے دو آج تک محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ فتح قسطنطنیہ کے وقت چھوٹے ستون پر پتھر کے تراشے ہوئے تین اژدھے لپٹے ہوئے تھے۔ جب سلطان محمد فاتح آیا صوفیا سے نکل کر یہاں پہنچا تو اس نے اپنی بھاری جنگیں تبر سے ان اژدھوں کے سر اُڑا دیئے تھے، اس لئے اس ستون کو ''سرپنٹ کالم'' کہتے ہیں (یعنی اژدھوں والا ستون)۔

یہاں سے ''آیا صوفیا'' پیدل کی مسافت پر ہے، لیکن ہمارے رہنماؤں نے اس سے پہلے ترکی کے شہرۂ آفاق عجائب گھر ''توپ کاپے'' لے جانے کا پروگرام بنایا، کیونکہ اُسے

www.freepdfpost.blogspot.com

دیکھنے کیلئے زیادہ وقت درکار تھا، اور کچھ دیر بعد اس کے بند ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔

چنانچہ ہم یہاں سے گاڑیوں میں سوار ہو کر ''توپ کاپے'' کیلئے روانہ ہو گئے۔ وہ بھی یہاں سے قریب ہی تھا، اس لئے چند منٹ میں اس کے دروازے پر پہنچ گئے۔

توپ کاپے سرائے اور اس کے نوادرات

ترکی زبان میں ''سرائے'' محل کو کہتے ہیں اور ''کاپے'' دروازے کو۔ لہٰذا ''توپ کاپے سرائے'' کے معنی ہیں ''توپ دروازہ محل''۔ اسی لئے عربی میں ''قصر باب المدفع'' بھی کہتے ہیں۔ دراصل بازنطینی دور میں یہاں قسطنطنیہ میں داخل ہونے کا ایک دروازہ تھا جو ''سینٹ رومانس دروازہ'' کہلاتا تھا، جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے اپنی ایک بھاری توپ اسی دروازے کے سامنے نصب کی تھی اور مسلمانوں کی گولہ باری سے سب سے زیادہ نقصان اسی دروازے کو پہنچا تھا، پھر فتح کے بعد سلطان محمد فاتح اسی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بناء پر اس دروازے کا نام ''توپ کاپے'' (توپ دروازہ) مشہور ہو گیا۔ بعد میں یہاں ایک محل بھی تعمیر کر دیا گیا، جو سلاطین آلِ عثمان کے دور میں (سلطان محمد فاتح سے سلطان عبدالمجید تک) سلاطین کی رہائش وغیرہ کیلئے بھی استعمال کیا گیا۔ اس محل کا نام ''توپ کاپے سرائے'' رکھا گیا۔ یعنی ''توپ دروازہ محل''۔ آج کل اس محل کو ایک تاریخی یادگار کے علاوہ ایک عجائب گھر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جو اپنے بیش قیمت نوادر کے لحاظ سے دنیا کے بہترین اور امیر ترین عجائب گھروں میں شمار ہوتا ہے۔

اس محل کے مرکزی دروازے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ایک کشادہ صحن سے گذر کر ''قصر محمد الفاتح'' کے نام سے ایک عمارت نظر آتی ہے جس کے سامنے ایک برآمدہ ہے۔ اس برآمدے کے سامنے صحن کے بیچوں بیچ فرش پر ایک بڑا سا سوراخ ہے، یہ اُس دور میں جھنڈا گاڑنے کی جگہ تھی، جہاں صدیوں تک خلافتِ عثمانیہ کا سرخ ہلالی پرچم لہراتا رہا ہے، وہ پرچم جس نے سالہا سال تک یورپ کی طاقتوں کو اپنے آگے سرنگوں

رکھا، جو صدیوں تک عالم اسلام کے اتحاد کی علامت بنا رہا اور جو آلِ عثمان کے دور میں دنیا کے تین براعظموں پر مسلمانوں کی شوکت کے نشان کے طور پر لہرایا۔۔۔ آج اس کی یادگار کے طور پر صرف یہ سوراخ باقی رہ گیا ہے جس کا خلا اُس پرچم کے اُکھڑنے کے بعد آج تک بھرا نہیں جا سکا۔

یہ برآمدہ جس کے آگے علم گاڑنے کی جگہ تھی ''باب السعادۃ'' کہلاتا تھا، اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سلطنت عثمانیہ کا ہر نیا سربراہ اپنی خلافت کیلئے بیعت لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد ''قصر محمد الفاتح'' شروع ہوتا ہے، ''قصر'' اور ''محل'' کے لفظ سے عموماً ایک زرق برق اور پُرتکلف عمارت کا تصور آتا ہے، لیکن یہ ''قصر'' اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اس میں قدم قدم پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بنانے والوں نے اُسے سادگی کے ساتھ بنایا ہے، اور بے ضرورت تعمیرات سے پرہیز کیا ہے۔ بس اس کی حیثیت پرانے زمانے کے ایک وسیع مکان سی ہے جس کے طول و عرض اور اونچائی میں محلاتی انداز نہیں ہے۔

اندر داخل ہو کر سب سے پہلے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں سلطان عبدالمجید کے افسر مہمان داری (پروٹوکول آفیسر) کا دفتر تھا، اس کے بعد ایک نسبتاً بڑا کمرہ ہے، جو سلطان کی ملاقات کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اسی سے متصل ایک اور کمرہ ہے جس میں ایک پرانے طرز کی مسہری بچھی ہوئی ہے یہ اُس مسہری کا نمونہ ہے جو اُس دور میں شاہی استعمال میں رہتی تھی، اور کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان کی خواب گاہ تھی۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سلطان کی یہ خواب گاہ بھی چھوٹی سی ہے اور کم از اس کے اندازِ تعمیر میں ٹھاٹھ باٹھ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔

''توپ کاپے سرائے'' بہت بڑا قلعہ ہے، جس کے بہت سے حصے ہیں، اور تمام حصوں کو ڈیڑھ دو گھنٹے کے وقت میں دیکھنا ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم اس کے چند منتخب حصے ہی دیکھ سکے جو اس عجائب گھر میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

تبرکات

چنانچہ ہم سب سے پہلے اس کمرے میں پہنچے جہاں سرکارِ دوعالم ﷺ کے تبرکات محفوظ کئے گئے ہیں، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ تبرکات زیادہ مستند ہیں۔ ان میں سرورِ دوعالم ﷺ کا جُبّہ مبارک، آپ ﷺ کی دو تلواریں، آپ ﷺ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقش شاہِ مصر کے نام آپ ﷺ کا مکتوبِ گرامی اور آپ ﷺ کی مہر مبارک شامل ہیں۔

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنوعباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کررہا تھا، اقتدار واختیار میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کی سلطنت تسلیم کرلی اور اسے ''خادم الحرمین الشریفین'' کا منصب عطا کیا گیا تو عباسی خلیفہ المتوکل نے ''خلافت'' کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا، اور مقاماتِ مقدسہ وحرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سندِ خلافت اُن کے حوالے کردیئے۔ اِسی کے بعد سے سلاطین عثمانیہ کو ''خلیفہ'' اور ''امیر المومنین'' کا لقب مل گیا اور پوری دنیائے اسلام نے اُن کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کرلی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے اور یہ اہتمام کیا کہ ''توپ کاپے سرائے'' میں ان کو محفوظ رکھنے کیلئے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدردانی اور ان سے عشق ومحبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حفاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ وہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں، حفاظ کی ڈیوٹیاں مقرر تھیں اور ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کردیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح دنیا میں شاید یہ واحد جگہ ہے جہاں چار سو سال تک مسلسل تلاوتِ قرآن ہوتی رہی ہے، اور اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہوا۔

ان تبرکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندقوں میں رکھا گیا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیسویں شب میں انہیں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دنوں میں یہ تبرکات صندقوں میں بند رہتے ہیں، اور صرف صندوق ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان تبرکات کی زیارت نہ کرسکے۔ صرف صندوق دور سے نظر آئے۔ یہ گنہگار آنکھیں یقیناً ان تبرکات کے لائق نہ تھیں، ان کے لئے اُس ظرف کی زیارت بھی ایک نعمتِ عظمیٰ تھی جسے ان کی صحبت ومساس کا شرف حاصل ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک اُمتی کے لئے اس نسبت کی سچائی کا احتمال، اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے۔

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شوکیسوں میں محفوظ ہیں، اور شفاف شیشوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جاسکتی ہے۔ ان میں ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدینؓ کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت ابوالحصینؓ کی طرف منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک حصے میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزابِ رحمت کے دو ٹکڑے، اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجرِ اسود رکھا گیا تھا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کے روضۂ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے۔ لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

دوسرے تاریخی نوادر

تبرکات کے کمرے سے نکل کر ایک اور قصر میں داخل ہوئے جو بہت سے کمروں پر مشتمل تھا، ہر کمرہ بیش قیمت نوادر سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں مختلف سلاطین کے لباس اور اسلحہ محفوظ ہیں، ان لباسوں میں خاص طور پر سلطان محمد فاتح کی ایک عبا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ سلطان مصطفےٰ سوئم کا فولادی لباس جس پر سونا چڑھا ہوا ہے، اور سلطان مراد کا بیش قیمت اسلحہ بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔

میں نے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم العالی کے سفرنامہ ترکی میں پڑھا تھا کہ:

> ''بعض واقفین کا کہنا ہے کہ اگر ترکی کسی زمانے میں دیوالیہ ہو جائے تو اس عجائب خانے ''توپ کاپے'' کا سونا کچھ مدت تک پورے ملک کا خرچ چلا سکتا ہے۔''
>
> (دو ہفتے ترکی میں۔ ص: ۵۷)

یہ پڑھتے وقت بادی النظر میں یوں معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے، شاید انہوں نے ضرورت سے زیادہ مبالغہ کر دیا ہے، لیکن ''توپ کاپے'' کا یہ حصہ دیکھ کر جو شاہی نوادر پر مشتمل ہے، واقعتہً اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور خیال یہ ہوا کہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ غالباً سونے، چاندی، جواہرات، مرصع ظروف اور بیش قیمت اشیاء کا اتنا نادر، اتنا قیمتی اور اتنا بڑا ذخیرہ دنیا کے کسی عجائب گھر میں نہیں ہوگا۔

دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول حضرت مولانا ندوی مدظلہم، سلاطین آلِ عثمان نے صدیوں متمدن دنیا کے غالباً سب سے بڑے حصے پر حکومت کی ہے، بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے سلاطین ان کے باج گذار اور زیر اثر رہے ہیں، اور وہ سب سلاطین آلِ عثمان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے تملّق کی حد تک سلاطین آلِ عثمان کو بیش قیمت تحفے بھیجتے رہے ہیں، یہ تمام تحفے اور خود سلاطین آلِ عثمان نے اپنے شوق

سے اپنے اور اپنی بیگمات کے لیے جو قیمتی چیزیں تیار کیں، وہ سب یہاں محفوظ ہیں۔

سلطان سلیم نے ایران کے شیعہ بادشاہ اسماعیل صفوی کو شکست دی تھی، اور اس کا شاہی تخت ایران سے استنبول لے آیا تھا۔ یہ تخت بھی یہاں محفوظ ہے۔ تخت کیا ہے؟ ہیرے جواہرات کا خزانہ ہے۔ اس تخت کے بارے میں لکھا ہے کہ دنیا بھر میں اس کی کوئی نظیر آج بھی موجود نہیں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انسانی صنعت کا یہ شاہکار کمرے میں داخل ہوتے ہی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے، اور میں نے فرنیچر کے قبیل سے کوئی انسانی صنعت اتنی حسین نہیں دیکھی۔ عموماً ہیرے جواہرات سے مرصع اشیاء اتنی بوجھل ہو جاتی ہیں کہ ان کا حسن محفوظ نہیں رہتا، لیکن باوجودیکہ اس تخت میں شاید کوئی اِنچ جگہ بھی جواہر سے خالی نہیں ہے، لیکن انہیں اس نزاکت اور خوبصورتی سے تراشا گیا ہے کہ بس انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔

سلطان عبدالمجید کے زمانے کا ایک فوارہ نظر آیا۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے میں ۴۸ کلو خالص سونا خرچ ہوا ہے، گویا پورے فوارے میں چھیانوے کلوگرام سونا موجود ہے، اور اس کے مختلف حصوں میں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔[1]

خالص سونے کے بنے ہوئے کئی بڑے بڑے شمع دان نظر آئے جن میں سے ایک پر کم از کم بیس بیس سیر سونا صرف ہوا ہوگا۔

الماس اور ہیرے کا اس سے پہلے نام ہی سنا تھا، لیکن کبھی اصیل ہیرا دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی، یہاں ایک بہت بڑا، حسین اور تاریخی ہیرا بھی دیکھا جو چھچھے کی طرح مخروطی گولائی لئے ہوئے ہے، اور ''کشک چہ الماسی'' کہلاتا ہے، یہ ۸۶ قیراط کا ہے،

---

[1] درحقیقت تعیش اور اسراف کا یہی وہ انداز ہے جو قوموں، اور خاص طور پر مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ سلطان عبدالمجید ترکی کے اس دور کے سلطان تھے جب ترکی اپنے انحطاط کے آخری دور میں تھا۔ اور ''مرد بیمار'' بن چکا تھا۔ اس دور میں بھی تعیش کا یہ شوق مکمل تباہی پر منتج نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

www.freepdfpost.blogspot.com

اور اس کے گرد سونے کا نہایت حسین فریم ہے۔ یہ ہیرا اس قدر تابدار ہے کہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک چینی کے انتہائی شفاف گلوب میں کوئی نظر نہ آنے والا بلب روشن ہو، اس کی چمک کا عالم یہ ہے کہ اگر اس کی شعاعوں کو سیدھے زاویے پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھا جائے تو آنکھ خیرہ ہو جائے۔

یہ ہیرا کسی ہندوستانی مہاراجہ کا تھا۔ ایک فرانسیسی جرنیل اسے خرید کر فرانس لے گیا، وہاں اس سے مشہور فرانسیسی فاتح نپولین بوناپارٹ کی ماں نے خرید لیا۔ نپولین اس وقت جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، اور اسے اس مصیبت سے چھڑانے کیلئے بڑی رقم کی ضرورت تھی، لہٰذا نپولین کی ماں نے یہ ہیرا ایک ترکی جرنیل علی پاشا کو ڈیڑھ سو ملین (پندرہ کروڑ) میں بیچ دیا۔ وہاں سے یہ عثمانی خزانے میں آیا اور بالآخر اس عجائب گھر کی زینت بنا۔

سلطان محمد کا ایک خنجر بھی دیکھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے قیمتی خنجر ہے یہ بھی ہیرے جواہرات سے مرصع ہے، اس میں تین زمرد بھی لگے ہوئے ہیں اور اس کے قبضے کے اوپر ایک ڈھکن دار گھڑی بنی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک کمرہ اُن شاہی تحفوں اور تمغوں کیلئے وقف ہے، جو وقتاً فوقتاً یورپ کی مختلف سلطنتیں عثمانی خلفاء کو بطورِ ہدیہ بھیجتی رہیں۔ ان میں اکثر اشیاء بھی سونے اور جواہر سے مرصع ہیں۔ ان میں بیش قیمتی تمغے، سنگھاردان، شمع دان، اسلحہ، ڈبے، برتن، زیورات وغیرہ شامل ہیں۔

صفوی تخت کے علاوہ جس کا اوپر ذکر ہوا اور بھی بہت سے بادشاہوں کے تخت یہاں موجود ہیں، جن میں نادر شاہ، سلطان احمد اوّل وغیرہ کے تخت بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مکمل سونے سے ڈھلے ہوئے ہیں اور جواہرات سے مرصع ہیں۔

غرض اس عجائب گھر میں واقعتہً ایسے نوادر جمع ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا تعارف ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ اور اس لحاظ سے جس کسی نے یہ کہا تھا کہ ترکی دیوالیہ ہونے پر کچھ عرصے توپ کا پے کے نوادر سے کام چلا سکتا ہے، اُس نے بظاہر غلط نہیں کہا تھا۔

یہ عجائب گھر بیشک سیاحوں اور تاریخ دانوں کے لئے ایک دلچسپ تماشا گاہ ہے، لیکن اس سے زیادہ ایک عظیم عبرت گاہ بھی ہے، وہ مال و دولت اور شان و شکوہ جس کیلئے تاریخ میں انسان، انسان کے گلے کاٹتا رہا، جس کیلئے اس کی ساری توانائیاں وقف رہیں، جس کی خاطر اُس نے لڑائی جھگڑے مول لیے، اُن میں سے کوئی چیز اُس کے ساتھ نہ جا سکی، وہ جب دنیا سے گیا تو خالی ہاتھ تھا، دنیا کی یہ ساری چمک دمک دوسروں کے ہاتھ آئی، اور بالآخر سیاحوں کی تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔ یہ وہ ناقابلِ فراموش حقیقت ہے جسے انسان ہمیشہ فراموش کر جاتا ہے، اور اگر زندگی کے منصوبے بناتے وقت انسان یہ سامنے کی حقیقت یاد رکھ لیا کرے تو یہ دنیا جو جھگڑوں اور ناانصافیوں کا جہنم بنی ہوئی ہے، امن و عافیت اور سکون و اطمینان سے گل و گلزار ہو جائے۔

انہی تصورات کے ساتھ دنیا کے اس منفرد عجائب گھر سے واپسی ہوئی۔ ہماری اگلی منزل آیا صوفیا تھی، چنانچہ چند منٹوں میں ہماری گاڑی اس تاریخی عبادت گاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

.....☆.....☆.....

(۳)

آیا صوفیا:

آیا صوفیا سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے فتح ہونے تک عیسائیوں کا دوسرا بڑا مذہبی مرکز بنا رہا ہے۔ تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے عیسائی دنیا دو بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک سلطنت مشرق میں تھی جس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، اور اس میں بلقان، یونان، ایشیائے کوچک، شام، مصر اور حبشہ وغیرہ کے علاقے شامل تھے اور وہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہلاتا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اور دوسری سلطنت مغرب میں تھی جس کا مرکز روم (اٹلی) تھا۔ یورپ کا بیشتر علاقہ اِسی کے زیرنگیں تھا، اور یہاں کا مذہبی پیشوا پوپ یا پاپا کہلاتا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ سیاسی اختلافات کے علاوہ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات جاری رہے، مغربی سلطنت جس کا مرکز روم تھا، رومن کیتھولک فرقے کی تھی، اور ان کا کلیسا رومن کیتھولک چرچ کہلاتا تھا، اور مشرقی سلطنت کے کلیسا کو ''دی ہولی آرتھوڈوکس چرچ'' کہا جاتا تھا۔ ''آیا صوفیا'' کا یہ کلیسا آرتھوڈوکس چرچ کا عالمی مرکز تھا۔ اور اس چرچ کا سربراہ جو بطریرک یا ''پیٹریارک'' کہلاتا تھا، یہیں پر مقیم تھا۔ لہٰذا آدھی عیسائی دنیا اس کلیسا کو اپنی مقدس ترین عبادت گاہ سمجھا کرتی تھی۔

روم اور قسطنطنیہ کے ان دونوں کلیساؤں میں ''آیا صوفیا'' اس لحاظ سے روم کے کلیسا پر فائق تھا کہ یہ روم کے کلیسا کے مقابلے میں زیادہ قدیم تھا۔ اس کی بنیاد تیسری صدی عیسوی میں اُسی رومی بادشاہ قسطنطین نے ڈالی تھی جو روم کا پہلا عیسائی بادشاہ تھا۔ اور جس کے نام پر اس شہر کا نام بیزنطیہ سے قسطنطنیہ رکھا گیا۔ قسطنطین نے اس جگہ ۳۶۰ء میں ایک لکڑی کا بنا ہوا کلیسا تعمیر کیا تھا۔ چھٹی صدی میں یہ کلیسا جل گیا تو اسی جگہ قیصر جسٹینین نے ۵۳۲ء میں اسے پختہ تعمیر کرنا شروع کیا، اور اس کی تعمیر پانچ سال دس مہینے میں مکمل ہوئی۔ دس ہزار معمار اس کی تعمیر میں مصروف رہے، اور اس پر دس لاکھ پونڈ خرچ آیا۔ اس کی تعمیر میں قیصر نے دنیا کے متنوع سنگ مرمر استعمال کئے، چنانچہ فریجیا کا سفید، لکونیا کا سبز، لیبیا کا نیلا، سلٹک کا سیاہ اور باسفورس کا سیاہ دھاری والا سنگ مرمر، مصر کا سنگ ستارہ اور سنگ سماق منگوا کر اس میں استعمال کیا۔ تعمیر میں دنیا کے خاص مسالے استعمال کئے گئے۔ دنیا بھر کے کلیساؤں نے اس کی تعمیر میں بہت سے نوادر نذرانے کے طور پر پیش کئے اور روایت ہے کہ جب جسٹینین اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس میں داخل ہوا تو اس نے کہا ''سلیمان! میں تم پر سبقت لے گیا۔''[1]

[1] حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس تعمیر کیا تھا، اس گستاخانہ جملے میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، گویا ''آیا صوفیا'' اپنی شان میں (معاذ اللہ) بیت المقدس سے بھی بازی لے گیا۔

تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمارت کلیسا کے طور پر ہی نہیں، بلکہ پورے عالم عیسائیت کے مذہبی اور روحانی مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کلیسا کبھی عیسائیوں کے قبضے سے نہیں نکلے گا، اور اس کے ساتھ عیسائیوں کے جذباتی وابستگی کا عالم یہ ہے کہ اس کو ان کے قبضے سے نکلے ہوئے اب صدیاں گذر گئی ہیں۔ لیکن ''آرتھوڈوکس چرچ'' کا سربراہ اب تک اپنے نام کے ساتھ ''سربراہِ کلیسائے قسطنطنیہ'' (The Head of the Church of the Constantinople) لکھتا آیا ہے۔

جب سلطان محمد فاتح کی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہونے لگیں، اور فوجی اعتبار سے بازنطینیوں کو شکست ہوگئی تو شہر کے مذہبی رہنماؤں اور راسخ العقیدہ عیسائیوں نے اسی کلیسا میں اس خیال سے پناہ لے لی تھی کہ کم از کم اس عمارت پر دشمن قبضہ نہیں جما سکتا، مشہور انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن اس منظر کی نقشہ کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''گرجا کی تمام زمینی اور بالائی گیلریاں باپوں، شوہروں، عورتوں، بچوں، پادریوں، راہبوں اور کنواری ننوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھیں، کلیسا کے دروازوں کے اندر اتنا ہجوم تھا کہ ان میں داخلہ ممکن نہ رہا تھا۔ یہ سب لوگ اُس ''مقدس گنبد'' کے سائے میں تحفظ تلاش کر رہے تھے جسے وہ زمانۂ دراز سے ایک ملأ اعلیٰ کی لاہوتی عمارت سمجھتے آئے تھے، اُن کے اس اعتقاد کی بنیاد ایک جوشیلے یا افترا پرداز عیسائی کے ایک الہام پر تھی جس نے بشارت دی تھی کہ ایک دن ترک قوم کے لوگ قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے اور رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے سینٹ صوفیا کے گرجا کے سامنے اس ستون تک پہنچ جائیں گے جو شاہ قسطنطین کے نام سے منسوب ہے، لیکن بس یہی ان کے مصائب کا نقطۂ آغاز ہوگا، کیونکہ اس موقع پر آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لیے نازل ہوگا، اور اس آسمانی ہتھیار کے ذریعے سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کردے گا جو اس

www.freepdfpost.blogspot.com

وقت اس ستون کے پاس بیٹھا ہوگا، فرشتہ اس شخص سے کہے گا: ''یہ تلوار پکڑو، اور اس سے اللہ والوں کا انتقام لو۔'' بس اس حیاتِ آفریں جملے کو سنتے ہی ترک فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے، اور رومی فتحیاب ہوکر ترکوں کو مغرب اور اناطولیہ سے ایران کی سرحدوں تک بھگا دیں گے۔''[1]

لیکن ترک اُس ستون سے بھی آگے بڑھ کر سینٹ صوفیا کے دروازے تک پہنچ گئے، نہ کوئی فرشتہ آسمان سے نازل ہوا، اور نہ رومیوں کی شکست فتح میں تبدیل ہوئی۔ کلیسا میں جمع عیسائیوں کا ہجوم آخر وقت تک کسی غیبی امداد کا منتظر رہا، یہاں تک کہ اس کلیسا کے بارے میں یہ طلسماتی یا اعتقادی توہمات سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے خاک میں مل گئے۔

فتح کے دن فجر کے بعد سلطان محمد فاتح نے یہ اعلان کیا تھا کہ ''انشاء اللہ ہم ظہر کی نماز آیا صوفیا میں ادا کریں گے۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس اعلان کی لاج رکھی، اور اس سرزمین پر پہلی نمازِ ظہر اِسی عمارت میں ادا کی گئی، اور اس کے بعد پہلا جمعہ بھی یہیں پڑھا گیا۔

سلطان محمد فاتح نے اس کلیسا کو مسجد بنا دیا تھا۔[2] اس کی دیواروں سے تصویریں منادی گئی تھیں اور محراب قبلہ رُخ کردی گئی تھی، سلطان نے اس کے میناروں میں بھی اضافہ کردیا تھا، اس کے بعد یہ مسجد ''جامع آیا صوفیا'' کے نام سے مشہور ہوگئی تھی، اور اس میں تقریباً پانچ سو سال تک پنج وقتہ جماعت ہوتی رہی۔ لیکن خلافت کے خاتمے

---

[1] The Decline and Fall of the Roman Empire (Abridged) P: 696, 697

[2] قسطنطنیہ چونکہ سلطان کی طرف سے صلح کی پیشکش کے باوجود بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا، اس لیے مسلمان ان کلیساؤں کو باقی رکھنے کے پابند نہ تھے، خاص طور سے آیا صوفیا کے ساتھ جو باطل مذہبی توہمات وابستہ تھے، انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے بھی سلطان نے یہ اقدام کیا ہوگا۔

کے بعد جب مصطفےٰ کمال پاشا کا زمانہ آیا تو اُس نے اس مسجد میں نماز بند کرکے اُسے ایک میوزیم (عجائب گھر) بنا دیا۔ اور یہ بھی استنبول کے کمالی دور کا ایک المیہ ہے کہ آج تک یہ مسجد ایک میوزیم بنی ہوئی ہے۔ جہاں ہر وقت غیر ملکی سیاح گھومتے رہتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آیا صوفیا کے سامنے ایک خوبصورت چمن ہے، ہم اس سے گذر کر اس کے مرکزی دروازے پر پہنچے، دروازے کے دونوں طرف وہ پتھر نصب ہیں جہاں پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ صدیوں تک ہمہ وقت دو مسلح افراد کے کھڑے ہونے سے ان پتھروں کے بیچ میں گڑھے پڑے ہوئے ہی جو واضح نظر آتے ہیں۔

اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع و عریض ہال نظر آیا جو تقریباً مربع شکل کا ہے، اس کی وسعت غلام گردش اور محراب کو چھوڑ کر جنوباً شمالاً ۲۳۵ فیٹ ہے۔ بیچ کے گنبد کا قطر ۱۰۷ فیٹ اور چھت کی اونچائی ۱۸۵ فیٹ ہے۔ پوری عمارت میں ۱۷۰ ستون ہیں۔ چاروں کونوں پر مسلمانوں نے چھ ڈھالوں پر اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نہایت خوشخط لکھ کر لگایا ہوا ہے۔ مسجدوں میں ان اسمائے گرامی کی تختیاں آویزاں کرنے کا طریقہ ترکی کی بیشتر مساجد میں نظر آتا ہے۔

اس عمارت میں داخل ہوکر یہ تاثر دل و دماغ پر محیط رہا کہ اس خاک پر نہ جانے کتنے مسلمان صدیوں تک اپنے مالک کو سجدے کرتے رہے ہیں ؎

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہی تری بادِ سحر میں

کمال اتاترک نے اپنے مزعومہ ''اصلاحی اقدامات'' کے ذریعے اس مسجد کو نہ صرف محض ایک سیرگاہ بنا کر چھوڑا، بلکہ یہاں نماز پڑھنا قانوناً منع کردیا۔ اگرچہ اتاترک کے وقت سے یہاں سیاحوں کو انفرادی نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، لیکن اب یہ پابندی رفتہ رفتہ ڈھیلی ہورہی ہے، چنانچہ ہم نے عصر کی نماز یہیں پر ادا کی، اور ہمیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

آیا صوفیا سے باہر نکل کر ہم واپس ہوٹل لوٹ آئے۔

آبنائے باسفورس اور طرابیہ

اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد میں ہوٹل سے اُتر کر آبنائے باسفورس کے کنارے چہل قدمی کے لیے نکل گیا، یہ انتہائی دلفریب منظر تھا۔ آبنائے باسفورس کا نام بچپن سے سنتے آئے تھے، اُس کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت بھی کتابوں میں پڑھی تھی، اور تصور میں اُس کا جو نقشہ تھا، حقیقت میں اُس سے کہیں حسین پایا۔ یہ آبنائے شمالاً جنوباً بحر اسود اور بحیرۂ مرمر کو ملاتی ہے، اور شرقاً غرباً یورپ اور ایشیاء کے دو براعظموں کے درمیان حد فاصل کا کام کرتی ہے۔ دو سرسبز ساحلوں کے درمیان نیلگوں سمندر کی یہ دلکش لکیر ۱۸ میل لمبی ہے، اور اس کی سب سے زیادہ چوڑائی اس کے شمالی دہانے پر ہے۔ جہاں اس کا پاٹ پونے تین میل ہے، اور سب سے کم چوڑائی رومیلی حصار کے سامنے ہے، جہاں اس کا پاٹ کل ۸۰۰ گز رہ گیا ہے۔ اس کی گہرائی مختلف جگہوں پر ۴۰ سے لے کر ۱۳۲ گز تک ہے۔

شروع میں باسفورس کے ایشیائی ساحل کے پار علاقہ جو ''اناطولیہ'' کہلاتا تھا، قسطنطنیہ سے بالکل الگ تھا، لیکن اب شہر استنبول بڑھتے بڑھتے ایشیائی ساحل پر دور تک پھیل گیا ہے، اور یہ حصہ ''اسکودار'' کہلاتا ہے، اور اس طرح استنبول وہ واحد شہر ہے جو آدھا یورپ اور آدھا ایشیاء میں واقع ہے، شہر کے دونوں حصوں کو ایک انتہائی پُرشکوہ اور حسین پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، جس کا تذکرہ میں انشاءاللہ آگے کروں گا۔

یہ چونکہ دنیا کی اہم ترین بحری گذرگاہ ہے، اس لیے یہاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے چھوٹے بڑے جہاز گذرتے رہتے ہیں۔ میں باسفورس کے یورپی ساحل پر تھا، سامنے باسفورس کی موجیں شمال سے جنوب کی طرف محوِ خرام تھیں، جن کے یہاں چھوٹی کشتیاں اور درمیانے حجم کے جہاز رواں دواں تھے، اور ان سب کے پیچھے ایشیائی ساحل پر سبز پوش پہاڑیاں اور ان پر بنی ہوئی خوبصورت عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

اس چھوٹی سی آبی گذرگاہ نے تاریخ کے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ہیں، تصور میں سامنے کے ایشیائی ساحل پر کسریٰ کی وہ عظیم فوج خیمہ زن نظر آئی جس نے قیصر روم کو مسلسل شکستیں دے کر قسطنطنیہ میں محصور کر دیا تھا، لیکن پھر اچانک قرآنِ کریم کی وہ حیرت انگیز پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ''رومی عنقریب اپنے مغلوب ہونے کے بعد غالب آ جائیں گے۔'' اور کسریٰ کی فوجوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ کبھی باسفورس کے پار ترک مجاہدین کے گھوڑے دوڑتے دکھائی دیے۔ کبھی سلطان محمد فاتح کی ترکتازیاں نگاہوں کے سامنے آئیں، کبھی باسفورس کے پانی میں عثمانی بحری بیڑہ حرکت کرتا نظر آیا، کبھی یہاں آگ اور دھوئیں کے بادل اُٹھتے محسوس ہوئے، غرض تصورات کی رو تھی جو یہاں چلتے ہوئے باسفورس کے ساتھ ساتھ بہتی رہی، یہاں تک کہ وہ خلیج طرابیہ جس کے کنارے میرا ہوٹل واقع تھا، اُس کا موڑ آ گیا۔

یہ خلیج طرابیہ عثمانی عہد سے بیرونِ ملک کے سفراء کی آبادی تھی، اور یہاں غیر ملکی سفارت خانے ہوا کرتے تھے، لیکن آج یہ استنبول کا ایک مضافاتی محلّہ ہے جس میں زیادہ تر ہوٹل، ریستوران اور چھوٹے چھوٹے تفریحی مقامات بنے ہوئے ہیں، خلیج میں بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں پڑی رہتی ہیں، جو باسفورس عبور کرنے کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔

.....☆.....☆.....

(۴)

قصرِ یلدز میں:

ناشتے کے بعد مذاکرے کا پہلا عملی اجلاس تھا، یہ اجلاس سلطان عبدالحمید کے محل میں منعقد ہونے والا تھا، جو قصرِ یلدز کے نام سے مشہور تھا۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یہ محل کافی عرصے تک بند رہا۔ لیکن اب اس محل میں اسی ''مرکز الأبحاث'' کا مستقر بنا دیا گیا

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے جس کے زیر اہتمام مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے۔

یہاں کئی گھنٹے مذاکرے میں مصروفیت رہی، بعد میں منتظمین نے ''مرکز'' کے مختلف دفاتر کا دورہ کرایا، مرکز کے سربراہ ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو ایک علمی ذوق کے ترکی نژاد نوجوان ہیں جو عربی اور انگریزی بہت بے تکلف بولتے ہیں، انہوں نے اس مرکز اور خاص طور پر اس کے کتب خانے کو بڑی خوش مذاقی سے ترتیب دیا ہے، اسلامی علوم کی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ نظر آیا، اور مختلف موضوعات پر بہت سے مصنفین کام کرتے نظر آئے۔

مرکز کے معائنے کے بعد قصر یلدز کے مختلف حصے بھی دکھائے گئے۔ یہ ایک سادہ سا محل ہے، جس میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا کوئی انداز نظر نہیں آتا۔ سلطان عبدالحمید جو آخری دورِ خلافت عثمانیہ کے بڑے مقتدر خلیفہ تھے، یہیں رہا کرتے تھے، ان کے دفاتر بھی اسی عمارت میں تھے، تمام عمارتیں بہت سادہ ہیں، اور تکلف اور تصنع کا نام نہیں ہے۔

یہ محل استنبول کے وسطی علاقے میں ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے، جہاں سے استنبول شہر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اب محل سے باہر اس پہاڑی پر ایک تفریحی پارک بنا ہوا ہے۔ محل کے دروازے سے بالکل متصل ایک مسجد ہے جو سلطان عبدالحمید ہی نے تعمیر کی تھی، اور وہ اِسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، ہم مذاکرے کے اجلاسات کے دوران اِسی مسجد میں نمازیں پڑھتے رہے۔ یہ ایک خوبصورت مسجد ہے، اور ترکی کی مساجد کا مشترک سانچہ یہاں بھی جلوہ گر ہے۔ چونکہ یہ مسجد سلطان عبدالحمید کی یادگار ہے، اس لئے اس میں کئی یادگاریں بھی محفوظ ہیں۔ جن میں سب سے جلیل القدر یادگار سرکارِ دوعالم ﷺ کے موئے مبارک ہے۔ لیکن ان کی زیارت بھی ہر وقت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے خاص تاریخیں مقرر ہیں۔

مسجد کے امام صاحب سے اس دوران اچھا خاصا تعارف ہو گیا تھا۔ ہم نے ان کی کافی منتیں کیں کہ وہ شرکاء مذاکرہ کو اس مقدس تبرک کی زیارت کرا دیں، لیکن وہ قواعد و ضوابط کی وجہ سے مجبور و معذور تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خواہشمند ہیں کہ ہمیں اس سعادت سے بہرہ ور کریں، لیکن کر نہیں سکتے۔

اسی مسجد میں قرآنِ کریم کا ایک نہایت قدیم قلمی نسخہ بھی ہے جو خط کوفی میں لکھا ہوا ہے، اس پر لکھی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری صدی ہجری میں لکھا گیا اور ایک کونے پر ''بخط حضرت علیؓ'' بھی لکھا ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

منبر پر صنوبر کی بنی ہوئی ایک نفیس رحل رکھی ہوئی ہے جس پر ہاتھی دانت کا کام ہے۔ امام صاحب نے بتایا کہ یہ سلطان عبدالحمید کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔ سلطان عبدالحمید کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا، اور مسجد کیلئے لکڑی کی کئی چیزیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔

عام طور سے بادشاہ اور سربراہانِ مملکت مسجدیں محل کے اندر بنوایا کرتے تھے، لیکن یہ مسجد محل کے دروازے سے باہر ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سلطان عبدالحمید نے ایسی مسجد میں نماز پڑھنا پسند نہ کیا ہو جس میں عام لوگ داخل نہ ہو سکیں، اسی لئے اس مسجد کو باہر رکھا ہو۔ واللہ اعلم

اس محل میں تین دن مذاکرہ جاری رہا۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید مذاکرہ تھا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے جو ترجمے ہوئے ہیں، اُن پر مختلف ملکوں کے شرکاء نے مفصل تنقیدی مقالے لکھے تھے، جو مذاکرے کی مختلف نشستوں میں پیش کئے گئے۔ ہر مقالے کے بعد اس پر مناقشے کا موقع دیا گیا جس میں ترجمہ قرآنِ کریم کے بارے میں بہت سے اُصولی مسائل بھی زیر بحث آئے۔ مناقشے کے دوران مختلف مسائل پر احقر کو بھی اظہارِ خیال کا موقع ملا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس مذاکرے میں شرکت کے بعد پہلی بار اس کوتاہی کا نہایت شدت سے احساس ہوا کہ ہم مسلمانوں نے قرآنِ کریم کے ترجمے کا انتہائی اہم اور نازک کام کس طرح غیر مسلموں کے حوالے کر رکھا ہے، اور وہ اس میدان پر قابض ہو کر کس طرح اسلام کی تحریف اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جو زبانیں دنیا میں زیادہ بولی جاتی ہیں، ان میں تو بحمد اللہ مسلمانوں کے ترجمے بھی منظر عام پر ہیں، لیکن کم بولی جانے والی زبانوں میں زیادہ تر غیر مسلموں کے تراجم ہی چھپے ہوئے ہیں۔ یہ تحقیق و تصنیف کیلئے ایک ایسا اُفق ہے جس کی طرف ابھی تک کسی مسلمان تنظیم یا ادارے نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی، اور اس بات کی شدید ضرورت

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ اس کام کا بیڑہ اُٹھا کر استقامت کے ساتھ یہ فرضِ کفایہ انجام دے۔ اس مذاکرے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس عظیم کام کی اہمیت وضرورت سامنے آئی، اور حاضرین کے دل میں اس کام کا ایک جذبہ پیدا ہوا۔

مذاکرے کے اختتامی اجلاس میں ڈاکٹر اوگلو کی فرمائش پر مندوبین کی طرف سے ''کلمۃ الوفود'' کے طور پر احقر نے تقریر کی جس میں اس اہم اور ضروری کام کی تکمیل کیلئے کچھ مثبت تجاویز بھی پیش کیں جو مذاکرے کی سفارشات کا ایک حصہ بنیں۔ طے یہ ہوا کہ اس کام کو آگے بڑھانے کیلئے ''مرکز الأبحاث'' اور ''جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ'' مسلمانوں کی بڑی بین الاقوامی تنظیموں ''مثلاً منظمۃ المؤتمر الاسلامی'' اور ''رابطۃ العالم الاسلامی'' وغیرہ سے بات چیت کر کے اسے ایک منظم شکل دینے کی کوشش کریں گے۔

باربروسا:

مذاکرے کے دوران مختلف اداروں کی طرف سے شرکائے مذاکرہ کی دعوتیں بھی ہوتی رہیں، جن کی وجہ سے شہر کے مختلف حصوں میں جانا ہوا، ایک دعوت ایک ایسے ہوٹل میں تھی جو باسفورس کے کنارے واقع تھا، اور اس کے قریب سمندر کے ساحل پر ایک پلیٹ فارم جیسا بنا ہوا ہے، اور اسی کے بازو میں ایک مزار بھی ہے۔ رہنماؤں نے بتایا کہ یہ مزار مشہور ترک بحری مجاہد خیر الدین باربروسا کا ہے، اور یہ پلیٹ فارم ان کے زمانے میں بندرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خیر الدین باربروسا تاریخ اسلام کے مشہور جہاز راں ہیں جن کے بحری بیڑے سے سقوطِ اُندلس کے بعد وہاں کے ستم رسیدہ مسلمانوں کو اُندلس سے نکال کر مراکش اور الجزائر پہنچانے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ بحر روم ان کی ترکتازیوں کا مرکز تھا، اور ان کی وجہ سے بحری مہمات کی تاریخ میں باربروسا کا نام زندۂ جاوید ہوگیا۔ اقبال مرحوم نے غالباً انہی کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

تاریخ اسلام کے اس مایۂ ناز مجاہد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

متفرق مصروفیات:

دار العلوم کے ایک ترکی طالب علم خیر اللہ دمری استنبول میں مقیم ہیں، اور تجارت کے علاوہ تبلیغی خدمات بھی انجام دیتے رہتے ہیں، وہ احقر کی آمد کی خبر سن کر تقریباً روز ہوٹل آتے رہتے، اُن کی خواہش تھی کہ کسی وقت کھانا ان کے یہاں کھایا جائے۔ چنانچہ مذاکرے کے دوران ہی ایک روز دوپہر کا کھانا ان کے یہاں کھایا۔ یہ استنبول کا ایک اوسط درجے کا محلّہ تھا۔ یہاں عام ترکی مسلمانوں سے ملاقات کا موقع ملا، ان سب کے دل اسلام کی محبت سے معمور دکھائی دیئے، اس محلے میں زیادہ تر خواتین باپردہ نظر آئیں۔ صفائی ستھرائی اور اندازِ زندگی کا سلیقہ ترکی کی قوم کا امتیاز ہے جو ان سب میں بدرجۂ اتم محسوس ہوا۔

خیر اللہ دمری صاحب نے ترکی کھانوں کی خاص خاص چیزیں پکوانے کا اہتمام کیا تھا، اور قدیم ترکی انداز سے کھلانے کا بھی، فرش پر ایک بڑا سا تھال رکھ دیا گیا، اس میں مختلف انواع کے کھانے تھے، اس تھال کے اردگرد بڑے بڑے پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں حسب منشاء کھانا نکال کر کھایا جائے، کھانے سب بہت اچھے بنے ہوئے تھے، لیکن اُن کے نام یاد رکھنے کیلئے خاصی ریاضت درکار تھی جس کا موقع نہ مل سکا۔

سنا کرتے تھے کہ عربی کتابوں کے ساتھ کمال اتاترک کی دراز دستیوں کے باوجود استنبول میں عربی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے کہ عربی کتب سے پابندی اُٹھنے کے بعد جگہ جگہ نادر کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہوا کرتی تھیں، سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اور دوسرے ملکوں کے اصحاب ذوق یہاں سے جھولیاں بھر بھر کر کتابیں لے جاتے رہے، اب رفتہ رفتہ وہ بہتات تو ختم ہوگئی ہے، لیکن کتابوں کے کباڑیوں کے پاس اب بھی بڑے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے خیر اللہ دمری صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھے کسی قدیم کتب فروش کے پاس لے جائیں۔

اس طرح ہم استنبول کے قدیم بازاروں میں پہنچے، یہ بازار قسطنطنیہ کی اس قدیم

www.freepdfpost.blogspot.com

فصیل کے اندر واقع ہے جس کا ذکر فتح قسطنطنیہ کے ذیل میں کر چکا ہوں، یہاں ایک بازار کی مسجد میں نمازِ عصر ادا کی، اور اس کے باہر کتابوں کی مختلف دکانوں میں گئے، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ عربی کتابوں کی بہتات کا وہ دور گذر چکا، اب کسی کسی کتب خانے میں کچھ پرانی کتابیں موجود ہیں، وہ بھی غیر اہم قسم کی۔ لہٰذا تقریباً گھنٹہ بھر کی تلاش کے بعد چار پانچ کتابوں سے زیادہ نہ خرید سکا۔

یہیں پر ایک چوک میں بنے ہوئے ایک مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خیر اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ ابراہیم متفرقہ کا مجسمہ ہے، اور یہ وہ شخص ہے جس نے ۱۷۴۵ء (بارہویں صدی ہجری) میں پہلی بار پریس بنایا تھا۔

جامع ابوایوب انصاریؓ:

مذاکرے کے اختتام کے بعد اگلے دن منتظمین نے استنبول کے مختلف مقامات کی سیر کے لیے ایک اجتماعی پروگرام ترتیب دیا تھا۔ لیکن خیر اللہ دمری صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ میں مقید ہونے کے بجائے اُن کے ساتھ دو دن گزاروں، کیونکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جو اس کے بغیر نہ دیکھے جا سکیں گے۔ چنانچہ وہ ۱۴؍ رجب کی صبح اپنے ایک رفیق کے ساتھ ہوٹل پہنچ گئے۔ ڈاکٹر یوسف قلیچ بھی اپنی محبت کی بنا پر میرے ساتھ چلنے کیلئے ہوٹل آ گئے، جب ہم چلنے لگے تو ہوٹل کی لابی میں ڈاکٹر ارونگ (Irving) سے ملاقات ہوگئی۔ یہ مشہور امریکی نژاد نو مسلم ہیں جنہوں نے انگریزی میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا ہے، اور اب احادیث کی کتابوں کا بھی ترجمہ کر رہے ہیں، مذاکرے میں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، پاکستان بھی کئی بار آئے ہیں۔ انہوں نے جب ہمارے علیحدہ پروگرام کے بارے میں سنا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ جانے کے بجائے ہمارے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی، اس طرح ہم پانچ افراد ہو گئے۔

سب سے پہلے ہم جامع ابوایوب انصاریؓ جانا چاہتے تھے، جہاں نبی کریم ﷺ کے اس مقدس میزبان کا مزار بھی واقع ہے، کیونکہ استنبول میں سب سے زیادہ اشتیاق وہیں حاضر

ہونے کا تھا۔ یہ مقام ہمارے ہوٹل سے بہت دور تھا، کیونکہ ہم باسفورس کے کنارے پر تھے اور یہ مزار استنبول کے انتہائی جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں قسطنطنیہ کی وہ قدیم فصیلیں بھی قریب سے دیکھیں جو ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں، اور اب اُن کے کھنڈر ہی ان کے ماضی کے شان و شکوہ کی داستان سناتے ہیں۔ بالآخر خاصے طویل سفر کے بعد ہم جامع ابوایوبؓ پہنچ گئے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کسی مسلمان کیلئے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ آپ کا نام خالد بن زیدؓ تھا۔ آپ مدینہ طیبہ کے قبیلہ بنو خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ بالکل ابتداء میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اور آپؓ ہی وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کو آنحضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک مہینے تک آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، آنحضرت ﷺ کی ناقہ قصواء آپؓ ہی کے مکان پر آ کر رُکی تھی۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کی خواہش کے مطابق انہوں نے آپ ﷺ کو نچلی منزل میں ٹھہرایا تھا، اور خود اپنی اہلیہ کے ساتھ اوپر کے کمرے میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ اوپر کے کمرے میں پانی گر گیا، آپؓ کو یہ خطرہ ہوا کہ یہ پانی کہیں ٹپک کر سرکار ﷺ کو تکلیف نہ پہنچائے، اس لئے آپؓ اور آپ کی اہلیہ چادر لے کر پانی کو جذب کرتے رہے۔

آپؓ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضرت علیؓ نے آپؓ کو مدینہ منورہ کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ لیکن پھر شوقِ جہاد میں آپؓ حضرت علیؓ کے پاس پہنچ گئے، اور خوارج کے خلاف جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہوئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں جو پہلا لشکر قسطنطنیہ پر حملے کیلئے روانہ کیا، اس میں آپ بھی شامل تھے، جس کا تذکرہ شروع میں کر چکا ہوں۔ یہاں محاصرہ طویل ہوا تو آپ بیمار ہو گئے، یزید آپ کی بیمار پرسی کیلئے حاضر ہوئے اور آپ سے پوچھا کہ کوئی خدمت بتائیے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''بس میری ایک خواہش ہے، اور وہ یہ کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کو گھوڑے پر رکھ کر دشمن کی سرزمین

www.freepdfpost.blogspot.com

میں جتنی دور تک لے جانا ممکن ہو، لے جانا اور وہاں لے جا کر دفن کرنا۔'' اس کے بعد آپؓ کی وفات ہوگئی، تو یزید نے آپؓ کی وصیت پر عمل کیا، اور قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب آپؓ کو دفن کیا گیا۔[1]

تاریخ میں ہے کہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد اہتمام کے ساتھ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کی تلاش شروع کی، اور ایک بزرگ کی نشاندہی پر اس جگہ وہ دستیاب ہوگئی۔ سلطان محمد فاتح نے ''جامع ابوایوب'' کے نام سے یہاں مسجد تعمیر کی۔[2] اور اس وقت سے یہ جگہ زیارت گاہ خاص و عام ہے، یہ پورا محلّہ ''ابوایوب'' ہی کہلاتا ہے، مزارِ مبارک پر لوگ اکثر بیٹھے ہوئے تلاوت کرتے رہتے ہیں۔

یہ مقدس صحابی جنہیں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کی میزبانی کا شرف بخشا تھا، اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اللہ تعالیٰ کے دین کا پیغام لیے ہوئے اس دیارِ غربت میں راہیٔ آخرت ہوئے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی خواہش تھی تو یہ کہ اس کلمے کو لیے ہوئے دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک جاسکوں، چلا جاؤں۔ وفات کے بعد صدیوں تک کسی کو آپ کی آخری آرام گاہ کا علم بھی نہ تھا، لیکن دیکھا جائے تو قسطنطنیہ کے اصل فاتح آپ ہی ہیں، آپ ہی کے ذریعے اس سرزمین پر پہلی بار اسلام کا کلمہ پہنچا، اور آپ ہی کے وسیلے سے اس خاک کو ایک صحابیِ رسول ﷺ کا مدفن بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

جامع ابوایوبؓ کو سلاطین آلِ عثمان نے ہمیشہ استنبول کا مقدس ترین مقام سمجھا، اور ہمیشہ یہ طریقہ جاری کیا کہ ہر نئے سلطان کی تاج پوشی اسی مسجد میں ہوا کرتی تھی، جس کے لیے یہاں ایک مخصوص جگہ بنی ہوئی ہے۔ تاج پوشی کی رسم تاج پہننے کے بجائے سلطان عثمان خان کی تلوار نئے سلطان کی کمر میں باندھ کر ادا کی جاتی تھی۔

جامع ابوایوبؓ سے باہر نکلیں تو ایک وسیع صحن ہے جس میں کبوتر بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں، اور لوگ ان کو دانہ ڈالتے رہتے ہیں، اس میدان کے دائیں جانب ایک

[1] الاصابہ۔ ص:۴۰۵، ج:۱

[2] تاریخ دولت عثمانیہ۔ از: ڈاکٹر محمد عزیر۔ ص:۱۲۱، ج:۱

چبوترے پر چنار کے دو بہت بڑے درخت ہیں جو دیکھنے ہی سے بہت قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت صحابہ کرامؓ کے زمانے کے ہیں۔ واللہ اعلم

فاتح نماز گاھی

جامع ابوایوبؓ سے ہمیں خیر اللہ صاحب استنبول کے ایک اور قدیم علاقے میں لے گئے، یہ جگہ غیر آبادی ہے، جس میں کچھ کھنڈر نظر آتے ہیں، کچھ بوسیدہ مکانات بھی ہیں جن میں کچھ لوگ رہتے ہیں، اس جگہ کو ''فاتح نماز گاھی'' کہا جاتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ فتح قسطنطنیہ کے دن سلطان محمد فاتح نے اس جگہ دو رکعت نماز پڑھ کر آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ یہاں ایک پرانا ستون بنا ہوا ہے جس پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے، مگر پڑھی نہیں جاتی۔ کہتے ہیں یہ سلطان محمد فاتح کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے، یہاں کسی زمانے میں ایک مسجد بنادی گئی تھی جو اب ٹوٹ پھوٹ گئی اور غیر آباد پڑی ہے۔

خشکی پر جہاز چلانے کی جگہ..... قاسم پاشا:

یہاں سے ہم قاسم پاشا گئے۔ یہ گولڈن ہارن کا وہ کنارہ ہے جہاں سے سلطان محمد فاتح نے اپنے جہاز خشکی سے گذار کر سمندر میں اُتارے تھے۔ یہ جگہ آج بھی کشتیوں کی چھوٹی بندرگاہ کے طور پر استعمال ہورہی ہے، اور یہاں ترکی بحریہ کی ایک چوکی بھی ہے، یہاں ہم گاڑی سے اُترے اور اُس سمت نظر ڈالی جہاں سے یہ جہاز لاکر سمندر میں ڈالے گئے تھے۔ یہ واقعہ تاریخ میں تو بار بار پڑھا تھا، اور اس پر تعجب بھی ہوا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ اس لئے کہ یہاں کھڑے ہوکر باسفورس کی اس سمت دیکھیں جہاں سے یہ جہاز لائے گئے تھے تو بیچ میں کئی بلند پہاڑ نظر آتے ہیں جو عرض میں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مسطح خشکی پر سے جہاز لے جانا بھی بذاتِ خود بہت حیرت انگیز تھا، لیکن ان پہاڑوں پر جہازوں کو چڑھا کر اُتارنا تو اس قدر محیر العقول ہے کہ اگر کوئی شخص اس علاقے کو دیکھ کر اس کا تصور کرے تو پسینہ آجائے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان پہاڑوں کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص یہ ارادہ ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

کیسے کرسکتا ہے کہ وہ ان پر جہاز چڑھا کر لے جائے گا۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اس کو عزم و ہمت بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ دس میل کے اس انتہائی ناہموار پہاڑی علاقے پر جہاز لے جانے کی تجویز کا ذہن میں آنا، اُس پر عملدرآمد کا حوصلہ پیدا ہونا، اور ایک رات میں اس منصوبے کو پورا کر لینا یقیناً سرکارِ دو عالم ﷺ کا معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک اُمتی کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا۔

یہیں سے ''گولڈن ہارن'' کا بھی قریب سے نظارہ کیا، یہ ایک مستطیل خلیج ہے، جو باسفورس سے مشرق میں خشکی کی طرف نکل آئی ہے، اور اس کی شکل ''سینگ'' کے مشابہ ہے۔ اسی نے قسطنطنیہ کی فصیل سے طلوعِ آفتاب کے وقت اُسے دیکھا تو سورج کی کرنوں کی وجہ سے اس کا رنگ سنہرا نظر آ رہا تھا، اس لئے اس نے کہا کہ یہ ایک ''سنہرا سینگ'' ہے، اس وقت سے اس کا نام ''گولڈن ہارن'' (سنہرا سینگ) مشہور ہو گیا۔ جسے عربی میں ''القرن الذھبی'' اور فارسی میں ''شاخِ زرّیں'' بھی کہا جاتا ہے۔ استنبول کی بندرگاہ بھی اسی خلیج میں واقع ہے، اور یہ شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان حد فاصل ہے، اور ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے اس پر کئی پل بنے ہوئے ہیں جن پر ہر وقت ٹریفک کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔

بُرج غلاطہ

یہاں سے ہم لوگ استنبول کے قدیم ترین بُرج ''غلاطہ'' گئے۔ یہ ایک نہایت قدیم ٹاور ہے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ ۵۰۷ء یعنی (تقریباً ۱۴۸۰ سال پہلے) رومی حکومت نے جہازوں کی رہنمائی کیلئے لائٹ ہاؤس کے طور پر تعمیر کیا تھا، اور شاید اپنے زمانے میں بلند ترین ٹاور سمجھا جاتا تھا، بعد میں اس کی توسیع و مرمت ہوتی رہتی ہے۔ اب بھی باہر سے اس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں، لیکن ابھی تک یہ پوری طرح قابل استعمال ہے۔ یہ ٹاور مسلمانوں کی فتح قسطنطنیہ سے پہلے شہر سے باہر گولڈن ہارن کے شمالی ساحل پر واقع تھا۔ اور یہاں یورپ کے تجار آباد تھے۔ اس بستی کا نام غلاطہ (Galata) تھا۔ اسی کے نام پر یہ بُرج موسوم ہے۔

یہ دس منزلہ بُرج ہے۔ اب اوپر جانے کیلئے اس میں لفٹ لگی ہوئی ہے جو ساتویں منزل تک جاتی ہے، اس کے بعد تین منزلیں زینے کے ذریعے طے کی جاتی ہیں، یہاں سے استنبول کا نظارہ بڑا دلکش ہے۔ جس جگہ لفٹ جا کر ختم ہوتی ہے، وہاں ایک متوسط سائز کا کمرہ ہے جس میں کچھ آثار قدیمہ محفوظ ہیں۔ اسی کمرے کی ایک دیوار پر چمڑے کے بنے ہوئے دو پَر لٹکے ہوئے ہیں، اور ان کا تعارف کراتے ہوئے برابر میں ترکی اور انگریزی زبان میں ایک عبارت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پَر اُس مسلمان مہم جو خدا قفین احمد کے بنائے ہوئے جس نے ان پَروں کے ذریعے سترہویں صدی عیسوی میں فضاء میں اُڑنے کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ اس شخص نے سلطان مراد چہارم کے زمانے (۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء) میں بُرج غلاطہ سے ان پروں کے ذریعے باسفورس پر پرواز کی تھی، اور باسفورس کے ایشیائی ساحل اسکودار سے ہوتا ہوا ایک مقام اسکوتاری تک چلا گیا تھا، گویا تقریباً آٹھ میل کا فاصلہ اُس نے اُڑ کر طے کیا تھا۔[1]

جامع سلیمانیہ:

یہاں سے ہم استنبول کی مشہور تاریخی مسجد ''جامع سلیمانیہ'' دیکھنے کیلئے گئے۔ یہ مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے استنبول کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اور فن تعمیر کے لحاظ سے دنیا کی گنی چنی مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ یہ مشہور عثمانی خلیفہ ''سلیمانِ اعظم'' کے دور میں تعمیر ہوئی تھی جو ترکی خلافت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، اُس دور کے شہرۂ آفاق معمار ''زینان'' نے اس کی تعمیر میں اپنے فن کی تمام صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔ یہ وہی زینان ہے جس کا نام سول انجینئرنگ کے میدان میں آج بھی مشہور و معروف ہے۔ سلیمانِ اعظم کے حکم پر زینان نے یہ مسجد دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں تعمیر کی تھی، اور اس کا سنگ بنیاد شیخ الاسلام ابوالسعود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا۔

[1] تاریخ میں انسان نے پَر لگا کر ہوا میں اُڑنے کے بہت سے تجربے کیے ہیں۔ غالباً سب سے پہلا تجربہ عربی کے مشہور لغوی اسمٰعیل بن حماد جوہری نے کیا تھا، لیکن یہ تجربہ ناکام رہا، اور وہ اسی تجربے میں ہلاک ہوئے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

مسجد کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی دائیں جانب وضو کا بہترین انتظام ہے۔ نمازِ ظہر کا وقت ہو چکا تھا، ہم نے یہیں پر وضو کیا، اور نمازِ ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

دنیا بھر کے بے شمار اقسام کے پتھروں سے مزین یہ مسجد ایک وسیع ہال پر مشتمل ہے، جس کی ہر جانب میں فنکاری کے دل آویز نمونے جلوہ گر ہیں، کہتے ہیں کہ جو پتھر اس مسجد میں استعمال کئے گئے ہیں، انہیں یہاں تک لانے کیلئے بار برداری کا خرچ اُن کی اصل قیمت سے زیادہ ہوتا تھا۔ اکثر پتھر ۱۵۰۰ کلوگرام کے ہوتے تھے، جو بیل گاڑیوں میں لائے جاتے تھے اور بعض اوقات زیادہ وزنی پتھروں کو منتقل کرنے کیلئے بیلوں کی دس دس جوڑیوں پر مشتمل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

مسجد کے منبر اور محراب مسجد سلطان احمد کی طرح انتہائی پُرشکوہ ہے۔ یہ ہال ۶۹ میٹر لمبا اور ۶۳ میٹر چوڑا ہے، اور اس میں ۱۳۸ کھڑکیاں ہیں۔ ہال میں جگہ جگہ ایسی شمعیں آج بھی نصب ہیں جو کم از کم ۱۰، ۱۰ فٹ اونچی اور ۳۔۳ فٹ موٹی ہیں، رات کے وقت ان شمعوں سے روشنی کی جاتی تھی۔ لیکن اس بات کا اندیشہ تھا کہ شمعوں سے اُٹھنے والا دھواں دیواروں کو خراب کر دے گا۔ اس لیے شمعوں کے اوپر خوبصورت چمنیاں بنائی گئی تھیں جو سارا دھواں اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں، اور اس میں بھی اس بات کا اہتمام تھا کہ چمنیوں کے اندر کا یہ دھواں بھی بے کار نہ جائے، چنانچہ اس دھویں سے سیاہی پیدا ہوتی تھی، اس سے لکھنے کیلئے روشنائی تیار کی جاتی تھی۔

تاریخ میں ہے کہ جس زمانے میں اس مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی، اس زمانے میں کسی وقت کسی مجبوری سے کچھ دن کیلئے تعمیر کا کام روکنا پڑا۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے اپنے ایک ایلچی کے ذریعے سلیمانِ اعظم کے پاس بہت بھاری رقم اور کچھ قیمتی جواہر ارسال کئے، اور پیغام بھیجا کہ اس مسجد کی تعمیر میں ہم بھی حصہ لینا چاہتے ہیں، اس لیے یہ رقم اور جواہر فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد میں لگالی جائے۔

جب ایلچی سلیمانِ اعظم کے پاس پہنچا تو اُس نے وہ رقم فوراً مساکین کو تقسیم کرنے کیلئے اپنے کسی آدمی کے حوالے کی اور سفیر سے کہا کہ: ''تم لوگ نماز تو پڑھتے نہیں ہو، پھر تمہاری رقم مسجد میں کیسے لگائی جائے۔'' اور جواہر کے بارے میں حکم دیا کہ ''ہم نے مسجد کے میناروں میں

انواع واقسام کے پتھر استعمال کئے ہیں، یہ جواہر مینار کے پتھروں کے طور پر استعمال کئے جائیں۔'' سفیر یہ سن کر بھونچکا رہ گیا، لیکن سلیمانِ اعظم نے اپنے اسی فیصلے پر عمل کیا۔

ہمارے رہنما خیر اللہ دمرسی صاحب نے اسی دور کا ایک اور عجیب واقعہ سنایا۔ اور وہ یہ کہ جامع سلیمانیہ کی تعمیر کے دوران یورپ کے کسی ملک (غالباً اٹلی) کے ایک کلیسا نے اپنے ملک کے سرخ سنگ مرمر کی ایک بہترین سل تحفے میں بھیجی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ سل اس مسجد کی محراب میں لگالی جائے۔ جب سل پہنچی تو زینان معمار نے سلیمانِ اعظم سے کہا کہ میں یہ سل محراب میں لگانا مناسب نہیں سمجھتا، اگر آپ فرمائیں تو اسے مسجد کے ایک دروازے کی دہلیز میں لگا دیا جائے، سلیمانِ اعظم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور وہ پتھر دہلیز میں لگا دیا گیا۔

زینان کو یہ شبہ بھی تھا کہ ان اہل کلیسا نے اس پتھر میں کوئی شرارت نہ کی ہو، چنانچہ اس نے ایک روز امتحاناً اس پتھر کو کسی خاص مسالے سے گھس کر دیکھا کہ اس کے اندر کیا ہے؟ گھسنے کے بعد اسی پتھر کے اندر سیاہ رنگ کی ایک صلیب بنی ہوئی نمودار ہوئی۔ یہ پتھر آج بھی دروازے کی دہلیز میں نصب ہے۔ اور اس میں صلیب کا نشان آج بھی نظر آتا ہے، جو اب قدرے دھندلا گیا ہے، لیکن پھر بھی خاصا واضح ہے، جو اُن اہل کلیسا کے مکر وفریب اور مسجد کے معماروں کی فراست وبصیرت کی گواہی دے رہا ہے۔

مسجد کے باہر ایک احاطے میں بہت سی قبریں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک قبر سلیمانِ اعظم کی بھی ہے۔ ان کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔

.....☆.....☆.....

(۵)

سلیمانِ اعظم:

سلیمانِ اعظم کا دور سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ کا سب سے درخشاں دور ہے، یہ خلافت عثمانیہ کے اُسی عروج کا زمانہ ہے جس کی سرحدیں زوال سے جا ملا کرتی ہیں۔ سلیمانِ اعظم

www.freepdfpost.blogspot.com

نے ۹۲۶ھ سے ۹۷۴ھ تک اڑتالیس سال جس جاہ وجلال اور دبدبے کی حکومت کی، اُس کی نظیریں تاریخ اسلام، بلکہ تاریخ عالم میں بھی خال خال ہیں۔ اُس زمانے میں خلافتِ عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوشحالی میں اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی، اور شاید تاریخ اسلام میں اتنی وسیع حکومت کسی اور کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یورپ، ایشیاء اور افریقہ تین براعظموں کے بڑے بڑے خطے اس کے زیرنگیں تھے، اور ہنگری سے لے کر بحرِ ہند تک اُس کی شوکت وعظمت کا پرچم لہراتا تھا۔

سلیمانِ اعظم بذاتِ خود بڑا عادل اور انصاف پسند انسان تھا، اُس کے عہد میں (ایک دو افسوسناک واقعات کے سوا) عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، اُس نے (شاید پہلی بار) اپنی سلطنت کے لئے ایک باقاعدہ قانون مدوّن کیا تھا۔ اور اسی لئے اس کو "سلیمان قانونی" بھی کہا جاتا ہے۔ اُس کے عدل وانصاف کی وجہ سے مسیحی علاقوں کے باشندے ترکِ وطن کرکر کے اُس کے علاقے میں آباد ہوتے تھے۔ سلطنت کے انتظام اور عدل وانصاف کے معاملے میں وہ اتنا سخت تھا کہ اُس نے خود اپنے داماد فرہاد پاشا کو رشوت اور ظلم کی بنا پر ایک صوبے کی حکومت سے معزول کیا، پھر فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی والدہ نے بڑی التجاؤں کے بعد اُسے دوبارہ مقرر کرادیا، لیکن جب اُس نے دوبارہ بدعنوانیاں شروع کیں تو اُسے معزول کرکے قتل کرادیا۔

زینان معمار

سلیمانِ اعظم کے مزار کے قریب ہی جامع سلیمانیہ کے معمار زینان کی قبر بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کا وہ مشہور معمار ہے جس کو فن تعمیر کا امام مانا گیا ہے۔ تاریخ میں ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں ایک سو چھتیس مسجدیں، ستاون مدرسے، سات مکتب، بائیس مقبرے، بائیس طعام خانے، تین ہسپتال، چودہ پُل، بیس مسافر خانے، پینتیس محل، اکتالیس حمام اور آٹھ گودام تعمیر کئے۔ اس طرح ترکی میں اس کی تین سو ساٹھ یادگاریں اس کے مرنے کے بعد محفوظ رہیں۔[1]

[1] جامع السلیمانیۃ۔ نشأۃ وخصائصہ از سلیمان ملا ابراہیم آملو۔ ص: ۱۲

ان یادگاروں میں جامع سلیمانیہ اس کا سب سے بڑا شاہکار ہے، جس کے بارے میں برنارڈ لوئس لکھتا ہے:

"جامع سلیمانیہ زینان کا حسین ترین فنی شہ پارہ ہے، اور زینان باتفاقِ مؤرخین سب سے بڑا معمار تھا۔"[1]

کتب خانہ سلیمانیہ:

جامع مسجد کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک وسیع عمارت اور ہے جو خلافتِ عثمانیہ کے دور میں ایک بڑے دارالعلوم کے طور پر استعمال ہوتی تھی، اور اب اسے ایک کتب خانے میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ استنبول کے عظیم ترین کتب خانوں میں سے ہے۔ استنبول چونکہ صدیوں عالم اسلام کا مرکز رہا ہے، اس لیے اس کے کتب خانے بھی عالم اسلام کے عظیم کتب خانے شمار ہوتے ہیں، اور اب کتب خانہ سلیمانیہ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کو ضم بھی کردیا گیا ہے، اور اس طرح اس کی ثروت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔

ہم نے اس کتب خانے کی بھی سیر کی، لیکن اس حسرت کے ساتھ کہ اس سے استفادے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں ایسی کتابوں کے نادر مخطوطات کی بہت بڑی تعداد محفوظ ہے جن کا ہم نے صرف نام ہی سنا تھا، کبھی زیارت کی نوبت نہیں آئی تھی، اور بہت سے ایسے مخطوطات بھی نظر سے گذرے جن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ایک طالب علم کے لیے یہ جگہ ایک آدھ گھنٹہ سیر کرنے کی نہیں، مہینے گذارنے کی ہے۔ میں چونکہ صحیح مسلمؒ کی شرح لکھ رہا ہوں، اس لیے صحیح مسلمؒ کی غیر مطبوعہ شروح جو یہاں موجود تھیں، ان کی فوٹو کاپی لینے کی کوشش کی، لیکن معلوم ہوا کہ غیر ملکیوں کے لئے اس کا ایک طویل طریق کار ہے، جس پر عمل اس وقت ممکن نہ تھا، لہٰذا میں نے ڈاکٹر یوسف قلیچ سے درخواست کی کہ وہ بعد میں ان کی تصویر کرا کر مجھے

[1] استنبول وحضارۃ الخلافۃ فی الاسلامیۃ۔ بقلم الدکتور سید رضوان علی۔ ص: ۱۳۷

www.freepdfpost.blogspot.com

بھجوادیں، چنانچہ وہ ان میں سے کئی کتب رفتہ رفتہ احقر کو بھجوا رہے ہیں۔

بند بازار (قبالی جارشی):

جامع سلیمانیہ سے ہم واپس ہوٹل آ گئے، عصر کے بعد خیراللہ دمری صاحب مجھے استنبول کے مشہور قدیم بازار قبالی جارشی لے گئے۔ یہ ایک خوبصورت مسقف بازار ہے۔ جو سلطان محمد فاتح نے تعمیر کیا تھا۔ اس پورے بازار پر خوبصورت اور منقش محرابوں کی شکل میں پختہ چھت پڑی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے یہ ''بند بازار'' کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مسقف بازاروں کا جو رواج تھا، ان میں سے پاکستان، ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، شام اور مصر وغیرہ کے بازار میں نے دیکھے ہیں۔ لیکن اپنے نظم وضبط، پختگی اور عمارتی حسن کے لحاظ سے یہ بازار اُن سب سے پر فائق ہے۔ اس کا ایک مرکزی دروازہ ہے، جس میں داخل ہونے کے بعد دور تک محرابی چھتوں کا سلسلہ اور دورویہ منظم دکانیں بڑا خوشنما منظر پیش کرتی ہیں۔ اس بازار میں ۳۲۱ دکانیں، چھ غسل خانے، پانچ مسجدیں اور ۶۵ گلیاں ہیں۔ اور ہر قسم کی ضروریات یہاں مل جاتی ہیں۔ یہ ترکی مصنوعات کا اہم مرکز ہے۔ قیمتوں کا معیار بھی مناسب ہے، اور یہاں سے کچھ مختصر سی خریداری خاصی دلچسپ رہی۔

مدرسہ تحفیظُ القرآن:

اسی روز عشاء کے بعد شیخ امین سراج صاحب کے ساتھ استنبول کے ایک مدرسے میں جانے کا پروگرام تھا۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھانا تھا، اور مختصر سی تقریر بھی کرنی تھی، چنانچہ عشاء کی نماز میں نے شیخ امین سراج صاحب کے ساتھ پڑھی، اور ان کے ہمراہ اس مدرسے میں حاضری ہوئی۔ ''حفظِ قرآن'' کے مدرسے کے نام سے ایک چھوٹے سے مکتب کا تصور اُبھرتا ہے، لیکن اس مدرسے کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ مدرسہ ایک پانچ منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ پانچوں منزلیں درسگاہوں اور طلبہ کے دارالاقامہ میں مشغول ہیں، چھ سو طلباء اس میں مقیم ہیں، اور باہر سے آنے والے اس کے علاوہ ہیں۔

حفظِ قرآن کے ساتھ ساتھ اس میں ابتدائی عربی اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تمام اساتذہ کی وضع وقطع سے لے کر انداز وادا تک ہر چیز سے اتباعِ سنت کا رنگ جھلکتا تھا۔ ان حضرات سے عربی میں گفتگو رہی، یہ سب عربی میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے پر قادر تھے اور ان کی گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خالص دینی اور تبلیغی جذبے کے ساتھ اس مدرسے کی خدمت کر رہے ہیں۔

معیارِ تعلیم بھی ماشاءاللہ بہت اچھا معلوم ہوا۔ ہمیں ایک کشادہ ہال میں لے جایا گیا، جہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا، اور تقریباً سو بچے (جو ۱۰ سال سے ۱۷ سال تک کی عمر کے ہوں گے) فرش پر خوبصورت تپائیاں لیے ہوئے بڑے نظم وضبط اور سلیقے سے بیٹھے ہوئے قرآنِ کریم کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک استاذ مرکزی مسند پر تشریف فرما تھے۔ اُستاذ نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا، بچے بدستور تلاوت میں مصروف رہے۔ ہم جا کر بیٹھے تو استاذ نے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ بتایا کہ یہ وہ بچے ہیں جو حفظ قرآن کی تکمیل کر چکے ہیں، اور دور کر رہے ہیں۔ آپ ان میں سے جس بچے سے چاہیں، اور قرآنِ کریم کے جس حصے سے چاہیں، قرآنِ کریم سن لیجئے۔

میں نے ان سو بچوں میں سے مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے تقریباً بیس بچوں سے قرآنِ کریم کی مختلف جگہوں سے تلاوت کی فرمائش کی۔ اور اُن سب سے تلاوتِ قرآن سن کر میں حیران ہی نہیں، مسرت سے سرشار ہوگیا۔ ان بیس بچوں میں سے (جن کا انتخاب میں نے خود کیا تھا) ہر ایک نے کم سے کم ایک رکوع سنایا، اور کسی ایک کی تلاوت میں ایک غلطی بھی نہیں آئی۔ اِدھر میں نے کسی آیت کے ابتدائی دو تین الفاظ پڑھے اور اُدھر اُس نے تلاوت شروع کر دی۔ یادداشت کی غلطی تو درکنار، کسی بچے کے مخارج اور قواعدِ تجوید میں بھی کوئی غلطی میں نہیں پکڑ سکا، اور لہجہ تو اس قدر دلکش کہ دل چاہتا تھا کہ یہ تلاوت رات بھر جاری رہے۔

طلبہ کے امتحان کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو اُستاذ کی فرمائش پر تمام بچوں نے مل کر قرآنِ کریم کی تعریف میں ایک عمدہ ترانہ بڑے دلکش انداز میں سنایا۔ اس ترانے کا یہ ٹیپ کا بند اُن

www.freepdfpost.blogspot.com

بچوں کی مسحور کن آواز میں آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے۔

غَرِّدْ یَاشِبْلَ الْاِیْمَانْ غَرِّدْ وَاصْدَعْ بِالْقُرْآنْ ○
فِیْہِ الْحَقّ و فیہ النُّوْر فِیْہِ اللُّؤلُؤ وَالْمَرْجَان

معلوم ہوا کہ مدرسہ دینی مدارس کے ایک منظم پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ صرف استنبول شہر میں اس قسم کے چھوٹے بڑے دو سو دس مدارس ہیں، اور پورے ترکی میں پانچ ہزار۔ ان پانچ ہزار مدارس میں رجسٹرڈ طلبہ کی تعداد چھ لاکھ ہے، اور صرف استنبول کے مدارس میں دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد چھ ہزار ہے، اور اس طرح یہ مدارس نئی نسل کو قرآنِ کریم اور ابتدائی دینیات سے روشناس کرنے کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں یہ تمام مدارس سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں، اور محکمہ تعلیم سے ان پر انسپکٹر بھی مقرر ہیں۔

میں یہ مدرسہ دیکھتا اور ان کی تفصیلات سنتا رہا، اور سوچتا رہا کہ یہ وہی ملک ہے۔ جہاں کبھی کمال اتاترک نے قرآنِ کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سَر پر مار دیا تھا، اور جہاں عربی زبان تو کجا، قرآنِ کریم کی تعلیم اور عربی زبان کی اذان تک ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ کمال اتاترک نے ''ہیٹ وار'' کے دوران یہ سمجھا تھا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ اس قوم کو ہیٹ پہنا کر اس کا دماغ بھی تبدیل کر دے گا۔ لیکن آج اسی قوم کی نئی نسل کے چھ لاکھ بچے عربی ٹوپیاں پہنے ہوئے اپنے سینوں میں قرآنِ کریم محفوظ کر رہے ہیں، اس کی تعریف میں عربی ترانے گا رہے ہیں، اور انہوں نے اپنا پورا وجود اللہ کی اس مقدس کتاب کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔

ترکی میں ابھی کوئی اسلامی علوم کا مکمل مدرسہ تو موجود نہیں ہے، لیکن حفظ قرآن کے یہ مدارس جو عربی سے بھی اچھا خاصا مَس پیدا کر دیتے ہیں، بڑی زبردست خدمات انجام دے رہے ہیں، اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش علماء کی طرف سے بڑی حکمت اور تدبر کے ساتھ جاری ہے۔

کھانے پر شہر کے دوسرے متعدد علماء بھی مدعو تھے، اُن سے دیر تک ترکی کے دینی حالات، حال اور مستقبل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اب تک استنبول شہر کے ماڈرن علاقوں

جدید ترکی کا ایک ہی رُخ زیادہ سامنے آیا تھا، جو مغربیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن یہ دوسرا دینی رُخ جو ترک قوم کی اکثریت کا اصل رُخ ہے اور جو اس کے ماضی و حال میں رَچا ہوا ہے اور ہزار کوششوں کے باوجود اُسے فنا نہیں کیا جا سکا، آج اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ سامنے آیا، اور اس کا سرور دیر تک دل و دماغ پر محیط رہا۔

آخری دن

اگلا دن استنبول میں میرے قیام کا آخری دن تھا۔ شام کو مغرب کے وقت مجھے واپس کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا، اور آج بھی خیر اللہ دمری صاحب کے ہمراہ کئی جگہوں پر جانے کا پروگرام تھا۔ استنبول کے ایشیائی حصے میں ابھی تک جانا نہیں ہوا تھا، وہاں خاص طور پر مرمرہ یونیورسٹی بھی جانا تھا۔

چنانچہ خیر اللہ دمری صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ صبح نو بجے کے قریب میرے ہوٹل پہنچ گئے، اور ہم اُن کے ساتھ دوبارہ روانہ ہوئے۔

ایمریگان پارک

خیر اللہ صاحب ہمیں پہلے استنبول کے ایک قدیم خوبصورت پارک میں لے گئے جو ایمریگان پارک کہلاتا ہے، اور روایت یہ ہے کہ یہ پارک سلطان محمد فاتح کی بیٹی نے بنوایا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں یہ شہر کی بہترین تفریح گاہ تھی۔ یہ پارک باسفورس کے یوروپی ساحل پر ایک بتدریج بلند ہوتی ہوئی پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ اوپر کھڑے ہو کر باسفورس کی طرف دیکھیں تو باغ کے کئی تختے تھوڑے تھوڑے نشیبی فاصلے سے طویل و عریض، سیڑھیوں کی طرح سمندر میں اُترتے دکھائی دیتے ہیں۔ استنبول کی زمین اور اس کی پہاڑیاں یوں بھی بہت سرسبز اور شاداب ہیں۔ لیکن اس پارک میں یہ سبزہ و گل جس نظم و ضبط کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں اُس نے ان کی رعنائی میں چار چاند لگا دیئے ہیں، یہ مہینہ اگرچہ مارچ کا تھا، لیکن ابھی سردی کافی تھی، اور سبزہ ابھی خزاں کے شکنجے سے نہیں نکلا تھا ورنہ رہنماؤں کا بیان تھا

www.freepdfpost.blogspot.com

کہ موسم بہار میں یہاں سبزہ پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ پارک میں طویل روشیں، جگہ جگہ خوبصورت تالاب اور درختوں کے سائے میں بیٹھنے کے خوش منظر مقامات بنے ہوئے ہیں، اور ہر جگہ سے سامنے بہتی ہوئی باسفورس اور اس کے پس منظر میں ایشیائی ساحل کی پہاڑیاں دیدہ و دل کو شاداب کرتی رہتی ہے۔

پارک کے بیچوں بیچ ایک شاندار قدیم عمارت بنی ہوئی ہے، جو ''قصر اصفر'' کہلاتی ہے۔ یہ عثمانی عہد کے ایک جرنیل اسماعیل خدیو پاشا کا محل ہے، جو اب اس تفریح گاہ کے ریستوران کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

بہر کیف! یہ پارک عثمانیوں کی جمالیاتی حس کا آئینہ دار اور ان کی خوش مذاقی کی بہترین یادگار ہے۔

رومیلی حصار

یہاں سے ہم سلطان محمد فاتح کے بنائے ہوئے قلعے ''رومیلی حصار'' کو دیکھنے گئے۔ جسے دیکھنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ میں فتح قسطنطنیہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ بایزید یلدرم نے آبنائے باسفورس کو کنٹرول کرنے کیلئے اس کے ایشیائی ساحل پر اُس جگہ ایک قلعہ تعمیر کیا تھا جہاں باسفورس کی چوڑائی سب سے کم ہے۔ بایزید یلدرم کے بنائے ہوئے اس قلعے کا نام ''اناضول حصار'' ہے۔ لیکن سلطان محمد فاتح نے محسوس کیا کہ باسفورس پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کیلئے صرف ''اناضول حصار'' کافی نہیں ہے، اس لئے اُس نے ''اناضول حصار'' کے بالکل سامنے یوروپی ساحل پر ایک اور قلعہ تعمیر کیا۔ اسی قلعے کا نام ''رومیلی حصار'' ہے۔

اس قلعے کی تعمیر بھی سلطان محمد فاتح کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ یہ تاریخی عمارت جس کا نقشہ سلطان محمد فاتح کے ایک انجینئر مصلح الدین آغا نے تیار کیا تھا، تین ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، اور سترہ ۱۷ بُرجوں پر مشتمل ہے۔ اس قلعے کا نقشہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز سے اُسے دیکھے تو ''محمد'' لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے، سترہ ۱۷ برجوں

میں سے تین بُرج بہت بلند ترین برج جو ''سروکا'' کہلاتا ہے، ۷ منزل (تقریباً نوے فٹ) بلند ہے، جس کی دیوار نو میٹر آٹھ کی ہے۔ فصیل کی دیواریں پانچ سے پندرہ میٹر تک بلند ہیں۔

اس تفصیل کے بعد جو بات محیر العقول حد تک عجیب ہے وہ یہ کہ یہ پورا قلعہ صرف چار مہینے چار دن میں تیار ہوا تھا۔ اس کی تعمیر ۲۴ اپریل ۱۴۵۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۸ اگست ۱۴۵۲ء کو مکمل ہوگئی۔ آج جبکہ فن تعمیر کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے، شاید ایسے قلعے کا نقشہ بھی چار مہینے میں تیار نہ کیا جا سکے۔

آج کل اس قلعے کا کچھ حصہ تو شاید فوجی چوکی کے طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے، لیکن بیشتر حصہ ایک تاریخی یادگار کے طور پر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ قلعے کے پُرشکوہ دروازے سے اندر داخل ہوں تو ایک طویل صحن میں کچھ تاریخی اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سلطان محمد فاتح کی ایک توپ ہے۔ جو قسطنطنیہ کی فتح میں استعمال ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک توپ سلطان عبدالحمید کی طرف منسوب ہے، اور یہیں فرش پر اُس زنجیر کے چار حلقے پڑے ہوئے ہیں، جو رومیوں نے گولڈن ہارن کے دہانے پر باندھا تھا تاکہ عثمانیوں کے جہاز گولڈن ہارن میں داخل نہ ہو سکیں۔ یہی وہ زنجیر تھا جس کی وجہ سے سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں خشکی پر جہاز چلانے کا عجوبہ ظہور میں آیا۔

بہر کیف! یہ قلعہ جس کا تذکرہ کہیں بچپن میں پڑھا، اور تصور نے اس کے نہ جانے کتنے خاکے بنائے تھے، آج اُسے دیکھنے کا شوق پورا ہوا۔

باسفورس کا پل اور ایشیائی استنبول:

یہاں سے ہماری منزل استنبول کا ایشیائی حصہ تھا جو ''اسکودار'' کہلاتا ہے، باسفورس عبور کرنے کیلئے استنبول کے مختلف حصوں سے کشتیاں بھی چلتی ہیں، لیکن اب باسفورس پر ایک نہایت عالیشان نیا پل بنا دیا گیا ہے جس نے یورپ اور ایشیاء کو سڑک کے راستے سے باہم ملا دیا ہے۔ یہ پل ۱۹۷۳ء میں گاڑیوں کے لئے کھولا گیا تھا۔ یہ ایک معلق پل ہے جس کے

www.freepdfpost.blogspot.com

صرف کناروں پر دو دو آہنی ستون ہیں۔ دو ستون ایشیاء اور دو یورپ میں۔ اور بیچ میں سمندر پر کوئی ستون نہیں ہے۔ اس کے بجائے پل کو اوپر سے ہلالی شکل میں لٹکے ہوئے دو لوہے کے مضبوط رسّوں نے سنبھالا ہوا ہے، اس پل کی لمبائی ایک ہزار چوہتر میٹر ہے اور چوڑائی ۳۳،۴۰ میٹر، یہ سمندر سے ۶۴ میٹر بلند ہے، اور اس کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے ستون ۱۶۵ میٹر اونچے ہیں۔ اگر سمندر کے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پل پر چلتی ہوئی کاریں کافی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں، اور اتنی بلندی اس لئے رکھی گئی ہے تاکہ باسفورس سے ہمہ وقت گذرتے ہوئے جہازوں کے لئے یہ رکاوٹ نہ بنے، اور جہاز اس کے نیچے سے گذر جائیں۔ اور اس طرح یہ انتہائی خوبصورت، پُرشکوہ اور مصروف پُل ہے جس پر سے روزانہ اوسطاً دو لاکھ گاڑیاں آبنائے باسفورس کو عبور کرتی ہیں، اور کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں گاڑیوں کا ایک ریلا اس پر رواں دواں نظر نہ آتا ہو۔

ہم نے اِسی پُل کے ذریعے باسفورس کو عبور کیا، استنبول کا ایشیائی حصہ ''اسکودار'' کہلاتا ہے، اور ترکی کے اس پورے خطے کو جو ایشیاء میں واقع ہے ''اناطولیہ'' کہتے ہیں۔ پل پار کر کے ہم ''اسکودار'' میں داخل ہو گئے۔ شہر کا یہ ایشیائی حصہ بھی بڑا خوبصورت اور بہت وسیع و عریض ہے۔ ہم اس کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ''مرمرا یونیورسٹی'' پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر یوسف قلیچ جو اس کے علومِ اسلامیہ کے شعبے میں استاذ ہیں، ہمارے منتظر تھے۔ ہمارے ترک دوست ڈاکٹر صالح طوغ اس یونیورسٹی میں کلیۂ الٰہیات کے ڈین ہیں، وہ اس پورے عرصے میں استنبول سے باہر تھے، اس لئے اب تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، اب ڈاکٹر قلیچ کے ہمراہ ان کے کمرے میں پہنچے تو وہ جا چکے تھے۔ اس لئے یہاں بھی ان سے ملاقات نہ ہوئی بعد میں ڈاکٹر قلیچ نے یونیورسٹی کے مختلف شعبے دکھائے۔ یہ ترکی کی مشہور یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کا شعبۂ ادیان اور ''علومِ اسلامیہ'' کا شعبہ ترکی میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ لیکن دوسری سرکاری یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی ''علومِ اسلامیہ'' کا مضمون ایک نظریہ اور فلسفے کی حد تک پڑھا

اور پڑھایا جاتا ہے۔ درس گاہ کے ماحول میں عملاً ان علوم کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔ فإلی اللہ المشتکی۔

یونیورسٹی میں نمازِ ظہر پڑھنے کے بعد خیر اللہ دمرسی صاحب ہمیں باسفورس کے ایشیائی ساحل پر عثمانی عہد کے بنے ہوئے ایک اور خوبصورت باغ میں لے گئے، وہیں پر انہوں نے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ اس سرسبز و شاداب اور پُرسکون فضا میں ترکی احباب کے ساتھ یہ ظہرانہ بڑا پُرلطف رہا۔

یہاں سے ہم ہوٹل واپس ہو گئے اور نمازِ عصر کے فوراً بعد ایئرپورٹ کیلئے روانگی ہو گئی۔ کانفرنس کے پروٹوکول آفیسر کے علاوہ ڈاکٹر یوسف قلیچ بھی ایئرپورٹ تک آئے۔ نمازِ مغرب پڑھتے ہی میں ٹرکش ایئرویز کے جہاز میں سوار ہوا۔ ترکی کے قیام کی خوشگوار یادیں سارے راستے ہم سفر رہیں۔ یقیناً استنبول میں گذرے ہوئے یہ چند روز بڑے یادگار، بڑے نشاط انگیز اور بڑے معلومات افزا تھے جن کے نقوش عرصے تک دھندلا نہیں سکتے۔

واپسی کا سفر

استنبول کے یہ احباب جن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں میں ان سے بہت اُنس پیدا ہو گیا تھا، اُن کا کہنا تھا کہ مجھے چند روز مزید ٹھہرنا چاہئے، اور ترکی کے دوسرے مشہور شہروں اور بالخصوص قونیہ، انقرہ، بورصہ اور ازمیر ضرور جانا چاہئے، عقلی طور پر میں بھی یہ سوچتا تھا کہ خدا جانے پھر کبھی یہاں آنا ہو یا نہ ہو، اس لیے چند روز ٹھہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، پی آئی اے کی پرواز بھی تین دن بعد تھی، اور پی آئی اے سے جانا میرے لئے زیادہ آسان تھا۔ طبعی طور پر ترکی میں بھی دل لگ رہا تھا، لیکن قلب پر ایک انجانی سی وحشت طاری ہونے لگی، جو عقل و طبیعت کے ان تمام تقاضوں پر اس درجہ غالب آتی گئی کہ میں نے بالآخر آج ہی ٹرکش ایئرویز سے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے لیے سیٹ بھی بُک کرالی، میرے پاس اُس انجانی سی وحشت کے سوا اپنے اس فیصلے کی کوئی معقول دلیل موجود نہیں تھی، جو میں احباب کے اصرار کے جواب میں پیش کر سکتا۔ بس میں نے ان کو

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ مجھے بعض وجوہ سے فوراً کراچی پہنچنا ضروری ہے۔

میں خود حیران تھا کہ ترکی میں دلچسپی اور دل بستگی کے اتنے سامان کے باوجود میں اتنی جلدی کیوں واپس جا رہا ہوں؟ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں، کوئی وقتی مجبوری بھی بظاہر سامنے نہیں تھی۔ لیکن جب کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو لاؤنج ہی میں میرے خسر مکرم جناب شرافت حسین صاحب اور میرے معاونِ خصوصی مولوی عبداللہ میمن صاحب نے بتایا کہ احقر کے شیخ (مربّی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی قدس سرہٗ) کئی روز سے صاحبِ فراش ہیں، اور آج انہیں ہسپتال لے جانے کی رائے ہو رہی ہے۔ بس یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنک گیا، گھر میں سامان رکھنے کے بعد میں سیدھا حضرتؒ کے مکان پر پہنچا، معلوم ہوا کہ حضرتؒ ہسپتال جا چکے ہیں، وہاں حاضری ہوئی۔ حضرتؒ بسترِ علالت پر کافی کرب میں تھے، بات کرنا دشوار ہو رہا تھا، لیکن احقر کو دیکھ کر حسبِ معمول مسرت کا اظہار فرمایا: ''بھائی، اچھا ہوا تم آ گئے، ہماری طبیعت بہت خراب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہمیشہ راضی رہنا چاہئے۔''

اس قسم کی چند باتیں ارشاد فرمائیں اور اگلے دن اذانِ فجر کے وقت یہ آفتابِ ہدایت دنیا سے روپوش ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ تمام واقعات اس قدر آناً فاناً پیش آئے کہ تشویش اور صدمے کی رو میں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بعد میں سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ استنبول سے فوراً روانگی کا وہ شدید داعیہ ارقلب کی وہ انجانی سی وحشت کیوں پیدا ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ میں اس انجانے سے داعیے پر عمل کرتے ہوئے فوراً لوٹ آیا، اگر ایک دن کی بھی مزید تاخیر ہو جاتی تو حضرتِ والاؒ کا دیدار نصیب نہ ہو سکتا، اور عمر بھر اس کا جو صدمہ رہتا اس کی تلافی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

جزیروں کا مُلک

سنگاپور، انڈونیشیا

شعبان ۱۴۰۲ھ جون ۱۹۸۲ء

www.freepdfpost.blogspot.com

(۵)

جزیروں کا مُلک

پچھلے دنوں حکومتِ انڈونیشیا نے حکومتِ پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے وزیر مذہبی اُمور اور پاکستان کے علماء پر مشتمل ایک وفد انڈونیشیا بھیجے تا کہ یہ وفد انڈونیشیا کے دینی اداروں اور وہاں کے دینی ماحول کا مشاہدہ کرے۔ یہ ایک خیر سگالی نوعیت کا دورہ تھا۔ جن کی تاریخوں میں کئی ماہ تک ردوبدل ہوتا رہا۔ بالآخر اس کے لئے جون کا پہلا ہفتہ مقرر ہوا۔

وفد میں پاکستان کے وزیر مذہبی اُمور الحاج محمد عباس خاں عباسی صاحب کے علاوہ جسٹس مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب جج وفاقی شرعی عدالت میاں فضل حق صاحب مہتمم جامعہ سلفیہ فیصل آباد، ورکن مجلس شوریٰ شبیہ الحسنین محمدی مہتمم مدرسۃ الواعظین لاہور اور وزارتِ مذہبی اُمور کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر امین اللہ وثیر صاحب اور راقم الحروف شامل تھے۔

یکم جون کی صبح کو پونے دس بجے کراچی سے پی آئی اے کے طیارے کے ذریعہ سنگاپور کے لیے روانہ ہوئے۔ کراچی سے کوالالمپور تک تقریباً چھ گھنٹے کی مسلسل اور طویل پرواز میں طیارے نے ہندوستان کو عرضاً طے کیا۔ اور مدراس کی سمت سے خلیج بنگال میں داخل ہو کر تقریباً تین گھنٹے سمندر پر پرواز کی۔ اور بالآخر پاکستانی وقت کے مطابق تقریباً ساڑھے تین بجے شام ملائیشیا کی حدود میں داخل ہو گیا۔ طیارے کی بلندی سے ملائیشیاء کا حسین جزیرہ انتہائی دلکش محسوس ہو رہا تھا۔ اور خوشنما سبزے کی مخملیں فرش کے درمیان بل کھا کر سمندر میں گرتے ہوئے دریا انتہائی خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے کوالالمپور کا شہر نظر آنے لگا۔ اور چند ہی لمحوں میں طیارہ ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

یہاں کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے مقدم ہے۔ اس لئے یہاں اس وقت تقریباً ساڑھے چھ بجے تھے اور آفتاب غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ شہر کے اندر جانے کا تو نہ پروگرام تھا نہ وقت، لیکن ہوائی اڈہ پر ہی ایک گھنٹہ گزارا۔ امریکی طرز کا الٹرا ماڈرن ایئرپورٹ تھا۔ نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت، جدید طرز کی مرصع دکانیں، ریسٹورنٹ، سب کچھ ایک نئے اسلامی ملک کو پہلی بار دیکھ کر دل میں محبت کے جذبات موجزن تھے۔ ملائیشیا کے مسلمانوں کے بارے میں تجربہ بھی ہوا اور مشہور بھی ہے کہ وہ بڑے سادہ دل اور نیک نفس لوگ ہوتے ہیں لیکن کم از کم ایئرپورٹ پر کوئی ایسے آثار نظر نہیں آئے جو ملک کی اسلامیت پر دلالت کرتے ہوں، کاش کہ ہمارے مسلم ممالک کو اپنا اسلامی تشخص نمایاں کرنے اور اس پر فخر کرنے کا احساس ہو۔ ایئرپورٹ کسی ملک یا شہر کا دروازہ ہوتا ہے۔ اس دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک انسان کو محسوس ہونا چاہئے کہ وہ کسی مسلمان ملک میں آیا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ وہاں کوئی موزوں جگہ سرسری تلاش سے نظر نہ آئی، جہاز کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے واپس جہاز ہی میں آ کر نماز ادا کی۔

طیارے کی اگلی منزل سنگاپور تھی اور کوالالمپور سے وہاں تک کا فاصلہ تقریباً پچاس منٹ میں طے ہوگیا۔ سنگاپور دراصل ملائیشیا ہی کا ایک حصہ تھا لیکن مغربی استعمار نے اس خطے کو آزادی دیتے وقت اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ بڑا حصہ ملایا یا ملائیشیا کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ لیکن ایک چھوٹا سا جزیرہ سنگاپور کے نام سے ایک مستقل ریاست بن گیا جس پر غیر مسلموں کی حکومت ہے اور یہاں کے باشندوں کی اکثریت چینی نژاد ہے۔

سنگاپور کے پاس بذات خود زراعت ہے، نہ صنعت، لیکن فری پورٹ ہونے کی بنا پر وہ تجارت کا عظیم الشان مرکز ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اپنے تمدنی حسن اور خوش انتظامی کے اعتبار سے یورپ کا کوئی ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا ہے۔ ایشیا کے جتنے شہر میں نے دیکھے ہیں۔ تمدنی آب و تاب کے لحاظ سے یہ ان سب پر فائق معلوم ہوتا ہے۔ پورا شہر خوبصورت سر بفلک عمارتوں سے آباد ہے۔ سڑکیں آئینے کی طرح شفاف ٹریفک نہایت باقاعدہ اور منظم،

آبادی گنجان اور گنجک ہونے کے بجائے وسیع اور کشادہ، بحرہ ہند کا پانی شہر میں جگہ جگہ وسیع دریاؤں کی سی شکل میں گھس آیا ہے لیکن اس پر کئی کئی منزلہ پلوں نے راستوں کو نہ صرف آسان بلکہ نہایت حسین بنا دیا ہے۔

یہ رات سنگاپور میں بسر ہوئی اور اگلی صبح پونے بارہ بجے سنگاپور ایئرلائنز کے طیارے سے جکارتہ روانہ ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا بیشتر سفر سمندر پر ہوا اور کچھ دیر بعد انڈونیشیاں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ جاوا کا وسیع جزیرہ شروع ہوگیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے جکارتہ کی آبادی نظر آنے لگی۔

جکارتہ کا ہوائی اڈہ پر انڈونیشیا کے وزیر مذہبی امور اور دوسرے اعلیٰ حکام، سفیر پاکستان، سفارت خانہ کے دوسرے عملے اور انڈونیشیا میں مقیم پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے استقبال کیا۔ جکارتہ شہر میں داخل ہوتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ڈھاکہ میں داخل ہو رہے ہوں۔ یہاں کی سرزمین مکانات کا اندازہ، سرسبزی و شادابی موسم لوگوں کے طرز بود و باش میں بنگال کی کافی شباہت ہے۔ فرق یہ ہے کہ تیل اور دوسرے وسائل نے جکارتہ کو تمدنی ترقی میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ برصغیر کے کسی بھی شہر کو یہ بات میسر نہیں۔

.....☆.....☆.....

انڈونیشیا بحر ہند کے جنوب اور مشرق اور آسٹریلیا کے شمال مغرب میں دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر ہے جو تقریباً تیرہ ہزار چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے، اور بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے۔ اس کا قدیم نام ''نوسانتارا'' (درمیانی جزیرہ) تھا۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی سے یہاں ہندو اور بدھ مذہب کے تاجروں کی آبادی تھی۔ جنہوں نے مختلف جزیروں میں اپنی ریاستیں قائم کی ہوئی تھیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد تقریباً چوتھی صدی سے سب سے پہلے جزیرۂ سماٹرا اور پھر جاوا میں اسلام آیا۔ ہندوستان کی طرح ان دور اُفتادہ جزائر میں بھی اسلام کی تبلیغ کرنے والے کچھ صوفیائے کرام تھے، جنہوں نے اپنی خاموش اور پُرامن جدوجہد سے اس علاقے کو نہ صرف اسلام کا حلقہ بگوش بنایا بلکہ بالآخر یہاں مسلمانوں ں

www.freepdfpost.blogspot.com

کی حکومت قائم کی۔ ان حضرات میں شیخ عبداللہ عارفؒ، حضرت مولانا ابراہیمؒ حضرت راون رحمتؒ، مخدوم ابراہیمؒ، شیخ فتح اللہؒ وغیرہ بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں ولندیزی تاجر اس علاقے میں پہنچے اور رفتہ رفتہ اپنی روایتی چالبازیوں سے اس علاقے کو اپنے استعمار کا نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ یہ تمام جزائر ایک ایک کر کے ان کے زیرنگیں آ گئے۔ ولندیزی اقتدار کے زمانے میں ان جزائر کو ''جزائر شرق الہند'' یا ''ولندیزی شرق الہند'' کہتے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں ایک جرمن ماہر نسلیات نے اسے ''انڈونیشیا'' کا نام دیا ہے۔ اسکی اصل یونانی زبان کا ایک مرکب لفظ ( ) ہے جس کے معنی ہیں ''سمندر اور جزائر'' چنانچہ ۱۹۲۱ء میں حریت پسندوں نے ایک قرارداد کے ذریعے ''ولندیزی شرق الہند'' کے بجائے ''انڈونیشیا'' کا نام اختیار کیا۔ اور آزادی کے بعد ملک کا یہی سرکاری نام قرار پایا۔

انڈونیشیا کے بے شمار جزائر میں سے جاوا، سماٹرا، مادورا، بنکا، بورنیو، سلاویسی، مالوکا، سونداوغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ اور دارالحکومت جکارتہ جزیرۂ جاوا کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ چونکہ یہ جزائر خطِ استوا سے قریب ہیں۔ اس لئے یہاں گرمی اور بارشوں کی کثرت ہے۔ سردی کے موسم سے یہ خطہ نا آشنا ہے، یہاں گرمی اور برسات کے علاوہ کوئی تیسرا موسم نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں پنکھوں کا استعمال بہت کم ہے۔ جہاں ہم جیسے لوگ گرمی سے عرق عرق ہو جاتے۔ وہاں مقامی حضرات اطمینان سے بغیر پنکھوں کے بیٹھے رہتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کے عادی ہو جانے کے بعد ان حضرات کو پسینہ زیادہ نہیں آتا۔

انڈونیشیا بڑا سرسبز و شاداب اور زرخیز ملک ہے۔ تیل کے علاوہ ربر، ٹن، چائے، کافی، ساگوان اور انواع و اقسام کے پھل (جن میں سے بہت سے ہم جیسوں کے لئے بالکل نئے ہیں) یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ لوگ عام طور پر نرم خو، خوش اخلاق، متحمل مزاج اور بردبار ہیں۔ ایک ہفتے کے قیام کے دوران ہم نے کہیں دو آدمیوں کو لڑتے جھگڑتے یا مشتعل ہوتے نہیں دیکھا۔

انڈونیشیا کی تقریباً نوے فیصد آبادی مسلمان ہیں۔ اور باقی دس فیصد آبادی میں عیسائی، ہندو، بدھ، جین وغیرہ ہیں۔ لیکن جب ولندیزی استعمار کے خلاف یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں ان تمام اقوام نے مشترک جدوجہد کی، اس وقت مسلم اور غیر مسلم آبادی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کیلئے پانچ اُصول طے کئے گئے جو ''پنچاشیلا'' کے نام سے معروف ہیں۔ ان اُصولوں کا بنیادی نکتہ باہمی مذہبی رواداری ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ''پنچاشیلا'' کے اُصولوں کو غیر مسلموں نے یہاں سیکولر حکومت قائم کرنے کیلئے استعمال کیا اور اس طرح یہاں اسلامی حکومت کے داعی اور سیکولرزم کی علمبردار جماعتوں میں آویزش شروع ہوگئی۔ مجموعی پارٹی نہضۃ العلماء اور جماعۃ المحمدیۃ یہاں کی مشہور دینی جماعتیں ہیں جو یہاں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ مجموعی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر ناصر کچھ عرصہ وزیراعظم بھی رہے۔ لیکن صدر سوئیکارنو کے عہد حکومت میں جب کمیونسٹ پارٹی نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی تو جنرل سوہارتو کے زیرقیادت کمیونسٹ تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔ اس کے بعد جنرل سوہارتو نے زمامِ حکومت سنبھالی اور اب تک وہی ملک کے صدر ہیں۔

موجودہ حکومت نے کمیونسٹوں کے مقابلے کے لیے تو اسلامی جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا لیکن جب کمیونسٹوں پر قابو پالیا تو اس کے بعد ملک میں خالص سیکولر حکومت قائم کی۔ اس وقت سے اسلامی جماعتوں اور موجودہ حکومت کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وقت پارلیمنٹ کے ایوان میں نوسو سے زائد نشستیں ہیں جن میں صرف تین سو سے کچھ اوپر نمائندے انتخابات کے ذریعے ایوان میں آتے ہیں۔ اور باقی تقریباً چھ سو افراد نامزد ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت انتخابات میں سو فیصد کامیابی حاصل کرے۔ تب بھی وہ ایوان میں اکثریت حاصل نہیں کر سکتی۔ ابھی ابھی وہاں انتخابات ہوئے تو مجموعی پارٹی، نہضۃ العلماء، جماعت محمدیہ اور دینی جماعتوں کے حضرات نے متحدہ محاظ بنا کر انتخاب میں حصہ لیا۔ اس کے نتیجہ میں اس متحدہ محاذ کو کل تراسی نشستیں حاصل ہوئیں۔ ان کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں زور زبردستی اور دھاندلی سے بھی بڑے

www.freepdfpost.blogspot.com

پیمانے پر کام لیا گیا۔

اس صورتحال کی وجہ سے سیاسی سطح پر دینی جدوجہد انتہائی کمزور پڑ گئی ہے اور اس کے راستے بظاہر مسدود نظر آتے ہیں۔ اب دینی جماعتیں زیادہ تر تعلیم و تبلیغ کے کاموں میں مصروف ہیں۔

ہمارے ملک کی طرح انڈونیشیا میں بھی قدیم طرز کے دینی مدارس بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن ان کی اکثریت دیہات میں ہے، اور ہمیں کوشش کے باوجود انہیں دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہمارے دورے کا انتظام انڈونیشیا کی وزارت امور نے کیا تھا۔ اور ایک ہفتہ کے مختصر پروگرام میں زیادہ تر وہ انہی اداروں کا معائنہ کرا سکی جو حکومت کے زیر استعمال چل رہے ہیں۔ سب سے پہلے وزارت مذہبی امور کے مختلف شعبے دکھائے گئے اور بلاشبہ اس وزارت کا انتظامی معیار بڑا قابل تعریف ہے۔ خاص طور پر حج کا انتظام دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ یہاں حجاج کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر سال حکومت کی طرف سے حج کے اخراجات کی رقم کا اعلان ہوتا ہے، اور جو شخص بھی اتنے اخراجات برداشت کر سکے وہ حج کی درخواست دے سکتا ہے۔ اور اس کی درخواست لازماً منظور ہوتی ہے۔

وزارت کی طرف سے حجاج کے گروپ بنائے جاتے ہیں، اور تمام حجاج کا سامان تک یکساں ہوتا ہے؟ جکارتہ میں ''حج ہاسٹل'' کے نام سے ''حاجی کیمپ'' جیسی شاندار عمارت قائم ہے جہاں اطراف ملک سے آئے ہوئے عازمین حج کے قیام کا انتظام ہے۔ اس عمارت کا ظاہری حسن صفائی، ستھرائی اور انتظام نہایت معیاری ہے اور یہاں حجاج کے مختلف گروپوں کو تین دن تک مناسک حج کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

حکومت کے زیر انتظام چلنے والی دو اسلامی یونیورسٹیاں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں سے ایک جکارتہ میں ہے اور دوسری سورابایا، میں دونوں یونیورسٹیوں کا علمی معیار اچھا خاصہ معلوم ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ افسوس ہوا کہ دونوں جگہ نظام تعلیم مخلوط ہے۔ اس صورتحال سے خود یونیورسٹی کے بعض اساتذہ بھی ناخوش معلوم ہوتے تھے لیکن

اپنی اس رنجیدگی کا کوئی علاج فی الحال ان کے بس میں نہیں۔ ان اسلامی یونیورسٹیوں کو ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو یہ کہ یہاں طالبات کا لباس کافی ستر پوش ہے۔ جبکہ عام تعلیمی اداروں میں طالبات کا عام لباس اسکرٹ ہے۔ لیکن جب احقر نے ایک یونیورسٹی کے ذمہ دار ترین فرد سے پوچھا ''اسلامی یونیورسٹی'' میں مخلوط تعلیم کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ ''یہ انڈونیشی'' اسلام ہے۔''

مشرقی جاوا کا صدر مقام سورابایا ہے جو جاوا کے مشرقی کنارے واقع ہے اور انڈونیشیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ ہمیں وہاں بھی لے جایا گیا، یہاں ''نہضۃ العلماء'' کے زیر اہتمام ''خدیجہ انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے ایک لڑکیوں کی دینی تعلیم کا ادارہ قائم ہے۔ اس ادارے میں صرف طالبات پڑھتی ہیں اور ان کے لئے دینی تعلیم کا خاصہ معیاری نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔ یہاں طالبات کی بہت بڑی تعداد زیر تعلیم ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ ''نہضۃ العلماء'' کے زیر اہتمام چلنے والے اس ادارے میں بھی علمی دینی رنگ کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے باوجود اس وقت ایک سیکولر حکومت قائم ہے جس میں ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ضرور ہے۔ لیکن حکومت کی سطح پر عوام کو اپنی زندگیاں اسلامی احکام کے مطابق ڈھالنے کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی تحریک نہیں بلکہ اس قسم کے تحریکات کو مملکت کے بنیادی اصول ''پنچہ شیلا'' کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے دینی اعتبار سے مملکت کی فضا حوصلہ افزا نہیں بلکہ حوصلہ شکن ہے۔ عیسائی مشنریوں کا کام اپنے عروج پر ہے اور ملک کے بعض کلیدی مناصب عیسائیوں کے زیر اقتدار ہیں۔ تجارت میں چینی باشندوں کا تسلط ہے اور دینی سیاسی جماعتیں مغلوب و بے دست و پا ہیں۔

ان تمام حوصلہ شکن حالات میں امید کی جو تابناک کرن نظر آتی ہے وہ یہاں کے عوام اور بالخصوص نوجوانوں کا دینی جذبہ ہے ایسے نامساعد حالات میں بھی مسجدوں کے اندر ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

بڑی تعداد کمسن نوجوانوں کی نظر آتی ہے۔ اور اسے قدرت کا ایک غیبی کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی ہر مسجد میں ''شبان المسجد'' کے نام سے نوجوانوں کی ایک دینی تنظیم قائم ہے جو نوجوانوں میں دین کا پیغام پھیلانے کے لئے بڑا مفید کردار انجام دے رہی ہے، حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس تنظیم کا کوئی مرکز یا صدر دفتر نہیں ہے نہ ملک گیر سطح پر اس کی کوئی مرکزی تنظیم ہے، اور بسا اوقات ایک مسجد کے ''شبان'' کا دوسری مسجد کے ''شبان'' سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ بس ہر مسجد کے آس پاس بسنے والے اپنے محلّے کی سطح تک خود بخود تنظیم قائم کر لیتے ہیں، اور نمازوں کے بعد ان کے مختصر حلقے ہوتے ہیں جن میں دینی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ عموماً مسجد کے امام صاحب ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس طرح یہ حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ سابق مسجومی پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر ناصر نے ہماری آمد کی خبر سنی تو وہ خود ملاقات کے لئے ہمارے ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ کا کہنا تھا کہ ''شبان المسجد'' کی غیبی طاقت اس وقت ہماری امیدوں کا بڑا مرکز ہے۔ اس تنظیم کا کسی بھی ملک گیر جماعت سے کوئی رابطہ نہیں اور ہمارے لئے اس بات کی توجیہ بہت مشکل ہے کہ مرکزیت کے فقدان کے باوجود ہر مسجد میں یہ حلقہ کس طرح قائم ہو گیا ہے؟ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ حلقہ ہر مسجد میں موجود ہے اور اس کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

انڈونیشیا کے قیام کے دوران یہ بات بھی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی کہ قادیانی جماعت یہاں خاصی سرگرم ہے اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی تبلیغ کالعدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام تو عوام بعد خواص کو بھی قادیانیوں کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اسلامی یونیورسٹی کی لائبریری میں قادیانی مصنفین کی کتابیں رکھی ہوئی نظر آئیں جن کے بارے میں لائبریرین کا کہنا یہ تھا کہ یہ لائبریری کو مفت فراہم کی گئی ہیں۔ لیکن قادیانیت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ یہ مسلم تبلیغی جماعتوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ انگریزی زبان میں قادیانیوں کی حقیقت واضح کرنے والا لٹریچر انڈونیشیا پہنچایا جائے۔

.....☆.....☆.....☆.....

جکارتہ کے علاوہ سورابایا اور اس کے قریب ایک پہاڑی مقام باتوں میں جانا ہوا لیکن مختصر سفر میں جاوا کے علاوہ انڈونیشیا کے کسی اور جزیرے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پانچ روز قیام کے بعد ہم ۷ جون کی شام کو جکارتہ سے سنگاپور روانہ ہوئے اور تقریباً ۲۴ گھنٹے سنگاپور میں قیام رہا۔ جو دراصل ملایا کا ایک حصہ تھا لیکن پھر ایک معاہدے کے تحت وہ ملایا سے علیحدہ ہو گیا اور اب خطِ استوا کے بالکل نیچے وہ ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے جس نے مختصر عرصہ میں معاشی طور پر حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ تجارتی اعتبار سے وہ ایشیا کی مصروف ترین بندرگاہ ہے۔ اور تمدنی حسن کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ کا شہر معلوم ہوتا ہے۔

یہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اسّی فیصد باشندے چینی نژاد ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی مساجد اور عبادات کا انتظام اچھا ہے۔ شہر کے وسط میں بنی ہوئی ''سلطان مسجد'' اپنے جمال، شکوہ اور صفائی ستھرائی کے انتظام میں بڑی معیاری مسجد ہے جسے دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں مساجد کے لئے چندہ نہیں کیا جاتا بلکہ مسلمان سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے ایک معمولی حصہ واضع کر کے اس سے سرکاری طور پر ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ سے مساجد کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

.....☆.....☆.....☆.....

آٹھ روز کے اس سفر میں جو تاثر احقر کے دل و دماغ پر محیط رہا وہ یہ تھا کہ دنیا کے مسلمان بہت سے مسلم ممالک ایسے ہیں جو مغربیت کے سیلاب میں اس بُری طرح بہہ چکے ہیں۔ کہ اب ان کے لئے واپسی سخت مشکل ہو گئی ہے۔ اور انہیں واپس لانے کے لئے پیغمبرانہ دعوت و عزیمت کا حوصلہ درکار ہے۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اس برصغیر میں دین کے جانثار خادموں کی جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ یہاں ابھی حالات حد سے نہیں گذرے۔ ہم اگر اخلاص للّٰہیت، محنت اور دُوراندیشی سے کام لیں تو یہاں ابھی اس طوفان کو آسانی سے روکا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے دین کے ایسے مخلص اور جاں نثار خادموں کی جو اپنے آپ کو دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کر دیں جن کے پیش نظر مال و دولت، جاہ و منصب شہرت یا اقتدار کا حصول نہ ہو بلکہ ان کی زندگی کا واحد مقصد عوام کی دینی تربیت ہو۔

www.freepdfpost.blogspot.com

تشویشناک یہ بات ہے کہ اس ضرورت کی طرف سے ہماری توجہ ہٹتی جارہی ہے اور اسی نسبت سے وہ بند رفتہ رفتہ ٹوٹ رہے ہیں جو ہمارے اکابر و اسلاف کے مغربیت کے سیلاب سے بچاؤں کے لئے لگائے تھے۔ اور جواب تک واقعتاً اس طوفان کو روکے رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہم نے اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ دے کر اپنی کوششوں کا رُخ صحیح نہ کیا تو خطرہ ہے کہ یہاں بھی وہ مناظر نظر آنے لگے جو بہت سے مسلم ممالک میں عام ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ روز بد نہ دکھائے۔ اور صدق و اخلاص للّٰہیت اور ایثار کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔

.....☆.....☆.....☆.....

بنگلہ دیش میں چند دن

اگست ۱۹۸۰ء

www.freepdfpost.blogspot.com

(۶)

بنگلہ دیش میں چند دن

پچھلے مہینے مدرسہ قاسم العلوم سلہٹ کی دعوت پر ایک ہفتے کے لئے بنگلہ دیش جانا ہوا، سقوطِ مشرق پاکستان کے بعد اس علاقے میں احقر کا پہلا سفر تھا جو چودہ سال بعد پیش آیا، اس سفر کے لئے پاسپورٹ ویزا کے مراحل طے کرتے ہوئے اور پھر ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اُتر کر امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کی کاروائی انجام دیتے وقت دل پر جو کچھ گزری اس کے اظہار کے لئے الفاظ ملنے بہت مشکل ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ایک مدّت تک آمدرفت کے امکانات سے مسدود رہنے کے بعد کم از کم اتنا تو ہو گیا ہے ادھر کے لوگ اُدھر کی صورتیں دیکھ سکیں۔

ڈھاکہ پہنچنے کے بعد دنیا ہی بدلی ہوئی تھی دس سال کے عرصے میں اس خطے پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں؟ مصائب وآفات کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ گئے؟ اور کیا کیا انقلابات رونما ہو گئے۔ بہت سی وہ بزرگ شخصیتیں بھی رخصت ہو چکی تھیں جن کی زیارت کا تصور بنگال کے سفر کو دلکش بنا دیتا تھا، جن لوگوں کو بچپن کی حالت میں دیکھا تھا وہ اب جوان نظر آئے، جو لوگ جوان اور چاق و چوبند نظر آتے تھے، وہ ضعف اور بڑھاپے کی سرحد پر دکھائی دیئے۔ پہلے مدارس کے ماحول میں ہر شخص یہ کہتا نظر آتا تھا کہ ”میں آپ کے والد صاحبؒ کا شاگرد ہوں اور اب بیشتر حضرات یہ کہتے سنائی دیئے کہ ہم فلاں سن میں آپ کے ہم سبق رہے تھے یا آپ سے پڑھا تھا۔“

قیام بنگلہ دیش کے دوران مختلف حضرات سے ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد کی جو بے شمار

www.freepdfpost.blogspot.com

لرزہ خیز داستانیں سُننے میں آئیں وہ اس تصور سے کہیں زائد تھیں جو اب تک ہم نے اُس دور کے بارے میں قائم کیا ہوا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس سرزمین پر ظلم وستم کے عفریت کا ننگا ناچ اِتنے مختلف، راستوں اور مختلف محرکات کے تحت ہوا اور اتنی مدّت تک جاری رہا ہے کہ اس کی داستان انتہائی پیچ در پیچ ہے اور اس کی ذمہ داری اتنے مختلف عناصر پر عائد ہوتی ہے کہ شاید اس دور کی صحیح تاریخ کبھی مرتب نہ ہو سکے، کیونکہ برصغیر کے کسی بھی ملک میں غیر جانبداری کے ساتھ ان واقعات کا جائزہ لینے کا حوصلہ نظر نہیں آتا، اس کے علاوہ بنگال کے چپّے چپّے پر ظلم وجور کے اتنے ان گنت نقوش ثبت ہیں کہ ان کا احاطہ کسی کے بس کی بات نہیں اور بس وہاں کے چشم دید واقعات وحالات سننے کے بعد یہ یقین اور مستحکم ہو گیا کہ وہاں جو قیامت ٹوٹی ہے وہ ہماری بداعمالیوں کی سزا تھی اور نوّے ہزار مسلّح افواج کی یہ رہزنیت جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، قدرت کی طرف سے ایک تازیانۂ عبرت کے سوا کچھ نہ تھی۔

۱۹۷۰ء کے انقلاب کے بعد ایک مدّت تک یہ خطہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اب بفضلہٖ تعالیٰ سنبھل گیا ہے، ملک کی سیاسی اور معاشی ابتری اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے اور صدر ضیاء الرحمٰن کی حکومت کے بعد حالات میں کافی سدھار پیدا ہوا ہے، جنگ کے دوران اور اس کے بعد جو ہمہ گیر تباہی مچی تھی اُس کے اثرات اب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ قیامت خیز گرانی اب باقی نہیں رہی جس نے اچھے اچھوں کی کمر توڑ دی تھی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھ جیسے نوارد کے لئے حیرت وعبرت کے اب بھی بے شمار سامان موجود ہیں، گرانی اب بھی پاکستان کے مقابلہ میں ہوش رُبا حد تک بڑھی ہوئی ہے، احقر کو جن ممالک میں جانے کا اتفاق ہُوا ہے اُن میں بنگلہ دیش واحد ملک ہے جہاں پہنچ کر پاکستانی کرنسی کی قیمت بڑھی ہوئی نظر آئی، جب عام بازار میں بنگلہ دیشی روپے کی قیمت پاکستانی روپے کے مقابلے میں تقریباً نصف ہو تو گرانی کا اندازہ خود بخود کیا جا سکتا ہے۔ نظم وضبط اور امن وامان کی صورتحال سقوط ڈھاکہ کے بعد کئی سال تو بالکل مفقود رہی، اب بحمد اللہ وہ کیفیت نہیں ہے لیکن اس معاملے میں اب بھی لوگ دس سال پہلے کے دور کو یاد کرتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد کئی سال تک تو یہ کیفیت رہی کہ علی الاعلان دین کی کوئی بات کرنا ناممکن سا تھا، لیکن اب بحمد اللہ وہ صورتحال مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے، دینی حلقے از سرِ نو سرگرم ہو گئے ہیں، بلکہ اب رفتہ رفتہ ملک میں نفاذِ شریعت کے مطالبات بھی آزادی کے ساتھ اُٹھنے لگے ہیں، دینی مدارس ایک عرصہ ویران رہنے کے بعد پھر آباد ہو چکے ہیں، اور حسبِ سابق اُن کی رونق بحال ہو چکی ہے، جگہ جگہ پہلے کی طرح دینی اجتماعات ہوتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے، تجارت کے معاملے میں ہندوستان پر انحصار قریب قریب ختم ہو چکا ہے اور دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارتی روابط بھارت کے مقابلے میں زیادہ ہو گئے ہیں۔

یہ تمام تبدیلیاں بحمد اللہ خوش آئندہ ہیں اور ملک کو سیاسی استحکام نصیب رہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ رفتہ رفتہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے گا۔

.....☆.....☆.....☆.....

سرکاری سطح پر دینی سرگرمیاں اگرچہ ابھی برائے نام ہی ہیں، لیکن قیام بنگلہ دیش کے ابتدائی دور کے مقابلے میں صورتحال بہت غنیمت ہے؛ حکومت کی طرف سے ایک اشاعتی ادارہ ''اسلامک فاؤنڈیشن'' کے نام سے قائم ہے جس کا مرکزی دفتر ڈھاکہ میں مسجد بیت المکرّم کے قریب واقع ہے، اور شاخیں مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ادارہ پاکستان کے ادارۂ تحقیقات اسلامی سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن گذشتہ ایک سال کے دوران اس نے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اشاعتی کام کیا ہے، صرف اس ایک سال میں اس ادارے نے اسلامی موضوعات پر چار سو سے زائد کتابیں بنگلہ اور انگریزی میں شائع کی ہیں، جو سرکاری اداروں کی عام رفتارِ کار کے لحاظ سے محیر العقول تعداد ہے۔

اِسی ادارے نے ایک گراں قدر کام یہ کیا ہے کہ معارف القرآن کا بنگلہ ترجمہ شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے محترم دوست اور بھائی مولانا محی الدین خاں صاحب ایڈیٹر ''مدینہ''

www.freepdfpost.blogspot.com

بڑی لگن اور محنت، مستعدی اور قابلیت کے ساتھ یہ ترجمہ کر رہے ہیں، اور اس کرامتی رفتار سے کر رہے ہیں کہ سال بھر کی مختصر مدّت میں پانچ جلدوں کا مکمل ترجمہ ہو چکا ہے، ان میں ایک جلد چھپ کر تیار ہو چکی ہے اور دوسری جلد زیرِ طبع ہے، ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد پہلا تحفہ جو احقر کو ملا وہ بنگلہ معارف القرآن کی پہلی جلد تھی۔

اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل بڑے جذبے کے پُر جوش مسلمان ہیں، انہوں نے احقر کے قیامِ ڈھاکہ کے دوران اسلامک فاؤنڈیشن کے ہال میں بنگلہ معارف القرآن جلد اوّل کی تقریبِ رُونمائی منعقد کی، اس تقریب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج الحق صاحب کو بطور صدر اور احقر کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا، شہر کے علماء دانشور اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب خاصی تعداد میں موجود تھے، سات، آٹھ مقررین نے معارف القرآن کے تعارف میں تقریریں کیں، جن میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج الحق صاحب، مدرسہ عالیہ کے حضرت مولانا عُبید الحق صاحب اور دوسرے اہلِ علم وفکر شامل تھے۔ احقر نے بھی تقریباً ایک گھنٹہ اس محفل سے خطاب کیا، اس تقریب کا کچھ حصہ ڈھاکہ ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ اور بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد شاید یہ پہلی اُردو تقریر تھی جو ڈھاکہ ریڈیو سے نشر ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ترجمے کے بارے میں اہلِ علم و دانش کا مجموری تأثر یہ تھا کہ وہ اپنی صحت اور سلاست کے اعتبار سے معیاری ترجمہ ہے اور اس نے بنگلہ زبان کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مترجم موصوف کو مزید توفیق سے نوازیں اور تفسیر کی باقی ماندہ جلدیں بھی جلد منظرِ عام پر آ جائیں۔ آمین!۔

.....☆.....☆.....☆.....

بنگلہ دیش کے اس سفر کے پانچ دن سلہٹ میں اور تین دن ڈھاکہ میں گذرے۔ چاٹگام اور بعض دوسرے مقامات کے حضرات کی طرف سے بھی اصرار تھا کہ وہاں حاضری ہو، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف انہی دو شہروں میں جانا ہو سکا، اس دوران تقریباً بیس سے پچیس چھوٹے بڑے اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، سلہٹ کا مدرسہ قاسم العلوم اس سفر کا اصل داعی تھا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر سلہٹ

تشریف لے جایا کرتے تھے اور وہاں حضرت شاہ جلال صاحب مجرد یمنی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک کے قریب جو مسجد درگاہ مسجد کے نام سے معروف ہے، اُس کے امام حضرت مولانا اکبر علی صاحب مدظلہم نے حضرت والد صاحبؒ ہی کی فرمائش پر چند سال پہلے یہاں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی، شروع میں یہ ایک چھوٹا سا مکتب تھا، لیکن رفتہ رفتہ بفضلہٖ تعالیٰ اس نے ایک بڑے مدرسے کی شکل اختیار کر لی اور یہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دُعاؤں اور حضرت مولانا اکبر علی صاحب کے خلوص اور جدوجہد کی برکت ہے کہ آج یہ مدرسہ بنگلہ دیش کے ممتاز دینی مدارس میں شامل ہوتا ہے، حضرت مولانا اکبر علی صاحب ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی بغایت سادہ، متواضع، فنافی اللہ، مگر شگفتہ و معصوم شخصیت کی مثالیں اور اس دور میں خال خال ہی ملیں گی، اُن کے سوز دروں نے اس مدرسے کو مختصر مدّت میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اس مدرسے میں متعدد خصوصی اجتماعات اور ایک عام جلسے سے خطاب کا موقع ملا۔ سلہٹ کے ایک اور مدرسے میں بھی حاضری ہوئی اور وہاں بھی کچھ معروضات پیش کی گئیں۔

اس کے علاوہ سلہٹ بار کونسل میڈیکل کالج، ہوسٹل اور اسلامک فاؤنڈیشن میں بھی خطابات کا موقع ملا۔ سلہٹ کافی عرصے سے بزرگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے اسے اوّل تو حضرت شاہ جلال صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی برکات حاصل ہیں جو اس علاقے کے صوری اور معنوی فاتح ہیں، پھر یہاں کے حضرات کے دینی ذوق وشوق نے ہمیشہ بزرگوں کیلئے اس خطے میں کشش رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سہول صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مدّت تک یہاں مقیم رہے جس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں، پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ مدّت دراز تک رمضان المبارک میں یہی گذارتے رہے۔ آپ کے فیوض یہاں چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب قدس سرہ تقریباً ہر سال یہاں تشریف لاتے اور طویل عرصے تک مقیم رہتے۔ آپ کے پھیلائے ہوئے فیوض و انوار بھی یہاں محسوس و مشاہد ہیں۔ اب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم یہاں تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ان تمام بزرگوں کی خصوصی

www.freepdfpost.blogspot.com

توجہات کا یہ اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے شہروں کے مقابلے میں تدین کا معیار بلند ہے، لوگوں میں دین کا خاص ذوق وشوق پایا جاتا ہے، بے پردگی، عریانی اور بے دینی کے دُوسرے اثرات بہت کم پائے جاتے ہیں، قُدرت نے اس علاقے کو اس معنوی حُسن کے ساتھ ظاہری حُسن سے بھی نوازا ہے۔ پُورا شہر دریائے سُرمہ کے دونوں اطراف سرسبز وشاداب پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے اور اکثر شہر میں چلتے وقت انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے کسی باغ میں چل رہا ہو، اس لئے سلہٹ کا قیام ہمیشہ احقر کے لئے بڑا پُر کیف اور پُرسکون رہا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہ کیف وسُرور پُوری طرح حاصل رہا، البتہ یہ کسک دل سے کسی وقت نہیں گئی کہ پہلے یہاں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حاضری ہوتی تھی اور اس مرتبہ تنہا ہوئی، اور پہلے یہاں ایک ملکی باشندے کی حیثیت سے آنا ہوتا تھا اور اب غیر ملکی ہونے کی حیثیت سے۔ لیکن کلمۂ طیبہ کے رشتے نے تمام مسلمانوں کو محبت و اُخوت کے جس رشتے میں منسلک کیا ہوا ہے، سچی بات یہ ہے کہ اُس نے اس انقلاب کا احساس نہیں ہونے دیا، وہاں کے حضرات جس خلوص ومحبت اور گرم جوشی کے ساتھ پیش آئے، وہ پہلے سے بھی زیادہ تھی۔

آخر تین دن ڈھاکہ میں گزرے اور وہاں جامعہ قرآنیہ لال باغ، مدرسہ نوریہ اور فرید آباد کے مدرسوں میں حاضری ہوئی، اس دوران اسلامک فاؤنڈیشن کی تقریب منعقد ہوئی، انجینئرنگ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ بھی ایک خصوصی نشست رہی، بہت سے بچھڑے ہوئے احباب سالہا سال کے بعد ملے: اور قیام ڈھاکہ کی سب سے بڑی سعادت حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب مدظلہم کی زیارت وصحبت تھی جو اَب اس علاقے میں حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرّہ کے واحد خلیفہ ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی دعوت وارشاد فیض پورے بنگلہ دیش میں پھیل رہا ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک پُر فضا جزیرے کمرنگی چر میں آپ نے جو مدرسہ نوریہ قائم فرمایا ہے وہ رفتہ رفتہ ایک عظیم مرکزِ فیض بنتا جارہا ہے۔ اس مدرسے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ساتھ ساتھ ایک آباد خانقاہ بھی ہے اور اطراف ملک سے تشنگانِ معرفت اس میں حاضر

ہوکر فیضیاب ہوتے ہیں۔ آج کل اس مدرسے کے مہتمم حضرت مدظلہم کے صاحبزادے برادر عزیز ومحترم مولانا حمید اللہ صاحب ہیں، جو ایک مدّت تک دارالعلوم کراچی میں زیر تعلیم رہے ہیں اور اب ماشاء اللہ بڑی قابلیت کے ساتھ مدرسے کی تدریسی اور انتظامی اُمور سنبھالے ہوئے ہیں، **ذادہ اللہ علماً وصلاحاً**۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے محترم بزرگ مولانا مفتی محی الدین صاحب مفتی مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ کا ذکر خیر نہ کروں، آپ کی شفقت وعنایت کا حال یہ ہے کہ احقر کے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کے وقت سے لے کر واپسی تک ایک لمحے کے لئے بھی گھر تشریف نہیں لے گئے اور مُسلسل اس ناکارہ کے ساتھ رہے، ان کی صحبت کو میں ایک عظیم نعمت سمجھتا ہوں جو بغیر کسی محنت کے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو تادیر بعافیت سلامت رکھے اور ہمیں ان کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!۔

.....☆.....☆.....☆.....

www.freepdfpost.blogspot.com

قطر سیرت کانفرنس

محرم ۱۴۰۰ھ نومبر ۱۹۷۹ء

(۷)

قطر سیرت کانفرنس

پچھلے مہینے قطر کے محکمہ اُمور مذہبی کی طرف سے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا اتفاق ہوا..... تقریباً چار سال قبل اس نوعیت کی پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس حکومت پاکستان نے کراچی میں منعقد کی تھی، اس موقع پر اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی تھی کہ ہر سال کوئی ایک اسلامی ملک سیرت طیبہ کے موضوع پر اسی نوعیت کا عالمی اجتماع منعقد کیا کرے۔ چنانچہ دوسرا اجتماع ترکی میں ہوا تھا اور قطر کی یہ کانفرنس اس سلسلے میں تیسری کڑی تھی۔

جزیرۂ عرب کے نقشے پر نظر ڈالیں تو اس کے مشرقی کنارے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ نما خلیج فارس میں لٹکا نظر آتا ہے، یہ جزیرہ نما قطر کے نام سے موسوم ہے اور جزیرۂ عرب ہی کا ایک حصہ ہے جسے عہد رسالت میں حضرت علاء بن الحضرمیؓ نے اسلام کی روشنی سے منور کیا تھا اور یہ ان خوش نصیب خطّوں میں سے ہے جسے سرکار دو عالم ﷺ کی زیر نگیں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ دو لاکھ آبادی اور تقریباً بارہ ہزار مربع میل کی یہ ریاست ابتداء سعودی عرب ہی کا ایک پسماندہ حصہ تھی۔ لیکن تیل کی دریافت کے بعد اس نے مستقل حکومت کی شکل اختیار کر لی اور اب یہاں تیل کے ''زرِ سیال'' کی بدولت جدید تمدّن کے تمام مظاہر آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

تیسری عالمی سیرت کانفرنس اسی ریاست کے دارالحکومت دوحہ میں منعقد ہوئی جسے اُردو میں دوہا بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اِس کانفرنس میں دنیا کے اکیاون 51 ملکوں

www.freepdfpost.blogspot.com

سے دو سو مندوبین کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور اس لحاظ سے یہ کانفرنس ایک مثالی کانفرنس تھی کہ بیشتر ملکوں سے وہاں کے چوٹی کے اہل علم و دانش نے اس میں حصہ لیا۔ دو سو مندوبین میں سے خاص طور پر جن حضرات کے اسماء گرامی اس وقت یاد آ رہے ہیں، اُن میں اردن سے مصطفےٰ الزرقاء، سعودی عرب سے شیخ عبد الفتاح ابوغدہ، شیخ عبد المحسن العباد، شیخ محمد المبارک، ڈاکٹر معروف الدوالیبی اور شیخ محمد علی الحرکان، کویت سے شیخ یوسف القرضاوی، شیخ یوسف ہاشم الرفاعی، شیخ عبداللہ العلی المطوع، ہندوستان سے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد سالم قاسم اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مراکش سے استاذ عمر بہاالامیری، شیخ عبداللہ بن کنون، ابوظبی سے شیخ عبدالعزیز المبارک۔ شام سے ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، مصر سے شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ محمد نجیب المطیعی، تیونس سے شیخ محمد الحبیب بلخوجہ اور استاذ مصطفےٰ کمال التارزی بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شرکاء کی ایک بڑی تعداد نے اپنے مقالوں کی تیاری میں محنت سے کام لیا اور بعض قابل قدر عملی تحقیقات پیش کیں، ورنہ آج کل کی کانفرنسوں میں یہ پہلو بھی کمزور ہونے لگا ہے۔ کانفرنس کا اصل موضوع اگرچہ سیرت طیبہ تھا، لیکن اس میں سنت وحدیث کی تشریعی حیثیت کا بھی شامل کرلیا گیا تھا چنانچہ اس موضوع پر اعلیٰ درجے کے علمی مقالے اس میں پیش کئے گئے، جو اس موضوع کے لٹریچر میں عمدہ اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کانفرنس کا حُسنِ انتظام بھی بلاشبہ قابل تعریف تھا اور سارے ہی مندوبین کو اس پہلو سے رطب اللسان پایا گیا۔

.....☆.....☆.....☆.....

لیکن اس قسم کی عالمی کانفرنسوں کا ایک پہلو جو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، یہ ہے کہ ان میں علمی اعتبار سے خواہ کتنے بلند پایہ مقالے پڑھے جائیں اور کتنے زوردار قرار دادیں منظور کی جائیں، عمل کی دنیا میں ان کا کوئی اثر کبھی ظاہر نہیں ہوتا اور نہ حاضرین کو اس

کام کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم العالی نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں.....جو ولی عہد ریاست قطر کے زیر صدارت منعقد ہورہا تھا..... وفود کی طرف سے جو اثر انگیز تقریر فرمائی، اس میں نہایت دردمندی، دل سوزی، حکمت اور بلاغت کے ساتھ اس پہلو کی طرف توجہ دلائی جس نے تمام حاضرین کو بے حد متاثر کیا۔

احقر کو بھی اس کانفرنس میں ''آنحضرت ﷺ کی دعوت وتبلیغ'' کے موضوع پر مقالے لکھنے کے لئے کہا گیا تھا، اور میں نے اس موضوع پر ایک مقالہ تقریباً تیار کر بھی لیا تھا، لیکن طبیعت پر یہ پہلو اس قدر غالب ہوا کہ اس مقالے کو پیش کرنے کے بجائے احقر نے ایک اور مختصر تقریر تیار کر کے پیش کی۔ ذیل میں اِس تقریر کا متن اور ترجمہ پیش خدمت ہے۔

بسمه الله الرحمن الرحيم

الحمد الله رب العالمين، واصلوٰة و السلام على خير خلقه سيدنا ومولانا محمّد و على اله و صحبه اجمين، وعلى من تبيعهم باحسان الى يوم الدين

و بعد، فايها السادة الافاضل!

انى لا اريد ان اقرا بحثا، فان البحوث العلميته قد كثرت، ولا ان القى كلمته، فان الكلمات القيمته قدالقيت، والحمدالله. ونستطيع ان نقتبس من خلالها ما يفيد نا فوائد و ينفعنا منافع علمية.

ولكنّى اريد ان الفت الا نظار الى نقطة هامّته ربّما تغيب عن اعيننارغم كو نها ظاهرة بديهيته .

و ذلك اننا نو من جميعا، والحمدالله، بانّ هذه الثورة الأمنة الاسلاميته التى احد ثها رسول الله ﷺ انما حدث

www.freepdfpost.blogspot.com

باتباع سنته وسيرته عليه السلام فی عبادته و خلقه، ومعاملاته و معاشرته، وفی سائر نواحی الحیاة. وممانتفق علیه ایضاانا لا یمکن لنا اعادة ذلک الماضی المجید من العزة و المکرامة، والرقی والا زدهار، الا بالرجوع الی سیرته ﷺ مرة اخری.

فهذاما نعتقده جمیعا و نؤمن به. ولکن السئوال الهمّ ههنا، لما ذالا نقطف ثمرات هذا الایمان؟ مع ان الصحابة رضی الله عنه بلغوابه ذروة المجد الکمال؟ فاذا ادرسناهذا الموضوع نی حیاة الصاحبابة رضی الله تعالیٰ عنهم رأینا ان ایما نهم بهذه الحقیقة لم یکن ایمانا عقلیا اور نظریا فحسب، و انما کان ایمانا قلبیا و طبعیا یعضده حبهم العمیق الله ولرسوله، فلم یکن یعجبهم الا هدی الرسول ﷺ فی حیاته و معاشرته، و خلقه و سیرته، وعبادته و معاملته، حتّی وفی صورته وزیه، وکانت میّزة اتباعهم لسنة الرسول ﷺ انهم لم یخافوافیه لومة لائم ولا انکار منکر، ولم یحتفلوا ابدا السخریة لکفاراواستهزاء الا جانب او استخفاف المشرکین بل ثبتوا علی السنة النبویة حبّا لهم ایاها. واعتقادا جازما منهم بانه لا خیر فی غیر ها، ولم یترکوها ارضاء للمشرکین اومداراة للکفّار اواستمالة لقلوب الا جانب. حتی وفی اشیاء نعدّها الیوم بسیطة جدّا.

فقد اخرج ابن ابی شیبة وغیره عن ایاس بن سلمة عن ابیه فی قصة طویلة انه لما خرج عثمان بن عفّان رضی الله عنه رسولا الی اهل مکة یوم الحدیبیة جاء عسکرا لمشرکین فعبثوا به واساء وا له القول، ثم اجاره ابان سعید بن العاص ابن عمه وحمله علی السرج ورد فه، فلما قدم قال یا ابن عمّ مالی اراک متخشعا؟

اسبل(یعنی ازارک) وکان ازاره الی نصف ساقیه، .....ولا شک انه کان فی هذا المشورة بعض المصلحةفی الظاهر، ولکن لم یرض بذالک عثمان رضی الله عنه وانما اجا بهم بقوله: "هکذاازارة صاحبنا" (ﷺ)(کنز العمال۸: ۵۶)

و اخرج ابو نعیم و ابن منده عن جثامةبن مساحق الکنانی رضی اللهعنه وکان عمرؓ قد بعثه رسولا الی هرقل، قال جلست فلم ادر ماتحتی؟ فاذا تحتی کرسی من ذهب، فلما رأیت نزلت عنه، فضحکَ، فقال لی: لم نزلت عن هذا الذی اکرمناک به؟ فقلت: انی سمعت رسول الله ﷺ ینهی عن مثل هذا. (کنز العمال۷: ۱۵ والا صابة ۱: ۲۲۸)

فالحدیث عن مثل هذا الا خبار طویل، وتاریخنا مفعم بهذه النماذج الطیبة لا تباع النبی الکریم ﷺ، والذی یتحصل مین امثال هذه القصص هوان الصحابة رضی الله عنهم قد اتبعو النبی الکریم ﷺ اتباعاً کاملا لا مدخل فیه للهوی، ولا للتحریف. ولا للخوف من الاجانب، ولا للمبالاة باستهزاء الکفار و المشرکین.

وأمّا نحن، فمع ایماننا بان سیرتهﷺ خیر سیرة نفرق بین سننه علیه السّلام، فنختار منها مانهواه، و نترک اخری قائلین مرة بانها سنة عادیة لا یجب علینا اتباعها کاننا وجد نا عادة خیرا من عادته ﷺ فاتبعنا ها، والعیاذ بالله. وتارة بانها سنة تخالف المصلحة فی ظروفنا الحاضرة، واخری بانها کانت مشروعة فی وقته ﷺ ولیست مشروعة فی عهد نا.

www.freepdfpost.blogspot.com

فامثال هذه التا ويلات التى نرتكبها فى حياتنا ليلا ونهار، انما تدل على ان ايماننا لسنة الرسول ﷺ ينقصه الحبّ وهذا هوا الفرق العظيم البين بين ايماننا وايمان اصحابةرضى الله عنهم فلو كنا نريد ان نلقى تلك العزة والكرامة وذلك الرقىّ والا زدهار الذى صار نصيب المسلمين فى القرون الا ولى بسبب اتباع السنة النبوية على صاحبها السّلام، فلا بدلنا ان نتبعه ﷺ كما اتّبعه اصّابه والتابعون من غيرتحريف وتمويه، ومن غير ارضاء لما تهوى النفوس، ومن غير خوف من استهزاء الا جانب..... هوالله ليس العزّ فى الابنية الشامخة، ولا فى القصور العالية، ولا فى الملابس الفاخرة وانما العزّنى اتباع النبى الكريم عليه الصوات والسلام الذى كان يجوع يوما ويشبع يوما. والذى كان ينام على الحصير ويربط على بطنه الا حجار، ويحفر الخندق، ويحمل بيده الشريفة البنات لنباء المسجد، فلا عنّ لنا الا بالا صطباغ التام فى صبغته ﷺ فى كل شئى.

وان هذا الموتمر الحاشد المبارک الذى جمع اهل العلم والفكر من مسارق الارض و مغاربها، ليقتضى منا ان نحاسب انفسنا على هذا الطريق ، وان نضع للمسلمين مخطّطا يغرس فى قلو بهم المحبّ العميق للسنة النبويةعلى صاحبها السّلام حتى لاتغر هم الا هواء ولا النظر يات الا جنبية الفاسدة.

فأ قترح ان يتخذ هذا المنو تمر توصيات تالية بكّل عزم و اخلاص.

١ .يوصى هذا المؤتمر جميع المسلمين عامّة وجميع اهل العلم والفكر وعاة الا اسلام خامة ان يهتمّو اهتما ما با لغا با لا تباع

التام للسيرة والسنة النبوية على صاحبها السّلام فى حياتهم ومعيشتهم بما يجعل حياتهم انمو ذجاعمليا صالحا للسنة النبوية.

٢ .يوصى هذا المئو تمر جميع المسلمين فى كل زمان ومكان ان يعين كل احدهم وقتا، ولو نصف ساعة،، كل يوم لدراسة السيرة النبوية على صاحبهاالسّلام. يدر سها بنفسه و يقرأ ها على اعضاء اسرته، ويحاسب نفسه كم عمل باحكامها؟.

٣ .يقترح هذا المئوتمرمن الحكومات الاسلامية ان يجعلوا السيرة النبوية مادة اجبارية من موادّ التعليم فى كل مرحلة من مراحل لدرسة فى المدارس وا لكيات والجامعات، وان يعينوا وقتاً صالحا تعلم فيه السيرة والسنة النبوية على الاذاعات كل يوم.

٤ . يوصى هذا المئوتمر اهل العلم والفكر ان يهتمّوا بنشر السيرة النبوية فيها بين الشعب والعامة بها يسهل لهم فهمها، سواء كان كتابة او خطابة، وان لا يطبّقوا القرآن والسنة على النظريات الا جنية الحديثة بما يئو دى الى التحريف بل يجعلوا السيرة النبويةكما هى، اسوة الحلّ مشاكل المسلمين فى جميع شئون الحياة.

www.freepdfpost.blogspot.com

بِسمِ اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

معزز حضرات!

میں اس وقت کوئی مقالہ پڑھنا نہیں چاہتا ، کیونکہ عملی مقالات بہت ہو چکے، نہ میں کوئی تقریر کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ بحمد اللہ گراں قدر تقریر بھی کافی ہو چکیں اور ہم انشاءاللہ ان مقالات اور تقریروں سے بہت سے عملی فوائد حاصل کر سکیں گے۔

اس کے بجائے میں صرف ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جو ظاہر بلکہ بدیہی ہونے کے باوجود اکثر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نادرِ عملی تحقیق نہیں ہے جو ممتاز عُلماء کے سامنے پیش کی جا رہی ہو، کیونکہ میں اس کا اہل ہی نہیں بلکہ دراصل یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ یاد دہانی ہے جسے ہم اس جیسی کانفرنسوں کے موقع پر بعض اوقات فراموش کر دیتے ہیں۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ بحمد اللہ سب کا اس بات پر ایمان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دنیا میں جو پُر امن اسلامی انقلاب برپا کیا، وہ صرف اس طرح رُونما ہو سکا کہ لوگوں نے عبادات واخلاق سے لے کر معاملات و معاشرت تک ہر شعبۂ زندگی میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت وسنّت کی پیروی کا اہتمام کیا۔ اسی طرح اس پر بھی ہم سب کا اتفاق ہے کہ ہمارے تابناک ماضی میں جو ہمیں عزت وکرامت اور ترقی وخوشحالی نصیب ہوئی اُسے دوبارہ واپس لانے کا واحد طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک بار پھر آنحضرت ﷺ کی سیرت کی طرف رجوع کر کے اس کا حقیقی اتباع کریں۔

یہ وہ بات ہے جس پر ہم سب ایمان واعتقاد رکھتے ہیں، لیکن یہاں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس ایمان و اعتقاد کا کوئی پھل کیوں نہیں مل رہا؟ حالانکہ صحابۂ کرامؓ اسی ایمان واعتقاد کی بدولت عزت وکرامت کے بامِ عروج تک پہنچ گئے تھے؟ جب ہم نے اس موضع کا مطالعہ صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں کرتے ہیں تو

ہمیں نظر آتا ہے کہ دراصل اس حقیقت پر اُن کا یہ ایمان محض عقلی یا نظریاتی ایمان نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا طبعی ایمان تھا جس کی جڑیں ان کے دلوں میں مستحکم تھیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ ان کی گہری عقیدت ومحبت اس ایمان کی آبیاری کرتی رہتی تھی، چنانچہ معیشت و معاشرت، سیرت واخلاق، عبادات و معاملات، یہاں تک کہ شکل وصورت اور لباس ووضع تک زندگی کے ہر شعبے میں انہیں نبی کریم ﷺ کے طور طریق کے سوا کوئی اور طریقہ بھاتا ہی نہیں تھا، ان کے اتباعِ سنت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اس معاملے میں نہ کبھی کسی کی ملامت کی پروا کی، نہ کسی تردید وتنقید کو خاطر میں لائے اور نہ کبھی غیروں کے تمسخر واستہزا کا کوئی اثر قبول کیا۔ انہوں نے کبھی غیر مسلموں کو خوش کرنے یا اُن کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سنت کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

مصنف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمانؓ بن عفان آنحضرت ﷺ کے ایلچی بن کر اہل مکّہ کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ استہزاء اور بدکلامی کا معاملہ کیا، بعد میں حضرت عثمانؓ کے چچا زاد بھائی ابان بن سعید نے انہیں پناہ دی اور اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لے گئے۔ حضرت عثمانؓ کا زیر جامہ (سنت کے مطابق) آدھی پنڈلی تک تھا (جسے سردارانِ قریش معیوب سمجھتے تھے) چنانچہ ان کے چچا زاد بھائی نے کہا کہ بھائی! آپ اتنے متواضع کیوں نظر آ رہے ہیں؟ آپ اپنے زیر جامہ کو ذرا نیچا کر لیجئے (تاکہ سردارانِ قریش آپ کو حقیر نہ سمجھیں) ..... بظاہر یہ مشورہ خیر خواہی اور مصلحت پر مبنی تھا، لیکن حضرت عثمانؓ اس پر راضی نہ ہوئے، بلکہ جواب میں فرمایا..... ''ہمارے آقا (ﷺ) کا زیر جامہ ایسا ہی ہے۔'' (لہٰذا میں اس طریقے کو چھوڑ نہیں سکتا۔ (کنز العمال ۸:۵۶)

اسی طرح حافظ ابونعیمؒ اور حافظ ابن مندہؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت

www.freepdfpost.blogspot.com

جُثامہ بن مساحق کنانی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمرؓ نے ہرقل شاہِ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تھا، وہ ہرقل کے دربار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''میں بے خیالی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے پتہ نہ چل سکا کہ میرے نیچے کیا چیز ہے؟ اچانک میں نے دیکھا کہ سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوں، جب میری نظر اُس پر پڑی تو میں اس سے اُتر گیا، ہرقل یہ دیکھ کر ہنسا اور کہنے لگا: ''ہم نے تو (اس کرسی پر بٹھا کر) تمہارا اعزاز کیا تھا، تم اُتر کیوں گئے؟'' میں نے جواب میں کہا کہ ''میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ اس جیسی کُرسی کے استعمال سے منع فرماتے تھے۔'' (کنز العمال ۷: ۱۵۔ اور اصابہ ۱: ۲۲۷)

اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں اور ہماری تاریخ اتباع سنّت کی ایسی پاکیزہ مثالوں سے لبریز ہے، لیکن ان جیسے واقعات سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے نبی کریم ﷺ کی ایسی مکمل پیروی کر کے دکھائی جس میں نہ خواہش کا کوئی دخل تھا، نہ تحریف وتاویل کا، نہ غیروں سے ڈرنے کی فکر تھی نہ کفار ومشرکین کے تمسخر واستہزاء کا کوئی خیال۔

اس کے برعکس، ہمارا حال یہ ہے کہ اگرچہ زبانی طور پر ہمارا ایمان یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ روئے زمین پر سب سے بہتر سیرت ہے لیکن عملاً ہم نے آپ کی سنّتوں میں یہ فرق شروع کر دیا ہے کہ جو سنّت طبیعت کے موافق ہو اُسے تو اختیار کر لیتے ہیں، لیکن جن سنّتوں پر عمل کرنے کے لئے طبیعت آمادہ نہ ہو انہیں کبھی یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ تو آپ ﷺ کی سنت عادیہ ہے جس کا اتباع ہم پر واجب نہیں، گویا معاذ اللہ ہمیں آپ ﷺ کی عادت سے بہتر کوئی عادت مل گئی ہے، جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے اور کبھی ترکِ سنّت کے لئے یہ بہانہ بنا دیتے ہیں کہ فلاں سنّت ہمارے موجودہ حالات کے لحاظ سے مصلحت کے مطابق نہیں ہے اور کبھی یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ سنّت آپ ﷺ کے عہد مبارک میں تو مشروع تھی، لیکن ہمارے زمانے میں مشروع نہیں ہے۔

ہماری یہ تلاوت جن کا ارتکاب ہم صبح و شام کرتے رہتے ہیں، اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے ایمان میں دراصل محبت کی کمی ہے اور یہی وہ عظیم اور واضح فرق ہے جو ہمارے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایمان کے درمیان پایا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم واقعۃً یہ چاہتے ہیں کہ اس عزت وکرامت اور اُس عروج وترقی کے مستحق بنیں جو قرونِ اولیٰ میں حضراتِ صحابۂ کرامؓ کو اتباعِ سنّت کی برکت سے حاصل ہُوا تو پھر یہ ناگزیر ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی اتباع اسی طرح کریں جس طرح صحابۂ کرامؓ نے کر کے دکھائی تھی۔ اس اتباع میں نہ کسی تحریف وتاویل کا کوئی شائبہ ہو، نہ خواہشات نفس کو راضی کرنے کا اور نہ غیروں کے استہزاء سے خوف کا۔ اس لئے کہ خدا کی قسم! ہمارے لئے نہ یہ سربفلک عمارتیں سرمایۂ عزت ہوسکتی ہیں، نہ یہ عالیشان محلات اور زرق برق لباس سامان افتخار بن سکتا ہے۔ ہمارے لئے عزت ہے تو اس نبی امی ﷺ کی ٹھیک ٹھیک پیروی میں ہے جو ایک دن کھاتا اور ایک دن بھوکا رہتا تھا، جو چٹائی پر سویا کرتا تھا، جو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودتا تھا۔ اور جو تعمیرِ مسجد کے لئے اپنے مبارک ہاتھوں سے اینٹیں ڈھونڈنے کی خدمت انجام دیتا تھا، جب تک ہم اس نبی امی ﷺ کے رنگ میں اپنے آپ کو پوری طرح رنگنے کی کوشش نہیں کریں گے، اس وقت تک ہمیں کوئی عزت اور کوئی سرفرازی حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ عظیم اور مبارک کانفرنس جس میں سیرت وسنّت کے نام پر مشرق ومغرب کے ممتاز اہل علم ودانش جمع ہیں، ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اس طریقے پر اپنے آپ کا محاسبہ کریں اور پھر وہ طریقے سوچیں جن سے مسلمانوں کے دل میں اتباعِ سنّت کی ایسی محبت پیدا کی جائے جس کی موجودگی میں وہ اپنی خواہشات نفس یا غیر اسلامی نظریات کے دھوکے میں نہ آسکیں۔

لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ کانفرنس پورے خلوص اور عزم کے ساتھ مندرجہ ذیل

www.freepdfpost.blogspot.com

قراردادیں منظور کرے۔

۱۔ یہ کانفرنس تمام مسلمانوں سے عموماً اور اہل علم و دانش اور مبلغین اسلام سے خصوصاً یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنے طرز معیشت اور اپنے طرز، معاشرت میں آنحضرت ﷺ کی مکمل اتباع کریں، خود اہتمام کریں تاکہ ان کی زندگیاں بذاتِ خود سنّتِ نبویؐ کا حسین عملی نمونہ ہوں۔

۲۔ یہ کانفرنس ہر زمانے اور ہر خطے کے مسلمانوں سے یہ سفارش کرتی ہے کہ وہ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ تھوڑا سا وقت.....خواہ وہ نصف گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو،

سیرت طیّبہ کے مطالعے کے لئے وقف کریں اور اس وقت میں وہ خود بھی سیرت کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر والوں کو بھی سنائیں اور روزانہ اس بات کا محاسبہ کریں کہ انہوں نے سیرت کے احکام پر کتنا عمل کیا؟

۳۔ یہ کانفرنس تمام اسلامی ممالک کی حکومتوں سے اپیل کرتی ہے کہ سیرت نبویؐ کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کے ہر مرحلے میں لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کریں اور نشریاتی اداروں پر روزانہ سیرت وسنّت کی تعلیم کے لئے موزوں وقت مقرر کریں۔

۴۔ یہ کانفرنس تمام اہل دانش سے اپیل کرتی ہے کہ وہ تقریر کے ذریعے عوام میں آسان اور عام فہم انداز سے سیرت وسنّت کی نشر و اشاعت کریں اور قرآن وسنّت میں تحریف کر کے انہیں جدید غیر اسلامی نظریات پر منطبق کرنے کی کوشش کی بجائے سیرت وسنّت کو اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مسلمانوں کے مسائلِ حیات کے حل کے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین .

دَورۂ چین

نومبر ۱۹۸۵ء

www.freepdfpost.blogspot.com

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۸)

دَورۂ چین

جب سے چین نے مذہب کے بارے میں اپنی سخت پالیسی کو نرم کر کے مسلمانوں کو کچھ مذہبی آزادی دی ہے، اُس وقت سے چینی مسلمانوں کا رابطہ عالم اسلام کے مختلف مراکز سے قائم ہونے لگا ہے، پاکستان کے توسط سے ہر سال چینی مسلمانوں کی ایک قابل ذکر تعداد حج کو جانے لگی ہے اور امسال تو دو ہزار چینی مسلمانوں نے یہ مقدس فریضہ ادا کیا، اور پاکستان کو ان کے سفری انتظامات کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ مناسب ہی نہیں ضروری بھی ہے کہ اسلامی ملکوں سے مختلف وفود چین جائیں اور دینی معاملات میں وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کی راہیں تلاش کریں۔ اسی غرض سے حکومت پاکستان کئی مرتبہ علماء کے وفود چین بھیج چکی ہے اور کئی بار چینی مسلمانوں کے وفود پاکستان آ چکے ہیں۔

امسال حکومتِ پاکستان نے ایک مختصر وفد احقر کی قیادت میں بھیجنے کا ارادہ کیا، دوسرے اعضاءِ وفد میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب (مہتمم جامعہ نعیمیہ لاہور)، مولانا فخر الحسن کراروی (پشاور) اور وزارتِ مذہبی اُمور کے ڈپٹی سیکریٹری محفوظ احمد صاحب شامل تھے۔

اتوار ۳ر نومبر کی صبح ۷ بجے ہم اسلام آباد ایئرپورٹ سے پی آئی اے کے ذریعے روانہ ہوئے۔ اس سمت میں یہ میرا پہلا سفر تھا، اور قدرتی طور پر بڑے اشتیاق کے ساتھ اس سفر کا آغاز ہوا۔ اب اسلام آباد سے جانے والی پرواز پاکستان کے طویل شمالی

www.freepdfpost.blogspot.com

سلسلۂ کوہ کو عبور کر کے سنکیانگ کے راستے پیکنگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسلام آباد کی مرگلہ پہاڑی عبور کرتے ہی حدِ نظر تک اس کوہستان کی برفانی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ اور جہاز نے ان سے بلند ہونے کے لیے دوبارہ اسلام آباد کا چکر کاٹا، اس کے باوجود ان برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ان کا فاصلہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ کی پرواز کے بعد دائیں طرف ایک بہت اونچی چوٹی نظر آئی، جو آس پاس کی تمام چوٹیوں میں ممتاز نظر آتی تھی۔ پائلٹ نے اعلان کیا کہ یہ ناگا پربت ہے جو سطحِ سمندر سے چھبیس ہزار فٹ بلند ہے اور دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں چھٹے نمبر پر ہے۔ جہاز اس کے بالکل قریب سے اسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ چند لمحوں بعد جہاز کے بائیں طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا گلگت شہر نظر آیا۔ اور اس کے چند ہی منٹ پر پائلٹ نے اعلان کیا کہ اس وقت جہاز دنیا کی مشہور چوٹی کے۔ٹو کی بالکل محاذات سے گزر رہا ہے۔ جہاز کے مشرق میں دائیں جانب ایک مثلث سر بفلک چوٹی نظر آئی جو پہاڑوں کے سمندر میں ایک سرافراز جزیرے کی طرح ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ یہ کوہِ قراقرم کے سلسلے کی وہ چوٹی ہے جسے گڈون آسٹن بھی کہتے ہیں اور جو اُنتیس ہزار فٹ بلند ہونے کی بناء پر ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔

پاکستان کے شمال میں اللہ تعالیٰ نے سر بفلک پہاڑوں کی جو حسین فصیل بنائی ہے، اسے اس طرح پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاز سے ان پہاڑوں اور ان پر حدِ نظر تک ڈھکی ہوئی برف کی سفید براق چادر کا منظر اس قدر دلکش تھا کہ رویں رویں سے فتبارک اللہ احسن الخالقین کی صدا آنے لگی۔ حسن و جمال کے خزانے لٹانے کے علاوہ یہ پہاڑ ملک کی جو دفاعی خدمات انجام دیتے ہیں، اس کے پیشِ نظر اقبالؔ مرحوم کے اشعار یاد آ گئے ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر — خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تقریباً پچاس منٹ کی پرواز کے بعد اسی کوہستان کے عین درمیان پائلٹ نے اعلان کیا کہ اب ہم پاکستان اور چین کی درمیانی سرحد پر پہنچ چکے ہیں، اور اس کے فوراً بعد جہاز چین کے سب سے بڑے صوبے سنکیانگ (چینی ترکستان) میں داخل ہو گیا۔

.....☆.....☆.....

چین رقبے کے لحاظ سے سوویت یونین اور کینیڈا کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے، جس کا مجموعی رقبہ ۹۶ لاکھ مربع کلومیٹر ہے، اور آبادی کے لحاظ سے تو دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے جس کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے۔ اس کی سرحدیں مغرب میں پاکستان، افغانستان، بھارت، نیپال، سکم اور بھوٹان سے، جنوب میں برما، لاؤس اور ویت نام سے، مشرق میں کوریا سے، شمال میں منگولیا اور سوویت یونین سے ملتی ہیں۔

یہ پورا علاقہ بڑی متنوع اور رنگا رنگ جغرافیائی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں سر بفلک پہاڑوں کے طویل سلسلے بھی ہیں، لق و دق صحرا بھی، اور نظر افروز سبزہ زار بھی، چنانچہ پیکنگ تک سفر میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے یہ متنوع علاقے نظر آتے رہے۔ قراقرم کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتے ہی ایسا بے آب و گیاہ ریگستان شروع ہو گیا جس میں حدِ نظر تک زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد پھر برف پوش پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ آ گیا، اور نشیب و فراز کا یہ سلسلہ پیکنگ پہنچنے تک جاری رہا۔ غالباً اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ چین کو اگر مغرب سے اس طرح دیکھا جا سکے کہ مشرق کے ساحلی علاقوں تک پورا خطہ سامنے ہو تو ایک زینہ سا اُترتا نظر آئے گا۔

تقریباً چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بیجنگ[1] کے ہوائی اڈے پر اُترا تو یہاں شام کے چار بجے تھے۔ (چین کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے آگے ہے)۔ جہاز کے شوٹ سے

[1] اس شہر کا اصل چینی نام بیجنگ ہے۔ انگریزوں نے اسے "پیکنگ" کے نام سے مشہور کیا، اور انگریزی میں اس کے ہجے (Peking) کئے۔ بعد میں اہل چین نے اس کو اصل تلفظ کی طرف لوٹانے کیلئے اس کو "بیجنگ" ہی کہنا شروع کر دیا ہے، اور اب دنیا بھر میں اسے (Beijing) ہی کہا جاتا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نکلتے ہی لاؤنج میں پاکستانی سفارت خانے کے اعلیٰ افسران نے وفد کا استقبال کیا، اور ایک لاؤنج عبور کرنے کے بعد چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے عہدہ داران، اور چین کے محکمۂ مذاہب کے نائب صدر استقبال کیلیے موجود تھے۔ چین میں ہماری میزبانی چونکہ چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کر رہی تھی، اس لئے وی آئی پی لاؤنج میں ان حضرات کے ساتھ کچھ دیر رسمی گفتگو رہی، اور نمازِ عصر وہیں ادا کرنے کے بعد ہم ہوائی اڈے سے روانہ ہوئے۔

ہمارے قیام کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا جو یہاں ''اقلیتی قومیتوں کے محل'' کے نام سے مشہور ہے، اور اس کی دس منزلہ شاندار عمارت بیجنگ کے سب سے بڑے مین روڈ ''چانگ این اسٹریٹ'' پر واقع ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے مغرب ہو چکی تھی، نماز اور رات کے کھانے کے بعد چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے حضرات نے چین میں قیام کے دوران ہمارے پروگرام سے ہمیں آگاہ کیا۔ تھکن بہت تھی، اس لیے اس رات ہم جلد ہی اپنے بستروں پر پہنچ گئے۔ ساتویں منزل پر واقع اس کمرے کی کھڑکی سے پیکنگ کا عمومی منظر سامنے تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں دور تک نظر آتی تھیں، لیکن ان پر روشنیوں کی وہ چمک دمک جس سے آجکل ہر ترقی یافتہ، بلکہ ترقی پذیر شہر بھی جگمگاتا نظر آتا ہے، یہاں اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ سارے شہر میں کہیں کوئی ایک نیون سائن بھی موجود نہیں تھا، آرائشی روشنیاں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آئیں، سڑکوں اور عمارتوں پر صرف بقدرِ ضرورت بلب روشن تھے، جو کراچی کی جگمگ کرتی ہوئی روشنیوں کے مقابلے میں کالعدم محسوس ہوئے، اور اس چکاچوند کی عادی نگاہوں کو بڑے اجنبی نظر آئے۔ لیکن عقل کا فیصلہ یہی تھا کہ جو ملک برقی طاقت کی کمی کا شکار ہو، اُسے اپنی تھوڑی بہت برقی طاقت کو نمائش و آرائش میں صرف کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چین نے اگر عقل کے اس فیصلے کو جذبات پر مقدم رکھا ہے تو یہ بات قابل اعتراض نہیں، قابل ستائش ہے، اور نظرِ ثانی کا محتاج ہے تو ہمارا طرزِ عمل، جو سال بھر لوڈشیڈنگ، اور وقتاً فوقتاً بجلی کی خرابی کو گوارا کر لیتے ہیں، لیکن نمائشی اور آرائشی روشنیوں میں روزانہ اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

صبح ناشتے کے بعد ہمارے دورے کا آغاز ہماری میزبان تنظیم ''چائنا اسلامک ایسوسی ایشن'' کے مرکزی دفتر کے معائنے سے ہوا۔ یہ تنظیم ملک گیر سطح پر چینی مسلمانوں کی ایک کثیر المقاصد تنظیم ہے، جو سرکاری سرپرستی میں کام کرتی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) مذہبی آزادی کے قیام میں حکومت کی مدد کرنا۔
(۲) بہترین اسلامی روایات کو قائم کرنا۔
(۳) اسلام کی روشنی میں جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دینا۔
(۴) عالمی امن کے قیام کی جدوجہد۔
(۵) اسلامی علوم میں تحقیق کا نظم سرانجام دینا، اور متعلقہ تاریخی مواد جمع کرنا۔
(۶) مسلمانانِ عالم کے ساتھ باہمی مفاہمت اور دوستی کو فروغ دینا۔

یہ تنظیم ۱۹۵۳ء میں قائم کی گئی تھی، اور اس کے اخراجات چینی حکومت کی مالی امداد کے علاوہ مسلمانوں کے باہمی چندے اور دنیائے اسلام کے مختلف اداروں کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔

اس انجمن کے صدر الحاج محمد علی ٹران جے ہیں، لیکن ان کے ضعف اور علالت کی بناء پر انجمن کے زیادہ تر عملی فرائض نائب صدر الحاج محمد الیاس انجام دیتے ہیں، جن کا چینی نام شین زیازی ہے۔ اس انجمن کی مجلس شوریٰ ۱۵۰ ارکان پر مشتمل ہے، جن میں سے ۴۰ منتخب ارکان مجلس عاملہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

اجتماعی سطح پر چینی مسلمانوں کی یہ واحد ملک گیر تنظیم ہے جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرتی ہے، چین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ ۱۹۴۲ء میں چیانگ کائی شیک کے زمانے میں جو مردم شماری ہوئی تھی، اُس کی رو سے یہاں کے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ لیکن اشتراکی انقلاب کے بعد کی مردم شماریوں میں چونکہ مذہب کا کوئی الگ خانہ نہیں تھا، اس لیے مسلمانوں کی تعداد الگ شمار کرنے کا کوئی قابل اعتماد راستہ نہیں ہے، انقلاب کے بعد کی مردم شماریاں قومیتوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ چین میں

www.freepdfpost.blogspot.com

۵۶ قومیتیں پائی جاتی ہیں، جن میں اکثریتی قومیت ھان ہے، جو کل آبادی کا ۹۳،۳ فیصد بتائی جاتی ہے۔ اس قومیت میں بھی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہے، لیکن زیادہ تر مسلمان اقلیتی قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور دیغور، قازق، تاجک، ازبک، ھوئی، تاتار، کرغیز، قونگ شیانگ، سالار اور پاؤ اُن قومیتوں میں مسلمانوں کی بھاری تعداد پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض قومیتوں، مثلاً دیغور، قازق اور تاجک وغیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

لہٰذا اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ان قومیتوں میں مسلمانوں کے تناسب سے لگایا گیا اور اب سرکاری طور پر عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ چین میں مسلمانوں کی کل تعداد ایک کروڑ چھالیس لاکھ ہے۔

مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں یہ بیان یقینی طور پر ناقابل اعتماد اور انتہائی بعید از قیاس ہے، کیونکہ اگر ۱۹۴۲ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تھی اور چالیس سال سے زائد مدت گذرنے کے بعد اس تعداد سے ساڑھے تین کروڑ کم کیسے ہوسکتی ہے؟

چین میں اسلام کی ضیا بار کرنیں پہلی صدی ہجری ہی میں طلوع ہوگئی تھیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ کے عہد خلافت ہی میں بعض مبلغین چین کے مشرقی ساحل تک پہنچ چکے تھے، بلکہ چین کے ایک مشرقی شہر کوانگچو میں ایک مزار ہے صاحب مزار کا نام ''حضرت ابووقاصؓ'' بتایا جاتا ہے، اور اس علاقے کے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ یہ صحابی تھے۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد بھی ایران کے مسلمان تاجر کاشغر کے راستے اور عرب کے حضرات بحری راستے کوانگچو اور دوسرے جنوبی اور جنوب مشرقی بندرگاہوں تک آتے رہے، اور انہوں نے یہاں تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے فوجی لشکر کشی تو پہلی بار ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں قتیبہ بن مسلم باہلی کی سرکردگی میں ہوئی تھی، لیکن وہ چین کے جنوب مغرب میں بہت تھوڑے حصے تک جاسکے تھے، کہ انہیں

واپس بلالیا گیا۔ لہٰذا چین میں اسلام کی نشر و اشاعت تمام تر انہی مسلمان تاجروں اور مبلغوں کا کارنامہ ہے۔ جن کے جذبۂ دعوت و تبلیغ کی بدولت آج صدیوں بعد بھی یہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے۔

.....☆.....☆.....

چین میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے بعد یہاں ''ثقافتی انقلاب'' کے نام سے جو تحریک چلی، اس میں مذہب کے خلاف بڑی سختیاں کی گئیں، مسلمانوں کی مسجدیں بند کردی گئیں، تعلیمی ادارے ختم کردیئے گئے اور اسلامی شعائر کو مٹانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مسلمانوں پر یہ دور بڑا سخت گذرا، اور ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ''چائنا اسلامک ایسوسی ایشن'' جیسی تنظیم کے لیے کسی قابل ذکر کام کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد چند سالوں سے (۱۹۷۶ء کے بعد) حکومت نے اپنی پالیسی تبدیل کی، ملکی قوانین میں مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، جو مسجدیں بند اور ویران پڑی تھیں، اُنہیں نہ صرف کھولا گیا، بلکہ ان کی مرمت اور تعمیر نو کی گئی، تعلیمی اداروں کو فی الجملہ کام کرنے کی اجازت ملی۔ اس وقت سے یہ ایسوسی ایشن ملک میں دینی خدمات انجام دینے کے لیے خاصی سرگرمی سے کام کررہی ہے۔

انجمن کے صدر دفتر کی عمارت خاصی شاندار ہے، یہاں انجمن کے صدر، نائب صدر، اور دوسرے عہدیداروں نے ہمارے وفد کا استقبال کیا۔ اور چین میں مسلمانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ بیجنگ میں ایک لاکھ اَسّی ہزار مسلمان آباد ہیں، اور شہر بھر میں چھالیس مسجدیں ہیں، نئے قانون کے بعد مسلمان آزادی سے یہاں عبادات انجام دیتے ہیں، مسلمانوں کے ریستوران اور مذبح خانے علیحدہ ہیں، ہوائی جہازوں اور ریلوں میں بھی ان کے لیے حلال کھانے کا الگ انتظام ہوتا ہے، بلکہ بیجنگ سے کانسو جانے والی ایک ٹرین کے بارے میں تو صرف مسلمانوں ہی کا کھانا ملتا ہے، کیونکہ اس علاقے میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

انجمن کے حضرات نے ہمیں انجمن کی طرف سے شائع کی ہوئی دو کتابیں ''تفسیر جلالین''

www.freepdfpost.blogspot.com

اور ''شرح الوقایہ'' کے نسخے بھی ہدیۃً پیش کیے، یہ کتابیں انجمن کے اپنے مدرسے میں پڑھانے کے لیے شائع کی ہیں۔ ''تفسیر الجلالین'' ایک مصری نسخے کا فوٹو ہے، اور شرح ''الوقایہ'' ہندوستانی نسخے کا جس پر حضرت مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی قدس سرہٗ کا حاشیہ ''عمدۃ الرعایۃ'' بھی ہے۔ دونوں کتابیں نہایت نفیس کاغذ پر اونچے معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، جنہیں دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔

اس کے بعد ہم اِسی عمارت کے اس حصے میں گئے جہاں مدرسہ قائم ہے، اس مدرسہ میں پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، جس میں عربی زبان کے ادب کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد اور اسلامی تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم مختلف جماعتوں میں گئے، ایک کمرے میں نحو کا درس ہو رہا تھا، اس میں تقریباً بیس پچیس طلبہ زیرِ تعلیم تھے، ہم نے طلبہ سے سوالات بھی کیے اور جوابات سے اندازہ ہوا کہ تعلیم کا معیار اچھا خاصا ہے۔ ایک جماعت میں شرح الوقایہ میں کتاب الطّلاق کا درس ہو رہا تھا، وہاں بھی بیس کے قریب طلبہ ہوں گے۔

چین جیسے ملک میں، جہاں ایک عرصے تک مذہب کو فنا کرنے کی کوشش کی گئی ہو، اور جہاں علم دین کے حامل افراد کے سامنے کوئی معاشی مستقبل نہ ہو، اتنے طلبہ کا ان مدرسوں کی طرف رجوع کرنا بھی بسا غنیمت ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ انجمن اپنے یہاں طلبہ کو دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں زیادہ وظائف دیتی ہے، کیونکہ اس وقت چینی مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ملک بھر کی ۲۳ ہزار مسجدوں کے موجودہ ائمہ زیادہ تر عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، اور اب اُن کی جگہ لینے کے لیے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے۔

اِسی انجمن کے تحت اِسی عمارت میں ایک دکان بھی قائم ہے۔ جس میں قرآنِ کریم کے نسخے، دینی کتابیں اور مسلمانوں کی دوسری دینی ضروریات مثلاً جانمازیں، ٹوپیاں، تسبیحیں، ہجری کلینڈر، خواتین کی اوڑھنیاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں فروخت ہوتی ہیں، یہیں سے ایک ماہنامہ رسالہ ''چینی مسلمان'' کے نام سے چینی اور دیغور زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

بیجنگ کی نیو جے مسجد:

ایسوسی ایشن کے صدر دفتر کے بعد ہم نیو جے مسجد پہنچے، جو بیجنگ کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ جس محلے میں آباد ہے، اُسے نیو جے اسٹریٹ کہتے ہیں اور یہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، بلکہ اس محلے کا نام بھی نیو جے اس لے پڑا کہ نیو جے چینی زبان میں گائے کو کہتے ہیں اور مسلمان چونکہ زیادہ تر گائے کا گوشت کھاتے ہیں، اس لیے اس سڑک کا نام ہی نیو جے رکھ دیا گیا۔

مسجد کے امام صاحب نے مسجد کے متصل ایک ہال میں استقبال اور مہمانی کے بعد سب سے پہلے مسجد کا کتب خانہ دکھایا، جس میں قرآنِ کریم اور دوسری عربی اور فارسی کتابوں کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔ قرآنِ کریم کا ایک نسخہ سات سو سال پرانا ہے، اور فقہ اور تصوف کی مختلف کتابوں کے مخطوطات ہیں، تصوف کی بعض ایسی کتابوں کے قلمی نسخے بھی نظر آئے جو ابھی تک احقر نے مطبوعہ شکل میں نہیں دیکھے۔

اس کے بعد ہم مسجد میں پہنچے، کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد ایک ہزار سال پہلے تعمیر ہوئی تھی، بعد میں چین کے منگ خاندان کے زمانے میں اس کی توسیع اور از سرِ نو تعمیر ہوئی، مسجد کا موجودہ ڈھانچہ اُسی وقت سے چلا آتا ہے، اور یہ اُس دور کے مخصوص طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے، مسجد کا اندرونی ہال تمام تر لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ لکڑی پر نہایت شاندار اور دیرپا روغن ہے، اور اس پر سونے کے پانی کا کام ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کام میں ڈھائی کلوگرام سونا خرچ ہوا تھا۔ یہ چوبی عمارت اس قدر پائیدار ہے کہ تقریباً پانچ سو سال گذرنے کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں فرق نہیں آیا، بلکہ اس دوران پتھر کی بنی ہوئی بہت سی عمارتیں شدید زلزلوں میں تباہ ہوگئیں، لیکن اس عمارت کو زلزلوں میں بھی نقصان نہیں پہنچا۔

چین کے ثقافتی انقلاب کے بعد اس مسجد کو بند کر دیا گیا۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں ۴۰ لاکھ یوآن کے خرچ اس کی دوبارہ مرمت کی گئی اور ۱۹۸۱ء میں اسے نمازیوں کے لیے کھول دیا گیا۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہاں پنج وقتہ نمازوں میں ۸۰ سے ۲۰۰ تک نمازی

www.freepdfpost.blogspot.com

ہوتے ہیں، جمعہ میں ۶۰۰ اور عیدین میں دو ہزار تک افراز نماز پڑھتے ہیں اور نمازیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

اِسی مسجد کے احاطے میں دو بزرگوں کے مزارات ہیں۔ ایک مزار کے کتبے پر قدیم عربی رسم الخط میں لکھا ہے کہ یہ شیخ محمد بن محمد بن احمد البُر سانی القزوینی کی قبر ہے جن کی وفات ۶۷۹ھ میں ہوئی، دوسرے صاحب مزار شیخ علی بن القاضی عماد الدین البخاریؒ ہیں، جن کی وفات ۶۸۲ء میں ہوئی۔ ان بزرگوں کے حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، لیکن ان کے مزارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ماوراء النہر کے علماء یہاں تبلیغ کیلئے مقیم رہے ہیں۔ اور یہ انہی حضرات کی محنتوں اور قربانیوں کا ثمر ہے کہ مراکز اسلام سے اس دور افتادہ علاقے میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ابھی تک کلمۂ توحید سینوں میں بسائے ہر طرح کے مشکل حالات کا سامنا کرتی رہی ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ وطیب شدا ہم۔

.....☆.....☆.....

شام ۳۱/۲ ہم چین میں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت میں پہنچے۔ چین میں پاکستان کے سفیر جناب انور بھٹی صاحب سے مفید ملاقات ہوئی، وہ یہاں ساڑھے تین سال سے سفارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ وہ چین کے تقریباً ہر صوبے میں گئے ہیں اور چین کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حالات سے وہ بہت باخبر ہیں۔ سفارت خانے کی عمارت بھی ماشاء اللہ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے جو ایک معاہدے کے تحت پاکستانی نقشے کے مطابق چینی حکومت نے اپنے خرچ پر تعمیر کی ہے۔ اس کے جواب میں پاکستان نے بھی اسلام آباد میں چینی سفارت خانہ اپنے خرچ پر بنایا ہے۔ سفارت خانے میں ایک مسجد بھی ہے، جس میں پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔

شام چار بجے مسلمانانِ چین کے ایک معمر رہنما جناب برہان شہیدی صاحب سے اُن کے مکان پر ملاقات ہوئی، یہ چین کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں اور چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے اعزازی چیئرمین بھی، یہ نسلاً دیغور ہیں اور ان سے بات چیت کے لیے پہلے دیغوری سے چینی پھر چینی سے اُردو میں ترجمانی کی ضرورت پڑی۔

البتہ چند معروف جملے انہوں نے عربی میں بھی کہے۔ ان کی عمر بانوے سال ہے، اور نہ صرف یہاں کے مسلمان انہیں عزت و احترام کے ساتھ دیکھتے ہیں بلکہ پورے ملک کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین ہونے کی بناء پر ملک میں ان کا سیاسی مقام بھی بہت بلند ہے۔

رات کو ہمارے ہوٹل ہی کے ''اسلامی مطعم'' میں میزبان ایسوسی ایشن نے وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا تھا۔ جس میں ایسوسی ایشن کے عہدیداروں اور بیجنگ کی مساجد کے ائمہ حضرات کے علاوہ سفیر پاکستان جناب انور بھٹی، سفارت خانے کے اعلیٰ افسران اور برہان شہیدی صاحب بھی شریک ہوئے۔

.....☆.....☆.....

۶ نومبر کی صبح نو بجے ہم پہلے بیجنگ کے مشہور چوک ''تھیان آن من'' گئے جو پیپلز اسکوائر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور دنیا کا سب سے بڑا چوک ہے۔ یہ بیجنگ کی مرکزی سڑک چانگ اِن اسٹریٹ پر واقع ہے، جو بذات نہایت وسیع سڑک ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے کسی شہر کے اندرونی حصے میں اتنی چوڑی سڑک نہیں دیکھی، اسی سڑک کا وہ چوراہا جو گریٹ ہال کے ساتھ واقع ہے، پیپلز اسکوائر کہلاتا ہے اور یہاں پہنچ کر چانگ این اسٹریٹ سے مغرب کی جانب ایک اس سے بھی کئی گناہ زائد پکا میدان ہے۔ جس کے مغربی سرے پر وہ عمارت ہے جس میں ماؤزے تنگ کا جسم رکھا گیا ہے، شمالی جانب گریٹ ہال اور جنوب میں ایک میوزیم کی شاندار عمارت ہے، ان عمارتوں کے درمیان جو پکی جگہ خالی پڑی ہے۔ جس میں تین مصروف سڑکیں بھی ہیں، تھیان آن من یا پیپلز اسکوائر کہلاتی ہے اور اس میں بیک وقت دس لاکھ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اہم قومی اجتماعات اسی چوک میں ہوتے ہیں، شمال کی جانب سنگِ طرزِ تعمیر کی ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی ہے۔ جو ایسے اجتماعات میں اسٹیج کا کام دیتی ہے، یہ انتہائی پُرشکوہ چوک ہے۔ جو اپنی وسعت، خوبصورتی، صفائی، ستھرائی اور گنجائش کے اعتبار سے دنیا بھر میں منفرد اور بے نظیر ہے۔ یہاں ہر وقت سینکڑوں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے، لیکن

www.freepdfpost.blogspot.com

بدنظمی پیدا نہیں ہوتی اور چانگ ین اسٹریٹ سے گذرتے ہوئے یہ ہجوم بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اس چوک کو پیدل عبور کرنے کے لئے تو بڑا وقت درکار ہے۔ ہم نے اسے کار ہی سے عبور کیا اور اس کے جنوبی سرے پر ماؤزے تنگ کی عمارت کے قریب اترے، یہاں اندر جانے والوں کی ایک طویل قطار حدِ نظر تک بل کھاتی ہوئی رواں دواں تھی، ہم عمارت کے اندر داخل ہوئے تو اس کے ایک ہال میں ماؤزے تنگ کی لاش کو مسالوں کے ذریعے محفوظ کر کے شفاف شوکیس میں رکھا ہوا ہے۔ جسم کا بیشتر حصہ چادر میں ڈھکا ہوا ہے، البتہ سینہ، گلا اور چہرا کھلا ہوا ہے جو شوکیس سے صاف نظر آتا ہے۔ لوگ اس عجوبے کو دیکھنے کے لئے بھی یہاں آتے ہیں کہ ایک شخص کی لاش ۱۹۷۶ء سے اب تک ممّی کی شکل میں صحیح سالم نظر آتی ہے۔ اور بہر حال! یہ ہے بھی ایک عجوبہ، لیکن اس عجوبے کے لئے لاکھوں روپے کی رقم خرچ کرنے والوں کو یہ کون بتائے کہ ماؤزے تنگ اس گوشت پوست کا نام نہیں تھا جس شخص کا نام ماؤزے تنگ تھا، وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے؟ قیمتی مسالے اس گوشت پوست کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، لیکن اس کی روح کی حفاظت کے لئے آج تک کوئی سائنس ایسا مسالہ دریافت نہیں کر سکی جس کے پرواز کرنے کے بعد چلتا پھرتا انسان ایک بے جان پتھر بن کر رہ جاتا ہے۔

یہ مجسمۂ عبرت اگرچہ اب بھی بہت سے چینی لوگوں کے لئے عقیدت واحترام کا مرکز ہے، لیکن اب لوگوں کے دلوں میں ماؤزے تنگ کی عظمت اس درجے میں باقی نہیں رہی جس درجے میں اس کی زندگی تھی۔ پہلے وہ ایک ایسا معصوم رہنما تھا جس کے فکر وعمل پر کسی تنقید کا تصور مشکل تھا، لیکن اب اس کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی جارہی ہے، کمیونسٹ پارٹی کی گیارھویں کانگریس کے تیسرے مکمل اجلاس میں (جو ۱۹۷۸ء میں منعقد ہوا تھا) حکومت کی پالیسی میں بڑی انقلابی تبدیلیاں پیدا کی گئیں (جن کا ذکر انشاء اللہ میں آگے کروں گا) اس موقع پر یہ بات بڑی کشادہ دلی اور صراحت کے ساتھ تسلیم کی گئی کہ ثقافتی انقلاب کے دس سالوں میں چین کو بہت سے میدانوں میں

بڑا نقصان پہنچا ہے اور اس ناقص پالیسی کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ، چیئرمین ماؤزے تنگ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ بیجنگ کے اخبار ''پیپلز ڈیلی'' نے لکھا کہ ''ماؤزے تنگ ایسا عظیم انسان تھا جس سے غلطیاں بھی بڑی عظیم سرزد ہوئیں۔'' بہر حال! اس پہلو پر میں انشاء اللہ سفرنامے کے آخر میں تبصرہ کروں گا۔

جامع مسجد دونگ سی:

اس کے بعد ہم بیجنگ کی ایک اور مشہور جامع مسجد دونگ سی (Dong si) دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ مسجد ۱۴۴۷ (یعنی ساتویں صدی ہجری میں) تعمیر ہوئی تھی، آگے کی محراب پتھر کی بنی ہوئی ہے اور تعمیر خاصی پرانی ہے۔ باقی ساری مسجد صنوبر کی لکڑی سے اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک بھی لوہے کی میخ استعمال نہیں ہوئی، طرزِ تعمیر ٹھیٹھ چینی انداز کا ہے۔ جو چینی بادشاہوں کے منگ خاندان کے زمانے میں رائج تھا۔ لکڑی کی مضبوطی اور اس پر آبِ زر سے بنائے ہوئے نقش ونگار بہت خوبصورت ہیں اور تقریباً ۵۰۰ سال گذرنے کے باوجود ان کی آب وتاب سے ایسا لگتا ہے کہ یہ مسجد ابھی تیار ہوئی ہے۔

مسجد کے ساتھ ملحق دو کتب خانے ہیں جس میں مطبوعات اور مخطوطات کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے، اس میں قرآن کریم کا نہایت خوبصورت نسخہ ہے۔ جو سن ۱۸۰۰ء میں لکھا گیا تھا۔ لکھنے والے کا نام محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن السرائی درج ہے۔ تقریباً سات سو سال گذر جانے کے باوجود لکھائی اتنی صاف، واضح اور روشن ہے کہ آج کل مطبوعہ کتابوں میں بھی ایسی کتاب ملنی مشکل ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی عربی، فارسی اور چینی زبان کی دینی کتابوں کے بڑے نادر مخطوطات موجود ہیں، جن میں تفسیر جلالین، اشعۃ اللمعات، شرح عقائد، مقامات، حریری شرح جامی، شرحِ وقایہ، فصوص الحکم کے مخطوطات بطورِ خاص قابل ذکر ہیں ان کے

www.freepdfpost.blogspot.com

علاوہ مطبوعات میں علامہ شامیؒ کی رد المحتار، البحر الرائق کے بھی کئی نسخے نظر آئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انقلاب چین سے پہلے کوئی بڑا دارالعلوم رہا ہوگا جس کی یہ کتابیں حوادث زمانے سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی ہے جو ۱۹۸۳ء میں قائم ہوا تھا، اس میں تفسیر، حدیث فقہ، عقائد اور تاریخ اسلام کا ویسا ہی پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ جیسا چائنہ اسلامک ایسوسی ایشن کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھایا جاتا ہے۔ اگلے سال اس میں ایک نئی جماعت بھی شروع کرنے کا پروگرام ہے۔

مسجد کے امام شیخ صالح ایک معمر بزرگ ہیں جو بیجنگ کی مقامی اسلامک ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں، مسجد میں ہمارا خیر مقدم انہوں نے ہی کیا اور اپنی تقریر میں بتایا کہ بیجنگ شہر میں ایک لاکھ اسّی ہزار مسلمان آباد ہیں اور مسجد کی تعداد ۴۶ ہے۔ بہت سی مسجدیں جو ثقافتی انقلاب کے دور میں بند کر دی گئی تھیں، اب کھول دی گئی ہیں، ان کی مرمت اور تعمیر نو کی گئی ہے اور اب مسلمان اطمنان کے ساتھ اپنی عبادات انجام دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان ۴۶ بڑی مسجدوں کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی مسجدیں اور بھی ہیں۔

اس موقع پر بیجنگ کی متعدد مساجد کے ائمہ حضرات بھی موجود تھے۔ مدرسہ کے ایک طالب علم نے تجوید اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت بھی کی۔ احقر کے سوال پر ائمہ نے بتایا کہ ۵ سالہ نصاب کے مدارس کے علاوہ متعدد مساجد میں مکتب بھی قائم ہے اور اب ان کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلمان ممالک کے جو سربراہ یا وفود آتے ہیں، وہ عموماً نماز اسی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے بھی اپنے دورۂ چین کے موقع پر نماز جمعہ یہیں ادا کی تھی، ان کی طرف سے اس مسجد کے پیش کئے ہوئے تحائف، مثلاً قالین اور کتبات وغیرہ یہاں نمایاں مقامات پر رکھے ہوئے ہیں جو امام صاحب نے ہمیں بطور خاص دکھائے

شہر ممنوعہ کی سیر:

شام ۳ بجے میزبانوں نے ''شہر ممنوعہ'' کی سیر کا پروگرام رکھا تھا جو بیجنگ شہر کے تاریخی عجائب میں سے ہے یہ دراصل چین کے منگ خاندان کے بادشاہوں کا بنایا ہوا ایک وسیع و عریض قلعہ ہے۔ جو عظیم الشان شاہی محلات پر مشتمل ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس قلعے کے تمام چھوٹے بڑے کمروں کی مجموعی تعداد نو ہزار نو سو ننانوے (۹۹۹۹) ہے۔ اسے شہر ممنوعہ اس لئے کہتے ہیں کہ بادشاہوں کے زمانے میں یہاں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا۔ قلعے کے گرد ایک زبردست فصیل ہے اور اس کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے بعد سولہ عالیشان محلات ہیں۔ ہر محل کے مرکزی حصے میں زمین سے تقریباً دو منزل کے برابر کرسی دیگر ایک پُرشکوہ اور خوبصورت ہال صنوبر کی لکڑی سے بنوا ہوا ہے، اس کے سامنے سیڑھیوں اور فواروں کے بعد وسیع و عریض صحن ہے اور دائیں بائیں جانب کمروں کی ایک طویل قطار ہے۔

ایک محل میں کھڑے ہو کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا ہے اس کے پیچھے کوئی اور محل بھی ہے۔ لیکن مرکزی ہال کے کسی گوشے سے ایک چھوٹا سا راستہ نکلتا ہے جو دوسرے محل میں پہنچا دیتا ہے۔

ان سولہ محلات میں سے ہر ایک کے مرکزی ہال کا ایک الگ نام منگ بادشاہوں نے رکھا ہوا تھا اور اس کا کوئی مخصوص مقصد مقرر کیا ہوا تھا۔ مثلاً پہلا ہال ''ایوان ہم آہنگی'' کے نام سے موسوم ہے، یہ ۱۴۲۰ء میں تعمیر ہوا تھا یہ ساڑھے پینتیس میٹر اونچا ہے اور ۲۳۷۷ مربع میٹر کے رقبے پر محیط ہے، یہاں منگ اور چنگ خاندان کے بادشاہ اہم تقریبات منعقد کرتے تھے۔ پوری عمارت صنوبر کی لکڑی کی بنی ہوئی ہے، اور چینی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ایک اور ہال ''ایوان تحفظ'' کے نام سے موسوم ہے، ۱۴۲۰ء میں ہی تعمیر ہوا تھا اور ۲۹ میٹر بلند اور ۱۲۴۰ مربع میٹر عریض ہے۔ اس ہال میں سفراء کا استقبال اور شہزادوں کی میزبانی کی جاتی تھی۔ یہیں ایک شاہی امتحان بھی ہوا کرتا تھا جو اس دَور میں اعلیٰ ترین تعلیم کی معراج سمجھی جاتی تھی۔

آج کل اس ہال میں ایک میوزیم ہے، جس میں عہد قدیم کے بہت سے برتن وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، ایک دیگچی اور چاقوں آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے، ایک نہایت خوبصورت منقش پیالہ جس کا حسن اور رونق آج بھی باقی ہے۔ گارہویں صدی قبل مسیح کا ہے، درندوں کی ہڈی کی بنی ہوئی بعض آرائشی اشیاء سولہویں صدی قبل مسیح کی ہیں۔

محلات کے صحن میں لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے اگردان رکھے ہوئے ہیں جو بہترین صناعی کا کا نمونہ ہیں، جا بجا پتیل کے بڑے بڑے لگن آگ بجھانے کے لئے استعمال ہوتے تھے، جگہ جگہ سنگ تراشی کے عجیب وغیرب نمونے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سولہ محلّات کے بعد ایک خوبصورت پائیں باغ ہے جس میں انواع واقسام کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ دو درخت چار پانچ فٹ کے فاصلے پر لگے ہیں، اور اگانے والے نے قدّ آدم بلندی پر ان دونوں کی آپس میں قلم اس طرح لگائی کہ جڑ سے دونوں درخت جدا ہیں، لیکن قدِ آدم بلندی پر دونوں کے تنے آپس مل کر یکجاں ہوگئے ہیں۔ اور ان کے باہم ملنے سے ایک خوبصورت محراب بن گئی ہے۔

ایک اور ہال دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ کی کُرسی اور اس کے سامنے کی تمام اشیاء اسی طرح سجی ہوئی ہیں جیسے وہ آج ہی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔

میں نے مختلف ملکوں میں بہت سے قلعے دیکھے ہیں، لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ قلعہ اپنی نظیر آپ ہے اور اس کی بیشتر خصوصیات آج بھی جوں کی توں محفوظ ہیں اور اسے دیکھ کر اس مقولے کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے کہ:

نزالت الحکمة.....علی أیدی الصین

حکمت.....چینوں کے ہاتھ پر نازل ہوئی ہے۔

اسی روز رات کو پاکستان کے سفیر جناب انور بھٹی صاحب نے وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اسلامک ایسوسی ایشن کے عہدہ داران کے علاوہ برھان شہید صاحب، چین کی وزارت مذہبی امور کے ڈائریکٹر اور وزارت خارجہ کے بعض اعلےٰ حکام بھی مدعو تھے، عشائیہ سفیر صاحب کے مکان پر تھا، یہ مکان بھی سفارت خانے کی طرح پاکستانی ماہرین کے نقشے کے مطابق بڑی خوبصورتی سے تیار کیا گیا ہے اور اس میں پاکستانی طرزِ تعمیر کی جھلک موجود ہے۔ اس عشائیہ میں پُر لطف گفتگو رہی اور رات گیارہ بجے قیام گاہ واپسی ہوئی۔

دیوار چین

۶۔ نومبر کی صبح میزبانوں نے شہرہ آفاق دیوار چین کی سیر کا پروگرام رکھا تھا۔ اس تاریخی عجوبے کو دیکھنے کا اشتیاق ہمیں بھی تھا۔ چنانچہ صبح ۸ بجے ہم نے اپنی رہائش گاہ سے تین کاروں میں روانہ ہوئے۔ ارکان وفد کے علاوہ چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے نائب سیکریٹری جنرل شیخ سلیمان انجمن کے بعض دوسرے حضرات بھی ہم سفر تھے۔ بیجنگ یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاذ مسٹر خوبن جو ایک چینی غیر مسلم ہیں، لیکن اُردو بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ اور اُردو کے ٹھیٹھ محاوروں اور ادبی اسالیب سے بھی حیرت ناک حد تک آگاہ ہیں، اس پورے سفر میں ہماری ترجمانی اور رہنمائی کے لئے ہر وقت ہر لمحے ساتھ رہے اور انہوں نے سفر کے ہر مرحلے میں ہمیں آرام پہنچانے اور ہماری ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، وہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی ہمارے ساتھ تھے اور ترجمانی اور رہنمائی کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے۔

دیوار چین کا جو حصّہ عموماً سیاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے، وہ زرّہ نانکو کہلاتا ہے اور ۶۰۰۵۰ کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ بیجنگ کے مضافات سے باہر نکلے کے بعد یہ راستہ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گذرتا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

دیوارِ چین کو چینی زبان میں چھان چین Chan chena کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین اور طویل فصیل ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز عہدِ مسیح میں ہوا تھا، اُس وقت چین میں طوائف الملوکی کا دور تھا اور مختلف بادشاہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں، ان کے درمیان جنگ و پیکار کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ریاست کے سربراہوں نے اپنے اپنے علاقے کو دُشمن کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے فصیلیں بنانی شروع کیں، یہ فصیل کسی ایک شہر کے گرد نہیں، بلکہ پوری ریاست کے گرداس کے اس حصّے میں ہوتی تھی جس طرف سے دُشمن کے حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ اس طرح چین کے مختلف حصّوں میں کئی فصیلیں قائم ہو گئیں۔

۲۴۶ قبل مسیح میں چن شہِ ہوانگ تی نے ان تمام ریاستوں کا ایک اتّحاد قائم کیا، اس وقت چونکہ پورا ملک ایک ہو گیا، اس لئے ۲۲۸ قبل مسیح میں اس نے متفرق فصیلوں کو باہم ملا کر ایک طویل فصیل تعمیر کی جس کی تکمیل میں سالہا سال لگے، لیکن مکمّل ہونے کے بعد یہ ایک ہزار پانچ سو میل لمبی فصیل بن گئی[1]۔ جو درّہ شان ہے سے درّہ پیاؤ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب اس کے بہت سے حصّے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں، بہت سے کھنڈر کی شکل میں باقی ہیں اور بہت سے سرے سے ختم ہو گئے ہیں لیکن اب بھی یہ چین کے متعدد صوبوں سے ٹوٹتی پھوٹتی گذرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعد میں چین کے منگ خاندان نے (آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے) اس کی مرمّت کی، بہت سی جگہوں پر اسے دوبارہ تعمیر کیا۔

درّہ نانکو (جہاں عموماً لوگ سیاحت کے لئے جاتے ہیں) پہنچنے سے کئی میل قبل ہی یہ دیوار پہاڑوں پر چڑھتی اترتی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن سیاحوں کے لئے منظر کے لحاظ سے قابلِ دید جگہ درّہ نانکو کی وہ وادی قرار دی گئی ہے جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری

[1] ہمارے رہنماؤں نے دیوارِ چین کی لمبائی چھ ہزار کیلومیٹر بتائی تھی، لیکن یہ بیان مبالغہ آمیز ہے، عام طور سے کتابوں میں اس کا طول ۱۴۰۰ یا ۱۵۰۰ میل بیان کیا گیا ہے، یعنی تقریباً ڈھائی ہزار کیلومیٹر۔ (دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۵ ص ۵۶۲ و ۵۴۲ China Chinese Architecture) مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

ہوئی ہے اور جہاں دیوارِ چین کے راستہ میں یکے بعد دیگر پانچ چھ پہاڑ آتے ہیں، یہ دیوار ہر پہاڑ پر چڑھتی پھر وہاں سے اُترتی ہے اور پوری طرح محفوظ اور مستحکم ہے۔

دیوار ۱۳ فٹ چوڑی ہے اور زمین سے اس کی اونچائی اوسطاً ۲۰ فٹ ہے اور نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اپنی اونچائی برقرار رکھتے ہوئے اُترتی چڑھتی گئی ہے، قلعوں کی فصیل کی طرح اس میں جابجا بُرج اور مکین گاہیں بنی ہوئی ہے جو اس دور میں دفاعی چوکیوں اور دفاعی اطلاع رسانی کے مراکز کا کام کرتی تھیں، اس دیوار کا اصل مقصد شمال مغرب کی جانب سے منگولیوں اور بعض دوسرے قبائل کے حملوں کو روکنا تھا۔ اگر کسی بُرج کے محافظوں کو اپنی طرف سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہوتا تو وہ یہاں آگ جلا کر دھواں پیدا کر دیتے، یہ دھواں دوسرے بُرج کے لوگوں کو نظر آتا تو وہ اپنی یہاں بھی دھواں سلگا کر اپنے سے اگلی چوکی کو خبر کر دیتے تھے، رات کے وقت دھویں کا کام آگ سے لیا جاتا تھا۔

ہم نے سامنے کی تین پہاڑوں کی اونچائی اس فصیل پر چلتے ہوئے طے کی، یہاں سردی شدید اور ہوا تیز تھی، جو دھوپ صاف ہونے کی بنا پر بحمد اللہ قابلِ برداشت رہی اور سنا گیا ہے کہ سردی کے موسم میں یہاں خون منجمد ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اِس فصیل سے نہ صرف وادی کا، بلکہ بل کھاتی ہوئی فصیل کے دوسرے حصّوں کا منظر بھی بڑا خوشنما ہے۔ تیسری پہاڑی پر پہنچتے پہنچتے سانس جواب دینے لگتا ہے اور واپسی پر اُترائی اُس سے زیادہ صبر آزما اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ڈھلان پر زمین کی کشش کی شدّت سے بعض اوقات چکر سا آنے لگتا ہے اور جو لوگ فصیل کے کنارے پر لگے ہوئے لوہے کے سہارے کے بغیر اُترتے ہیں، وہ بعض اوقات توازن قائم نہ رکھنے کی بناء پر گر بھی جاتے ہیں۔

دیوار کی چوڑائی اور اونچائی کوئی ایسی غیر معمولی نہیں، قلعوں کی فصیل اس سے زیادہ بھی اونچی اور چوڑی ہوتی ہیں، لیکن ڈیڑھ ہزار میل لمبی ہونے کی بنا پر یہ دنیا کے عجائب میں شمار ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ علاقہ میدانی اور ہموار ہوتا تو شاید اتنی قابلِ تعجب بات نہ ہوتی، حیرت ناک بات یہ ہے کہ چین کے بیشتر علاقوں کی طرح یہ سارا علاقہ بھی

www.freepdfpost.blogspot.com

پہاڑوں سے معمور ہے۔

بہرکیف! دنیا کے اس مشہور عجوبے کی سیر بڑی پُرلطف رہی۔

منگ مقبرے:

دیوارِ چین سے واپسی پر ہمارے میزبان ہمیں بیجنگ کی ایک اور تاریخی جگہ لے گئے، یہ علاقہ ''منگ مقبرے'' (Ming Tombs) کہلاتا ہے اور اس میں چین کے منگ خاندان کے بادشاہوں کے وہ مقبرے ہیں جو ہر بادشاہ نے اپنے لئے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کئے تھے۔

اُس دَور کے بادشاہوں کو یہ خبط تھا کہ مرنے کے بعد بھی وہ بادشاہ ہی رہیں اور ان کا مال و دولت اور چشم و خدم بھی ان کے ساتھ ہی مقبرے میں جائے۔ اس خبط کے نتیجے میں بعض شاہی خاندانوں میں یہاں تک رواج رہا ہے کہ ان کیساتھ ان کے محبوب غلام اور کنیز بھی تابوت میں دفن کردی جاتی تھیں، بعد میں یہ انسانیت سوز طریقہ تو ختم ہوا، لیکن بادشاہ کے ساتھ ڈھیروں سونا چاندی، جواہر، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء اور اس قسم کی دوسری چیزیں مقبرے ہی میں رکھ دی جاتی تھیں، ایک تابوت بادشاہ کا ہوتا تو دسیوں تابوت ان اشیاء کے ہوتے، اس کے علاقہ مقبرے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور برتن بھی رکھے جاتے تھے، گویا بادشاہ کی حکومت اب زیرِ زمین چلی گئی ہے۔

لیکن اس طریقے میں خطرہ یہ تھا کہ یہ بیش قیمت سامان کوئی مقبرے سے اُٹھا کر نہ لے جائے، دوسرے خاندانی عداوتوں کی بنا پر یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ کسی بادشاہ کی لاش کو کوئی دشمن اُٹھا نہ لے جائے، لہٰذا ہر بادشاہ اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ تعمیر کرتا تھا کہ سطحِ زمین پر ایک عالیشان عمارت ہو، لیکن مقبرہ زیرِ زمین ہو، جس میں اس کا تابوت رکھا جائے، اس زیرِ زمین مقبرے کا راستہ سوائے اُس بادشاہ اور اُس کے چند ہمرازوں کے کسی اور کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب اس کا انتقال ہوتا تو اس کا تابوت، اور زر و جواہر وغیرہ کے تابوت اُس خفیہ راستے سے زیرِ زمین مقبرے میں پہنچا،

دیئے جاتے، اس کے بعد جو لوگ بادشاہ کی قبر پر آنا چاہتے وہ سطحِ زمین کی عمارت پر خراجِ عقیدت ادا کر کے چلے جاتے، اصل تابوت تک کسی کو رسائی نہ ہوتی۔

اس طریق کار کے تحت اس علاقے میں بارہ بادشاہوں کے مقبرے ہیں جن کی علامتی عمارتیں سطحِ زمین پر موجود ہیں، لیکن ان کے زیرِ زمین مقبروں کا راستہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا۔ صرف ایک بادشاہ چوای چن (جس کا لقب واں لی ہے) کا زیرِ زمین مقبرہ اٹھائیس سال پہلے دریافت ہوسکا ہے۔

اور یہ دریافت بھی اس طرح ہوئی کہ واں لی کے مقبرے کی سطحی عمارت سے کافی فاصلے پر کچھ کھیت تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کاشتکار کو ہل چلاتے ہوئے زمین میں کسے کتبے کی شکل کے پتھر کے آثار نظر آئے، اس کتبے پر زیرِ زمین مقبرے تک پہنچنے کے لیے ایک خاص سمت میں زمین کھودنے کی ہدایات تھیں، وہاں تک کھدائی کی گئی تو ایک اور کتبہ ملا۔ جس میں مزید ہدایات دی گئی تھیں، ان ہدایات کے مطابق کھدائی کرتے کرتے مقبرے کا دروازہ برآمد ہوگیا۔ اس دروازے کو کھولنے کا طریقہ بھی خفیہ نوعیت کا تھا، بہرصورت! یہ دروازہ کھلا تو اندر ایک عظیم الشان ہال نظر آیا جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا ہوا تھا۔

ہم واں لی کے مقبرے کی سطحی عمارت سے کافی دور چل کر کھیتوں میں پہنچے تو وہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں اُترنا شروع کیا تو ۱۴۔۱۴ سیڑھیوں کے ایک درجن کے قریب زینے طے کرنے پڑے۔ اس کے بعد اندرونی مقبرے کا دروازہ نظر آیا۔ اس دروازے کے دونوں کواڑ ٹنوں وزنی پتھر کے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا کواڑ ایک ہی پتھر ہے، بہت سے آدمی مل کر بھی دروازے کو سرکا نہیں سکتے، ہاں اس میں کچھ عجیب و غریب قسم کی کیلیں لگی ہوئی ہیں، جنہیں دروازہ کھولنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک شاندار ہال سامنے آتا ہے جو ۳۴ء۸۷ (ستاسی عشاریہ چونتیس) میٹر لمبا ہے۔ ہال کا مجموعی رقبہ ۱۱۹۵ مربع میٹر ہے اور یہ تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصے میں بادشاہ کا دیوہیکل تابوت اور اس کے اردگرد نسبتاً چھوٹے بہت سے تابوت رکھے ہیں جن میں زر و جواہر وغیرہ بھرے گئے

www.freepdfpost.blogspot.com

تھے، دوسرے حصے میں پتھر کی بنی ہوئی کرسیاں، تخت، بڑے بڑے لگن وغیرہ ور کھے ہوئے ہیں، اور تیسرا حصہ خالی ہے۔ یہاں ایک بورڈ نصب ہے جس پر لکھا ہے کہ اس ہال کی تعمیر کا آغاز ۱۵۸۴ء میں ہوا، یہ چھ سال میں مکمل ہوا اور اس کی تعمیر میں ۴ لاکھ کلوگرام چاندی خرچ ہوئی۔

ہال کے اس حصے کے ختم پر باہر نکلنے کے لیے سیڑھیاں بنائی ہوئی ہیں، جو مقبرے کی سطحی عمارت پر جا کر ختم ہوتی ہیں، یہاں پر یہ سیڑھیاں داخلے کی سیڑھیوں سے کافی کم یعنی ۱۵ سیڑھیاں ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ فن تعمیر کے نقطہ نظر سے یہ ''منگ مقبرے'' ایک تاریخی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن دیدۂ بینا ہو تو دراصل یہ عجیب وغریب عبرت گاہ ہے، جو لوگ تعمیر اور سنگ تراشی میں اس حیرت انگیز ذہانت، دیدہ ریزی اور مہارت وصناعی کا ثبوت دے سکتے ہیں وہ اتنی سامنے کی حقیقت تک سے جاہل تھے کہ مرنے کے بعد زر و جواہر کے یہ انبار مرنے والے کے لیے مٹی کے ڈھیلوں سے زیادہ بے قیمت ہیں۔ جو لوگ حملہ آوروں کے دفاع کے لیے دیوارِ چین اور شہر ممنوعہ تعمیر کر سکتے تھے، وہ موت کے حملے کو روکنے کے لیے کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکے، اُن کی پُرشکوہ فصیلیں بھی ملک الموت کا راستہ نہ روک سکیں، انجام اُن کا بھی وہی ہوا جو ایک بے سروسامان مزدور اور ایک بے وسیلہ کسان کا ہو سکتا تھا۔

اس حقیقت کے تصور سے اپنے ہی یہ اشعار یاد آ گئے۔

جو مرکزِ اُلفت تھے، جو گلزارِ نظر تھے — سڑتے ہیں تہ خاک وہ اجسامِ بتاں آج
وہ دبدبہ جن کا تھا کبھی دشت وجبل میں — وہ تاجِ سکندر ہے، نہ وہ تخت کیاں آج
وہ جن کے تہور سے دہلتی تھیں زمینیں — ڈھونڈے سے بھی اُن کا کہیں ملتا ہے نشاں آج
تھی جن کی جھلا جھل سے چکا چوند نگاہیں — عبرت کے کھنڈر ہیں وہ محلاتِ شہاں آج
جن باغوں کی نکہت سے معنبر تھیں فضائیں — ہے مرثیہ خواں اُن پہ ببولوں کی زباں آج

گریٹ ہال میں ضیافت

اسی روز شام کو ۵ بجے چین کے وزیر اقلیتی اقوام مسٹر ابراہیم ہان چینگ زین سے

گریٹ ہال میں ملاقات کا پروگرام تھا۔ یہ خود مسلمان ہیں اور صوبہ ''کانسو'' سے تعلق رکھتے ہیں، چین کی حکومت میں اُن کو بڑا سینئر مقام حاصل ہے، اقلیتی قومیتوں کے اُمور کے مرکزی وزیر ہونے کے علاوہ چین کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔

ٹھیک ۵ بجے ہم گریٹ ہال پہنچے، جو نئے چین کی تعمیرات میں مشہور اور ممتاز عمارت ہے اور پیپلز اسکوائر (تھیان آن من) کے کنارے واقع ہے، یہ عمارت چین کا پارلیمنٹ ہاؤس بھی ہے، اس میں وزراء کے چیمبر بھی ہیں، ہر صوبے کے ارکانِ پارلیمنٹ کے لیے الگ الگ ہال بھی ہیں جس میں وہ باہم مشورے کر سکیں، غرض کمروں اور ہالوں کا ایک جہان ہے، اور مشہور یہ ہے کہ اس کا مرکزی ہال دنیا کا سب سے بڑا ہال ہے۔ جس کے بیچ میں کوئی ستون نہیں، اور اتنا بڑا ہے کہ اس میں فٹ بال کھیلی جا سکتی ہے۔

اسی عمارت کے ایک حصے میں مسٹر ابراہیم یان چینگ زین نے وفد کا استقبال کیا یہاں پاکستانی سفارت خانے کے منسٹر بھی ملاقات میں شامل ہونے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ مسٹر ابراہیم یان چین زین نے اس معاملے میں خاص طور حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے چینی حجاج کو حجازِ مقدس بھیجنے کا انتظام کیا ہے، اور اس کے ذریعے امسال دو ہزار حجاج نے فریضۂ حج ادا کیا، اور اس دوران پاکستانی حکومت اور عوام نے چینی مسلمانوں کو بڑا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی بہترین میزبانی کی۔ ان سے رسمی گفتگو کے بعد احقر نے چینی مسلمانوں کے ساتھ مزید تعاون کے لئے تین تجاویز پیش کیں۔

(۱) چینی مسلمان کچھ نوجوانوں کو تیار کر کے اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے پاکستان بھیجیں تو ہم اپنے دینی تعلیم کے لئے معیاری اداروں میں ان کی مکمل تعلیم، قیام و طعام اور جملہ ضروریات کی کفالت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اس طرح چینی مسلمانوں میں اچھے معیاری علماء تیار ہو سکیں گے جو اپنے علاقے میں دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۲) دینی علوم کے پانچ سالہ نصاب کے جو چند مدارس بیجنگ، کانسو وغیرہ میں قائم ہیں اُن میں تدریس کے لئے پاکستان سے زائر اساتذہ (Visiting Lecturers)

www.freepdfpost.blogspot.com

کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) چین میں اسلامی علوم کی جن کتابوں کی ضرورت ہو ہم پاکستان سے اپنے چینی مسلمان بھائیوں کے لئے انہیں بھیجنے کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔

جناب ابراہیم یانگ چینگ زین نے اس پیشکش کا شکریہ کے ساتھ خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان اُمور کی عملی تفصیلات کے لئے متعلقہ حکام آپ کے سفارت خانے کی وساطت سے آپ سے رابطہ پیدا کریں گے۔

مغرب کے بعد جناب ابراہیم نے گریٹ ہال کے ایک حصے میں وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ کے اہتمام کیا تھا۔ لیکن اُنہیں اچانک ایک دوسری سرکاری ملاقات کے لئے جانا پڑ گیا، اس لئے وہ محکمۂ مذاہب کے ڈائریکٹر جنرل کو (جنہیں چین کا وزیر مذہبی امور کہنا چاہئے) اپنی نمائندگی کے لئے چھوڑ کر خود چلے گئے۔ عشائیہ کے دوران ان سے مذکورہ امور کی عملی تفصیلات کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

.....☆.....☆.....☆.....

(۲)

نائب صدر سُپریم کورٹ کی طرف سے ظہرانہ:

۷۔ نومبر کی دوپہر بارہ بجے چینی سپریم کورٹ کے نائب صدر مسٹر رین جیانگزن (Ren jianxin) نے وفد کے اعزاز میں ظہرانہ کا اہتمام کیا تھا۔ پاکستان کی طرح چین میں بھی سپریم کورٹ (جسے سپریم پیپلز کورٹ کہتے ہیں) ملک کے اعلیٰ ترین عدالت ہے اور مسٹر رین جیانگزن اُس کے نائب صدر ہیں، جن کی حیثیت نائب چیف جسٹس کی ہے اور وہ صدر سپریم کورٹ کے بعد عدالت کے سب سے بڑے سینئر جج ہیں۔

اس دعوت کا اہتمام مسٹر جیانگزن کے ایک ممتاز اسلامی ریسٹورنٹ میں کیا تھا۔ انہوں نے اپنی مختصر خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ چین اور پاکستان کے درمیان زندگی کے

مختلف شعبوں میں تعاون اور وفود کے تبادلوں کا سلسلہ جاری، بلکہ روز افزوں ہے لیکن عدلیہ کی سطح پر باہمی ملاقاتوں اور وفود کے تبادلوں کی بہت کمی ہے، اس مرتبہ ہمیں خوشی ہے کہ علماء کے اس خیر سگالی وفد کی قیادت پاکستانی عدلیہ کے ایک رکن کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس ملاقات کا اہتمام کیا ہے، تاکہ دونوں ملکوں کی عدلیہ کے درمیان روابط کا ایک اچھا آغاز ہو۔

احقر کی مختصر جوابی تقریر کے بعد ان سے چین کے نظام عدل کے بارے میں دلچسپ گفتگو رہی، چین کے عدالتی نظام کے متعلق جو قابل ذکر امور ان سے معلوم ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) چین میں عدالتوں کی چار سطحیں ہیں:

(الف) بنیادی عوامی عدالتیں (جو ہمارے ملک کے مجسٹریٹ کے عدالتوں کے مشابہ ہیں، لیکن براہ راست عدلیہ کے ماتحت ہیں، انتظامیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں)۔ یہ عدالتیں کاؤنٹیوں، اور اضلاع کی سطح پر قائم ہیں۔

(ب) پرفیکچروں (ڈویژنوں) مرکزی حکومت کے تحت بلدیات کی انٹرمیڈیٹ عوامی عدالتیں۔ (جو ہماری عدالتی نظام کی سول سشن عدالتوں کے مشابہ ہیں)

(ج) صوبوں کی عدالتیں ہائے عالیہ

(د) سپریم پیپلز کورٹ

ان کے علاوہ کچھ خصوصی عدالتیں خاص قسم کے مقدمات کے تصفیہ کے لئے بھی قائم ہیں۔

(۲) عدالت عظمیٰ (سپریم پیپلز کورٹ) تمام مقامی اور خصوصی عدالتوں کی نگرانی کرتی ہے، اور اپنا اصلی (Original) اور اپیلیٹ (Applellate) اختیار سماعت بھی قانون کے مطابق استعمال کرتی ہے۔

(۳) دیوانی مقدمات میں چینی عدالتیں باقاعدہ مقدمے کی کاروائی سے قبل مصالحتی

www.freepdfpost.blogspot.com

کاروائیوں پر بہت زور دیتی ہیں۔ اس غرض کے لئے ملک بھر میں ۹ لاکھ ۳۹ ہزار سے زائد عوامی مصالحتی کمیٹیاں قائم ہیں۔ جن میں پینتالیس لاکھ چھہتر ہزار افراد ثالثی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ افراد کارخانوں، کانوں، دیہات اور مختلف محلوں میں تعینات ہیں اور ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ تنازعے کو عدالت تک پہنچنے سے پہلے باہمی گفتگو وشنید سے ختم کردیا جائے۔

اس کے علاوہ وہ عدالت بھی پہلے مرحلے میں فریقین کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس غرض کے لئے بسا اوقات جج کو کمرہ عدالت سے باہر فریقین سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات جج خود فریقین کے رہائشی مقامات پر جاکر دوسرے عوام کی مدد سے فریقین کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں بسا اوقات مصالحت ہوجاتی ہے، اور تنازعہ ختم ہوجاتا ہے، لیکن اگر مصالحت کی کاروائی ناکام ہوجائے تو پھر باقاعدہ مقدمے کی قانونی کاروائی کرکے فیصلہ کیا جاتا ہے۔

(۴) عدالتی کاروائی کا طریق کار دو فریقی نظام (Adwersary System) کے بجائے تفتیشی نظام (Enquisitorial System) سے قریب تر ہے، چنانچہ جج صرف فریقین کے بیانات اور دلائل سننے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ مقدمے کی کاروائی کو تحقیقی واقعات کے لئے استعمال کرتا ہے، چنانچہ گواہوں سے واقعے کے بارے میں خود بھی بکثرت سوالات کرتا ہے، ضرورت کے مواقع پر اضافی شہادتیں (Additional Evidence) طلب کرکے ان کے بیانات ریکارڈ کرتا ہے، اور فوجداری مقدمات میں بوقتِ ضرورت جائے واردات پر جاکر اس کا معائنہ بھی کرتا ہے۔

(۵) احقر نے سوال کیا کہ یہاں اعلیٰ عدالتوں کورٹ کا اختیار سماعت (Jurisdiction writ) بھی حاصل ہے؟ اولاً ان حضرات نے ''رٹ'' کی اصطلاح سے ناواقفیت کا اظہار کیا، پھر جب احقر نے اس کی تشریح کی تو انہوں نے جزوی طور پر

ایسے اختیار سماعت کا اقرار کیا، لیکن ان کے جواب سے احقر کا تاثر یہی تھا کہ رٹ کا جو مفہوم اور طریق کار ہمارے ملک میں رائج ہے، وہاں اس تفصیل کے ساتھ اس کا تصور موجود نہیں ہے۔

(۶) ملک میں فوجداری مقدمات کی تعداد دیوانی مقدمات کے مقابلے میں زائد ہے، اور فوجداری مقدمات میں بھی چوری کے مقدمات کی تعداد اسب سے زیادہ ہے۔ مسٹر جیانگزن باوقار اور شگفتہ انسان ہیں، اور دوسرے جج صاحبان کی مدد سے ہمیں سوالات کا اطمنان بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ جواب دیتے رہے، قانونی اصطلاحات کی وجہ سے ہمارے چینی ترجمان مسٹر خوین نے درخواست کی تھی کہ اگر آپ ان سے انگریزی میں گفتگو کریں تو زیادہ بہتر ہے، تاکہ ترجمانی کی مشکلات پیدا نہ ہو، چناچہ یہ گفتگو بیشتر انگریزی میں ہی ہوتی رہی، مسٹر جیانگزن کچھ دیر انگریزی میں جواب دیتے رہے، لیکن پھر انہوں نے عدالت کے ایک ترجمان کی مدد لی، جو انگریزی زیادہ روانی سے بول سکتا تھا، چنانچہ باقی گفتگو ان کی وساطت سے ہوئی۔

یہاں سے ہمیں صوبہ کانسو کے دورے کے لئے ڈیڑھ بجے ایئرپورٹ روانہ ہونا تھا، اس لئے میزبانوں نے بھی ہر کام میں وقت کے اختصار کا خاص خیال رکھا، اور ٹھیک ڈیڑھ بجے بڑے تپاک کے ساتھ ہمیں رخصت کردیا۔

صوبۂ کانسو کا سفر

چین میں سب سے زیادہ مسلمان صوبۂ سنکیانگ میں آباد ہے، اس لئے قدرتی طور پر ہمیں وہاں جانے کی خواہش تھی، لیکن چونکہ ہمارے قیام چین کی مدت مختصر تھی، اس لئے ہماری میزبان تنظیم نے دو وجہ سے سنکیانگ کے بجائے صوبۂ کانسو اور صوبۂ چھینگ ہائی کا پروگرام رکھا، اوّل تو اس لئے کہ مسلم ممالک سے جو وفود آتے ہیں، وہ بار بار سنکیانگ کا دورہ کرچکے ہیں، لیکن کانسو اور چھینگ ہائی میں کوئی باقاعدہ وفد نہیں گیا، حالانکہ ان دونوں صوبوں میں بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ دوسرے اس لئے

www.freepdfpost.blogspot.com

کہ سنکیانگ میں شدید سردی شروع ہو چکی تھی، اب برف باری کی وجہ سے وہاں کی پروازیں بھی مشکوک ہوگئی تھیں، پچھلی مرتبہ ایک پاکستانی وفد سنکیانگ میں موسم کی خرابی کی بنا پر پھنسا رہا تھا۔

ہم ۷ نومبر کو سپریم کورٹ کی ضیافت سے فارغ ہو کر نکلے تو آسمان ابر تھا اور ہلکی ہلکی بارش اور تیز ہواؤں کے سبب درجہ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب پہنچا ہوا تھا ایئرپورٹ پہنچے تو موسم کی خرابی کی بنا پر پروازیں معطل تھیں، اس لئے تقریباً دو گھنٹے وی آئی پی لاؤنج میں انتظار کرنا پڑا۔ اس سفر میں پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکریٹری مسٹر حسن جاوید بھی ہمارے وفد کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، جو ایک فعال اور باخبر نوجوان ہیں، اور چینی زبان بڑی روانی سے بولتے ہیں، نیز چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل سلیمان بطور میزبان ہمارے ساتھ تھے۔

تقریباً ساڑھے چار بجے ہم چائنا ایئر لائنز کے ٹرائمنڈنٹ طیارے میں سوار ہوئے، اور تقریباً پونے دو گھنٹے کے پرواز کے بعد کانسو کے دارالحکومت لانچو پہنچے۔ اترنے سے پہلے پائلٹ نے اعلان کیا کہ زمین پر درجہ حرارت صفر سے ۴ سینٹی گریڈ کم ہے۔ طیارے سے باہر نکلے تو شدید برفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، لیکن ایپرن پر استقبال کرنے والے ہجوم کی گرمجوشی نے موسم کی شدت کو بھلا دیا۔ وی آئی پی لاؤنج میں مغرب کی نماز ادا کر کے ہم شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں شہر ایئرپورٹ سے ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اس لئے شہر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ سے زائد وقت صرف ہوا۔

لانچو صوبۂ کانسو دارالحکومت اور چین کا مشہور صنعتی شہر ہے، جو شہرہ آفاق دریائے زرد کے دونوں طرف آباد ہے۔ دریائے زرد چین کا دوسرا طویل ترین دریا ہے۔ اس کی لمبائی پانچ ہزار چار سو تریسٹھ کلومیٹر ہے اور اس کے طاس کا رقبہ سات لاکھ چھپن ہزار چار سو تینتالیس کلومیٹر ہے۔ یہ دریا صوبہ چھینگ ہائی میں کوہ پایان ہار کی شمالی سمت سے نکلتا ہے اور متعدد صوبوں سے گزرتا ہوا شان تونگ کے علاقے میں بحیرۂ یوھانی کے اندر جا گرتا ہے، دریائے زرد کی وادی چین کی تہذیب وثقافت کا گہوارہ

رہی ہے، اس لئے اسے ''گہوارہ چین'' کہا جاتا ہے۔

اس دریا کو دریائے زرد اس لئے کہتے ہے کہ اس میں دنیا کے تمام دریاؤں کی نسبت زیادہ گاد ہوتی ہے۔ یہ ہر سال ایک ارب ساٹھ کروڑ ٹن گاد بہا کر زیریں وادی تک لاتا ہے، جہاں اس کا بہاؤ سست ہو جاتا ہے اور تہہ میں کیچڑ جمع ہوتی رہتی ہے، اس کیچڑ اور گاد کی وجہ سے دریا اتنا اتھلا ہو گیا ہے کہ کنارے پر اونچے اونچے پشتے تعمیر کئے گئے ہیں اور یہ سطح زمین سے بلند دریا بن گیا ہے۔

دریائے زرد میں اکثر وبیشتر سیلاب آ جاتا ہے جس کی بنا پر بڑی تباہی مچتی تھی، اور کہا جاتا تھا ہے کہ اس دریا نے تاریخ میں چھبیس مرتبہ اپنا رخ تبدیل کیا جس کے نتیجے میں چینی عوام کے بڑے مصائب اٹھانے پڑے، یہاں تک کے اس کا لقب ''چین کا ناسور'' مشہور ہو گیا۔ بالآخر حکومت نے اس کی بالائی اور وسطی وادیوں میں تدخیر آب کے بڑے بڑے منصوبے تعمیر کئے ہیں، اور زیریں وادیوں میں پشتوں کو مستحکم کی ہے، جس کے نتیجے میں اس دریا سے ہونے والی تباہ کاریاں بہت کم ہو گئی ہیں۔

صوبۂ کانسو کی کل آبادی ایک کروڑ نوے لاکھ ہے جس میں بارہ لاکھ مسلمان ہیں، اور پورے صوبے میں تقریباً بارہ سو مسجدیں ہیں اور اور اس صوبے کے دارالحکومت لانچو کی آبادی بارہ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار ہے اور بڑی مسجدیں پچاس سے زائد ہیں، یہاں کی مرکزی مسجد جو دریائے زرد کے کنارے واقع ہے، دینی تعلیم اور ائمہ کی تربیت کا ایک مدرسہ بھی ہے جس میں وہی پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے جو بیجنگ کے مدارس میں مروج ہے، اس مسجد کے امام اور مدرسے کے سربراہ شیخ یونس یان سن ایک نورانی صورت بزرگ ہیں، تکلف کے ساتھ عربی بولتے ہیں اور وضع قطع سے لے کر انداز وادا تک میں سلف صالحین کا نمونہ ہیں۔ وہ صوبۂ کانسو کی چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں اور صوبۂ کانسو کے پورے سفر میں ہمارے ساتھ بلکہ احقر ہی کی کار میں تشریف فرما رہے اور ثناء سفر ان سے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں، وہ بہت سے فقہی مسائل پر بھی گفتگو کرتے رہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

انہوں نے بتایا کہ بفضلہٖ تعالیٰ اب چین میں مسلمانوں کی حالت بہت بہتر ہے، جس پر مسلمان بہت خوش ہیں۔ احقر کے بار بار سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ یہاں علماء کا اصل مسئلہ اسلامی کتب کی کمی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پاس حدیث میں صرف ''مشکوٰۃ'' اور ''اللولو والمرجان'' ہے اور حدیث کی کوئی شرح موجود نہیں، فقہ میں صرف شرح وقایہ اور ''ردالمحتار'' ہے، کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔

انہی سے یہ افسوسناک بات معلوم ہوئی کہ یہاں مسلمانوں کے درمیان بعض نظریاتی فقہی اور کلامی مسائل میں فرقہ بندی اور تنازعہ بھی موجود ہے، مثلاً ''استواء علی العرش'' کی حقیقت مسئلہ رفع یدین، مولود کا جواز اور عدم جواز وغیرہ، افسوس اس بات سے ہوا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں اصل مسئلہ اپنے دین وایمان کا تحفظ اور اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت ہے، وہاں اس قسم کے مسائل پر بحث ومباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ مسائل حال ہی میں کسی نے اس علاقے میں کھڑے کئے ہیں، ورنہ یہاں کے مسلمان، جو سو فیصد حنفی ہیں، اس سے قبل سیدھے سادھے طریقے سے اپنے دین پر عمل کرتے چلے آرہے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان ایسے مسائل کھڑے کر کے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے والوں کے حق میں دعائیں ہدایت کے سوا اور کیا جاسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں عقل سلیم اور فکر مستقیم عطا فرمائے۔ آمین۔

تقریباً آٹھ بجے رات ہم شہر لانچو میں داخل ہوئے، ہم یہاں ایک مقامی ہوٹل میں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا، اسی ہوٹل کے کمرۂ ملاقات میں صوبۂ کانسو کے نائب گورنر جناب شریف نیا صاحب جو ایک ہنس مکھ مسلمان ہیں، وفد سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، ان سے تھوڑی دیر وہی گفتگو رہی، اس کے بعد اسی ہوٹل کے مطعم میں انہوں نے وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اس عشائیہ میں شہر کے دوسرے معززین بھی شامل تھے، جن میں جناب حبیب اللہ ماسولین، شیخ یونس یاں سن، اور لانچو کی مساجد کے ائمہ حضرات بطور خاص قابل ذکر ہیں،

جناب شریف نیا صاحب س (نائب گورنر صوبۂ کانسو) عشائیہ کے دوران بار بار

حکومتِ پاکستان کا شکریہ ادا کرتے رہے کہ اس نے چینی مسلمانوں کے حج کا انتظام کیا، انہوں نے آئندہ سال خود بھی حج کے لئے جانے کا ارادہ کیا، وہ کھانے کے دوران صوبۂ کانسو میں مسلمانوں کے حالات بیان کرتے رہے۔ رات گیارہ بجے قریب یہ دلچسپ نشست برخاست ہوئی۔

لِن شا کا سفر:

صبح سویرے ہم صوبۂ کانسو کے ایک اور شہر لن شا کے لئے روانہ ہوئے یہ اپنے پریفکچر (ڈویژن) کا صدر مقام ہے اور کاروں کے ذریعے لانچو سے اس شہر کا راستہ تقریباً پانچ گھنٹے کا ہے۔ لانچو سے شیخ یونس یاں سین (صدر صوبائی چائنا مسلم ایسوسی ایشن) اور جناب حبیب اللہ ماسولین (نائب صدر صوبائی سیاسی مشاورتی کمیٹی) اور نائب صدر یوسف ماتن بھی ساتھ ہو گئے، اس طرح پانچ کاروں اور ایک ویگن کا یہ قافلہ سڑک کے ذریعے لانچو سے روانہ ہوا۔ یہ راستہ زیادہ تر پہاڑی علاقے سے گزرتا تھا اور سردی شدید مگر خوش گوار تھی، درجۂ حرارت صفر سے بھی گرا ہوا تھا اور جا بجا پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف پڑی ہوئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک دریا (دریائے تھاؤ خہ) عبور کیا تو سامنے چند جیپیں اور ایک ہجوم کھڑا نظر آیا جس نے اشارے سے ہماری گاڑی رکوائیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا یہ لن شا شہر کے لوگ ہیں، چونکہ دریائے تھاؤ خہ کے پار لن شا پریفکچر (ڈویژن) کی حدود شروع ہوتی ہیں، اس لئے یہ اپنے ڈویژن کی سرحد پر وفد کا استقبال کرنے آئے ہیں، ان لوگوں میں لن شا ڈویژن کے کمشنر، ڈپٹی کمشنر، محکمہ مذاہب کے اعلیٰ افسران، اور لن شا کی مساجد کے ائمہ وخطباء حضرات شامل تھے۔ یہاں سے لن شا شہر تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے اور ان حضرات کے اس وقت یہاں موجود ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ طلوع فجر سے کافی پہلے سخت سردی میں جیپوں کے ذریعے روانہ ہوئے ہوں گے۔ ان کی اس گرم جوش محبت نے بڑا

www.freepdfpost.blogspot.com

متاثر کیا۔ زبان نہ جاننے کی بناء پر ان حضرات سے براہ راست گفتگو ممکن نہ تھی، لیکن ان کے چہروں سے جو محبت اور جو خلوص ہویدا تھا، وہ الفاظ کی ترجمانی سے ماوارا تھا۔ کاروں کے سے اتر کر ان حضرات سے بغلگیر ہونے اور زبانوں کے اختلافات کے باوجود گرمجوشی کے ساتھ ''السلام علیکم'' کا واحد مشترک جملہ ادا کرنے کا منظر بڑا پر کیف تھا۔

یہاں سے ہمارے قافلے میں تین جیپوں کا اضافہ ہوگیا اور اب آٹھ گاڑیوں کا یہ کارواں جس میں سب سے آگے ڈویژن کمشنر کی گاڑی پائلٹ کے فرائض انجام دیتی ہوئی چل رہی تھی، جس بستی سے گزرتا وہاں عوام کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوجاتی اور ان عوام میں اکثر کے سروں پر گول ٹوپیاں اس کی علامت تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو پاکستانی وفد کی آمد کی اطلاع کسی طرح ہوچکی تھی، اس لئے جہاں سے ہمارا قافلہ گزرتا، لوگ کھڑے ہوکر اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔

لن شاپر یفیکچر صوبۂ کانسو کا وہ ڈویژن ہے جس میں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، اس لئے اس ڈویژن کو ''چین کا مکہ'' کہا جاتا ہے، اس میں ڈویژن میں کل آبادی ۴ء۳ لاکھ ہے، جس میں مسلمانوں کی تعداد ۵ء۷ لاکھ بتائی جاتی ہے، گویا ۵ء۵۲ فیصد مسلمان ہیں، اور صرف اس ڈویژن میں مساجد کی تعداد ۱۷۱۵ ہے لیکن احقر کا اندازیہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر مردم شماری نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعداد وشمار پوری طرح صحیح نہیں ہونگے۔ اور غالباً یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۲ فیصد سے زیادہ ہوگا۔ اس لئے راستے میں جتنے دیہات ہمارے سامنے آئے، ان کی ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت نمایاں محسوس ہوئی۔

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، ان میں مسلمانوں کی شناخت تو ٹوپی سے باآسانی ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ عورتوں میں مسلمانوں کی شناخت اس طرح ہوتی ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے سر پر اوڑھنیاں باندھتی ہیں۔ برقع اور نقاب وغیرہ کا تصور تو یہاں موجود نہیں ہے، لیکن دیہات میں سر پر اوڑھنیوں کی خاصی شدت سے پابندی کی

جاتی ہے، اور ان اوڑھنیوں میں بھی ان خواتین نے ایسی تقسیم کر رکھی ہے جو کسی اور خطے میں کبھی نظر نہیں آئی۔ یہاں قاعدہ یہ ہے کہ کنواری لڑکیاں سر پر سبز اوڑھنیاں باندھتی ہیں۔ شادی شدہ اور ادھیڑ عمر عورتیں سیاہ اوڑھنیاں استعمال کرتی ہیں اور بوڑھیاں سفید اوڑھنیاں۔ عموماً جب کسی عورت کے یہاں پوتا یا نواسہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ سیاہ اوڑھنی کی بجائے سفید اوڑھنی استعمال کرنا شروع کردیتی ہے۔ سڑکوں پر سبز اوڑھنی والی لڑکیاں بہت کم نظر آئیں، زیادہ تر سیاہ اور سفید اوڑھنیاں دکھائی دیں غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کو عام طور پر گھر سے باہر نہیں نکالا جاتا۔

بہرکیف! مردوں میں ٹوپیوں سے عورتوں میں اوڑھنیوں سے اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

راستے میں دیہات میں متعدد مسجدیں نظر آتی رہی، لیکن میزبانوں نے راستے کی ایک بستی میں جو کھان لو کاؤنٹی کا ایک گاؤں تھا، تقریباً نصف گھنٹے ہمارے قیام کا پروگرام رکھا تھا۔ جونہی ہماری گاڑی اس گاؤں میں داخل ہوئیں۔ سڑک پر مسلمانوں کی دورویہ کھڑے ہوئی قطاروں نے بیک وقت آواز ''السلام علیکم'' کا نعرہ بلند کیا۔ یہاں سینکڑوں مسلمان نہ جانے کب سے اس قافلے کے منتظر کھڑے تھے، اور جب ہم کاروں سے اترے تو ہر شخص مصافحہ کرنے اور بغلگیر ہونے کے لئے دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر میں تھا۔ ان حضرات کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور ان پر وہ بیتابی صاف پڑھی جاسکتی تھی جو اظہار محبت ومسرت کا مناسب طریقہ میسّر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا پسماندہ اور دور افتادہ گاؤں تھا جس کی آبادی شاید آٹھ دس ہزار سے زائد نہ ہوگی، گاؤں کے بیشتر مکانات خستہ حال، راستے کچے اور جابجا کیچڑ سے بھرے ہوئے اور باشندے زیادہ تر غریب ہیں لیکن اس میں دو بڑی خوبصورت اور کشادہ مسجدیں ہیں۔ پہلے یہ دونوں مسجدیں چھوٹی سی تھی، ابھی ڈیڑھ دو سال کے دوران انہیں پختہ تعمیر کیا گیا ہے۔ امام صاحبان نے بتایا کہ یہاں چھوٹے مدرسے بھی قائم ہیں جن میں قرآن کریم اور ابتدائی دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، نوجوان طلبہ میں سے بیشتر نے

www.freepdfpost.blogspot.com

سروں پر بڑے خوبصورت عمامے باندھے ہوئے تھے۔

چونکہ جمعہ کا دن تھا اور ہمیں نماز لن شا شہر میں ادا کرنی تھی۔ اس لئے گاؤں میں مختصر قیام اور دونوں مسجدوں میں تھوڑی تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہوگئے۔

لن شا کی جامع مسجد میں جمعہ:

برف پوش پہاڑ پر اترتے چڑھتے ہم دوپہر کے ایک بجے سے ذرا پہلے لن شا شہر میں داخل ہوئے، یہاں قیام کا انتظام ایک صاف ستھرے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں تھا، وضو کرتے ہی ہم جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جامع مسجد شہر کے بالکل مرکزی چوک کے کنارے واقع تھی۔ ہمارا قافلہ یہاں پہنچا تو لوگوں کے جوش وخروش کا عالم قابل دید تھا۔ مسجد کے کافی دور سے مسلمانوں نے دورویہ قطاریں بنائی ہوئی تھیں، بہت سے لوگ آس پاس کی دیواروں اور عمارتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مسجد کا صحن، برآمدہ اور اندرونی ہال ماشاءاللہ نمازیوں سے بھرا ہوا تھا۔

جمعہ سے پہلے مسجد کے امام صاحب نے چینی زبان میں مختصر تقریر کی، اس کے بعد احقر کی تقریر ہوئی جس کا چینی ترجمہ پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری مسٹر حسن جاوید نے کیا، جو بیجنگ سے سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ احقر نے ممبر سے دیکھا تو مسجد ماشاءاللہ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دروازوں اور سیڑھیوں پر بھی آدمی تھے اور سامنے کی سڑک تک نکلے ہوئے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق مجمع سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہوگا۔ احقر نے اپنی تقریر میں ان مسلمانوں کو اپنے دین وایمان کے تحفظ اور اس دور افتادہ علاقے میں شمع اسلام فروزاں رکھنے پر مبارک باد پیش کی، پاکستان کی عوام کی طرف سے انہیں پیغام محبت دیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ ایمان کی اس مقدس امانت کو اپنی آئندہ نسلوں تک بحفاظت پہنچانے کے لئے دینی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔

احقر کے بعد مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے بھی مختصر تقریر میں چینی مسلمانوں کے جذبے کو خراج تحسین پیش کیا اور اپنے مشاہدے وتاثرات بیان فرمائے۔

اس کے بعد امام صاحب نے عربی میں خطبہ دیا، خطبہ فصیح عربی زبان میں تھا اور امام صاحب کے انداز قرأت سے واضح تھا کہ وہ خطبے کا مفہوم سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔ احقر کو شیخ یونس یاں سن نے بتایا کہ اس علاقے کے مسلمان جمعہ کے بعد سنتوں کے علاوہ ''احتیاط الظہر'' کی چار رکعتیں پڑھنے کے عادی ہیں، چنانچہ جماعت کے بعد مسجد سے نکلنے میں خاصی دیر لگی، کیونکہ اکثر لوگ جماعت کے بعد دس دس رکعتیں پڑھ رہے تھے۔ احقر نے شیخ یونس سے عرض کیا تھا کہ شرعاً ''احتیاط الظہر'' کی رکعتیں پڑھنا پسندیدہ نہیں ہے، اور لوگوں کو حکمت وتدریج کے ساتھ اس طرح یہ مسئلہ بتانے کی ضرورت ہے، جس سے کوئی خلفشار یا فتنہ پیدا نہ ہو، شیخ یونس کی فرمائش پر احقر نے انہیں اس مسئلے کے متعلق فقہاء کرام کے حوالوں کی نشاندہی بھی کر دی تھی، جسے انہوں نے توجہ کے ساتھ سنا، اس کے مطابق عمل کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

نماز جمعہ کے بعد پھر لوگ مصافحے اور معانقے کے لئے جمع تھے اور مسجد کی محراب سے گاڑیوں تک پہنچنے میں کافی وقت لگا، جس میں محبت اور اخلاص کے ساتھ یہ حضرات مصافحے کر رہے تھے اس کے پیش نظر ہر شخص سے ہاتھ ملانے کو خود دل چاہتا تھا، خدا جانے کس اللہ کے بندے کے ہاتھوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارے حالات کی اصلاح فرمادیں۔

جب صبر آزما حالات سے گذر کر ان حضرات نے اپنے دین وایمان کو بچایا ہے، ان کے پیش نظر ان کو ایمان کی حلاوت ہم سے کہیں زیادہ حاصل ہوگی۔ جب یہ خیال آتا تو ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا تھا، ان حضرات کو شاید آج سے پہلے چین سے باہر کے کسی مسلمان وفد سے ملنے کا اس طرح موقع نہیں ملا تھا اور سالہا سال کے بعد غالباً احقر پہلا غیر چینی مسلمان تھا جس نے اس جامع مسجد میں خطاب کیا، اس لئے ان حضرات کے جذباتِ محبت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

جمعہ کے بعد قیام گاہ پر دوپہر کا کھانا کھایا جس کے فوراً بعد لن شا کی دوسری مساجد

www.freepdfpost.blogspot.com

میں جانا تھا۔ یوں تو لن شا شہر میں کل سولہ بڑی مسجدیں ہیں، لیکن یکے بعد دیگر ان میں سے تین مزید مساجد میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ مسلمانوں کے خیر مقدم کا وہی منظر نظر آیا۔ جو جامع مسجد میں دیکھا تھا۔ ان تینوں مسجدوں میں دینی تعلیم کا بندوبست بھی ہے۔ تینوں مسجدیں بڑی شاندار ہیں اور حکومت کی امداد سے پچھلے ڈیڑھ دو سال میں تعمیر ہوئی ہیں۔

مساجد کے باہر میز بانوں نے ایک مقامی فیکٹری کے معائنے کا پروگرام رکھا تھا۔ یہ بڑی عظیم الشان فیکٹری ہے جس میں آواز اور عکس سے متعلق آلات اور مشینریاں تیار ہوتی ہے۔ فیکٹری کے مختلف حصے کئی کلومیٹر میں پھیلے ہوئے ہیں، یہاں مزائل کے ساتھ فٹ ہونے والے کیمرے، چھوٹے بڑے ٹیپ ریکارڈ، ان اشیاء میں استعمال ہونے والی مشینری اور فاضل پرزے تیار ہوتے ہیں۔ فیکٹری کے مینجر نے متعدد اشیاء دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ اشیاء چین ہی کی ایجاد ہیں اور ابھی دنیا میں کہیں اور پیدا نہیں ہوتیں۔

فیکٹری کے تکنیکی معیار کے بارے میں اظہار رائے تو کوئی ماہر فن ہی کر سکتا ہے، لیکن عامیانہ نظر سے یہ میدان کی بڑی معیاری فیکٹری نظر آتی ہے اور جس چیز نے احقر کو بڑا متاثر کیا، وہ فیکٹری کی عمارت اور اس میں کام کرنے والوں کی سادگی تھی عمارت ایسی ہے کہ باہر سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ کوئی عظیم الشان تکنیکی ادارہ ہوگا۔ پوری عمارت میں آرائش وزیبائش کی کوئی چیز نظر نہیں آئی پرانے طرز کی عمارت ہے جس کا فرش تک سادہ سیمنٹ کا ہے، دفاتر وغیرہ معمولی درجے کے ہیں لیکن اس میں صنعتی اور تکنیکی اعتبار سے کام بڑا عظیم الشان ہو رہا ہے اور تمام مالی وسائل اس اصل کام پر صرف ہو رہے ہیں۔ کاش! کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا یہ زریں اصول، جو درحقیقت اسلام کی تعلیم ہے ہم بھی اپنانے کے قابل ہو سکیں۔

اس دن کا اختتام ایک خوبصورت پارک میں ایک استقبالیہ سے ہوا جو لن شا پریفکچر کے کمشنر نے ہمارے وفد کے اعزاز میں دیا تھا۔ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دونوں مسلمان تھے، اور لن شا کی حدود سے ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں ڈپٹی کمشنر نے بڑی پرجوش اور محبت بھری تقریر کی۔ احقر نے بھی جوابی تقریر میں اپنے دورے کے تاثرات کے قدرے

تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ محبت اور مسرت کے جو جذبات ہمارے دلوں میں موجزن ہیں، ان کے اظہار کے لئے ہمارے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں۔

مغرب کی نماز اسی پارک میں ادا کرنے کے بعد ہم قیام گاہ پر واپس آئے اور عشاء کے بعد کھانے سے فارغ ہوئے تو طویل سفر اور مسلسل پروگراموں کی تھکن نے جلد ہی بستر کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔

چھینگ ہائی کا سفر:

۹ نومبر کی صبح سویرے ناشتے کے بعد لن شا سے صوبہ چھینگ ہائی کے دارالحکومت شننگ کے لئے روانگی ہوئی۔ لن شا کے میزبان جن میں لن شا کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر محکمہ مذاہب کے ڈائریکٹر اور چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے متعدد عہدے دار شامل تھے، ہمارے اصرار کے باوجود ہمیں لن شا رخصت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، ان کا اصرار تھا کہ ہم صوبۂ کانسو کی آخری حدود تک وفد کو چھوڑنے کے لئے جائیں گے، چنانچہ وہ حضرات کانسو کی سرحد تک ہمارے ساتھ رہے۔

لن شا سے شننگ جانے کے لئے راستے میں کئی سر بفلک پہاڑ حائل ہیں، جو آجکل برف سے ڈھکے ہوئے تھے، انہی میں سے ایک پہاڑ لاچی کہلاتا ہے اور اس کی چوٹی اس علاقے کی بلند ترین چوٹی ہے، سطح سمندر سے اس کی بلندی ۳۵۶۰ میٹر ہے۔ یہ چوٹی ہی کانسو اور چھینگ ہائی کے صوبوں کے درمیان سرحد کا کام کرتی ہے۔ ابھی ہم اس چوٹی تک نہیں پہنچ پائے تھے، سڑک کے دونوں طرف پہاڑ تھے اور دونوں پہاڑوں پر سڑک کے کنارے برف کی سفید چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ کہ اس برفستان کی ایک درمیانی وادی میں کئی جیپیں اور کاریں اور ان سے باہر کھڑا ہوا ایک مجمع نظر آیا۔

یہ صوبۂ چھینگ ہائی کے لوگ تھے جو شننگ سے ہمارے وفد کے استقبال کے لئے نہ جانے کب سے یہاں کھڑے تھے۔ ان میں صوبۂ چھینگ ہائی کے مسلم ایسوسی ایشن کے

www.freepdfpost.blogspot.com

صدر شیخ عبداللہ، صوبائی محکمہ خارجہ کے ڈائریکٹر مسٹر وانگ یان (جن کا درجہ صوبائی وزیر کے برابر ہے، کیونکہ چین میں صوبائی وزیر کا کوئی منصب نہیں ہے، اس کے بجائے متعلقہ محکمے کا سربراہ اعلیٰ ڈائریکٹر کہلاتا ہے) اقلیتی امور کمیشن کے ڈائریکٹر مسٹر لابن لی اور مذہبی امور کے وائس ڈائریکٹر مسٹر ماشن لو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہاں سے شننگ کا فاصلہ تقریباً پانچ گھنٹے کا ہے، لہٰذا اس وقت ان حضرات کے یہاں موجود ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ رات کو چار بجے شننگ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔

یہاں سردی لن شا سے بھی کہیں زیادہ تھی، اس لئے یہ حضرات وفد کے تمام ارکان کے عارضی استعمال کے لئے ایک ایک اوور کوٹ ساتھ لائے تھے۔ جو انہوں نے ہمارے کاروں سے اترتے ہمیں پہنا دئے۔ ان میں سے ہر اوور کوٹ کم از کم چھ سے سات سیر کا ہوگا، اور واقعۃً آگے سردی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ جو گرم کپڑے ہم ساتھ لائے تھے، ان کی اوقات یہاں باریک ورق سے زیادہ نہیں تھی۔

اب تک ہم صوبۂ کانسو کی گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے۔ چھینگ ہائی کے میزبان اپنے ساتھ اپنے صوبے سے گاڑیاں لے کر آئے تھے، کانسو کے میزبان یہاں ہم سے رخصت ہوگئے اور اب نئی گاڑیوں میں سفر شروع ہوا۔ اب میرے ساتھ گاڑی میں شیخ یونس کے بجائے شیخ عبداللہ تھے، جو صوبۂ چھینگ ہائی میں مسلم ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔

سالار کاؤنٹی میں

دشوار گزار برفانی چوٹیوں سے گزرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک قصبے میں داخل ہوئے جو سالار کے نام سے مشہور ہے۔ میزبانوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ یہاں کی مساجد اور مدارس کے معائنے کے بعد یہیں ایک دیہاتی مکان میں دوپہر کا کھانا ہوگا اس کے بعد آگے روانہ ہوں گے۔

سالار کے نام سے کاؤنٹی (ضلع) مسلم اکثریت کی کاؤنٹی ہے۔ پوری کاؤنٹی میں ساٹھ ہزار مسلمان آباد ہیں جن میں سے ۵۱ ہزار سالار قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور

نو ہزار ہوئی قومیت سے اور صرف اس کی ایک کاؤنٹی میں ۹۴ مساجد ہیں۔ جب ہماری کاروں کا قافلہ اس قصبے میں داخل ہوا تو سڑک کے دونوں طرف مسلمانوں کی قطاریں نہ جانے کب سے منتظر کھڑی تھی۔ کاروں سے اترے تو کاؤنٹی کے میئر صالح صاحب، ڈپٹی کمشنر خان شاوین صاحب اور یہاں کی جامع مسجد کے امام شیخ سعید حسن نے وفد کا استقبال کیا۔

یہاں ہم دو مسجدوں میں گئے۔ دونوں بڑی عظیم الشان مسجدیں ہیں اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی قائم ہیں۔ صوبۂ چھینگ ہائی میں اب تک کوئی غیر چینی وفد کبھی نہیں گیا تھا، بلکہ اس علاقے میں غیر ملکیوں کی آمد پہلے ممنوع تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہی صوبہ غیر ملکیوں کے لئے کھولا گیا ہے، اس لئے یہاں کے اکثر مسلمان کسی غیر چینی مسلم کی صورت سے اب تک نا آشنا تھے اور پہلی بار باہر کے کچھ مسلمانوں کو دیکھنے کے لئے ان کا بیتابانہ اشتیاق قابل دید تھا۔ مصافحے کے دوران متعدد افراد کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے نظر آئے اور جب امام صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس بات پر پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چینی مسلمانوں کو حج پر جانے کے انتظامات کئے ہیں تو ایک صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ نہ جانے یہ دور افتادہ مسلمان کب سے اپنے سینوں میں حج بیت اللہ کی آرزوں چھپائے بیٹھے تھے اور نہ جانے کتنے لوگ یہ آرزوں دل میں لئے دنیا سے رخصت بھی ہوگئے، اب اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حج کا راستہ کھولا ہے تو ان کے سینے مسرت و تشکر کے جذبات سے معمور ہیں اور اس نعمت پر شکر ادا کرتے نہیں تھکتے۔ یہ حضرات زبان کے اختلاف کی بنا پر الفاظ کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں، لیکن ان کے خلوص و محبت سے لبریز چہرے دل کی داستان سنانے کے لئے کافی تھے اور ان کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو ان کے اخلاص کی وہ پونجی تھی جو وہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے سامنے نچھاور کر رہے تھے۔ اس کے ان آنسوؤں میں ماضی کے صبر آزما حالات کی جو روح فرسا داستانیں پوشیدہ تھیں، ان کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، آفرین ہے ان فرزندان توحید پر جنہوں نے حالات کا

www.freepdfpost.blogspot.com

مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنے دین وایمان کو بچا بچا کر صحیح وسلامت عہد حاضر تک لے آئے، یہاں تک نہ جانے کتنی مدت کے بعد ہم انہیں اپنے کسی غیر ملکی بھائی کے سامنے اپنے جذبات کے خاموش اظہار کا موقع ملا۔

ایک مسجد سے باہر نکلے تو احاطے میں دو مزار تھے، یہ ان دو مسلمانوں کی آخری آرام گاہ ہے جو اس قصبے میں اسلام کی روشنی پھیلانے کا سبب بنے۔ مقامی حضرات میں مشہور یہ ہے کہ قارمان اور احمان[1] نامی دو بھائی تھے، یہ دونوں اصل میں سمرقند کے باشندے تھے، کسی وقت سمرقند کا حکمران ان کا دشمن ہوگیا تو یہ ترک وطن کر کے ایک اونٹ پر روانہ ہوئے، یہاں ایک چشمہ تھا جس کے کنارے یہ آرام کے لئے اترے، لیکن جب دوبارہ سوار ہو کر سفر جاری رکھنے کا ارادہ کیا تو اونٹ نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے اس بات کا غیبی اشارہ سمجھا کہ اسی جگہ اقامت اختیار کرنی چاہئے۔ یہ زمانہ قدیم کے دستور کے مطابق اپنے ساتھ سمرقند کی مٹی اور تھوڑا سا پانی لے کر آئے تھے، انہوں نے اس جگہ کی مٹی اور پانی کو تولا تو اسے سمرقند کی خاک اور پانی کے ہموزن پایا۔ اس سے ان کے ارادے میں مزید تقویت پیدا ہوئی اور یہ یہیں مقیم ہوگئے۔ اب سالار قومیت کے تمام افراد انہی کی اولاد ہیں۔

مسجد سے کچھ فاصلے پر ایک چوبی قبہ بنا ہوا ہے جو ان حضرات کے یہاں ٹھہرنے کی یادگار ہے، اسی کے نیچے ایک تالاب ہے جس کے پار ایک اونٹ کا مجسمہ مذکورہ واقعے کی یاد کے طور پر بنا ہوا ہے۔

مساجد، مدرسے اور مزارات پر حاضری سے فراغت کے بعد مسجد کے امام صاحب ہمیں بستی کے اندر اپنے گھر لے گئے، یہ گھر باہر سے کچی دیواری میں گھرا ہوا تھا لیکن اندر سے خاصہ کشادہ، آرام دہ اور خوبصورت تھا۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام یہیں تھا۔ یہاں امام صاحب نے سالار قوم کے مخصوص کھانے پکوائے تھے، جو عام چینی کھانوں سے

[1] شاید ان کے اصل نام "قہرمان" اور "عبدالرحمٰن" ہوں۔ تقی

قدرے مختلف ہیں اور ان میں سے بعض اشیاء پاکستانی کھانوں سے کچھ مناسبت رکھتی ہیں، جبکہ چینی کھانے، جن کا ہم اب تک تجربہ کرتے آئے تھے، پاکستانی کھانوں سے اس قدر مختلف ہے کہ کوئی قدر مشترک تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غالباً سالار قوم کے کھانوں میں سمرقند کے کھانوں کی خوبو آئی ہوگی جس کی بنا پر ان میں عام چینی کھانوں سے اختلاف پیدا ہوگیا۔

کھانے کے بعد مسجد میں نماز ظہر ادا کی۔ ماشاءاللہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نماز میں شریک تھی۔

نماز ظہر کے بعد سفر دوبارہ شروع ہوا اور کار یکے بعد دیگر بہت سے اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتی اترتی رہی، نہ جانے کتنے پہاڑ اس دوران عبور کئے انہیں پہاڑوں کے درمیان جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی بستیاں آتی رہی اور تقریباً ہر بستی میں مسجدیں نظر آئیں۔ ٹوپیوں اور اوڑھنیوں کی علامت سے مسلمانوں کی تعداد کا بھی اندازہ ہوتا رہا اور بحیثیت مجموعی احقر کا تاثر یہ تھا کہ یہ علاقہ ماشاءاللہ مسلمانوں سے بھرا ہوا ہے۔

صوبۂ چھینگ ہائی کا سرقبہ تو ۷ لاکھ ۳۰ ہزار مربع کلومیٹر ہے، لیکن اس کی آبادی چین کے تمام صوبوں میں سب سے کم ہے۔ صوبے کی کل آبادی چالیس لاکھ ہے، جس میں چھ لاکھ مسلمان بتائے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی احقر کا اندازہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد چھ لاکھ سے یقیناً کافی زائد ہوگی، پورے صوبے میں گیارہ سو سے زائد مسجدیں ہیں جو چین کی حالیہ تغیرات کے بعد (جن کی تفصیل انشاءاللہ آگے ذکر کروں گا) مسلمانوں کے لئے کھول دی گئی ہیں اور بحمداللہ نمازیوں سے آباد ہیں۔

سفر کے دوران عصر کا وقت ہوگیا تو احقر نے میزبانوں سے کہا کہ ہم کسی قریبی بستی میں رک کر نماز ادا کرنا چاہتے ہیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک چھوٹی سی بستی آئی، ہم نے کاریں روکیں، سڑک کے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی کے اوپر مسجد کے مینار نظر آئے، ہم مسجد پہنچے تو آس پاس کے مسلمان جمع ہوگئے، مسجد میں جماعت ہوچکی تھی، سردی عروج پر تھی اور وضو خانہ دیہاتی طرز کا تھا، لیکن مسجد کے امام صاحب نے چند ہی منٹ

www.freepdfpost.blogspot.com

میں ہمارے لئے گرم پانی کا انتظام کردیا اور ہم نے بسہولت مسجد میں نماز ادا کی۔

شننگ شہر میں

مغرب کا وقت ہو چکا تھا جب ہم شہر شننگ میں داخل ہوئے، یہ ایک بارونق اور ترقی پذیر شہر تھا جو کئی ضلعوں پر مشتمل ہے، مغربی ضلع کا ایک شاندار سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا، جو جدید ترین سامان کی آرائش سے آراستہ تھا۔ نماز مغرب کے فوراً بعد ملاقات کے کمرے میں صوبۂ چھینگ ہائی کے سیاسی مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین مسٹر شن لینگ (غیر مسلم) وائس چیئرمین جناب ایوب آئن ین شواں (مسلم) صوبائی حکومت کے سیکریٹری جنرل مسٹر ماٹرکھو (غیر مسلم) محکمہ مذہبی امور کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر تھاؤ شوژین (غیر مسلم) اور چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے وائس سیکریٹری جنرل ماتی فا (مسلم) وفد سے ملاقات کے لئے آئے۔ اس موقع پر وہ تمام حضرات بھی موجود تھے جو چھینگ ہائی کی سرحد سے ہمارے ساتھ تھے۔ ان سے مختلف موضوعات پر بالخصوص چینی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

اس ملاقات کے فوراً بعد مسٹر شن لینگ (چیئرمین سیاسی مشاورتی کمیٹی) نے اسی ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس سے تقریباً ساڑھے دس بجے رات فراغت ہوئی۔

صبح کو ناشتہ کے بعد ہم شننگ کی سب سے بڑی مسجد کے معائنے کے لئے گئے۔ شننگ شہر کی کل آبادی پانچ لاکھ ہے، جس میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار بتائی جاتی ہے اور شہر کی مسجدوں کی تعداد پینتیس ہے۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی مسجد ''جامع مسجد تنگ کو'' کہلاتی ہے۔ جو پانچ سو سال پرانی ہے، لیکن ثقافتی انقلاب کے خاتمے کے بعد زرکثیر کے صرفہ سے اس کی تعمیر نو اور مرمت کا کام ہوا ہے۔ جس میں مسلمانوں کے باہمی چندے کے علاوہ حکومت نے بھی کافی بڑی مالی مدد دی ہے۔ اس مسجد کی وسعت شکوہ، خوبصورتی اور حسن نظام دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ یہاں امامت وخطابت

کے فرائض وہی شیخ عبداللہ شان شین کوئی انجام دیتے ہیں جو صوبائی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں اور چھینگ ہائی کے سرحد سے ہمارے ساتھ تھے۔

مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ہے جس میں ائمہ مساجد کو تربیت دی جاتی ہے، تربیت کی مدت چھ ماہ ہے اور ان حضرات کو داخل کیا جاتا ہے جو پہلے سے عربی کے مبادی کے واقف ہوتے ہیں، روزانہ چھ پیریڈ کی تعلیم کے ذریعے اس میں مشکوٰۃ جلالین اور شرح وقایہ کا معتدبہ حصہ پڑھایا جاتا ہے، ہم مدرسے میں گئے تو اس میں مشکوٰۃ شریف کا درس ہو رہا تھا اور طلباء کی تعداد تقریباً ۳۵ء۴۰ ہزار کے درمیان ہوگی۔ شننگ میں اس روز درجہ حرارت صفر سے نو درجہ نیچے گرا ہوا تھا، اس لئے شدید سردی کی بناء پر درسگاہ کے بیچ میں ایک سرپوش والی بہت بڑی انگیٹھی جل رہی تھی، جس کے بعد کمرے کا درجہ حرارت نسبۃً معتدل ہوگیا تھا۔ یہاں ہم نے اساتذہ اور طلباء سے عربی میں باتیں کیں، بعض طلباء نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں ہمارے سوالات کے جواب دیئے۔

احقر کے سوال پر مقامی حضرات نے بتایا کہ یہاں مسجد کے انتظام کے لئے مسلمانوں کی ایک کمیٹی ہوتی ہے اور مسجد کی آمدنی چار ذرائع سے حاصل ہوتی ہے، سب سے پہلے تو مسلمانوں کا باہمی چندہ دوسرے بعض مساجد کو حکومت کی طرف سے امداد بھی ملتی ہے، تیسرے بعض مساجد کی مالی امداد چین سے باہر کے بعض مسلم ادارے بھی کرتے ہیں۔ چوتھے مسجدوں کے ساتھ کچھ مستقل ذرائع آمدنی بھی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زیادہ تر مساجد میں بہت سے حمام تعمیر کردئے جاتے ہیں اور عوام سے ان کے استعمال کی فیس وصول کی جاتی ہے، جو مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی ہے۔

جامع مسجد تنگ کو امیں بھی ایسے بہت سے صاف ستھرے حمام بنے ہوئے ہیں۔ وضو کا انتظام بھی بہت اچھا اور صاف ستھرا ہے۔ اس کے علاوہ اس مسجد کے ساتھ ایک کمرہ مردوں کو غسل دینے کے لیے مخصوص ہے جس میں دو الگ الگ پتھر کے تختے بنے ہوئے ہیں، ایک مردوں کے غسل کے لئے اور دوسرا خواتین کے لئے۔ یہ انتظام احقر نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

امام صاحب نے بتایا کہ مسجد کے ساتھ ایک خاصا وسیع کتب خانہ بھی ہے، لیکن ثقافتی انقلاب کے دور میں اس کی خاطر خواہ حفاظت نہ ہو سکنے کے سبب ابھی وہ مرتب اور قابل استفادہ نہیں ہے۔ دراصل اس مسجد میں انقلاب سے پہلے ایک بڑا دارالعلوم قائم تھا اور یہ کتب خانہ اسی دور کی یادگار ہے۔

بیجنگ کی طرف واپسی

جامع مسجد تنگ کوا کی زیارت کے بعد شنگ سے ہماری روانگی کا وقت آ گیا تھا، ہمیں یہاں سے بیجنگ جانا تھا، لیکن روز شنگ سے بیجنگ کے لئے کوئی پرواز نہیں تھی، اس لئے یہاں سے بذریعہ کار لانچو ایئر پورٹ جانا ضروری تھا جس کا راستہ یہاں سے تقریباً چھ گھنٹے کا ہے۔ چنانچہ یہاں تقریباً دس بجے روانہ ہوئے۔ ایک بجے تک ہمارا سفر صوبہ چھینگ ہائی میں ہوتا رہا اور یہاں بھی راستے کی بہت سی بستیوں میں مسجدیں نظر آتی رہیں، ایک بجے کے قریب احقر نے نماز ظہر کے لئے سفر روکنے کی فرمائش کی تو میزبانوں نے ایک بستی میں قافلہ کو روکا۔ یہ بستی شی ناتھی جو دریائے تے تھون کے قریب چھینگ ہائی اور کانسو کے درمیان سرحد پر واقع ہے۔ یہاں سڑک کے قریب ہی ایک مسجد بنی ہوئی تھی، لیکن نماز ظہر ہو چکی تھی اور مسجد بند تھی، ہمارے رفقاء میں سے بعض حضرات بستی میں امام کا مکان تلاش کر کے انہیں بلا لائے۔ وہ غیر متوقع طور پر وفد سے مل کر خوشی سے پھولے نہ سمائے، انہوں نے جلدی جلدی گرم پانی کا انتظام کیا اور ہم نے وضو کر کے نماز پڑھی، دوپہر کے کھانے کے لئے لنچ باکس ہمارے ساتھ تھے، امام صاحب باصرار اپنے گھر سے بھی کھانا لے آئے اور مسجد کے متصل ایک کمرے میں کھانا کھایا۔ اس کمرے میں چینی دیہات کی روایت کے مطابق ایک تختہ بچھا ہوا تھا۔ جس کے نیچے آتش دان روشن ہونے کی بناء پر وہ تخت کافی گرم رہتا ہے۔ اس تخت پر بیٹھ کر بے تکلفی اور راحت کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔

ہمارے مسجد سے نکلتے نکلتے ہماری آمد کی خبر بستی میں پھیل چکی تھی اور مسجد کے دروازے پر سیکڑوں مسلمان جمع ہو چکے تھے۔ ہمارے نکلتے ہی انہوں نے با آواز بلند ''السلام علیکم'' کا نعرہ لگایا اور مصافحوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کار تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگا۔

ابھی تین گھنٹے کا سفر باقی تھا، یہ سارا صفر صوبۂ کانسو میں قطع ہوا اور ہم ٹھیک پانچ بجے لانچو ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ یہاں صوبہ کانسو کے میزبانوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا انہوں نے ایپرن تک رخصت کرنے کے لئے پاس بنوائے ہوئے تھے۔

یہ سب حضرات ایک ایک کر کے بغلگیر ہوئے۔ کئی علماء کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایپرن پر شدید برفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ لیکن جب تک جہاز روانہ نہیں ہوگا۔ یہ سب حضرات وہیں کھڑے رہے۔ اس خداداد محبت وخلوص کا گہرا نقش دل پر لئے ہم چھ بجے شام بیجنگ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور پونے آٹھ بجے قریب بیجنگ ایئر پورٹ پر اترے جہاں درجہ حرارت صفر سے چھ درجہ نیچے تھا اور سائبیریا کی برفانی ہواؤں سے پورا شہر ٹھٹھرا ہوا تھا۔

اگلا دن چین میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا، صبح کے وقت کوئی باقاعدہ مصروفیت نہیں تھی، اس لئے ہم بازار چلے گئے۔ یہ بیجنگ ہوٹل کے قریب بڑا خوبصورت اور بارونق بازار تھا۔ کئی کئی منزلہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور باہر اسٹور میں خریداروں کا اتنا ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہر جگہ اشیاء کی قیمتیں معین تھی اور مول بھاؤ کا کوئی سوال نہ تھا، زیادہ تر چینی مصنوعات تھی، لیکن کچھ اشیا جاپان اور ہانگ کانگ وغیرہ کی بنی ہوئی بھی بک رہی تھیں۔

دوپہر کو چائنا مسلم ایسوسی ایشن نے سنکیانگ کے باشندے کے ایک مسلمان ریسٹورنٹ میں الوداعی ظہرانہ دیا تھا۔ میزبانوں کا کہنا تھا کہ آپ سنکیانگ نہ جا سکے تو کم از کم اہل سنکیانگ کے ریسٹورنٹ میں ان سے ملاقات کر لیں۔ ریسٹورنٹ کے لوگوں نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ ان کے کھانے پاکستان کے شمالی علاقوں کے کھانوں سے

www.freepdfpost.blogspot.com

کافی مشابہ تھے اور ایک ہفتہ بعد کھانوں میں پاکستانی خوبو نظر آئی۔

یہاں سے قیام گاہ واپس پہنچ کر فوراً ہی ہم واپسی کے لئے ایئر پورٹ روانہ ہو گئے۔

.....☆.....☆.....☆.....

(۳)

مجموعی تاثرات

ہمارے میزبان درست کہتے تھے کہ چین جیسے ملک کے لئے نو دن کی مدت بالکل ناکافی ہے ہمیں اپنے دورے، میں یہ حقیقت کھلی آنکھوں نظر آ گئی۔ اس کے باوجود نو دن کا یہ طوفانی دورہ بڑا پر کیف، خوشگوار، معلومات افزا اور مفید رہا۔

سب سے پہلے تو اس دورے، چین کے بارے میں وہ معلومات حاصل ہوئیں جن کا دور بیٹھ کر حاصل ہونا مشکل تھا۔ دوسرے ۱۹۴۹ء کے بعد چین جس طرح ایک عالمی حیثیت سے ابھرا ہے اور اس نے تھوڑی مدت میں عالمی برادری کے اندر جو نمایاں مقام حاصل کیا ہے، اس کے پیش نظر اس ملک کے حالات کا کچھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تیسرے یہ ملک اشتراکیت، بلکہ کمیونزم کی دوسری بڑی تجربہ گاہ تھا اور اس میں کمیونزم کے تجربے کے نتائج کا بھی فی الجملہ علم ہوا۔ میں انہی تین حیثیتوں سے اپنا اجمالی تاثرات بالاختصار عرض کرنا چاہتا ہوں۔

چین میں اشتراکیت کا تجزیہ:

۱۹۴۹ء سے پہلے چین غیر ملکی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے خانہ جنگی، انتشار، اور بدنظمی کا شکار تھا، اگرچہ پورے چین پر کسی غیر ملکی طاقت کا تسلط نہیں تھا، لیکن استعماری طاقتوں نے اسے اس طرح اپنے زیر اثر کیا ہوا تھا کہ وہ معنوی اعتبار سے ان کی ایک

کالونی بن کر رہ گیا تھا۔ ان حالات میں ماؤزے تنگ اور اس کے رفقاء نے پیہم جدوجہد کے بعد چین میں کمیونسٹ انقلاب برپا کیا اور ۱۹۴۹ء میں موجودہ ''عوامی جمہوریہ چین'' کا قیام عمل میں آیا۔

ماؤزے تنگ کٹر کمیونسٹ خیالات کا حامی اور مارکسزم کا اس درجہ علمبردار تھا کہ اس کے شہرآفاق ''لال کتاب'' میں متعدد مقامات پر روس کے خرشچیف کو ''رجعت پسند'' اور ''بورژوا'' طاقت کا دلال قرار دیا گیا ہے۔ گویا ماؤزے تنگ کے خیال میں روس مارکسزم کے راستے پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلا۔ بلکہ چین نے مارکس کے نظریات کو ٹھیک ٹھیک برسرکار لانے کا علم اٹھایا تھا۔ چنانچہ ماؤزے تنگ نے برسر اقتدار آنے کے بعد سے اپنی وفات ۱۹۷۸ء تک ملک میں ٹھیٹھ اشتراکی نظام زندگی قائم کرنے کے لئے قولی اور عملی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ چنانچہ تعلیم و تبلیغ اور تعمیرِ ذہن سے لے کر جبر و تشدد تک کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جو ''ماؤزے تنگ'' اور اس کے ہم خیال رفقاء نے چین میں نہ آزمایا ہو،

۱۹۴۹ء کے بعد رفتہ رفتہ اشتراکی فلسفے کے مطابق ملک کے تمام وسائل پیداوار سرکاری تحویل میں لئے گئے۔ کئی مرتبہ مختلف انداز سے زرعی اصلاحات'' نافذ کی گئی اور بالآخر ۱۹۵۸ء میں پورے ملک میں ''کمیون سسٹم'' قائم کر دیا گیا، جس کے تحت کوئی زمین کسی کی نجی ملکیت نہیں رہی، چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کے پاس جو چھوٹے چھوٹے قطعات نجی ملکیت میں باقی رہ گئے، وہ بھی ان سے ضبط کر کے ''کمیون'' کو دے دئے گئے اور اب کاشت کار کی حیثیت ایک مزدور کی رہ گئی۔

دیہی آبادی کو مختلف ''کمیونوں'' میں تقسیم کر کے انہیں مشترک طور پر زراعت کرنے کا پابند بنایا گیا۔ ان مشترک زرعی فارمولوں سے جو پیداوار حاصل ہوتی اس کا کچھ حصہ حکومت کو جاتا۔ باقی پیداوار کا ۸۰ فیصد کمیون کی ملکیت ہوتا، جس سے علاقے کے ترقیاتی کام بھی کئے جاتے تھے اور اسے کمیون کے افراد میں بطور اجرت تقسیم بھی کیا جاتا تھا اور ۲۰ فیصد صرف کام کرنے والے افراد کو ان کے کام کے حساب سے دیا جاتا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اسی طرح تمام صنعتیں سرکاری ملکیت قرار دی گئیں۔ ان میں کام کرنے والے اپنی محنت کے حساب سے تنخواہ کے حق دار ہوتے، لیکن کاروبار کا منافع تمام تر حکومت کے پاس جاتا تھا۔

۱۹۶۶ء تک اس نظام کو ملک میں کامیاب بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں، لیکن اشتراکی نظام کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ تمام وسائل پیداوار حکومت کے کنٹرول میں آجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حکومت سرکاری ملازمین ہی کے ذریعے چلائی جاتی ہے۔ اس لئے سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں اور ان کے متعلق العنانی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

دوسری طرف ''کمیون سسٹم'' کے مذکورہ بالا طریق کار میں پیداوار بڑھانے کے لئے کماحقہ محنت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

تیسری طرف صنعتی پیداوار پر بھی ذاتی منافع کے محرک کے فقدان کی بناء پر مضر اثر مرتب ہوتا ہے اس لئے حقیقی پیداوار منصوبہ بندی کا ساتھ نہیں دیتی۔

چوتھے جن کاشت کاروں کو ابتداء میں یہ سبز باغ دیکھایا جاتا ہے کہ ملک کی ساری زمینیں تمہاری ملکیت ہوجائیں گی۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ عملاً وہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی ملکیت سے بھی محروم ہوگئے ہیں اور اب ان کی آمدنی کا تمام تر تعین حکومت کے ہاتھ میں ہے جو سرکاری ملازمین کے توسط سے بدعنوانیوں کا ارتکاب بھی کرتی ہے، تو ان کے درمیان اس نظام کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

یہ تمام مسائل چین میں بھی پیش آئے جنہیں حل کرنے کے لئے ابتداء میں لوگوں کے اندر ایک ''قومی جذبہ'' اور ''اشتراکی انقلاب'' کی روح پھونکنے پر زور دیا گیا۔ تاکہ اس جذبے کے ذریعے مذکورہ بالا خرابیوں کو کچلا جاسکے، چنانچہ تعلیمی اداروں سے لے کر گھروں تک ''اشتراکی انقلاب'' سے محبت اور اس کے لئے خلوص پیدا کرنے کی تبلیغی مہم چلائی گئی۔ بیرونی اثرات کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لئے سخت قوانین بنائے گئے، پورا نظام زندگی ایسا بنانے کی کوشش کی گئی، جس میں سادگی، قناعت پسندی اور حب وطن کو فروغ ملے اور اشتراکی انقلاب کے ساتھ محبت پیدا ہو۔

لیکن ۱۹۶۶ء تک ان تمام تجربات سے گزرنے کے بعد حکومت کو یہ احساس ہوا کہ وہ نوکرشاہی پر قابو پانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکی، دوسری طرف پیداوار میں بھی متوقع ہدف کے مطابق اضافہ نہیں ہوسکا اور دونوں باتوں کے لازمی نتیجے کے طور پر عوام میں بھی اس نئے نظام سے بددلی پیدا ہوچلی ہے۔

ثقافتی انقلاب

چنانچہ ۱۹۶۶ء میں ماؤزے تنگ لن پیاؤ اور ان جیسے انتہا پسند لوگوں نے ایک گہرے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ اس گہرے آپریشن کا نام ''ثقافتی انقلاب کی تحریک'' تھا، اس تحریک کے مقاصد بڑے متنوع تھے، لیکن بنیادی طور پر اس کا مقصد پرانی نوکرشاہی سے نجات حاصل کرکے ایسی قیادت کو ابھارنا تھا جو اشتراک کے ساتھ پوری طرح متفق اور اس کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہو۔ اس غرض کے لئے عوام میں ایک مرتبہ پھر انقلابی روح پھونکنے کی کوشش کی گئی طلبہ کو ریڈگارڈز بنا کر انہیں بڑے وسیع اختیارات دیئے گئے، عوام سے کہا کہ وہ لوکل باڈیز سے ''رجعت پسندوں اور'' بورژوا طبقے کے حمایتیوں کو نکال پھینکیں، اور نعرہ یہ دیا گیا کہ ''ثقافتی انقلاب'' کی تحریک چار پرانی چیزوں (پرانے نظریات، پرانی ثقافت پرانے رسم ورواج اور پرانی عادتوں[1]) کے خلاف ایک کھلی جنگ ہے، جس میں ہر شخص کو حصہ لینا ہے۔ گویا عوام کے سامنے اس انقلاب کا پروگرام مختصر یہ تھا کہ ع

جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جب یہ تحریک چلنی شروع ہوئی تو اس کے ذریعے پورا ملک لاقانونیت، انارکی اور انتشار کی آماجگاہ بن گیا۔ بستی بستی لوکل باڈیز سے پرانے افراد کو نکالنے کی جدوجہد

[1] ''چار پرانی چیزوں'' (Four Olds) کے خلاف یہ قرارداد ۱۹۶۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں مرکزی کمیٹی کے گیارہویں اجلاس میں منظور کی گئی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

شروع ہوئی۔ تو وہ لوگ مزاحم ہوئے اور یہ کشمکش بہت سی جگہوں پر خونی تصادم کی صورت اختیار کر گئی۔ جو لوگ تحریک کے کرتا دھرتا تھے، وہ اس تحریک کا اپنا سیاسی حریفوں اور ذاتی دشمنوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے ''ریڈ گارڈز'' نے جس شخص کو چاہا ''رجعت پسند'' انقلاب دشمن اور سامراج کا ایجنٹ قرار دے کر اس کے گھر پر دھاوا بول دیا، اس کی املاک لوٹ لیں، اُسے اور اس کے گھر کے افراد کو جیل میں بند کروا کے انسانیت سوز اذیت رسانی کا نشانہ بنایا۔ اسی دور میں مذہبی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ مسجدوں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہ صرف بند کر دیا گیا۔ بلکہ ان کو تباہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی، مذہبی کتابوں کا گھر میں رکھنا جرم قرار پایا اور جو لوگ گھروں کی تلاشی کا وسیع اختیار لے کر گھر گھر گھوم رہے تھے، انہیں اگر کسی گھر میں قرآن شریف کے نسخے کا بھی سراغ لگ گیا تو انہوں نے بعض جگہ پورے خاندان کو تباہ کر ڈالا۔ غرض قتل غارت گری، بدامنی خانہ جنگی اور قومیت کا ایک طوفان تھا جس نے ملک بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، بیشتر تعلیمی ادارے بند ہو گئے، تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا پیداوار تشویشناک حد تک گھٹ گئی یہاں تک کے اشیاءِ خورد و نوش کی قلت ایک دردِ سر بن گئی، ایک پاؤ گوشت بازار سے خریدنے کے لئے بھی سرکاری کوپن ضروری تھا، اور یہ کوپن لے کر بھی لمبی لمبی قطاروں میں لگنے کے بعد پاؤ بھر گوشت ملتا تھا۔

پارٹی کے لیڈروں میں ایک نسبتہً اعتدال پسند گروپ اس ساری لاقانونیت کے خلاف تھا اور اس میں ملک کی تباہی دیکھ کر اعتدال کا رویہ اختیار کرنا چاہتا تھا، اس گروپ میں لیوشاؤ چی، ڈینگ زیانگ پنگ اور چواین لائی وغیرہ شامل تھے، لیکن ماؤزے تنگ اُس وقت عمر کے تقاضے سے بڑی حد تک از کار رفتہ ہو چکا تھا اور اس کے فیصلوں پر وہ انتہا پسند ٹولہ مسلط تھا جس میں خود اس کی بیوی جیانگ چنگ، اُس کا دستِ راست لن پیاؤ [1]

[1] (''ماؤزے تنگ'' کے ساتھ ''لن پیاؤ'' کی حیثیت کچھ ایسی ہی تھی جیسے رل مارکس کے ساتھ فریڈرک اینجلز کی۔ ماؤ کی لال کتاب پر پیش لفظ بھی ''لن پاؤ'' ہی نے لکھا ہے، (باقی اگلے صفحے پر)

اور ان دونوں کے دونوں کے دوسرے رفقاء شامل تھے، ان لوگوں نے اعتدال پسند گروپ کو بھی ''انقلاب دشمن'' قرار دے کر سازشوں کا نشانہ بنایا، لیوشاؤ چی کو قتل کروایا۔ ڈینگ زیانگ پنگ اور اس کے رفقاء کو قید و بند کی صعوبتوں سے گذارا، چواین لائی کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کیں اور ان مقاصد کے لئے سینکڑوں انسانوں کے خلاف بہیمانہ ظلم و ستم کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم چواین لائی کا انتقال ہوا تو اس گروپ کو مزید کھل کھیلنے کا موقع ملا، لیکن عوام ثقافتی انقلاب کی تباہ کاریوں سے عاجز آ چکے تھے۔ چنانچہ اگلے سال اپریل ۱۹۷۶ء میں آنجہانی چواین لائی کی برسی منانے کے لئے لاکھوں کا مجمع بیجینگ پیپلز اسکوائر (تھیان آن من) اور بعض دوسرے شہروں میں جمع ہو گیا جس نے پہلی بار ''چار کے ٹولے'' کے خلاف عوام پر صدائے احتجاج بلند کی۔ انتہا پسند گروپ نے اسے اپنے حق میں خطرے کی گھنٹی سمجھ کر اس مجمع کے خلاف تشدد کی کاروائیاں کیں اور اخبارات کے ذریعے ان کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم چلائی لیکن عوام اضطراب انتہا کو پہنچ چکا تھا، اگست ۱۹۷۶ء میں ماؤزے تنگ کا انتقال ہوا تو ہوا کوفنگ کو اس کا جانشین چیئرمین مقرر کیا گیا، ہوا کوفنگ اعتدال پسندوں میں شامل تو نہ تھا بلکہ کہا جاتا تھا کہ ماؤزے تنگ نے اپنے بعد اس کی جانشینی کے اشارے بھی دیئے تھے، لیکن اعتدال پسند گروپ رفتہ رفتہ اس کو انتہا پسندی کے خلاف کچھ اقدامات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ثقافتی انقلاب کی تحریک ختم ہو گئی۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ سے پیوستہ) اور وہ ماؤ کا نمبر ۲ سمجھا جاتا تھا لیکن قدرت کے فیصلے عجیب و غریب ہیں۔ ثقافتی انقلاب کی افراتفری کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ''لن پاؤ'' نے ماؤ کا تختہ الٹنے کے لئے اندر اندر سازش تیار کی اور اس کے قتل کا منصوبہ بنایا، اتفاق سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور اس وقت سے وزیر اعظم چواین لائی کو اس سازش کا پتہ ہو گیا۔ تو لن پاؤ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک جہاز میں سوار ہو کر خفیہ طور پر فرار ہو گیا۔ اس کی گمشدگی ایک معمہ بنی رہی بعد میں پتا چلا کہ وہ جس جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوا تھا۔ وہ ایک فضائی حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کی تباہ شدہ ملبہ منگولیا کے علاقے میں دریافت ہوا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جب ''ثقافت انقلاب'' کا سر سام سروں سے اُترا اور خود پارٹی کے رہنماؤں نے اس کے نتائج پر نگاہ بازگشت ڈالی اور اس دور کا حاصل چار سو پھیلی ہوئی تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عوام پہلے ہی اس دور سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس لئے اعتدال پسند گروپ رفتہ رفتہ صورتحال میں اصلاحات لانے کی پالیسی منوانے کے لائق ہو گیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی گیارہویں کانگریس کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کھلے بندوں اعتراف کیا گیا کہ ماؤزے تنگ کی بہت سی پالیسیوں سے چین کو شدید نقصان پہنچا ہے اور اب دور اصلاح کی ضرورت ہے، اسی پر بس نہیں، بلکہ اس اجلاس میں ہوا کوفنگ کو بھی چیئرمین شپ سے ہٹا کر پریمئر بنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی کہ اس نے پالیسیوں میں ماؤ کی تقلید کی کوشش کی تھی۔

اس موقع پر اعتدال پسند گروپ (جس میں ڈینگ زیاؤ پنگ کی شخصیت سب سے نمایاں تھی) اپنے قدم اچھی طرح جما چکا تھا، چنانچہ نومبر ۱۹۸۰ء میں انتہا پسند گروپ کے دس سرکردہ رہنماؤں کے خلاف ایک اسپیشل کورٹ میں تاریخی مقدمہ چلا جسے تاریخ چین کا سب سے اہم مقدمہ کہا جاتا ہے، اس مقدمے میں چار کے ٹولے، ماؤ کی بیوہ جیان چنگ اور لن پیاؤ کے دھڑوں کے ممتاز ترین رہنما شامل تھے۔ ان سب لوگوں پر الزامات یہ تھے کہ انہوں نے اپنی پوزیشنوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قتل و غارت گری، صریح فراڈ، دھوکہ بازی، جعلسازی اور سفاکانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔

اس مقدمے کو عدالت کے سینتیس ججوں پر مشتمل ایک بنچ نے سنا۔ دس ممتاز وکلاء نے ملزموں کا دفاع کیا۔ کھلی عدالت میں یہ مقدمہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ بالآخر ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء کو عدالت نے متفقہ طور پر ان تمام ملزموں کو مجرم قرار دیا، اکثر ملزموں کو ۱۶ سے لے کر ۲۰ سال اور عمر قید کی سزا ہوئی اور انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ماؤ کی بیوی جیانگ چنگ کو دو سال کی مہلت کے ساتھ سزائے موت سنائی گئی جو بعد میں عمر قید کے اندر تبدیل کر دی گئی۔

اس مقدمے کی کاروائی انگریزی زبان میں بیجنگ کے نیو ورلڈ پریس سے شائع

ہو گئی ہے۔ کتاب کا نام ''چینی تاریخ کا عظیم مقدمہ'' (IN Chinese History A great Trial!) ہے۔ یہ کتاب ثقافتی انقلاب'' کے دور کی تباہ کاریوں کا ایک دستاویزی مرقع ہے اور احقر نے اپنے اس مضمون میں بہت سی معلومات اسی کتاب سے اخذ کی ہیں۔ اس کتاب کے مقدمے میں پروفیسر فے زیاؤ ننگ (Hsiao Tung fei) جو اس مقدمے میں بطور جج شامل تھے لکھتے ہیں۔

''جو مقدمہ ہمارے پیش نظر تھا، اس کا ایک بڑے سیاسی مسئلے یعنی ثقافتی انقلاب سے گہرا تعلق تھا، مدعا علیہم پر جن جرائم کا الزام عائد کیا گیا ان کا ارتکاب ثقافتی انقلاب کے دوران اور اسی کی آڑ میں کیا گیا تھا۔ یہ بات تو اب عیاں ہو چکی ہے کہ۔ ''ثقافتی انقلاب'' چینی عوام کے لئے ایک رعایت ناآشنا تباہی بن کر آیا تھا اور اس نے چینی عوام اور چینی قوم کو جو زخم لگائے ہیں وہ ابھی تک ہرے ہیں۔''

اس انقلاب سے سبق سیکھنے اور اس کی ذمہ داریاں متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جن عناصر تباہ کاری میں حصہ لیا۔ اُن کا ٹھیک ٹھیک معائنہ اور تجربہ کیا جائے۔ سب سے پہلے یہ امتیاز پیدا کرنا ضروری ہے کہ کونسی چیزیں ''سیاسی نوعیت کی غلطیاں''، تھیں اور کونسے کام ''قانون کی مجرمانہ'' خلاف ورزیوں'' کی تعریف میں آتے ہیں۔ ''ثقافتی انقلاب'' کی سیاسی غلطیوں کی سنگینی اب کوئی راز نہیں رہی نیشنل پیپلز کانگریس کی مجلس قائمہ کے چیئرمین کی حیثیت میں مسٹر لی جیانگ ینگ نے عوامی جمہوریہ چین کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کہا تھا کہ ''جس وقت ثقافت انقلاب کی مہم شروع کی گئی، اس وقت پارٹی اور ملک کے اندر کے حالات کے جو اندازے لگائے گئے تھے، وہ حقیقت کے برخلاف ثابت ہوئے، اس وقت رجعت پسندی کی کوئی واضح تعریف نہیں دی گئی اور ایک غلط پالیسی

www.freepdfpost.blogspot.com

اور جدوجہد کا بالکل غلط طریقہ اختیار کیا گیا جو جمہوری مرکزیت کے اصول سے کلی طور پر منحرف تھا''۔

چین کمیونسٹ پارٹی آج کل اُن تجربات کا خلاصہ نکالنے میں مصروف ہے جو ۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد سے اب تک ہمیں حاصل ہوئے ہیں، نیز وہ ان تجربات سے سبق بھی حاصل کرنا چاہتی ہے، اور اس کے اس عمل میں ثقافتی انقلاب کے فوائد ونقصانات کا اندازہ بھی شامل ہے۔ میرے خیال ہے کہ یہ تجربات اور انداز ے جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گے۔

''ثقافتی انقلاب'' جن وجود کی بنا پر اس قدر تباہ کن ثابت ہوا۔ ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ایک گروہ کو ثقافتی انقلاب کے دوران جو قوت حاصل ہوگئی تھی اُس کو اُس نے پارٹی اور ملک دونوں کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کیا اور اس غرض کے لئے ہر قانونی اور غیر قانونی، اخلاقی اور غیر اخلاقی طریقہ استعمال کیا۔ یہ لوگ مجرم تھے، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فوجداری قوانین کی صریح خلاف ورزی کی، اس لئے یہ اُن لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں جن سے سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں۔''

(A Great Trial In CHinese History P -12)

اس مقدمے نے ''ثقافتی انقلاب'' کی تباہ کاریوں کی پوری طرح الم نشرح کر دیا۔ جو لوگ اس مقدمے میں صرف غلط کار نہیں، بلکہ مجرم ثابت ہوئے وہ سزایاب ہو کر چین کے سیاسی منظر سے غائب ہو گئے اور اس طرح انتہا پسند گروہ اور کمزور پڑ گیا۔[1]

[1] یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مقدمے میں ماؤ کی بیوہ جیانگ چنگ کے سوا اکثر ملزموں نے اپنے بیشتر جرائم کا بالآخر اعتراف کیا۔ ان میں سے بعض نے اظہار ندامت کے ساتھ اپنے آپ کو صریح لفظوں میں مستحق سزا قرار دیا۔ یہاں تک کہ ان کے وکلاء صفائی ان کے اظہار ندامت کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کے سوا کوئی اور مؤقف اختیار نہ کر سکے۔

۱۹۸۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بارہویں کانگریس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر چین کے سیاسی اور معاشی نظام میں بڑی انقلابی تبدیلیاں لائی گئی، سیاسی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین کا عہدہ سرے سے ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ سیکریٹری جنرل کا عہدہ رکھا گیا، اور اس طرح پارٹی کے ڈھانچے پر جو شخصی چھاپ تھی، اسے ختم کر کے اجتماعی قیادت کا آغاز کیا گیا دستور میں دہریت کی طرف جو میلان تھا، اُسے ختم کر کے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کی تاکید کی گئی اس کے علاوہ اسی کانگریس نے ہوا کوفنگ کو (جو ماؤ کا جانشین سمجھا جاتا تھا اور جسے چیئرمین شپ سے پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا) پریمیئر شپ سے ہٹا دیا اور اس طرح انتہا پسند گروپ کے ممکنہ اثرات مزید کمزور ہو گئے۔ اس کے علاوہ اسی زمانے سے ''کھلے دروازے کی پالیسی'' اختیار کی گئی اور غیر ملکیوں کی آمد پر لگی ہوئی پابندیوں کو بہت نرم کر دیا گیا۔

معاشی اعتبار سے یہ زبردست انقلاب آیا کہ دیہات میں کمیون سسٹم کو بالکل ختم کر دیا گیا اور ملک بھر میں ۵۴ ہزار سے زائد جو کمیون قائم تھے اُن سب کو ختم کر کے ''اجتماعی ذمہ داری (Collective Resoiblity) کا ایک نیا نظام جاری کیا گیا۔ اس نظام کے تحت دیہات کے ہر کنبے کو اس کے افراد خاندان کے لحاظ سے ایک قطعۂ زمین کاشت کے لئے دے دیا جاتا ہے۔ حکومت پیداوار کا ایک معین ہدف (مقدار کے لحاظ سے) مقرر کر دیتی ہے کہ اتنی مقدار حکومت کو دینی ہوگی۔ اس کے بعد باقی پیداوار کاشت کاروں کی اپنی ملک سمجھی جاتی ہے جسے وہ اپنی مرضی سے فروخت کر کے اس پر نفع کما سکتے ہیں۔

گویا اب حکومت اور کاشت کار کا رشتہ زمینداروں اور مزارع کا سا ہے، حکومت زمیندار ہے اور کاشت کار مزارع، فرق یہ ہے کہ ہمارے نظام مزارعت میں دونوں فریقوں کا حق متناسب حصوں (تہائی یا چوتھائی یا نصف) کی شکل میں مقرر ہوتا ہے، اور وہاں حکومت نے اپنا حصہ معین مقدار میں طے رکھا ہے (جو فقہ اسلامی کے تحت مزارعت کی فاسد صورت ہوتی ہے۔)

www.freepdfpost.blogspot.com

دوسری طرف صنعت وتجارت میں یہ انقلابی تبدیلی آئی ہے کہ اب محدود سطح پر نجی سرمایہ کاری کی اجازت دی جانے لگی ہے۔ یہاں تک کے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بھی ملک میں سرمایہ لگانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک حد تک ذاتی منافع کے محرک کا پیداوار بڑھانے کے لئے استعمال کی جارہا ہے اور اس غرض کے لئے رسدو طلب کی قوتوں (Market forces) کو بھی متحرک کیا گیا ہے۔

جون ۱۹۸۴ء سے صنعتوں میں بھی زراعت کی طرح ''ذمہ داری'' کا نظام نافذ کردیا گیا ہے جس کہ خلاصہ برٹانیکا ایئر بک ۱۹۸۴ء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''جون میں سرکاری ملکیت کی تمام صنعتوں کو باقاعدہ سرکاری طور پر اپنے تمام نفع اور نقصان کا ذمہ دار بنادیا گیا ہے، اب ایک فیکٹری کو اپنا تمام منافع حکومت کو حوالے کرنے کے بجائے اپنے منافع پر حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوگا اور باقی منافع مزدوروں کو بونس دینے اور سرمایہ کاری کے دیگر فیصلوں پر رکھنے اور ان سے ان کی کارکردگی کے معیار کے لحاظ سے معاملات طے کرنے کے لئے ایسے نئے اختیارات دئے گئے ہیں، جو اہمیت کے حامل ہیں''۔

(Britannica year book 1984 " China " p.235)

آج کل چین میں پالیسی کی ان تبدیلیوں کو ''اصلاحات'' کا عنوان دیا جارہا ہے، اور اصلاحات'' کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور پرفیسر نے زیاؤ تنگ کے الفاظ میں یہ ''۱۹۴۹ء سے لے کر موجودہ دور تک کے عملی تجربات سے حاصل ہونے والے سبق'' کا نتیجہ ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ان پالیسیوں نتیجے میں پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے ورکسانوں کی آمدنی میں بھی۔

یہ ہے چین میں اشتراک کی تجربے کی چھتیس سالہ تاریخ کا انتہائی مختصر خلاصہ۔ اس سے چند امور بالکل واضح ہیں۔

(۱) چینی قوم میں اپنی غلطی کے اعتراف ان کے حقیقت پسندانہ جائزے اور

اس کے مطابق اپنی پالیسیوں میں تبدیلی لانے کا حوصلہ موجود ہے جس کا مظاہرہ وہ پچھلے تقریباً نو سال سے کررہی ہے۔

(۲) وہ ٹھیٹھ اشتراک کی تصورات جن کو روایتی طور پر اشتراک کے بنیادی پتھر کہا اور سمجھا جاتا تھا چین میں ان کا عملی تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا اور اس بنا پر باوجود یکہ چین اب بھی ایک کمیونسٹ ملک ہے، وہاں معیشت کے نظام میں رفتہ رفتہ ایسی اصلاحات کی جارہی ہیں جو کمیونزم کے روایتی تصورات سے خاصی مختلف ہیں۔

(۳) ''ثقافتی انقلاب'' طبقاتی جنگ کا ایک مثالی مظاہرہ تھا جس کی پشت پر بڑی مستحکم طاقت موجود تھی، لیکن وہ چین کو رستے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔

واقعہ یہ ہے کہ چین میں اشتراک کی تجربے کی چھتیس سالہ تاریخ تحقیق ونظر کا بڑا دلچسپ موضوع ہے جس پر احقر کے علم میں اب تک عالمِ اسلام میں کسی نے محققانہ انداز سے قلم نہیں اٹھایا۔ احقر کی رائے میں وقت کی شدید ضرورت ہے کہ اس تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کرکے اس کے نتائج علمی انداز میں منظر عام پر لائے جائیں تاکہ ان سے پوری دنیا مستفید ہوسکے۔

یہ مختصر سفرنامہ کسی تحقیقی مقالے کا متحمل نہیں اور نہ احقر کے لئے نو دنوں کے اس طوفانی دورے میں یہ ممکن تھا کہ تمام متعلقہ پہلوؤں کا پوری ذمہ داری اور وقت نظر سے جائزہ لے سکے، لیکن ایک عام قاری کے لئے حالات کا ایک اجمال خاکہ احقر نے پیش کردیا ہے، جو انشاء اللہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ تاکہ اگر یہ خاکہ کسی باہمت محقق کے دل میں اس موضوع پر تفصیلی کام کرنے کی تحریک پیدا کرسکے۔ تو میں سمجھوں گا کہ اس مختصر مضمون نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

عام نظامِ زندگی

یہ تو تھا چین میں اشتراک نظام کا ایک مختصر جائزہ لیکن چینی عوام میں بعض خوبیاں

www.freepdfpost.blogspot.com

ایسی نظر آئیں جو بلا شبہ رشک ہیں اور غالباً وہی خوبیاں ایسی ہیں جن کی بنا پر یہ ملک اندرونی خلفشار کے شدید جھٹکے سہنے کے باوجود ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔

ان میں سے پہلی خوبی اس قوم کا سادہ طرز زندگی ہے، چین میں جہاں جہاں ہمارا جانا ہوا، وہاں یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوئی کہ حکومت اور عوام دونوں کی اصل توجہ نمود ونمائش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے بجائے پائیدار ترقیاتی کاموں کی طرف ہے۔ میں شروع میں لکھ چکا ہو کہ بیجنگ جیسے مرکزی شہر میں رات کے وقت روشنیوں کا انتظام بس ضرورت کے مطابق ہے۔ شہر بھر میں کہیں کوئی نیون سائن احقر کو نظر نہیں آیا۔ اس کے علاوہ وہ پبلسٹی اور اشتہارات کا وہ طوفان جو سرمایہ دارانہ نظام سے متاثر ملکوں میں تمدن کی لازمی خصوصیت بن کر رہ گیا ہے یہاں وہ بھی مفقود ہے۔ سڑکوں پر انکا دکا اشتہاری سائن بورڈ نظر آتے ہیں، لیکن ان میں بھی سادگی کا پہلو نمایاں ہے۔ بیجنگ خاصا صاف ستھرا شہر ہے، سڑکیں کافی کشادہ ہیں اور ان کی کشادگی کے باعث یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے، لیکن محلاتی طرز کی عمارتیں اور رہائشی بنگلے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر متوسط درجے کے فلیٹ ہیں اور انتہائی خستہ حال مکانات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

لوگوں کا لباس بھی عموماً سادہ اور بڑی حد تک ایک جیسا ہے، خاص طور پر کانسو اور چھینگ ہائی کے صوبوں میں یہ بات محسوس ہوئی کہ عوام اور سرکاری عہدہ داران کے درمیان فاصلے زیادہ نہیں ہیں، سرکاری حکام عوام میں ملے جلے رہتے ہیں، لن شاپر یفکچر کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر جو دو روز مسلسل ہمارے ساتھ رہے، ان کے کوٹ کے ایک حصے پر ریت جمی ہوئی تھی اور عوام کے ساتھ خاصے بے تکلف نظر آتے تھے۔ صوبۂ کانسو کے ڈپٹی گورنر بھی اپنے انداز داد میں ایک عام آدمی محسوس ہوئے اور ٹھاٹ باٹ کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ایک ادنی ملازم اور اعلے افسران کی تنخواہوں میں تفاوت بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔

اس لحاظ سے بھی چین دنیا کے ممالک میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ ایک کروڑ

آبادی کے شہر بیجنگ میں پرائیوٹ کاروں کی تعداد ابھی تک چند سو سے زائد نہیں ہوگی۔ (ایک زمانے میں تو پرائیوٹ کار رکھنے کی اجازت ہی نہ تھی، اب اجازت ملی ہے۔ لیکن ابھی تک شہر میں زیادہ ٹیکسیاں، سرکاری، یا غیر سرکاری گاڑیاں ہیں۔ چینیوں کی پرائیوٹ کاریں بہت کم ہیں۔ باقی تمام تر آبادی بسوں میں اور سائیکلوں پر سفر کرتی ہے، سڑک کے دونوں کناروں پر سائیکلوں کے لئے الگ راستہ بنا ہوا ہے۔ جس پر ہر وقت سائیکلوں کا ایک سیلاب بہتا نظر آتا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ سائیکلیں کھڑی کرنے کے لئے مخصوص پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ طویل فاصلوں کی صورت میں لوگ ایک حد تک سائیکل پر سفر کر کے اسے ان پلاٹوں میں کھڑا کر دیتے ہیں اور باقی سفر بس سے طے کرتے ہیں۔

ٹھاٹ باٹ اور نمود ونمائش کی کمی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ چین میں عُریانی وفحاشی کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو مغربی ممالک کا جزوِ زندگی بن گیا ہے، بلکہ اب رفتہ رفتہ مغرب زدہ مشرقی ممالک میں بھی بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چینی عوام کا ایک اور وصف محنت اور جفاکشی ہے، شہر ہوں یا دیہات، لوگ اپنے کاموں کی انجام دہی میں منہمک نظر آتے ہیں، چین مجموعی اعتبار سے ایک غریب ملک ہے، اس کے قدرتی وسائل بھی آبادی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں، حد یہ ہے کہ اس کے ۹۶ لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبے میں سے صرف دس فیصد حصہ کاشت کے قابل ہے، باقی حصہ یا تو پہاڑوں اور دریاؤں کے نیچے ہے، یا بے آب وگیاہ صحرا ہے، یا دوسرے جغرافیائی عوامل کے تحت ناقابل زراعت ہے، لیکن چین کی فی ایکڑ پیداوار پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ یہ زیادتی کسان کی محنت اور جفاکشی کی رہین منت بتائی جاتی ہے۔

جن دنوں ہم بیجنگ میں تھے، وہاں تھوڑے فاصلے پر گوبھی سے بھرے ہوئے ٹرک گھوم رہے تھے، گلی گلی گوبھی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ قدم قدم پر لوگ سائیکلوں اور اسکوٹروں پر بڑی مقدار میں گوبھی لے جاتے نظر آرہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج کل گھوبھی کی فصل کٹ رہی ہے اور اب پوری سردی کے

www.freepdfpost.blogspot.com

موسم میں شدید سردی کے باعث گھوبھی کاشت نہیں ہوسکی گی، اس لئے لوگ اسے پورے موسم کے لئے اپنے پاس ذخیرہ کررہے ہیں۔اس غرض کے لئے گھروں میں ایک خاص طرز کی سرنگ سی بنا کر اس میں گھوبھی کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور پورے موسم اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

لانچو سے لن شا جاتے ہوئے راستے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں جگہ جگہ غار اور کھدائی کے آثار نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں وادیوں کی زمین کی مٹی کاشت کے لئے موزوں نہیں ہے، اس لئے کاشت کار پہاڑوں کو کھود کر اس سے مٹی نکالتے ہیں، اور اسے ڈھو کر اپنے کھیتوں میں بچھاتے ہیں اور پھر اس پر کاشت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ فصل کاٹنے کے بعد ان غاروں سے کھلیان کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

کانسو اور چھینگ ہائی کے زیادہ تر دیہات بہت پسماندہ ہیں، مکانات خستہ، سڑکیں کچی اور ناہموار، باشندوں پر افلاس کے اثرات نمایاں، اور چہرے سرخ سفید ہونے کے باوجود برفانی موسم سے جھلسے اور کملائے نظر آتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ ہر شخص جفاکشی کے ساتھ محنت میں مصروف ہے، سستی اور کاہلی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔

چینی عوام کو ورزش کا بڑا ذوق ہیں اور فجر کے بعد بیجنگ کی سڑکوں پر نکل جائیں تو جگہ جگہ لوگوں کے جتھے اجتماعی طور پر ورزش کرتے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے لوگوں نے باقاعدہ گروپ بنائے ہوئے ہیں جو کسی تجربہ کار ماہر کے زیر نگرانی اجتماعی طور پر ورزش کرتے ہیں۔

عام لوگوں کی تنخواہوں کا معیار کافی کم ہے، بیجنگ یونیورسٹی کے ایک استاد نے بتایا کہ انہیں ماہانہ ایک سو دس یوآن ملتے ہیں) جو چھ سو پاکستانی روپے سے بھی کم بنتے ہیں) ہم نے پوچھا کہ ''کیا اس رقم میں آپ کا گزارہ ہوجاتا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں، ورنہ خواہشات کی کوئی انتہاء نہیں''۔ معلوم ہوا کہ ان کو جو فلیٹ ملا ہوا ہے۔اس کا کرایہ صرف ۵ یوآن ہے لیکن وہ صرف پچاس مربع گز میں بنا ہوا ہے۔) بس میں سفر کرنے کے لئے انہیں پاس ملتا ہے، علاج اور بچوں کی تعلیم مفت

ہے۔ضرورت سے زیادہ نئے نئے لباس بناتے رہنے کا معمول نہیں، لہذا یہ تنخواہ زیادہ تر اشیائے خوردونوش ہی پر صرف ہوتی ہے اور کافی ہوجاتی ہے۔

بہرکیف! سادگی محنت وجفاکش اور قناعت کے یہ اوصاف جو قوم بھی اختیار کرے گی، اسے یقیناً ترقی کرنے کا حق ہوگا اور وہ ایک نہ ایک دن اقوام عالم سے اپنا لوہا منوا کر رہے گی۔ یہ اوصاف درحقیقت مسلمانوں کے اختیار کرنے کے تھے اور جب تک یہ مسلمانوں میں باقی رہے دنیا کی کوئی قوم ان کی گرد کو نہ پہنچ سکی، لیکن جب اسے ہم نے نمود ونمائش اسراف بیجا، تن آسانی اور عیش وعشرت کا وطیرہ اختیار کیا، دنیوی عزت اور ترقی نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا۔اب یہ اوصاف چین نے اپنائے ہیں تو مختصر مدت میں اس نے اقوام عالم کی صف میں اپنا مقام بنالیا ہے۔

مسلمانوں کا حال اور مستقبل

مضمون کے شروع میں عرض کرچکا ہوں کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد بظاہر پانچ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے، کمیونسٹ انقلاب کے بعد، بالخصوص ثقافتی انقلاب کے دور میں ان حضرات نے بڑا کٹھن اور صبر آموز وقت گذارا۔ جن مدارس اور کتب خانوں کا میں نے پیچھے ذکر کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ انقلاب سے پہلے یہاں دینی تعلیم وتبلیغ کے بڑے بڑے مراکز قائم تھے۔ جو انقلاب کے بعد بند کردئے گئے۔ ثقافتی انقلاب کے دور میں بیشتر مسجدیں بھی بند ہوگئی اور قرآن کریم کے نسخے تک گھروں میں رکھنا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف قرار پایا۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس دور میں بھی تہ خانوں میں چھپا چھپا کر مذہبی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی، یہاں تک اللہ تعالیٰ نے اب ان کے لئے سہولت کی راہ کھول دیں۔ یہ محض پروپیگنڈا نہیں، واقعی حقیقت ہے کہ اب وہاں مسلمانوں کو بڑی حد تک مذہبی آزادی مل گئی ہے، جس کی بنا پر ان کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، مسجدیں دوبارہ تعمیر ہوئی ہیں، نئی نئی مسجدیں بھی بن رہی ہیں۔ مدارس کا احیاء ہورہا ہے، نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، غرض حالات بڑے حوصلہ افزا ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

لیکن مذہب پر پابندیوں کا جو کٹھن دوران پر گذرا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنے اثرات چھوڑ گیا ہے، اس وقت چینی مسلمانوں کی رہنمائی کا واحد مرجع مسجد کا امام ہے جس کی بڑی عزت کی جاتی ہے، لیکن یہ امام دینی تعلیم کے حصول کے لئے اپنے محدود ماحول سے کبھی باہر نہیں نکلا۔ اس نے چین ہی کے مدارس میں تعلیم پائی ہے اور اب ائمہ کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے ۱۹۴۹ء کے بعد کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دین کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں، یہ حضرات اوّل تو چینی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان بے تکلفی کے ساتھ نہیں جانتے دوسرے اگر کچھ عربی زبان انہیں آتی بھی ہے تو عربی کتابوں کی کافی قلت ہے، یہ حضرات اپنا سارا کام مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف، شرح عقائد سے چلا آرہے ہیں۔ دوسری کتابوں میں بڑے شہروں کے اکا دکا کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن اندرونی علاقوں میں میسر نہیں۔ عوام کے لئے چینی علماء نے چینی زبان میں ایسے عام فہم رسالے لکھ دئے ہیں جو عقائد و عبارت کی بنیادی معلومات فراہم کرسکیں۔ ایسے بعض رسائل ''چائنا مسلم ایسوسی ایشن'' نے بھی مرتب کرا کر شائع کئے ہیں۔ لیکن خود ائمہ اور علماء کی رہنمائی کے لئے کتابوں کی کافی کمی ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ مساجد کے ائمہ اب بیشتر عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ بحمد اللہ ریکیٹنگ، لانچو اور شنگ وغیرہ میں پانچ سالہ تعلیم کے ادارے قائم ہیں، لیکن وہ ملک بھر کی ضرورت کے لئے ناکافی ہیں۔ نئے اداروں کے قیام کے لئے مالی وسائل کی بھی ضرورت ہے اور ماہر اساتذہ کی بھی۔

تیسرا مسئلہ بچوں کی دینی تعلیم کا ہے، بعض زرائع سے معلوم ہوا کہ ابھی تک ملک میں یہ قانون باقی چلا آتا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچے کو کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی اگرچہ اس قانون پر عملدرآمد کے سلسلے میں موجودہ حکومت نے قدرے نرم اور لچکدار پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اور اس معاملے میں عملاً زیادہ دارو گیر نہیں کی جاتی، چنانچہ بعض جگہ مکاتب میں بچے تعلیم پا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک یہ قانون باقی ہے اس وقت تک مسلمان کھل کر بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کرسکتے، چنانچہ بچوں کو قرآن کریم اور نماز

وغیرہ کی تعلیم زیادہ تر گھروں میں دی جاتی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ ماں باپ کی معاشی مصروفیات انہیں اتنا موقع نہیں دیتی ہوگی کہ وہ بچے کے لئے ایک مکتب کی تلافی کرسکیں۔

ادھر ان مسائل کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی سامنے رہنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ مذہبی آزادی عرصے کی مشکلات کے بعد ملی ہے، اور جذبات میں آکر ایسا اقدام ان کے لئے مناسب نہیں ہے جو اس آزادی کی پالیسی پر منفی اثرات مرتب کرے۔ لہٰذا انہیں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہے، بحالات موجودہ مناسب یہی ہے کہ جب حکومت رفتہ رفتہ مذہبی آزادی کے معاملے میں کھلی پالیسی اپنا رہی ہے تو ان مسلمانوں کے ساتھ عالم اسلام کا جو بھی تعاون ہو، حکومت کے واسطے سے یا چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے واسطے سے ہو۔

ہم اپنے دورے میں حکومت چین کو یہ پیشکش کی ہے کہ وہ مسلمان طلبہ کو پاکستان بھیجے تو ہم ان کی اعلیٰ دینی تعلیم کا انتظام مع قیام و طعام کرنے کو اپنی سعادت سمجھیں گے، نیز یہاں سے محدود مدت کے لئے زائر اساتذہ بھی وہاں کی تعلیمی اداروں میں جاسکتے ہیں، حکومت کے ذمہ دار افراد نے تجاوز کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا ہے، اس سلسلے میں عملی تفصیلات طے کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

عام مسلمانوں کے لئے اپنے چینی بھائیوں سے تعاون کا سب سے پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ انہیں ہمیشہ اپنی دعائے خیر میں یاد رکھیں، کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دین و ایمان کے تحفظ کی توفیق اور اس امانت کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے مواقع عطا فرمائیں۔ آمین۔

دوسرے وہاں کے علماء کو تفسیر، حدیث اور فقہ کی عربی کتابوں کی شدید ضرورت ہے، اگر کچھ اہل خیر حضرات ان کے لئے یہ کتابیں بھیجنے کو تیار ہو تو کتابوں کے انتخاب اور بھیجنے کے طریقے کے بارے میں احقر سے مشورہ فرمالیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

www.freepdfpost.blogspot.com

امریکہ اور یورپ کا
پہلا سفر

(امریکہ، برطانیہ، مصر، سعودی عرب)

شعبان ۱۳۹۸ھ جولائی ۱۹۷۸ء

www.freepdfpost.blogspot.com

فرنگ میں کوئی دِن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جُنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

(۹)
امریکہ اور یورپ کا پہلا سفر

گذشتہ ماہ اچانک احقر کو امریکہ اور یورپ کا ایک طویل سفر پیش آ گیا جس کی وجہ سے سابقہ شمارے میں اداریہ بھی شامل نہیں ہو سکا۔

امریکہ کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں نے بہت سی تنظیمیں قائم کی ہوئی ہیں انہیں تنظیموں میں سے ایک فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز (ایف آئی اے) کے نام سے موسوم ہے، یہ مختلف امریکی ریاستوں میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جمعیتوں کا ایک اتحاد ہے جس کا مرکز نیویارک میں ہے۔ ایف آئی اے ہر سال امریکہ کے کسی علاقے میں اپنا سالانہ کنونشن منعقد کرتی ہے، اس سال اس نے اپنا کنونشن امریکی ریاست ویسٹ ورجینیا کے مرکزی شہر چارلسٹن میں منعقد کیا تھا جو واشنگٹن سے تقریباً تین سو میل دور جنوب میں واقع ہے، اس مرتبہ اس نے اپنے کنونشن میں ممبر جماعتوں کے علاوہ مختلف اسلامی ملکوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی، اس ضمن میں اس نے حکومت پاکستان کو مدعو کیا تھا۔ حکومت پاکستان نے اس کنونشن میں شرکت کے لئے تین افراد پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا جس میں محترم جناب خالد اسحاق صاحب ایڈوکیٹ جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب اور راقم الحروف کے نام تجویز کئے گئے۔

اس وفد کی روانگی کی اطلاع ہمیں بالکل اچانک ملی، ۲۰ جولائی کو چارلسٹن میں کنونشن شروع ہو رہا تھا اور ۱۴ جولائی کو ہم سے اس نامزدگی کی منظوری لی گئی۔ ۲۰ جولائی کو چارلسٹن پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۸ جولائی کو ہم روانہ ہو جائیں اس لئے ہمیں تیاری کے لئے کل تین دن ملے جن میں سے ایک دن کراچی کی شدید بارش کی نذر ہو گیا، بعد میں معلوم ہوا

www.freepdfpost.blogspot.com

کہ ایف آئی اے کی طرف سے دعوت ہی حکومت کو بہت دیر سے ملی تھی، اس لئے سفر کے تمام مراحل نہایت تیز رفتاری سے طے کرنے پڑے۔

۱۸ر جولائی کو صبح دو بجے پی آئی اے کے طیارے کے ذریعے ہم نیویارک کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ چھبیس گھنٹے کا انتہائی طویل سفر تھا جس میں طیارے کو تین براعظم عبور کر کے امریکہ پہنچنا تھا اور بیچ میں دبئی، قاہرہ، فرینکفرٹ اور پیرس رکتے ہوئے جانا تھا اس روز ہمیں کراچی سے روانہ ہونے کے بعد صرف تین گھنٹے رات ملی، اس کے بعد تقریباً تیئس گھنٹے تک مسلسل دن ہی رہا، کیونکہ طیارے کا سفر سورج کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کراچی کے وقت کے لحاظ سے ۱۸ جولائی کو رات نو بجے طیارے پیرس پہنچا تو وہاں شام کے پانچ بجے تھے۔ یہاں ہم نے ایئر پورٹ ہی کے حصے میں نماز ادا کی اس کے بعد چھ گھنٹے تک مسلسل بحر اٹلانٹک پر پرواز ہوتی رہی لیکن اس پورے عرصے میں ہمارا عصر کا وقت باقی رہا، اور جب ساتویں گھنٹے جہاز نیویارک پہنچا ہے تب بھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، اس وقت کراچی میں ۱۹ جولائی کی صبح کے پانچ بجے ہوں گے اور یہاں ۱۸ جولائی کی شام کے سات بجے تھے اور چونکہ یہاں سورج آٹھ بجے کے بعد غروب ہو رہا تھا اس لئے عصر کا وقت کافی باقی تھا۔

نیویارک میں پاکستان کے نائب قونصل ہمیں لینے کے لئے ایئر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ اس لئے ایئر پورٹ کے تمام مراحل بحمد اللہ جلد نمٹ گئے۔ اس رات نیویارک کے ایک ہوٹل میں قیام رہا اور اگلے روز گیارہ بجے ہم نیویارک کے چارلسٹن روانہ ہوئے اور دوپہر کو ایک بجے کے قریب منزل مقصود پر پہنچے چارلسٹن ویسٹ ورجینیا کا دارالحکومت ہے اور سرسبز وشاداب پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، یہاں دریائے کینوہا کے کنارے ہوٹل ہالی ڈے ان میں ہمارا قیام ہوا۔ اسی ہوٹل کے ایک ہال میں سیمینار منعقد ہونا تھا۔

امریکہ میں چار قسم کے مسلمان آباد ہیں، ایک تو مسلمان ہیں جو اصلاً کسی مسلمان ملک کے باشندے ہیں لیکن ملازمت کاروبار یا تعلیم کی غرض سے امریکہ میں مقیم ہیں، دوسرے وہ مسلمان جن کے آباؤ وجداد کسی مسلمان ملک کے باشندے تھے اور کسی وجہ سے ترک وطن

کر کے یہاں آباد ہو گئے، اب ان کی اولاد جو امریکہ ہی میں پروان چڑھی ہے اپنے طرز بود و ماند میں سو فیصد امیریکی نظر آنے کے باوجود عقیدۃً اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ تیسرے سیاہ فام نومسلم ہیں ان کی ایک بڑی تعداد تو ایلجاہ کی پیروکار ہے جو درحقیقت مسلمان نہیں اور کچھ واقعتہً مسلمان ہیں جنہوں نے مختلف مسلمان تنظیموں کی تعلیم وتبلیغ سے اسلام قبول کیا ہے یا وہ شروع میں ایلجاہ کے پیروکار تھے بعد میں ان پر حقیقت حال واضح ہوئی اور انہوں نے صحیح معنی میں اسلام قبول کر لیا، ان سیہ فام نومسلموں کو عام طور سے ''بلالی مسلمان'' کہا جاتا ہے اور چوتھی قسم سفید فام نومسلم ہے یہ وہ امریکی نسل کے لوگ ہیں جو مختلف مسلمان تنظیموں کی تعلیم وتبلیغ سے مسلمان ہوئے ہیں۔

ایف آئی اے جس کی زیر اہتمام یہ کنونشن منعقد ہو رہا ہے، اگرچہ دستوری لحاظ سے چاروں قسم کے مسلمانوں کی تنظیم ہے۔ لیکن اس میں عملاً پہلی دو قسمیں زیادہ اور آخری دو قسموں کے مسلمان کم ہیں، اس تنظیم کے ارباب وحل وعقد یا تو کچھ عرب مسلمان ہیں یا پھر دوسری قسم کے کچھ امریکی مسلمان اس جماعت سے مختلف امریکی ریاستوں کی متعدد تنظیمیں وابستہ ہیں، اور اس کنونشن میں ان تنظیموں کے نمائندے مدعو کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب مصر، شام، اردن، لبنان اور پاکستان سے بھی مختلف مندوبین کی دعوت دی گئی تھی۔

کنونشن کا اصل مقصد تو (جو وہیں جا کر معلوم ہوا) یہ تھا کہ امریکہ کے مختلف خطوں میں اس تنظیم سے وابستہ جو مسلمان آباد ہیں، ان کا ایک سوشل اجتماع ہو جائے، یہ لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں، ایک دوسرے کے مسائل سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں، اور کچھ اجتماعی تفریحات کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب آئیں، لیکن اس بنیادی مقصد کے ساتھ ایک سیمینار کو بھی پروگرام میں شامل کر لیا گیا تھا: ''امریکہ میں اسلام'' اور اسی سیمینار کیلئے ہم لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔

ہمیں چونکہ سیمینار کے لئے مقالہ لکھنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا، اس لئے ہم اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ تیار نہ کر سکے تھے اور وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ یہ اسٹیج بھی کسی تحقیقی مقالے کے لئے موزوں نہ تھا، اس کے بجائے پاکستان میں رہتے ہوئے امریکی مسلمانوں کے جن

www.freepdfpost.blogspot.com

مسائل کا علم تھا اور یہاں کے دو چار روز میں جس کی تصدیق ہوئی انہی کے بارے میں چند ضروری گذارشات احقر نے چارلسٹن ہی میں مرتب کیں اور افتتاحی اجلاس کے اگلے دن صبح کی نشست کے آخر میں احقر نے مقالہ پڑھا، جلسے کی زبان چونکہ انگریزی تھی اس لئے احقر نے یہ مقالہ انگریزی میں ہی لکھا تھا۔ اس کی خاص باتوں کا اردو خلاصہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

رسمی تمہید کے بعد احقر نے اس میں عرض کیا کہ:

''سیمینار کا نوٹس چونکہ ہمیں بہت مختصر ملا۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کر سکا لیکن میں اس موضوع پر چند عمومی گذارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور یہ درحقیقت ایک پیغام ہے جو میں آپ حضرات کی وساطت سے امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

ہم پاکستانی مسلمان اگرچہ جسمانی اعتبار سے اپنے امریکہ میں مقیم بھائیوں سے بہت دور ہیں، لیکن پاکستانی مسلمان کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے اتنی گہری دلچسپی رہی ہے کہ مسلمان خواہ زمین کے کسی حصے میں آباد ہوں، پاکستانی مسلمانوں کے دل ہمیشہ اس کے ساتھ دھڑکتے ہیں، لہٰذا ہم لوگ اگر پوری جامعیت کے ساتھ سہی، تو عمومی طور پر ان اہم مسائل سے آگاہ ہیں جو اس براعظم میں اسلام اور مسلمانوں کو درپیش ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ''امریکہ میں اسلام'' کے مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک طرف اس موضع کا تعلق غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے اور باقی رکھنے سے ہے، یعنی اس موضع کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اس خطے کے مسلمان اپنی ملی..... تشخص اور دینی عظمت کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں مسئلے باہم اس قدر مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ مسلمان اس وقت تک

تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے جب تک وہ خود صحیح معنیٰ میں مسلمان بن کر اسلام کا ایک دلکش نمونہ پیش نہ کریں۔

مجھے یقین ہے کہ مغربی ممالک کے غیر مسلموں کے درمیان اسلام کی تبلیغ و دعوت اور نشر و اشاعت کے لئے ہمارا زمانہ موزوں ترین زمانہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ چند صدیوں کے دوران اہل مغرب بہت سے نظام ہائے فکر کا عملی تجربہ کر چکے ہیں، انہوں نے یورپ پرستی سے لے کر انکار خدا تک ہر فکری نظام کو آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن جتنے نظریات کو انہوں نے اپنی زندگی میں اپنایا ان میں سے کوئی بھی ان کو زندگی کا کوئی متوازن لائحہ عمل فراہم نہیں کر سکا۔ ان کا قدیم مذہب ان کی مادی اور سائنسی ترقیات کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوا۔ لیکن جب انہوں نے اس مذہب کو عملاً خیر باد کہہ کر زندگی کی مادہ پرستانہ تعبیر کو اپنایا تو اپنی تمام تر مادی ترقیات کے باوجود روح کے سکون اور ضمیر کے اطمنان سے محروم ہو گئے۔ وہ چاند اور مریخ پر کمندیں ڈالنے کے باوجود اپنی روح میں جو نہ بجھنے والی پیاس محسوس کرتے ہیں اس کا کوئی مداوا اس زندگی کے پاس مل ہی نہیں سکتا جو مادے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

لہٰذا احقر کی نظر میں روحانیت کے ان پیاسوں کو اسلام کی صراط مستقیم دکھانے کا یہ بہترین وقت ہے۔ ان لوگوں پر یہ ثابت کرنے کا یہ مناسب ترین وقت ہے کہ صرف اور صرف اسلام ہی تمہیں ایک ایسی زندگی فراہم کر سکتا ہے جس میں مادی ترقیات روحانی سکون کے ساتھ شیر و شکر ہو کر چل سکیں۔

مشرق اور مغرب کے درمیان ایک عرصے سے زبردست فکری تصادم کی فضا قائم ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تصادم ناقابل تصفیہ نہیں۔ اس تصادم کا ایک بہترین حل ممکن ہے، اگر دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں کو سیکھنے کے جذبے سے کام کریں تو دونوں کے درمیان بہترین تصفیہ ہو سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب پچھلے دنوں مادی ترقیات کے نقطہ عروج پر پہنچ چکا ہے اور مشرق کو

www.freepdfpost.blogspot.com

اس میدان میں اس سے بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن دوسری طرف مغرب اس وقت اپنی تمام مادی ترقیات کے باوجود روحانی اعتبار سے دیوالیہ ہے اسے ایک ایسی روحانی ہدایت کی شاید احتیاج ہے جو اسے روحانی سکون عطا کر سکے اور یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ مغرب کو یہ روحانی ہدایت اسلام کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اکثر مشرق و مغرب کے درمیان یہ مصالحت عمل میں آجائے کہ مشرق مغرب کے مادی تجربات سے فائدہ اٹھائے اور مغرب اس سے روحانی ہدایت حاصل کرے تو ایک ہی کرہ زمین کہ یہ دونوں خطے اس انسانیت کیلئے کہیں زیادہ مفید اور تعمیری خدمات انجام سے سکیں گے جو آج باہمی جھگڑوں بے چینیوں، جہالت، مفلسی اور بداخلاقی کے الاؤ میں سسک رہی ہے۔

امریکہ میں جو مسلمان آباد ہیں، یہ خاص طور پر ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے اس پیغام کو اپنے غیر مسلم ہم وطنوں تک پہنچائیں اور ان میں اس طرز فکر کی آبیاری کریں، یہ کسی خاص تنظیم کسی خاص گروہ یا کسی خاص جماعت کا فریضہ نہیں، بلکہ یہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے، خواہ وہ کہیں آباد ہوں لیکن یاد رکھیے کہ یہ عظیم الشان کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک مسلمان بذات خود سچے اور عملی مسلمان نہ بنیں، یہ انقلابی کارنامہ ان لوگوں کے ہاتھوں انجام نہیں پا سکتا جو محض زبانی، پیدائشی مسلمان ہوں اور ان کی عملی زندگی میں اسلام کی کوئی جھلک موجود نہ ہو۔

تبلیغ اسلام کا سب سے مؤثر طریقہ خود اسلام پر عمل ہے اور اس طرح زیر بحث موضوع کا دوسرا پہلو یعنی ''خود مسلمانوں کا مسلمان بننا'' ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں پر ایک زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو صرف اس وقت ٹھیک ٹھیک ادا کر سکیں گے جب وہ خود اپنے ملی تشخص اور اپنی دینی عظمت کا تحفظ کرنے کے لائق ہوں، اگر امریکہ میں رہ کر وہ خود دوسرے امریکیوں کے طرز زندگی میں اس طرح جذب ہو گئے کہ دونوں کے درمیان کوئی امتیازی علامت باقی نہ رہی تو اگر انہوں نے

دعوات اسلام کا بیڑا اٹھایا بھی تو وہ ایک ایسی مبہم چیز کی دعوت ہوگی جس کا خارجی زندگی میں کوئی وجود وہ ثابت نہ کر سکیں گے۔

امریکی مسلمانوں کو سب سے پہلے اس بات پر ایمان مستحکم کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک جامع نظامِ زندگی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے احکام یکساں طور پر دلکش مفید اور واجب العمل ہیں، اس کے بعد عقائد سے لے کر عملی زندگی تک ہر شعبے میں پورے اعتماد اور خودداری کے ساتھ ان کے احکام پر عمل کرنا چاہئے۔ ان گذارشات کی روشنی میں اگر ہم اسلام کے ساتھ اپنے آپ کے ساتھ اور اپنی آئندہ نسلوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے پورے طرز زندگی پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور اپنی ہر ہر ادا کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کی فکر کرنی چاہئے یہاں تک کہ ہم وہ مثالی مسلمان بن سکیں جس کی ہر نقل و حرکت مجسم تبلیغ ثابت ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لئے یوں تو ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن میں چند آسان تجاویز پیش کرتا ہوں جن پر عمل کرنے سے انشاءاللہ اس مقصد کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

۱۔ امریکہ کا ہر مسلمان خاندان چوبیس گھنٹے میں سے کم از کم آدھ گھنٹہ اسلامی تعلیمات کے مطالعے کے لئے مخصوص کرے۔ اس آدھ گھنٹے میں تمام افراد خاندان اسلامی عقائد و احکام اور تاریخ و سیرت سے متعلق کسی کتاب کا اجتماعی مطالعہ کریں، خاص طور سے بچوں کو بنیادی اسلامی احکام اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ ہر مسلمان خواہ وہ کسی جگہ ہو، پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرے، نماز اسلام کا اہم ترین ستون ہے اور اس کے بغیر اسلامی زندگی اپنانے کی ہر کوشش نامکمل بلکہ ناکام رہے گی۔

۳۔ ہر مسلمان اپنے گھر میں بھی اور باہر بھی اسلامی طرز معاشرت کی پوری پابندی کرے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

۴۔ ہر مسلمان اس بات کا عہد کرے کہ اسے جب اور جہاں موقع ملے گا اپنے گردوپیش کے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو موزوں انداز سے پیش کرے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق بخشے کہ ہم اسلام کے تمام احکام وقوانین کی خود بھی پابندی کریں اور اسلام کے پیغام کو بہتر سے بہتر انداز میں دوسروں تک پہنچانے کے قابل ثابت ہوں آمین ثم آمین۔

احقر نے جو کچھ اس تقریر میں عرض کیا پورے خلوص اور یقین کے ساتھ عرض کیا، لیکن اس محدود اجتماع میں یہ نحیف ونزار آواز وعملاً کتنی مؤثر ہوتی ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

کنونشن کی دوسری نشستوں میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے بھی ''عصرِ حاضر میں مسلمانوں کے مسائل'' کے عنوان پر فی البدیہہ تقریر کی جناب خالد اسحاق صاحب نے بھی ایک موقع پر اپنی مختصر تقریر میں کچھ مفید تجاویز پیش کیں اور امریکی غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا جو طرزِ عمل ہونا چاہئے، اس پر روشنی ڈالی۔

کنونشن تین روز جاری رہا اور اس کا ایک مفید پہلو تو یہ تھا کہ امریکہ اور کینیڈا کے مختلف علاقوں سے مسلم تنظیموں کے جو نمائندے جمع ہوئے ان سے تبادلہ خیال کے ذریعہ وہاں کے مسائل کا علم ہوا ہوٹل ہالی ڈے ان ہی کے ہال میں جمعہ کی نماز بھی ہوئی اور جن عام مسلمانوں نے اس اجتماع میں شرکت کی انہیں شاید اسلامی عبادات وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل ہوئی ہوں لیکن درحقیقت یہ ہے کہ اس اجتماع سے جو کام لیا جاسکتا تھا، احقر کی رائے میں وہ نہیں لیا گیا جن عام مسلمانوں نے اس کنونشن میں شرکت کی ان میں اکثریت ان امریکی مسلمانوں کی تھی جن کے آباؤ وجداد سالہا سال سے امریکہ میں آبسے تھے اور یہ لوگ امریکہ میں ہی پیدا ہوئے یہی آنکھ کھولی اور امریکی تہذیب ومعاشرات کے سوا انہوں نے کچھ نہیں دیکھا چنانچہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی شکل وصورت لباس وپوشاک، انداز واداء اور زبان وبیان میں سے کوئی چیز ان کے مسلمان ہونے پر دلالت نہیں کرتی اور اگر باصرار یہ نہ بتایا جائے کہ یہ لوگ مسلمان ہیں تو انہیں مسلمان سمجھنا مشکل

ہے۔ اور ان میں ایسے بھی ہے جنہیں نماز نہیں آتی، لہٰذا اس اجتماع سے ایک بڑا فائدہ یہ حاصل کرنا چاہئے تھا کہ ان کو اسلامی تعلیمات سے منظم طور پر روشناس کرایا جائے، لیکن افسوس ہے یہ کام کسی منظم پروگرام کے تحت نہیں ہوا۔ احقر نے اس بارے میں منتظمین سے بات کی تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مزاج ومذاق اور عادت واطوار کے لحاظ سے سو فیصد امریکی سانچے میں ڈھل چکے ہیں لہٰذا اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کم از کم زبانی طور پر ہی انہیں مسلمان رکھنے میں کامیاب ہوجائیں اور اگر اس وقت ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی جو ان کے مزاج کے خلاف ہو تو خطرہ ہے کہ کہیں ہم ان کے اس زبانی اقرار سے ہی محروم نہ ہوجائیں، چنانچہ ان کو نہایت بتدریج اور حکومت کے ساتھ مسلمانوں سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

منتظمین کا یہ عذر کسی حد تک حق بجانب بھی تھا، لیکن اس کنونشن کے دوران پکنک کشتی رانی اور ڈنر کے جو پروگرام ترتیب دئے گئے، ان میں خوردبین لگا کر بھی اسلام کی نہ صرف کوئی جھلک نظر آسکی بلکہ بعض ایسی چیزیں بھی ان پروگراموں کے دوران سامنے آئیں جنہیں دیکھ کر پیشانی عرق عرق ہوگئی، حکمت اور تدریج اپنی جگہ ہے، لیکن اس کی رعایت کرتے ہوئے بھی ان پروگراموں کو بامقصد تعمیر، بلکہ تربیتی اور نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔

.....☆.....☆.....

امریکہ میں چار لسٹن بعد واشنگٹن اور نیویارک میں بھی قیام رہا، امریکہ کے بعد تقریباً ایک ہفتہ لندن میں بھی ٹھہرنا ہوا اور جس مغربی زندگی کو اب تک کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا تھا، اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مغرب کے مادی عروج اور روحانی دیوالیہ پن کا جو تصور مطالعے سے قائم ہوتا ہے، اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا، بعض چیزوں کو دیکھ کر حسرت ہوئی کہ درحقیقت یہ کام تو مسلمان کے کرنے کے تھے اور بعض چیزوں کو دیکھ کر عبرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی دولت عطا فرما کر اور سرورِ دو عالم ﷺ کی غلامی کا شرف بخش کر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے اور یہ لوگ ان نعمتوں سے محروم ہوکر پستی کے کس آخری کنارے تک پہنچ چکے ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب ایمان کے ذہن پر اس مغربی زندگی کا مشاہدہ کر کے اس قدر متضاد تاثرات قائم ہوتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے، ان قومون کے بعض کاموں کو دیکھ کر بے ساختہ تحسین آفرین کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں اور دوسری طرف انہی کی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہی بے ساختہ لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔

ان لوگوں کی زندگی کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان میں بحیثیت مجموعی جہد و عمل، قومی حمیت اور اجتماعی شعور کی فراوانی ہے۔ ہمارے حلقوں میں ان لوگوں کی عیاشی تو زبان زد عام ہے لیکن اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ صبح نو بجے سے شام چار بجے تک پوری فرض شناسی کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس دوران کسی کام چوری، رشوت ستانی، بدنظمی یا سستی اور کاہلی کو روا نہیں رکھتے، کسی انسان کو سرکاری دفتروں سے کام پڑ جائے تو اسے بلا وجہ چکر کاٹنے نہیں پڑتے بلکہ اگر اس نے قانونی مقتضیات کو پورا کر لیا ہے تو اس کا کام فوراً ہو جاتا ہے، رشوت کی بیماری شاذ و نادر ہے، اور معاملات عام طور سے صفائی اور سچائی کے ساتھ انجام پاتے ہیں، اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ یا دھوکہ فریب کا کوئی خطرہ شہریوں کو نہیں ہوتا باہمی تعلقات میں ان کا طرز عمل بحیثیت مجموعی نہایت شریفانہ اور بااخلاق ہے اپنے قیام کے دوران کسی دو آدمیوں کے درمیان تو تکار، غیظ و غضب یا تکرار کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا جب کہ خالص عوامی حلقوں سے بھی خاصہ سابقہ پڑا، ہر اس جگہ جہاں دو سے زیادہ آدمی کسی کے منتظر ہوں کسی تیسرے کی مداخلت کے بغیر خود بخود قطار بن جاتی ہے اور بڑے سے بڑے ہجوم میں اس قطار کو عمداً توڑنے کی کوشش نہیں ہوتی، ٹرینوں اور بسوں میں سوار ہوتے وقت، خواہ کتنی جلدی کا وقت ہو، کوئی کسی کو کہنی نہیں مارتا، بلکہ بسا اوقات دوسرے کو سوار ہونے کا موقع دیا جاتا ہے، عام مقامات، مثلاً ریستورانوں، ٹرینوں اور بسوں اور سڑکوں پر بلند آواز سے گفتگو کا دستور نہیں بلکہ سب دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں، چنانچہ بڑے بڑے ڈبے مسافروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن لوگ یا تو اخبار یا کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں یا خاموش بیٹھتے ہیں اور اگر کوئی بات ضروری ہو تو آہستگی سے کی جاتی ہے کوئی بوڑھا

یا معذور شخص بس یا ٹرین میں داخل ہو تو فوراً اس کے لئے سیٹ خالی کر دیتے ہیں، اجنبیوں کو راستہ بتانے کا اہتمام کیا جاتا ہے بار بار ایسا ہوا کہ ہمیں کسی راستے کی تلاش تھی اور مقامی لوگوں نے محض ہمارے انداز سے یہ بات محسوس کر کے ہمارے پوچھے بغیر خود رک کر پوچھا کہ ہمیں کس جگہ کی تلاش ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عام طور سے میٹر سے زیادہ پیسے از خود ہڑپ کرنے کی فکر میں نہیں رہتے نیویارک میں ایک دفعہ ٹیکسی کا کرایہ میٹر کے حساب سے نو ڈالر کچھ سینٹ بنا میں نے ڈرائیور کو دس ڈالر کا نوٹ دیا: اس کے پاس ریزگاری نہیں تھی وہ اتر کر ایک دکان پر گیا، وہاں سے نوٹ بھنا کر لایا، اور باقی ریزگاری پہلے میرے حوالے کر دی اس کے بعد کہا "میں نے آپ کا سامان بھی اٹھایا تھا، اگر آپ چاہے تو کچھ ٹپ بھی دے دیں۔

تمدنی سہولیات اور حسن انتظام بھی ان ملکوں میں اور سب سے بڑھ کر امریکہ میں قابل ستائش ہے نیویارک رقبے اور آبادی کے لحاظ سے کراچی سے کم از کم تین گناہ تو ضرور ہوگا، اور یہ طویل و عریض شہر بھی کئی جزیروں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان سمندر حائل ہے اور بیچ میں خوبصورت پلوں کے ذریعے ان جزیروں کو ملایا گیا ہے لیکن اتنے بڑے شہر میں بھی ٹرانسپورٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے خاص طور پر زیر زمین لوکل ٹرینوں کا نظام اس قدر آسان اور آرام دہ ہے کہ کار کے ذریعے سفر کرنا پارکنگ وغیرہ کے مسائل کی بناء پر مشکل لیکن ان ٹرینوں کے ذریعے سفر کرنا آسان ہے، پورے شہر میں زیر زمین ریلوے لائنوں کا ایسا وسیع جال بنایا گیا ہے، اور اس پر ہر دو منٹ بعد اتنی فراوانی سے ٹرینیں مہیا کی گئی ہے کہ ایک حصے سے دوسرے حصے تک سفر کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پچاس سینٹ کا ایک ٹوکن لے کر آپ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی بکنگ ٹیلیفون ہی کے ذریعے پختہ ہو جاتی ہے اور ایئر کمپنی کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ سفر ملتوی ہونے کی صورت میں مسافر اپنی بکنگ منسوخ کرانا نہیں بھولے گا، اندرون ملک سفر میں ایئر پورٹ پر عموماً دیر نہیں لگتی نیو یارک اور واشنگٹن میں ہوائی اڈے کے رن وے پر اڑنے والے جہازوں کی اس طرح قطار لگی رہتی ہے جیسے ٹریفک سگنل کے پاس کاروں کی، اس کے باوجود جہاز کے لیٹ ہونے کے واقعات شاذ و نادر ہی رونما ہوتے ہیں، جہاں ایئر بس سروس کا نظام قائم ہے، وہاں آپ پرواز

www.freepdfpost.blogspot.com

سے پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ جائے تو کسی سابقہ بکنگ کے بغیر ایئر کمپنی آپ کو سیٹ دینے کی پابند ہے خواہ اس کے لئے اسے دوسرا جہاز بھیجنا پڑے، بلکہ واشنگٹن سے نیویارک جاتے ہوئے ہم تو پرواز سے صرف تین منٹ پہلے ایئر پورٹ پہنچے، انہی تین منٹ میں کاؤنٹر بریفنگ بھی ہوگئی، سامان بھی چلا گیا ہم طیارے میں سوار بھی ہوگئے اور پرواز بھی بروقت ہوگئی۔

کمپیوٹر نے خاص طور پر زندگی کو بیحد تیز رفتار بنا دیا ہے، قدم قدم پر مشینوں کے عجیب وغریب مناظر نظر پڑتے ہیں اگر آپ کی رقم بینک میں جمع ہے اور رات کو کسی ایسے وقت آپ کو پیسے کی ضرورت پڑ گئی ہے جب کہ بینک بند ہے تو آپ کمپیوٹر کے ذریعے مطلوبہ رقم حاصل کر سکتے ہیں نیویارک میں بعض علاقے بیحد گندے بھی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی صفائی ستھرائی اور شہری خوبصورتی کا معیار کافی بلند ہے غرض باشندوں کو تمدن سہولیات فراہم کرنے میں جس ذہانت، باریک بینی، محنت اور حسن انتظام سے کام لیا گیا ہے وہ بلاشبہ قابل تحسین وستائش ہے۔

☆☆☆

لیکن اگر مغربی ممالک کی صرف انہی خصوصیات کا حال دور دور سے سنایا جائے تو بظاہر اس سے یہ اندازہ قائم ہو کہ یہ علاقے امن وعافیت کا گہوارہ ہوں گے، یہاں سکون واطمنان کا دور دورہ ہوگا اور جرائم وبداخلاقی کا بیج مارا جا چکا ہوگا، لیکن حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مغربی زندگی کا مذکورہ بالا روشن خصوصیات کے باوجود ان اندازوں کا جواب کلیتہً نفی میں ہے تمدن سہولت، عام معاشی خوشحالی صفائی معاملات اور اخلاق وشرافت کے جو چند نمونے احقر نے اوپر ذکر کئے ہیں وہ ان خصوصیات کی محض ایک جھلک ہے اور اس پر بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مغربی زندگی کا دوسرا پہلو انتہائی تاریک، بھیانک اور مذکورہ بالا صفات سے حیرت انگیز حد تک تضاد ہے۔

کیفیت یہ ہے کہ روپے پیسے کی ریل پیل کے باوجود، چوری، جیب تراشی، نقب زنی

اور ڈکیتیوں کے واقعات روزمرہ کا معمول ہیں جس معاشرے میں امانت ودیانت اور صفائی معاملات کے قابل رشک مناظر نظر آتے ہیں، ٹھیک اسی معاشرے کا حال دوسری طرف یہ ہے کہ کوئی راہگیر جیب کتروں اور ٹھگوں سے محفوظ نہیں، راہ چلتے چلتے کوئی آدمی قریب آ کر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور دوسرے ہی لمحے اس کی چھوٹی سے پستول راہگیر کی طرف ہوتی ہے اور وہ دن دہاڑے اپنی جیب خالی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ راستہ اگر قدرے سنسان ہو تو چلتے ہوئے آدمی کو روک کر اس کے سر پر اس زور سے ضرب لگائی جاتی ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتا ہے اور پھر اس کی جان ومال ضارب کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اس خاص طریقہ واردات کو (Mugging) کہا جاتا ہے اور یہ آرٹ اب روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

گھروں میں نقب زنی، لوٹ مار اور ڈاکے روز افزوں ہیں، خاص طور سے جن ہوٹلوں میں غیر ملکی لوگ مقیم ہوں وہاں نت نئے طریقے سے ڈاکہ زنی کی جاتی ہے، چانچہ امریکہ کے تمام ہوٹلوں میں کمرے کے دروازے پر چٹخنی کے علاوہ ایک زنجیر اس مقصد سے لگائی جاتی ہے کہ دروازہ کھلنے کے باوجود چوکھٹ سے اٹکا رہے اور اگر دروازہ کھولنے والا کسی دھوکے کا شکار ہوا ہے تو وہ دوبارہ دروازہ بند کر سکے، بہت سے ہوٹلوں پر نوٹس لگا ہوا ہے کہ رات کے نو بجے کے بعد ہوٹل کا دروازہ مقفل ہو جائے گا، اس کے بعد کوئی مسافر آئے تو پہلے فون پر انتظامیہ سے بات کر کے اپنے مسافر ہونے کا یقین دلائے اس کے بعد اندر داخل ہو۔ پچھلے دنوں نیویارک میں چند گھنٹوں کے لئے بجلی فیل ہوئی تھی، تو لوٹ مار کا جو طوفان مچا اس کا شور ساری دنیا نے سنا، یہ اس معاشرے میں امن وامان اور جان ومال کے تحفظ کا معیار ہے جس کی پولیس انتہائی چوکس تربیت یافتہ فرض شناس اور فعال ہے اور جس کے شاندار تمدن انتظامات اور حسن اخلاق کا بیان آپ نے اوپر پڑھا ہے۔

جہاں تک ان لوگوں کی جنسی طرز عمل کا تعلق ہے، اس کے مناظر دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ وہی قوم ہے جس کی شرافت واخلاق کے مظاہرے ہم دوسرے شعبوں میں

www.freepdfpost.blogspot.com

دیکھ کر آئے ہیں، صرف تفریح گاہوں پر ہی نہیں بارونق سڑکوں اور پرہجوم بازاروں میں ٹرینوں اور بسوں میں اور پبلک مقامات پر برسرِ عام بوس و کنار اور جنسی اتذاذ ایک عام بات ہے جس کے پانچ سات مناظر دن بھر میں خواہی نخواہی نظر آ ہی جاتے ہیں عورتوں کے لئے عریانی عیب تو کیا ہوتی، شاید مایۂ افتخار سمجھی جاتی ہے کپڑے نام کی جو چند تہتیں ہوتی ہیں ستر پوشی کے نقطۂ نگاہ سے ان کا بھی کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا اور خاص خاص مواقع پر بالکل برہنگی میں بھی چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا جگہ جگہ Nude Dancers (ماور زاد رقاصائیں) کے بورڈ بڑے فخر سے لگے نظر آتے ہیں۔ قحبہ خانوں کے اشتہار ''مجالس حسن'' (Beauty parlours) کے نام سے برسرِ بازار تقسیم ہوتے ہیں، نیویارک کے ایک بازار میں گذرتے ہوئے ایک شخص نے اشتہار ہم جیسوں کے ہاتھ میں بھی تھما دیا جس میں چند برہنہ تصویروں کے ساتھ جلی حروف میں لکھا تھا۔

Play Withourbodies یعنی ''ہمارے جسموں سے کھیلئے'' اور اس اشتہار میں جو کچھ لکھا تھا اسے ایک شریف آدمی کے لئے پڑھنا بھی مشکل ہے۔ غرض یہ کہ جنسی طرزِ عمل کے لحاظ سے یہ قومیں بلا مبالغہ کتے بلیوں کی سطح تک پہنچ چکی ہیں۔

پھر حیرت اور عبرت کا انتہائی مقام یہ ہے کہ جس معاشرے میں عورت اتنی سستی اور اس سے لذت حاصل کرنا اتنا آسان ہو، جہاں سے عورت سے لطف اندوز ہونے کے لئے خلوت بھی ضروری نہ ہو اور جہاں زنا بالرضا کو صرف قانونی طور پر ہی نہیں سماجی اور عقل اعتبار سے بھی کوئی عیب نہ سمجھا جاتا ہو، ٹھیک اسی معاشرے میں ''زنا بالجبر'' کی اتنی وارداتیں ہوتی ہیں کہ الامان!

زنا کے علاوہ ہم جنسی کا رجحان انتہائی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور باہمی رضامندی ہو تو اس انسانیت سوز بد مذاقی میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ہمارے قیام کے دوران ''نیویارک ٹائمز'' میں ایک بحث ''ہم جنسی'' کے موضع پر چل رہی تھی، ہم نے سمجھا کہ اس کے جواز و عدم جواز کی بحث ہوگی لیکن پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ مرحلہ گذر چکا ہے، اب یہ بات

تو طے ہو چکی ہے کہ اس بداخلاقی میں فی نفسہ کوئی قباحت نہیں، البتہ بحث یہ ہے کہ اس عمل میں کالے گورے کے درمیان کوئی امتیاز برتا جائے یا نہیں؟

شراب نوشی تو اس معاشرے میں ایک مقدس عمل ہے، قدم قدم پر شراب خانے موجود ہیں۔ اس کے باوجود غیر قانونی منشیات کا کاروبار زوروں پر ہے، نوجوانوں میں افیون اور چرس وغیرہ کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ راحت و آسائش کے اسباب، تمدنی اسہولت اور عیش و عشرت کی آسانی کے باوجود قلبی سکون کا یہ عالم ہے کہ بے خوابی کی شکایت عام ہو رہی ہے اور خواب آور ادویہ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

ظاہری اخلاق کے اس معیار کے باوجود جس کا مختصر تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، خاندانی تعلقات کا نظام درہم برہم ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت والفت کے تقاضے نایاب ہوتے جا رہے ہیں، امریکی معاشرے میں بڑھاپا موت سے بدتر عذاب ہے، بوڑھوں کے لئے الگ مرکز قائم ہے جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے لیکن وہ اس محبت کو ترستے ہیں جو صرف خون کے رشتے کی خاصیت ہے۔ بڑے بڑے مالدار لوگوں کے ماں باپ ان مراکز میں بے چارگی کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں اور ان کی اولاد مہینوں بلکہ بعض اوقات سالوں ان سے ملنے نہیں آتی اور جو بوڑھے گھر پر رہ جائیں، انہیں کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا، ایسے بوڑھوں کی طرف سے باقاعدہ اشتہارات شائع ہوتے ہیں کہ ''ہم سے فلاں پتے پر پل کر گھنٹہ بھر بات کر لیجئے'' اور اس ہمدردی کا بسا اوقات معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے، تنہائی سے اکتائے ہوئے بوڑھے بعض اوقات بے مقصد لوگوں کو فون کرتے رہتے ہیں تاکہ کچھ دیر کسی سے بات کر سکیں۔

مغرب معاشرے میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت عورت کی ہے، اس بیچاری کو جس بری طرح بے وقوف بنا کر اس کے ساتھ جو فراڈ کھیلا گیا ہے اس کا اندازہ تو پہلے بھی تھا، لیکن ان مغرب ممالک کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کی زار و زبوں حالت پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو گئی کہنے کو تو کہا یہ گیا ہے کہ ہم عورت کو مرد کے دوش بدوش

www.freepdfpost.blogspot.com

لانا چاہتے ہیں لیکن عملاً یہ ہوا کہ معاشرے میں جتنے نچلے درجے کے کام ہیں وہ تمام تر نہ سہی تو بیشتر ضرور عورت کے حوالے ہیں، اس دوران ہمیں دسیوں ہوٹلوں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں مرد بیرا شاذ و نادر ہی نظر آیا، عام طور سے یہ خدمت عورت ہی کے سپرد ہے دوکانوں پر سودہ بیچنے کا کام بھی اکثر و بیشتر عورتیں ہی کرتی ہیں، ہوٹلوں کے ڈیسک پر عموماً عورتیں نظر آتی ہیں، جہاز کا پائلٹ یا کیپٹن تو مرد ہوگا لیکن مسافر کی خدمت اور ناز برداری کا فریضہ عورتوں کے سپرد ہے۔ دنیا کی کسی چیز کا اشتہار عورت کے بغیر ناممکن سا ہے اور ہر وہ کاروبار جس میں عام لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو، اس کی انجام دہی عورت کے سپرد ہے اور پھر یہ نہیں کہ گھر سے باہر کے یہ فرائض انجام دینے کے بعد عورت کو امور خانہ داری سے چھٹی مل گئی ہو، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت بھی عام طور سے بدستور اسی کے سپرد ہے بلکہ اس آزادی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کے جن کاموں کا تعلق باہر سے ہے مثلاً اشیاءِ ضرورت کی خریداری وغیرہ بھی عورت کے فرائض میں داخل ہے بعض عورتیں دفتر کی ڈبل ڈبل ڈیوٹی کرنے کے بعد بھی گھر پہنچ کر کھانا تیار کرنے گھر کی صفائی اور بچوں کی نگہداشت کے فرائض انجام دیتی ہیں پھر اس کا سماجی رتبہ یہ ہے کہ جس مرد کا دل چاہے اس کا دل لبھا کر اس سے دوستی پیدا کر لے، اور جب تک دل چاہے اس کی قربت سے برسر عام لطف اندوز ہو اور جب اس سے جی بھر جائے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے راہ و رسم پیدا کر لے۔

خلاصہ یہ کہ مغربی مرد عورت سے قدم قدم پر لطف اندوز بھی ہونا چاہتا ہے، اس کے ذریعے اپنی تجارت بھی چمکانا چاہتا ہے، لیکن اس کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہیں، اور اس خود غرضانہ فراڈ کو سند جواز نہ دینے کے لئے اس کا نام ''تحریک آزادیٔ نسواں'' رکھ دیا ہے، دعویٰ تو کیا گیا ہے کہ ہم عورت کو مرد کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اسے اعلیٰ مناصب تک لے جانا چاہتے ہیں، لیکن عملاً ہوا یہ کہ عموماً معاشرے کے تیسرے درجے کے کام عورت کے حوالے ہیں اور اعلیٰ مناصب پر بدستوری مرد ہی کا تسلط ہے مغرب ممالک کا ایک سرسری جائزہ لے کر ہی دیکھ لیجئے کہ وہاں کتنی عورتیں صدر و وزیر اعظم یا

سربراہِ مملکت کا عہدہ حاصل کر سکی ہیں، کابینہ میں عورتوں کا تناسب کیا ہے؟ اسمبلی اور سینٹ میں مردوں کے مقابلے میں کتنی عورتیں ممبر بنی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی مغرب ملک میں اعلیٰ مناصب پر فائز عورتوں کی تعداد شاید پچیس سے تیس سے زائد نہ ہو۔ لیکن ان چند عورتوں کو اعلیٰ مناصب تک پہنچانے کی خاطر لاکھوں عورتوں کو اس طرح سڑکوں پر گھسیٹ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے تیسرے درجے کے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن عورت کی اس ہمہ جہتی تذلیل کا خوبصورت نام ''آزادیٔ نسواں'' رکھ کر اور جن معاشروں نے عورتوں کو گھر کی ملکہ بنا کر اس کے سر پر عفت و عصمت کا تاج رکھا، ان کے خلاف دقیانوسیت اور پسماندگی کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر مغرب نے اپنے اس فراڈ کو سند جواز ہی نہیں دی، بلکہ عورت بے چاری کو یہ باور کرا دیا ہے کہ صرف مغرب اس کے حقوق کا علمبردار ہے۔ چنانچہ مغرب عورت کی مظلومیت کا درد ناک پہلو یہ ہے کہ اس بے چاری کو اپنی مظلومیت کی خبر نہیں اور جن قزاقوں نے اس کی عزت و حرمت کو ملیا میٹ کیا ہے، اُنہی کو وہ اپنا نجات دھندہ سمجھنے پر مجبور ہے۔

.....☆.....☆.....

مغرب ممالک سے متعلق اپنے سفر کے چند مشاہدات احقر نے کسی تعصب یا ارادی مبالغے کے بغیر پیش کئے ہیں اور ان تمام مشاہدات کے نتیجے میں احقر کی حتمی رائے یہ ہے کہ مغرب میں تبلیغ اسلام کا بہترین وقت ہے، مغرب کی عوام اس لحاظ سے قابل رحم ہیں کہ وہ مادی ترقیات کے بہت خوشگوار نتائج سے محروم ہیں اور آخرت کے لحاظ سے تو معاملہ صفر ہے ہی۔ مغرب کے سفر کے دوران قرآن کریم کی یہ آیت بار بار کانوں میں گونج رہی تھی:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ.

(ترجمہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں انکو گرفتار عذاب

www.freepdfpost.blogspot.com

رکھے اور انکی جان کفر کی حالت میں نکل جاوے۔

اور:

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ، مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَأْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِھَادُ.

(ترجمہ) تجھ کو دھوکہ نہ دے ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا چند روز بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بری آرام گاہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغرب میں تبلیغ اسلام کی کوئی باقاعدہ منظم اور مخلصانہ جدوجہد ہماری طرف سے ابھی تک شروع نہیں ہوئی، مسلمانوں کی جو چھوٹی چھوٹی تنظیمیں مختلف علاقوں میں کام کررہی ہیں اُن کی تمام تر توجہ خود مسلمانوں کے مسائل کی حد تک محدود ہے۔ اور ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ وہاں بھی یہ تنظیمی باہمی افتراق وانتشار اور دھڑے بندیوں کی شکار ہیں ایک تبلیغی جماعت کی سادہ پرخلوص مگر محدود کوششیں غیر مسلموں کی طرف بھی متوجہ ہیں خاص طور پر انگلستان میں اس جدوجہد کے بہت مفید اثرات سامنے آئے ہیں، لیکن اس رخ پر کوئی ہمہ گیر کام نہیں ہوا، نہ ہمارے پاس اس غرض کے لئے کافی لٹریچر ہے، نہ کوئی منصوبہ بندی ہے اور نہ جدوجہد عمل کا خاطر خواہ جذبہ ہے، اس حالات میں مغرب میں کام کرنے کا انتہائی وسیع میدان ہے، اگر کوئی منظم جدوجہد اس سمت میں کی جائے تو اس کے بہت مفید اثرات سامنے آسکتے ہیں وہاں کن کن پہلوؤں سے کس کس کام کی ضرورت ہے؟ یہ مستقل مفصل موضوع ہے، اس سلسلے میں بہت سی تجاویز ذہن میں ہیں لیکن اس شمارے میں اسے پیش کرنے کا موقع نہیں رہا، زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر کسی فرصت میں اس موضوع پر مفصل گفتگو ہوسکے گی۔

.....☆.....☆.....

امریکہ سے واپسی پر تقریباً ایک ہفتہ لندن میں بھی قیام رہا، وہاں اسلامک سینٹر اور بعض دوسری مسجدوں میں خطاب کا موقع بھی ملا، انگلینڈ کے دوسرے شہروں سے بھی وہاں جانے کا اصرار تھا، لیکن رمضان المبارک قریب ہونے کی بنا پر ہم نے اپنے سفر کو مختصر

کیا اور (مصر کی تقویم کے لحاظ سے) ۲۹ شعبان کی رات کو لندن سے قاہرہ روانہ ہوگئے۔ راستے میں جہاز اٹلی کے دارالحکومت روم اور یونان کے دارالحکومت ایتھنز بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا اور صبح آٹھ بجے کے قریب ہم قاہرہ پہنچ گئے یہاں دو دن اور ایک رات قیام رہا، قاہرہ صدیوں سے عالم اسلام کا ممتاز علمی مرکز رہا ہے، اس لئے یہاں زیادہ ٹھہرنا چاہئے تھا لیکن خواہش یہ تھی کہ رمضان المبارک کا آغاز حجاز مقدس میں ہو، اس لئے یہاں کا حق ادا نہ ہوسکا، اس دو روز کے قیام میں صرف جامعۃ الازہر سرسری طور سے دیکھ سکے، اس کے علاوہ قاہرہ کا وہ عجائب گھر دیکھنے کا موقع ملا جس میں فراعنہ اور ان کی بیگمات کی حنوط کردہ لاشیں محفوظ ہیں، یہ ایک عظیم عبرت کدہ ہے جس میں خدائی کے دعویدار پتھر بنے پڑے ہیں اور قرآن کریم کے ارشاد کی حقانیت کی گواہی دے رہے ہیں۔

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ آیَۃً

پس آج ہم تمہارے بدن کو نجات دیتے ہیں تاکہ تم اپنے بعد آنے والوں کے لئے سامان عبرت بن جاؤ۔

قاہرہ کے قیام میں ایک شدید غلط فہمی کی واضح تردید ہوئی۔ عام طور سے مشہور یہ ہے کہ مصر میں قمری تقویم حسابی تخمینوں پر مرتب کی جاتی ہے اور چاند دیکھنے کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا، لیکن اس روز اس خیال کی تردید ہوگئی۔ جس روز ہم قاہرہ پہنچے وہاں کے حساب سے وہ چاند رات تھی، معلوم یہ ہوا کہ وہاں ہر سال ۲۹ شعبان کو عشاء کے قریب ''استقبال رمضان'' کے نام سے ایک تقریب ہوتی ہے جس میں مصر کے ممتاز علماء اعیانِ حکومت اور معززین شہر شریک ہوتے ہیں، یہ تقریب ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر کی جاتی ہے۔ اس روز اس تقریب میں مفتی مصر شیخ احمد الخضر کے علاوہ صدر سادات کی نیابت کے طور پر قاہرہ کے گورنر بھی شریک تھے۔ اس میں مفتی مصر نے ایک عالمانہ تقریر کرتے ہوئے ان لوگوں کی واضح تردید کی کہ جو رمضان اور عید وغیرہ کے تعین کے حسابات کو فیصلہ کن قرار دیتے ہیں اور اعلان کیا کہ کتاب وسنت کی رو سے اعتبار چاند کے حقیقتاً نظر آنے کا ہے، البتہ

www.freepdfpost.blogspot.com

انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اختلاف مطالع کے مسئلے میں جمہور کے قول کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور جن خطوں میں رات مشترک ہو، وہاں اگر کسی جگہ چاند نظر آ جائے اور اس کی اطلاع شرعی ذرائع سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو دوسری جگہ بھی یہ رویت ہلال معتبر ہونی چاہئے۔ اس اصول کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت مصر کی طرف سے قاہرہ اور اسکندریہ کی رصد گاہوں میں، نیز برج القاہرہ پر چاند دیکھنے کے لئے جماعتیں مقرر کی گئی ہیں (برج القاہرہ دریائے نیل کے کنارے ایک خوبصورت مینار ہے جس کی اونچائی اسی منزلوں کے برابر ہے، اور یہاں سے نا صرف قاہرہ کا پورا شہر بلکہ مضافاتی علاقے بھی نظر آتے ہیں، لیکن کسی بھی جگہ چاند نظر نہیں آ سکا، اس کے علاوہ سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک سے بھی رابطہ قائم کیا گیا، وہاں بھی چاند نظر نہیں آیا، اس لئے پہلا روزہ جمعہ کے بجائے ہفتہ کو رکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ اس سفر کا اختتام حجاز مقدس پر ہوا رمضان المبارک کا پہلا روزہ مکہ مکرمہ میں رکھا، رمضان کی مبارک ساعتوں و زیارت کی توفیق ہوئی، پانچ دن حرمین شریفین کے جوار میں رہنے کا شرف ملا اور ایک پھر اس حقیقت کی کھلی آنکھوں تصدیق ہوئی کہ دنیا و مافیہا کے تمام مناظر حسن و جمال اس حسن و جمال کے آگے گرد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس بظاہر بے آب و گیاہ خطے میں ودیعت فرما دیا ہے، امریکہ اور انگلینڈ میں بحمد اللہ راحت و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے، موسم بھی خوشگوار تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک دن بھی نشاط خاطر میسر نہ آ سکا، بلکہ ایک عجیب قسم کی ظلمت محسوس ہوتی رہی، لیکن بیت اللہ کے جوار میں پہنچنے کے بعد شدید گرمی، روزے اور عمرے کی تھوڑی بہت مشقت کے باوجود یوں محسوس ہوا کہ ؎

اگر جنت بریں روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

ہندوستان کا سفر

بہ سلسلۂ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند

مارچ ۱۹۸۰ء

www.freepdfpost.blogspot.com

(۱۰)

ہندوستان کا سفر

پچھلے مہینے دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم کا وہ یادگار صد سالہ اجلاس منعقد ہوا جس کا مدت سے اشتیاق اور انتظار تھا۔ اس اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے احقر نے ہندوستان کا سفر کیا اور تقریباً پورا ہی مہینہ سفر کی نذر ہو گیا۔

اس اجلاس میں شریک ہونے والوں کے لئے پاک و ہند کی حکومت نے باہمی معاہدے کے تحت خصوصی سہولت فراہم کی تھی اور حکومت پاکستان نے لاہور سے ایک اسپیشل ٹرین اٹاری تک اور حکومت ہند نے اٹاری سے دیوبند تک چلائی تھی۔ لاہور میں اس ٹرین کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ رخصت کیا گیا اور اس میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو افراد کا قافلہ دیوبند کے لئے روانہ ہوا، اس قافلے میں دیوبند سے وابستگی رکھنے والے ممتاز علماء خطباء طلباء اور دوسرے مسلمان شامل تھے اور مقصد و مشرب کی یکجہتی نے اس اجتماعی سفر میں بڑا کیف و سرور پیدا کر دیا تھا۔ ٹرین لاہور سے ۱۹ مارچ کو ٹھیک بارہ بجے روانہ ہوئی تھی۔ لیکن اٹاری میں کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے عصر کا وقت ہو گیا اور مغرب کی نماز تسر کے اسٹیشن پر پڑھی گئی۔ امرتسر کے دیوبند تک کا سفر اگرچہ سات آٹھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے، لیکن رات کو بے وقت پہنچنے کے خیال سے ٹرین کو اس اندازے سے لے جایا گیا کہ وہ اگلے دن فجر سے پہلے دیوبند نہ پہنچ سکے، چنانچہ یہ سفر رات بھر جاری رہا۔

آنکھ کھلی تو سحری کا وقت تھا اور گاڑی سہارنپور کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ گویا دیوبند اب صرف اٹھائیس میل دور رہ گیا تھا، لیکن اشتیاق و انتظار کی ناقابل بیان

www.freepdfpost.blogspot.com

کیفیت نے اس مسافت کو انتہائی صبر آزما بنا دیا۔

دیوبند کے ساتھ مجھ ناچیز کا تعلق بڑا گوناگوں قسم کا ہے۔ اگرچہ احقر کی جائے پیدائش دیوبند ہی ہے لیکن میری عمر صرف چھ سال کی تھی جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے تھے اس کے بعد تیرہ سال کی عمر میں ایک مرتبہ دیوبند جانا ہوا لیکن وہ بھی مسافر اور مہمان بن کر، اس لئے اپنے سابقہ وطن کی حیثیت سے دیوبند کا تصور احقر کی نظر میں ایک دھندلے خواب سے زیادہ نہیں، لیکن قدرت نے کسی انسان کی جائے پیدائش میں اس کے لئے جو کشش رکھی ہے اس کا حیرت انگیز مظاہرہ ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے۔ بظاہر ایک چھ سالہ بچے کو وطن اور وطن کی محبت کا کوئی شعور نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن یہ ایک طبعی بات ہے کہ آج تیس سال بعد بھی دیوبند کے نام سے دل میں محبت کی پھواریں پڑتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیوبند میں ابھی تک احقر کے ایسے عزیز و اقارب آباد ہے جن کی بے لوث محبت اور جن کا خلوص بذات خود ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوبند احقر کے لئے صرف ایک جائے پیدائش اور اعزہ و احباب کا شہر نہیں، بلکہ رشد و ہدایت کا وہ عظیم سرچشمہ ہے۔ جس کے فیض نے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود مجھ جیسے نہ جانے کتنے پیاسوں کو سیراب کیا ہے، یہ ان علماء محققین کا مرکز ہے جن کی خوشہ چینی کر کر کے مجھ جیسے طالب علم جی رہے ہیں یہ ان اولیاء اللہ کی سرزمین ہیں جنہوں نے نے اپنی پاکیزہ سیرتوں سے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کی اور دین و دنیا کی جو کوئی نعمت مجھ جیسے طالب علموں کے پاس ہے وہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے، یہ ان خدامت مجاہدین کی چھاؤنی ہے۔ جنہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر طاغوت کی ہر شکل اور باطل کے ہر روپ کے خلاف جہاد کیا اور اپنے خون پسینے سے برصغیر کے علاقے میں مسلمانوں کی عزت و آزادی کے چراغ روشن کئے اور مختصر یہ کہ ان نفوس قدسیہ کا دیار ہے جو اس آخری صدی میں دین کے مجدد ثابت ہوئے اور جنہوں نے قرآن و سنت کی علمی و عملی تفسیر اس آخری دور میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین آج بھی عمل کرنے والوں کے لئے سدا بہار ہے، ان نفوس قدسیہ

نے دیوبند کی سرزمین میں جو دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی ہے اور اس کی بنا پر اس چھوٹی سی بستی سے عقیدت و محبت کا جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ خون اور نسب کے ہر رشتے سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔

گاڑی سہانپور سے دیوبند کی طرف بڑھ رہی تھی اور دل میں جذبات و تصورات کا ایک تلاطم برپا تھا۔ ذہن میں ماضی کے بیشمار ورق تیزی سے الٹ رہے تھے اور نگاہوں کے سامنے یادوں کی ایک فلم چل رہی تھی، اپنے سابقہ وطن کو دیکھنے کا شوق، اعزہ و احباب سے ملنے کی آرزو اور سب سے بڑھ کر اکابر علمائے دیوبند کے مآثر کی زیارت کی تڑپ نہ جانے کتنے جذبات شوق کا رواں تھا جو ٹرین سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دیوبند کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ افق پر دور تک پھیلے ہوئے بجلی کے قمقمے نمودار ہوئے، دیوبند کے آس پاس چونکہ ایک ایسی جگمگ کرتی ہوئی کوئی آبادی نہیں ہے، وہاں سے پھیلنے والے عالمگیر معنوی نور کے بعد کبھی دیوبند کو نمود نمائش کی ظاہری چمک دمک کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لئے یقین ہو گیا کہ یہ اجلال صد سالہ کا وہ کیمپ ہوگا جو عارضی طور پر دیوبند کی بستی کے باہر قائم کیا گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں جب صبح صادق کا جھٹپٹا اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا تو ریل گاڑی اس کیمپ کے سامنے ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر رک گئی جس پر ''دارالعلوم ہالٹ'' لکھا ہوا تھا، یہ پلیٹ فارم ریلوے نے عارضی طور پر اجلاس میں آنے والے اسپیشل ٹرینوں کے لئے قائم کیا تھا کیونکہ اجلاس کا کیمپ یہاں سے شروع ہوتا تھا اور حد نظر تک چلا گیا تھا، ہم نے یہاں اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ دیوبند کا اصل اسٹیشن تقریباً تین میل دور تھا، فیصلہ یہ ہوا کہ تمام لوگ اسی اصل اسٹیشن پر جا کر اتریں گے، چنانچہ نماز کے بعد ٹرین پھر روانہ ہوئی، اور چند منٹ میں اس نے دیوبند پہنچا دیا۔

چوبیس سال کے بچھڑے ہوئے اعزہ سے ملاقات ہوئی بہت سی صورتیں ایسی تھیں کہ قریبی رشتہ داری کے باوجود ان کی زیارت پہلی بار ہو رہی تھی بہت سی صورتیں وہ تھی کہ مرور ایام کی وجہ سے انہیں پہچاننا مشکل تھا، غرض یہ دن دن عزیزوں اور دوستوں

www.freepdfpost.blogspot.com

سے ملاقات اور دیوبند کی گلیوں اور مکانات کے درمیان پرانی یادیں تازہ کرنے میں گزر اعم زادہ محترم جناب مولانا خورشید صاحب کے یہاں قیام ہوا جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں سے ہیں اور اجلاس صد سالہ کے ان آٹھ منتظمین میں سے ہیں جن کی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے برسر اجلاس خاص طور پر تحسین فرمائی۔ مہمانوں کے کیمپنگ، پنڈال، اسٹیج اور اسٹالوں کا انتہائی مشکل انتظام انہی کی شب وروز کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا، ان کا مکان بھی ہمارے آبائی محلے میں ہے اور اسی کے متصل وہ مکان بھی ہے جو کبھی ہمارا تھا۔

قیام گاہ سے نکل کر سب سے پہلے دارالعلوم کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ وہاں عید کا سماں تھا اور ہر لحاظ سے مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، سب سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، خیال تھا کہ اس وقت ان پر اتنے عظیم اجلاس کی ذمہ داری اور اس کے انتظامات کا زبردست بوجھ طاری ہوگا، لیکن دیکھا کہ حضرت مہتمم صاحب رحمتہ اللہ علیہ اپنی نشست پر انتہائی پرسکون انداز میں تشریف فرما ہیں۔ حسب معمول ایک دلآویز تبسم کے ساتھ ہر آنے والے کا خیر مقدم فرما رہے ہیں اور اس طرح مصروف گفتگو ہیں جیسے کوئی نئی بات نہیں۔ فرمانے لگے کہ دل یوں چاہتا ہے کہ جتنے حضرات باہر سے آئے ہیں ان میں سے ایک ایک کی قیام گاہ پر جا کر ان کا خیر مقدم کروں، لیکن دو تین روز سے بخار سا ہے۔ اس لئے معذور ہو گیا۔ احقر نے اجلاس کے انتظامات کی بات چھیڑی تو فرمایا کہ ”بھائی میں نے تو اپنے تمام رفقاء سے کہہ دیا ہے کہ جتنا انتظام آپ کے بس میں ہے وہ کر لیجئے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھئے، انشاء اللہ سارے کام ان کی طرف سے درست ہو جائیں گے“۔

دارالعلوم کا ایک ایک گوشہ ایک مستقل تاریخ ہے، احاطہ مولسری میں داخل ہوتے ہی ان مقدس شخصیتوں کے سانسوں کی مہک آج بھی فضا پر چھائی محسوس ہوتی ہے، مشرق میں وہ کنواں آج بھی علم کے پیاسوں کو سیراب کر رہا ہے جس کے بارے میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب جیسے ولی اللہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ یہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا

ہے۔ اس کے اردگرد تشنگان معرفت کا ہجوم ہے اور سرکار رحمتہ اللعالمین ﷺ ان کو اس کنویں سے سیراب فرما رہے ہیں۔ احاطے کے بیچوں بیچ مولسری کے وہ درخت ہیں جن کی پرکیف چھاؤں میں نہ جانے کتنے علماء واولیاء اسباق کے تکرار میں مصروف رہے۔ مغرب میں وہ دارالحدیث ہے جس نے اس صدی کے سب سے مایہ ناز محدثین پیدا کئے اور اس کے اوپر دارالتفسیر کا وہ پرشکوہ گنبد ہے جس میں گذشتہ صدی کے عظیم مفسر تیار ہوئے۔ احاطہ مولسری کی شمالی دیوار میں وہ کمرہ ہے جو مدتوں دارالافتاء کی حیثیت میں استعمال ہوا۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ سالہا سال تک یہیں فتاویٰ لکھتے رہے اور اس طرح یہاں سے ”فتاویٰ دارالعلوم“ کا وہ عظیم خزانہ تیار ہوا جس کا بمشکل بیسواں حصہ ابھی تک شائع ہو سکا ہے۔ غرض اس احاطے سے لے کر باب الظاہر تک یہاں کا چپہ چپہ اسی صدی کے بہترین انسانوں کی یادگار ہے اور اس کے ایک ایک کونے کی تاریخ پر مستقل کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ماضی کے تصورات کا ایک جہان دل میں لئے گھنٹوں اس ادارے کے مختلف حصوں میں گومتا رہا، ایک ایک یادگار کو دیکھ کر متنبی کا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے۔

بلیت بلی الا طلال ان لم اَقف بہا
وقوف شحیح ضاع فی الترب خاتمہ

عصر کے بعد چند رفقاء کے ہمراہ قبرستان کا رخ کیا، یہ قبر ”مقبرہ قاسمی“ کے نام سے موسوم ہے سب سے پہلے حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی، دارالعلوم انہی کا لگایا ہوا پودا ہے جس کے برگ وبار آج سارے عالم اسلام میں پھیل چکے ہیں۔ آج اس مزار پر دارالعلوم کے فیض یافتگان کا اتنا ہجوم تھا کہ شاید پہلے کبھی نہ ہو۔ انہی کے پائنانے میں دو قبریں سب سے ممتاز نظر آتی ہیں۔ ایک شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کی ہے جو دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب تھے اور پھر مدرس صدر مدرس شیخ الحدیث سبھی کچھ رہے اور دارالعلوم کی چٹائیوں پر بیٹھ کر ہی انہوں نے آزادی ہند کی وہ بین الاقوامی تحریک چلائی جو ”ریشمی رومال کی تحریک“

www.freepdfpost.blogspot.com

کے نام سے معروف ہے۔ دیکھنے میں مشت استخوان اور کفر و باطل کیلئے ناقابل تسخیر چٹان۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان

ساری عمر جہاد اور اس کی تیاری میں گذری جب وفات کا وقت آیا تو طبیعت پر آزردگی دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھے کہ شاید موت کی فکر ہے۔ لیکن پوچھا گیا تو جواب دیا کہ:۔

آرزو یہ تھی کہ کسی میدان کارزار میں موت آتی، سر کہیں ہوتا دھڑ کہیں، غم اس کا ہے کہ آج بستر پر مر رہا ہوں"۔ علم و فضل تقویٰ و طہارت جہد و عمل وللّٰہیت اور ایثار و قربانی کا یہ پیکر جمیل دارالعلوم دیوبند کی فصل کا پہلا پھل تھا، جو یہاں ایک کچی قبر کے نیچے آرام فرما ہے۔ انہی کے بالکل برابر شیخ السلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کا مزار ہے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ان جاں نثار رفقاء میں سے تھے۔ جنہوں نے اپنے شیخ کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی۔ اور ان کے مقصد زندگی کو پورا کرنے کیلئے جان کو جان نہیں سمجھا۔ احقر کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے تھے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب شیخ العرب والعجم بن چکے تھے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں نکاح کی کوئی تقریب تھی۔ اس موقع پر میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خود اپنے سر پر پانی کا مٹکا رکھ کر اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے گھر لے جا رہے تھے۔ انہوں نے جس طرح ساری عمر اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت و صحبت میں گذاری۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وفات کے بعد بھی اپنے شیخؒ کا پہلو نصیب فرمایا۔

ان حضرات کے آس پاس حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب قدس سرہ مفتی اعظم دارالعلوم، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب وقد سرہ مہتمم دارالعلوم شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ اور نا جانے علم و فضل کے کتنے پہاڑوں مدفون ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پائنتا نے ذرا مغرب کی طرف ہٹ کر احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہ کا مزار ہے۔ جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

صاحب تھانوی قدس سرہ کے ہم سبق اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اور ہر علم و فن میں اعلیٰ استعداد رکھنے کے باوجود ساری عمر دارالعلوم کے درجہ فارسی و ریاضی کے استاذ رہے اور دیوبند کا شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جہاں کئی کئی پشتوں نے ان سے نہ پڑھا ہو۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے "میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ" میں ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھ دئے ہیں۔

قبرستان کے شمال میں ذرا فاصلے پر حضرت حاجی عادل حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے جو دارالعلوم کے موسسین میں سے ہیں اور ولایت و تقویٰ کے اس مقام پر تھے جو معاصرہ اہل علم کے لئے بھی قابلِ رشک تھا۔

قبرستان کے شمال میں مغرب تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر دیوبند کی عیدگاہ ہے۔ اور اس کے جنوبی پہلو میں امام العصر حضرت سید انور شاہ صاحب کشمیر قدس سرہ کا مزار ہے۔ اس دعوے میں شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس صدی میں علم حدیث کے سب سے بڑے امام تھے۔ اس بات کا اعتراف صرف علماء ہند ہی نہیں عالم عرب کے محقق علما نے بھی کیا ہے، حافظے اور وسعت مطالعہ میں ان کی کوئی نظیر ماضی قریب میں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری اور تقریر ترمذی شائع ہو چکی ہیں لیکن جن حضرات نے براہ راست آپ کے درس میں شرکت کی ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ ان تقریروں میں حضرت شاہ صاحب کے انداز درس کی بمشکل 25 فیصد جھلک آ سکی ہے۔

غرض اس قبرستان کا ایک فرد ایسا ہے کہ اس تذکرے کے لئے مستقل کتابوں کی ضرورت ہے الحمد اللہ بہت سے بزرگوں کی سوانح شائع بھی ہو چکی ہیں، کاش! کوئی اللہ کا بندہ "مقبرہ قاسمی" کے نام سے ایک کتاب لکھے اس میں ان تمام بزرگوں کے مزارات کی نشاندہی بھی ہو اور ان کی نمایاں خصوصیات کا تذکرہ بھی۔

.....☆☆.....☆.....

مغرب کے بعد اس جگہ کا رخ کیا جہاں اگلے دن سے اجلاس صد سالہ شروع ہونے

www.freepdfpost.blogspot.com

والا تھا۔ دیو بند کے شہر میں کوئی ایسی جگہ فراہم ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ جہاں اتنا بڑا اجتماع منعقد ہو سکے چنانچہ جب ہم کراچی میں رہتے ہوئے یہ تصور کرتے تھے کہ دیو بند میں اتنا بڑا اجتماع کہاں اور کیسے منعقد ہوگا؟ تو تصور ہی سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی، لیکن آفرین ہے ان حضرات کی ہمت پر جنہوں نے دیو بند جیسی چھوٹی جگہ میں جس کی آبادی بمشکل ساٹھ ستر ہزار ہوگی اور جس کے تمام وسائل قصباتی انداز ہیں۔ اتنے بڑے اجتماع کا انتظام کیا۔ اس غرض کے لئے دارالعلوم نے عیدگاہ کے اس پار ایک طویل وعریض رقبے کے کھیت خالی کرائے تھے۔ اور پھر زمین کو اس طرح ہموار کر دیا تھا۔ جیسے یہ جگہ ہمیشہ سے جلسے منعقد کرنے ہی کیلئے بنائی گئی ہو۔ اس جلسہ گاہ کا مغربی سرا ریلوے لائن سے شروع ہوتا تھا۔ اور مشرقی کنارہ اس سے تقریباً دو ڈھائی میل دور باغات تک پہنچا ہوا تھا۔ شمال میں اس کی حد جی ٹی روڈ تھی اور جنوب میں عیدگاہ۔

اس جلسہ گاہ کے مشرقی حصے میں باہر سے آنے والے حضرات کی رہائش کے لئے کیمپ لگائے گئے تھے ہر علاقے کے مہمانوں کا الگ کیمپ تھا۔ اور ہر کیمپ پر اس علاقے کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھی۔ پانی فراہم کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین سو ہینڈ پمپ نصب کئے گئے تھے۔ شمالی حصے میں اشیاء خورد ونوش کے اسٹال تھے۔ مغرب میں جلسہ گاہ تھی۔ جس میں شامیانوں کے نیچے تین لاکھ افراد کے بیٹھنے کا انتظام تھا اور اتنی ہی جگہ شامیانوں کے باہر کھلے میدانوں کے طور پر رکھی گئی تھی اور اس کے پیچھے اقامتی کیمپ تھے۔ جلسہ گاہ کے مغرب کے سرے انتہائی پرشکوہ اسٹیج پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا جو تین سو فیٹ لمبا تقریباً ڈیڑھ سو فیٹ چوڑا اور دس فیٹ اونچا تھا۔ اسٹیج پر خصوصی مہمانوں کے لئے صوفوں اور کرسیوں کا انتظام تھا۔ اور اجتماع کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ شامیانوں کے مشرقی سرے پر کھڑے ہو کر اتنے وسیع وعریض اسٹیج پر بیٹھے ہوئے آدمی صاف نظر آ رہے تھے۔۔۔ شامیانوں کے بیچ میں بانسوں کے ستون اتنے توازن کے ساتھ بالکل سیدھے لگائے گئے تھے کہ کم از کم میں نے اس سے پہلے بانسوں میں اتنا توازن نہیں دیکھا شامیانوں کے درمیان اسٹیج تک پہنچنے کے لئے پانچ کشادہ راستے رکھے گئے تھے جن

میں دو رویہ آمد ورفت ہو سکے۔ لیکن جلسے کے دوران یہ تمام راستے بھی آدمیوں سے اس طرح پٹے ہوئے تھے کہ گذارنا تو کجا تل دھرنا محال تھا۔

جمعہ کی نماز اسی پنڈال میں ہونی تھی اور جمعہ کے بعد افتتاح اجلاس کا آغاز ہونے والا تھا ہم لوگ جمعہ سے پہلے جب پنڈال کی طرف آئے تو انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زمین میں سے آدمی ابل رہے ہیں اور جی ٹی روڈ پر جو پنڈال کے شمال میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی بسوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ تھا جن کی چھتوں پر آدمی چڑھے ہوئے تھے۔ ادھر ریلوے اسٹیشن پر ہندوستان کے اطراف سے اسپیشل ٹرینیں ہر گھنٹے پہنچ رہی تھی۔ منٰی اور عرفات کے بعد ایسا پرشکوہ نظارہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ نمازِ جمعہ کی امامت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم نے فرمائی وہ اسٹیج پر تھے۔ اور ہمیں رہائشی کیمپوں کے قریب جگہ ملی۔ جبکہ ہمارے پیچھے بھی حد نظر تک آدمی ہی آدمی تھے۔

نماز کے بعد ہم نہ جانے کس طرح اسٹیج پر پہنچے تو جلسے کا آغاز ہو رہا تھا۔ اسٹیج سے نظر دوڑا کر دیکھا تو حد نگاہ تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ اور پورا پنڈال اس طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ سرکنا محال تھا۔ درمیانی راستوں پر بھی آدمی اس طرح کھڑے تھے کہ نہ آگے جانے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی اور بیٹھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ احقر کی عمر تو تھوڑی ہی سی ہے بڑے بڑے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ حضرات کا کہنا یہ تھا کہ عمر میں کبھی کسی جلسے کا ایسا اجتماع نہیں دیکھا۔

جلسے کا افتتاح عالم اسلام کے مشہور قاری شیخ عبدالباسط عبدالصمد کی تلاوت سے ہوا اور اس کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی نے اپنے افتتاحی خطبے میں دارالعلوم کے مقصد اس کی تاریخ اور صد سالہ کارناموں پر روشنی ڈالی۔

اس جلسے میں اندرا گاندھی (وزیر اعظم ہندوستان) کی شرکت بلاشبہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا لیکن اول تو یہ خبر انتہائی غلط اور شر انگیز ہے کہ اجلاس کا افتتاح ان سے کرایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک عام مقرر کی حیثیت سے جلسے میں خود شریک ہوئیں ان کی

www.freepdfpost.blogspot.com

شرکت دارالعلوم کے منتظمین کی خواہش پر نہیں بلکہ خود ان کے اصرار پر ہوئی۔ دارالعلوم نے کسی بھی سربراہ مملکت کو اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی لیکن شاید اتنے عظیم اجتماع سے اپنی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے اندرا گاندھی صاحبہ نے اصرار کیا کہ وہ خود اس جلسے میں شریک ہوں گی اور ان کے اصرار کو قوت کے ساتھ رد نہ کرنے پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کو بالکلیہ پاکستان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال! اجلسے میں ایک غیر مسلم عورت کی تقریر خواہ اس کے اسباب اضطراری ہی کیوں نہ ہوں ایک افسوس ناک واقعہ ضرور ہے جس نے اس مقدس اجتماع کے انوار و برکات اور اس کی پاکیزہ فضا میں تکدر پیدا کر دیا۔ اور عجیب نہیں کہ یہ اسی افسوس ناک واقعہ کی بے برکتی ہو کہ اجلاس کی جس نشست میں انہوں نے شرکت کی اس میں مجمع کا ایک حصہ بیشتر اوقات قابو سے باہر رہا اور ساری نشست میں اس حصے کی ابتری اتنی نمایاں رہی کہ تقاریر کا سننا مشکل ہو گیا۔

اس ایک افسوسناک پہلو سے قطع نظر اس نشست کے بعد تمام اجلاس بفضل تعالیٰ نہایت کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے مسلسل تین دن تک جاری رہنے والے اجلاس میں حاضرین کا اتنی استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ بیٹھے رہنا کسی بھی نشست میں پنڈال کے اندر کوئی ادنیٰ خلا نظر نہ آئے۔ جلسوں کی تاریخ میں ایک انوکھا اور بے نظیر واقعہ ہے ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پنڈال میں پنکھوں اور پانی پلانے کا انتظام ناممکن تھا لیکن دن کے وقت لیکن دن کے وقت شدید حبس کے باوجود جس استقلال کے ساتھ جمع رہا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس اجتماع کے موقعہ پر دیوبند میں برصغیر کے مایہ ناز علماء صلحاء اور بزرگ موجود تھے، بلکہ عالم عرب کے بھی ممتاز اہل علم وقلم اور پوری دنیائے اسلام کی سفارتی نمائندے بھی شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ تین روز کے اجلاس میں تمام حضرات کی تقریر اور بیانات ممکن نہیں تھے جبکہ اسی اجلاس میں دس ہزار سے زائد فضلاء دارالعلوم کی دستار بندی بھی ہونی تھی۔ لیکن اجلاس کے دوران ان میں سے بیشتر حضرات کے خطبات اور ان کی

تقاریر اور مواعظ سے حاضرین مستفید ہوتے رہے اور جن حضرات کی تقاریر یادگار افادیت کی حامل تھیں ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہم العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم العالی کی تقریریں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس اجلاس کا اصل مقصد فضلاء دارالعلوم کی دستار بندی تھا اور چونکہ یہ جلسہ دستار بندی تقریباً ستر سال سے منعقد ہو رہا تھا۔ اس لئے اس دوران فارغ التحصیل ہونے والے علماء کی ایک بڑی تعداد تو دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ جو حضرات بقید حیات تھے اور دیوبند تک پہنچ سکے تھے ان کی تعداد بھی تقریباً دس ہزار تھی اور اگر عام معمول کے مطابق سب کی باقاعدہ دستار بندی کی جاتی تو اس تین روزہ اجلاس کا ہر پروگرام منسوخ کرنے کے باوجود شاید سب کا حق ادا نہ ہو سکتا اس لئے کیا یہ گیا کہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش سے جو فضلاء دارالعلوم یہاں تشریف لا سکے ان میں سے ایسے حضرات دستار بندی کے لئے منتخب کئے گئے جن کا علمی و عملی مقام مسلم الثبوت ہے ان کی دستار بندی کی گئی اور باقی حضرات کو دستی طور پر دستاریں تقسیم کی گئیں۔

دستار بندی کا منظر بھی نہایت عجیب وغریب اور اثر انگیز منظر تھا۔ جن حضرات کی دستار بندی ہوئی ان میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کے نواسے جناب بھائی جی سعید صاحب بھی شامل تھے۔ جو اس وقت دارالعلوم کی بزرگ ترین ہستی ہیں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کو دستار بھی انہوں نے ہی عنایت فرمائی اس کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم نے مدینے طیبہ سے چار خصوصی دستاریں ارسال فرمائی تھیں جن میں سے ایک حضرت مہتمم صاحب مدظلہم کے لئے ایک مولانا محمد سالم صاحب مدظلہم کے لئے مولانا اسعد مدنی صاحب مدظلہم کے لئے اور چوتھی غالباً حضرت بھائی جی سعید صاحب مدظلہم کے لئے تھی۔

اجلاس کے اختتام پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب مدظلہم کی تحریک پر کچھ قرار داد بھی منظور کی گئیں۔ جن میں نمایاں ترین قرار داد افغانستان میں روسی جارحیت

www.freepdfpost.blogspot.com

کے خلاف اور مجاہدین افغانستان کی حمایت میں تھی۔ ہندوستان میں منعقد ہونے والے ایک اجتماع کی طرف سے یہ قرار داد نہایت اہمیت کی حامل اور جرأت مندانہ قرار داد تھی۔ قرار دادوں کے بعد اتوار 23 مارچ کو دوپہر ایک بجے کے قریب حضرت مہتمم صاحب مدظلہم نے دعا پر اس یادگار اور تاریخی اجلاس کا اختتام فرمایا۔

جلسے دنیا میں بہت ہوتے ہیں لیکن جس ذوق وشوق والہیت اور لگن کے ساتھ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد نے اجلاس میں شرکت کی وہ یقیناً برصغیر کی تاریخ کا ایک منفرد واقعہ ہے ایسے ایسے معذور لوگ جو چند قدم بھی دوسری کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتے نہ جانے کتنی مشقتیں اٹھا کر اجلاس میں پہنچے اور شروع سے آخر تک اس میں شریک رہے۔ دیو بند کے عام باشندوں نے بھی اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیں بعض محلوں نے اجلاس میں آنے والے مہمانوں کے لئے دسترخوان عام بچھا رکھا تھا۔ کہ مہمان وہاں آ کر کھانے میں شریک ہوتے رہیں۔

اتنے بڑے مجمع کا ٹھیک ٹھاک اندازہ تو مشکل ہے اس میں مبالغہ آمیزیاں بھی ہوتی ہیں لیکن احقر کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ اس اجتماع کے حاضرین کی تعداد پندرہ سے بیس لاکھ تک ضرور ہوگی۔ دیو بند جیسا چھوٹا قصبہ جس کی آبادی بامشکل ساٹھ ستر ہزار ہوگی اس پر پندرہ بیس لاکھ افراد بیک وقت پہنچ جائے تو خوراک اور پانی کا قحط پڑ جانے، وبائیں پھوٹ پڑنے، گندگی اور تعفن پھیل جانے کا قومی اندیشہ ہوسکتا تھا لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کا اور اکابر دیو بند کی دعاؤں کی برکت تھی کہ اتنے بڑے مجمع میں کسی فرد واحد کو کھانا یا پانی نہ ملنے کی شکایت نہیں ہوئی۔ نہ کسی گندگی یا تعفن کا کسی کو احساس ہوا نہ کوئی لڑائی جھگڑا پیش آیا اور نہ کوئی قابل ذکر حادثہ رونما ہوا۔ یہ اتنا بڑا مجمع تین روز کے بعد بحمد اللہ پوری خیر وعافیت اور صبر وسکون کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

برصغیر کے باشندے تو پھر بھی بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعات کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن عرب ممالک میں اس قسم کے جلسوں اور اجتماعات کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ اس لئے خاص طور پر سے عرب مہمان اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر حیران وششدر تھے، متعدد حضرات نے

بڑے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ منیٰ اور عرفات کے علاوہ اتنا بڑا اجتماع ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دیو بند کی سرزمین پر اسلام اور مسلمانوں کی شوکت کا ایسا امظاہر فرمایا جسے دیکھ کر غیر مسلم بھی دنگ تھے۔ اور خاص طور پر ہندوستان کے حالات کے پیش نظر یہ اجتماع انشاء اللہ مسلمانوں کے لئے بغایت مفید اور حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔

اجلاس صد سالہ کے دوران دارالعلوم کے دارالحدیث میں ایک خصوصی مجلس مذاکرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مجلس مذاکرہ کا موضوع نہایت اہم اور نازک تھا یعنی دینی مدارس اور عہد حاضر میں ان کی ذمہ داریاں اسی میں دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا مسئلہ بھی زیر بحث آنا تھا دوسری نشست رکھی گئی تھی۔ پہلی نشست کے صدر مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے اور دوسری نشست عالم اسلام کے ممتاز عالم ومفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم کے زیر صدارت تھی۔ اس دوسری نشست میں پاکستان میں احقر اور برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب (مدیر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک) نے بھی دینی مدارس کے نصاب ونظام سے متعلق اپنے مقالے پیش کئے۔ مذاکرات کا موضوع اگرچہ نہایت اہم تھا۔ لیکن اجلاس کی صدر سالہ کے لئے اتنے عظیم اجتماع کی وجہ سے دینی مدارس کے اکابر اس میں بہت کم شریک ہوسکے۔ اور بڑے اجلاس کی ناگریز مصروفیات کی بناء پر اس مذاکرے کو اتنا وقت اور اتنی توجہ فراہم نہ ہوسکی کہ جس کا وہ مستحق تھا تاہم اس میں بعض نہایت گرانقدر مقالے بھی پیش ہوئے۔ جن میں سے اس وقت برادر محترم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کا مقالہ اس لئے بطور خاص یاد رکھا گیا کہ اس نے ناچیز کو کافی متاثر کیا۔ مذاکرے کے آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے جو تقریر فرمائی وہ بلا شبہ اس مذاکرے کا حاصل تھی اور اسے مولانا مدظلہم کے علم وبصیرت کا شاہکار کہنا چاہئے۔

اس اجلاس کا ایک اور عظیم فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے وہ خدام دین جو دور دور سے ایک دوسرے کے بارے میں سنتے پڑھتے رہتے تھے لیکن ان کے درمیان ملاقات کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ اس مبارک اجتماع کی بدولت ان کو ایک دوسرے

www.freepdfpost.blogspot.com

سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور وہ باہم قریب آئے۔

احقر نے گذشتہ ماہ کے اداریے میں بھی لکھا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر میلوں ٹھیلوں اور جشنوں کے کبھی قائل نہیں رہے انہوں نے ہمیشہ للّٰہیت کے ساتھ دین کی خدمت انجام دی ہے اور نام نمود سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے یہ اجلاس صد سالہ بھی کوئی جشن یا میلا نہیں تھا۔ اس کو ''جشن صد سالہ'' کا عنوان دینا بھی غلط ہے کیونکہ دارالعلوم کی طرف سے اس کا نام ''جشن صد سالہ'' نہیں بلکہ ''اجلاس صد سالہ'' مقرر کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں دارالعلوم کی طرف سے جو لیٹریچر شائع کیا گیا اس میں اسے ''اجلاس صد سالہ'' ہی کہا گیا ہے ''جشن صد سالہ'' کا لفظ چھوڑ کر ''اجلاس صد سالہ'' کا لفظ اختیار کرنا محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا اقدام ہے تاکہ اسے عام جشنوں کی طرح کوئی جشن نہ سمجھا جائے بلکہ درحقیقت یہ ایک جلسہ دستار بندی تھا جو تقریباً سو سال کے بعد منعقد ہوا اس لئے اس نے اسے عظیم اجتماع کی صورت اختیار کر لی اور کوئی شک نہیں کہ اس اجتماع کے ذریعے مسلمانوں کی جو شوکت ظاہر ہوئی، دارالعلوم دیوبند کے جن مآثر کو لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور اکابرین دیوبند کے جو ایمان افروز تذکرے سننے آئے اور ان سے جو نئے حوصلے دلوں میں پیدا ہوئے وہ اس اجتماع کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

لیکن جو حضرات اکابرین علمائے دیوبند سے وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کا کام اس اجتماع کے ان فوائد پر فخر مسرت کا اظہار کر کے ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہے جن اکابر کے نام پر ہم ایسا فقید المثال اجتماع کرنے کے قابل ہوئے ان کا مشن کیا تھا؟ ان کی زندگیاں کیسی تھی؟ انہوں نے قرآن وسنت کے پیغام کو محفوظ رکھنے اور دنیا کی آخری حدود تک پہنچانے کیلئے کیا قربانیاں پیش کیں؟؟ آج ہم ان بزرگوں کی قائم کی ہوئی عملی سطح سے کتنی دور نکل آئے ہیں؟ ہمارے درمیان عملی اور عملی انحطاط کس تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے؟؟ اور ہم کس طرح اس انحطاط کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اجتماع کے بعد نئے حوصلوں اور نئی امنگوں کے ساتھ ہمیں یہ عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے بزرگوں کے

نقشِ قدم کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھے گے۔ انہوں نے ہمیں فکر وعمل کو جو راہ دکھائی تھی اس پر ثابت قدم رہے گے اور اپنی زندگیوں کو ان زندگیوں کو ان کے قائم کئے ہوئے نمونوں کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کریں گے۔

دارالعلوم دیوبند کسی متعصب فرقے کا نام نہیں، ہے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے، نہ کوئی ایسا گروہ یا جتھہ ہے جو حق وناحق میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کیلئے قائم کیا گیا ہو اور نہ کوئی بحث ومناظرہ کی کوئی ٹیم ہے جو صرف کسی خاص فرقے کی تردید کے لئے معرض وجود میں آئی ہو۔ بلکہ درحقیقت دارالعلوم دیوبند قرآن وسنت کی اس تعبیر کا نام ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ تابعین عظام اور اسلاف امت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ اس علم صحیح کا نام ہے جو بزرگان دین نے پیٹ پر پتھر باندھ کر ہم تک پہنچایا ہے۔ یہ سیرت وکردار کی اس خوشبوں کا نام ہے جو صحابہ وتابعین کی سیرتوں سے پھوٹی ہے۔ یہ اس عہد وعمل کا نام ہے جس کا سہرا بدر واحد کے میدانوں تک پہنچتا ہے۔ یہ اس اخلاص وللّٰہیت تواضع وسادگی تقوی وطہارت اور حق گوئی وبے باقی کا نام ہے جو تاریخ اسلام کے ہر دور میں علمائے حق کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ پچھلی صدی میں دارالعلوم دیوبند کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمان کے دور انحطاط میں ان علمی وعملی اوصاف کو زندہ کیا۔ اور ایسے انسان پیدا کئے جو ان اوصاف کے جیتے جاگتے پیکر تھے۔ لہٰذا جو شخص ان اوصاف سے متصف ہے جسے ان خطوط پر پہلے اپنی اور پھر ساری امت کی اصلاح کی فکر ہے وہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے۔ خواہ ظاہری طور پر اس نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا بھی نہ ہو اور جو شخص ان اوصاف سے بے فکر اور اس مشن سے بے پروہ ہے اس کا دارالعلوم دیوبند سے کوئی تعلق نہیں، خواہ ظاہری طور سے اس کے پاس دارالعوم کی سند اور دستار کیوں نہ موجود ہو۔

آج ہمیں اس معیار پر اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ دارالعلوم دیوبند سے ہماری وابستگی کتنے فیصد باقی رہ گئی ہے؟ اور اگر اس سوال کا حقیقت پسندانہ جواب ہمارے دل میں کوئی ندامت پیدا کر سکے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے حقیقی وابستگی پیدا کرنے کے لئے تدبیر کیا ہو؟ خدا کرے کہ اس اجتماع کا یہ فائدہ ہم حاصل کر سکیں کہ یہ فکر ہم میں

www.freepdfpost.blogspot.com

سے ہر شخص کے دل کا انمٹ درد بن کر رہ جائے۔ ایسا درد جو مردہ دلوں کو نئی زندگی بخشے اور زوال پذیر ماحول میں نشاۃِ ثانیہ کی روح پھونکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آمین ثمامین۔

.....☆.....☆.....☆.....

اجلاس صد سالہ کے بعد ہندوستان کے دوسرے مختلف علاقوں میں بھی جانا ہوا۔ جن میں تھانہ بھون، گنگوہ، نانوتہ، جلال آباد، دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور الہٰ آباد شامل ہیں، ان سفروں کے بعض حالات بھی قابل ذکر ہیں۔

.....☆.....☆.....☆.....

(۲)

ذاتی طور پر اس سفر کا ایک مقصد احقر کی نظر میں یہ بھی تھا کہ ہمارے جو دوسرے علمی و دینی مراکز ہندوستان میں رہ گئے ہیں بقدر امکان ان کی زیارت اور وہاں کے اہل علم وصلاح کی ملاقات سے مستفید ہوں۔ اور تین ہفتے میں یہ مقصد جس حد تک پورا ہوسکتا تھا، بحمد اللہ وہ پورا ہوا۔

دیوبند میں احقر کا قیام گیارہ دن رہا لیکن یہ گیارہ دن گیارہ لمحوں کی طرح گذر گئے۔ دیوبند کے حضرات سے ملاقاتیں بذات خود مستقل وقت چاہتی تھیں۔ لیکن اجلاس کی وجہ سے وہاں نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام کے اہل علم وفکر اور اہل صلاح وتقویٰ موجود تھے اور ان سبھی سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ چنانچہ یہ ایام اسی لذیذ مصروفیت میں گذر گئے اور واقعہ یہ ہے کہ ان ایام کے قیمتی لمحات کو تول تول کر خرچ کرنے کے باوجود بہت سے حضرات سے ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ بہت سوں سے تو نہایت سرسری انداز میں ملنا ہوا اور اطمنان سے ملنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔

احقر کے برادرزادے (جو عمر میں سے بڑے ہیں) مولانا شاہد حسین صاحب دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اہل دیوبند سے اجتماعی ملاقات کا یہ حیلہ کیا کہ ایک روز

جامع مسجد دیوبند میں تنظیم ابنائے دارالعلوم کی طرف سے عشاء کے بعد ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور اس میں احقر کی تقریر رکھ دی۔ اگرچہ سہ روزہ اجلاس صد سالہ کے بعد پورا دیوبند تھکا ہوا تھا لیکن احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں کو عقیدت ومحبت کا جو غیر معمولی تعلق تھا وہ انہیں اس روز بھی کھینچ لایا اور اچھا خاصہ اجتماع ہوگیا۔ پاکستان سے برادر مکرم مولانا سعید الرحمان علوی (مدیر خدام الدین) اور بنگلہ دیش سے حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب مدظلہم نے بھی اجتماع سے مؤثر خطاب فرمایا۔ احقر کو اس جامع مسجد میں زبان کھولتے ہوئے سخت تردد تھا۔ جس جگہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر خطاب فرماتے رہے ہوں وہاں اس احقر کے لئے لب کشائی ایک آزمائش سے کم نہ تھی۔ لیکن انہی بزرگوں کے فیض نے چند کلمات عرض کرنے کی توفیق بخشی۔ سورۂ قریش کے حوالے سے احقر نے عرض کیا کہ قریش مکّہ کو کعبۃ اللہ کی مجاورت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اعزاز فرمایا تھا کہ پورا جزیرۂ عرب ان کا احترام کرتا تھا اور جس ماحول میں قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ وہاں قریش مکّہ کو چور ڈاکو بھی کچھ نہ کہتے تھے۔ سارا عرب سفر کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ لیکن قریش مکّہ اطمینان کے ساتھ شام، یمن کا سفر کرتے اور انہی تجارتی سفروں سے ان کے معاش کا بندوبست ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ قریش میں اہل مکّہ اپنے اس انعام کی طرف توجہ دلا کر ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا یہ امن وسکون اور تمہاری یہ معاشی خوشحالی صرف بیت اللہ کی رہینِ منّت ہے۔ اس لئے تم پر اس بیت اللہ کی تعظیم اور اس کے پروردگار کی عبادت دوسروں سے زیادہ واجب ہے۔ اس سورت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسانوں کے جس گروہ کو دنیا میں جس دینی خصوصیت کی بنا پر کوئی عزت ووقعت حاصل ہوئی ہو اس پر دین کی پابندی دوسروں سے زیادہ فرض ہوجاتی ہے۔ اس قرآنی تعلیم کے حوالے سے احقر نے عرض کیا کہ، آج بحمد اللہ دیوبند کی بستی چار دانگ عالم میں مشہور معروف ہے۔ اس کا نام عزت وحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے باشندوں کو لوگ محبت ووقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اجلاس صد سالہ کے موقع پر اطراف زمین سے لوگوں نے جس طرح جوق در جوق اس بستی کا رخ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

مسلمانوں کے دلوں میں اس خطۂ ارض کی کیا قدر و قیمت ہے؟ سوال یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں اس بستی کی دھوم کیوں مچی ہوئی ہے؟ ان تنگ و تاریک گلیوں، کچے پکے مکانوں، شکستہ سڑکوں اور بے ترتیب بازوروں میں کونسی کشش ہے جو لاکھوں انسانوں کو یہاں کھینچ لائی ہے؟ ظاہر ہے کہ دیوبند کی یہ شہرت و عظمت صرف اور صرف اس عظیم درس گاہ کی رہین منت ہے جس نے اس پسماندہ بستی میں علم دین کی شمعیں روشن کر کے اسے ایک مینارۂ نور بنا دیا۔ یہ ہر دلعزیز صرف ان بزرگوں کا صدقہ ہے جنہوں نے اس بستی میں بیٹھ کر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کی اور اس چودہویں صدیں میں تجدید و احیائے دین کا فریضہ انجام دیا۔

لہٰذا ہم لوگوں کو جو دیوبند سے کسی بھی حیثیت سے وابستہ ہیں، یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہماری دینی اور دنیوی ترقی کا راز صرف ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے میں ہے اور اگر ہم ان بزرگوں کے طریقے کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار کرینگے تو وہ ہمیں ہلاکت کی طرف لے جائے گی۔

اس موضوع پر تقریباً 45 منٹ احقر نے اپنی گذارشات پیش کیں۔ امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ نے صاحبزادۂ گرامی جناب مولانا انظر شاہ صاحب مدظلہم دارالعلوم کے طبقہ عُلیا کے اساتذہ میں سے ہیں۔ آج کل دارالعلوم میں بخاری شریف کا درس ان سے متعلق ہے اور اس طرح وہ اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہوں نے محبت و شفقت کی انتہا کر دی کہ اس مجلس میں وہ بھی تشریف لائے۔ ابھی احقر نے اپنی گذارشات شروع ہی کی تھیں کہ وہ تشریف لاتے نظر آئے اور تقریر کے دوران تشریف فرما رہے۔ چنانچہ آخر میں ان سے درخواست کی گئی تو انہوں نے بڑا مؤثر خطاب فرمایا۔

دیوبند آنے کے بعد بڑا اشتیاق اس بات کا تھا کہ مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہ (جو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں) کے مکان پر حاضری ہو۔ اگرچہ حضرت میاں صاحب قدس سرہ کا زمانہ احقر کی یاد سے پہلے کا ہے لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بعد اپنے اساتذہ اور بزرگوں میں شاید سب سے زیادہ تعلق انہی سے تھا۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو جس میں والد صاحب

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف نہ لے جاتے ہوں۔ چنانچہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے واقعات ہم نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے بھی ان کی زیارت کی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حاجی بلال صاحب مدظلہم آج کل حضرت ہی کے مردانہ مکان میں مقیم ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، انہوں نے اس مکان کو اس طرح جوں کا توں رکھا ہوا ہے جس طرح حضرت کے زمانے میں تھا۔ حضرت حاجی بلال صاحب مدظلہم اگرچہ علیل اور صاحب فراموش تھے لیکن نہایت محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا۔ ان کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر ایسا لگتا تھا جیسے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی خدمت میں حاضر ہیں اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہوئے واقعات (جن کا کچھ حصہ بھائی جان مرحوم کے قلم سے بارہا البلاغ میں آ چکا ہے) ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔

حضرت میاں صاحب قدس سرہ نے اپنی حیات میں اپنے مکان کی قریبی مسجد میں ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی، جو اب ماشاء اللہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ اور مدرسہ اصغریہ کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت حاجی بلال صاحب کے صاحبزادے مہتمم سید خلیل میاں صاحب مدظلہم اس مدرسے کے منتظم ہیں۔ اس مدرسے میں قرآن کریم اور ابتدائی اردو دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور کبھی درس نظامی کی ابتدائی کتب بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ مولانا خلیل میاں صاحب نے اصرار کر کے ایک روز عشاء کے بعد کھانے پر مدعو فرمایا۔ یہ نشست بھی بڑی پر کیف رہی۔۔۔ احقر دو روز بعد تھانہ بھون اور نانوتہ اور گنگوہ جانا چاہتا تھا۔ مولانا نے اس سفر کے لئے اپنی جیپ فراہم کر کے سفر کی بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ چنانچہ دو روز بعد انہی کی جیپ میں یہ سفر ہوا۔

احقر کے لئے ایک ماہ کے اس سفر کا حاصل درحقیقت وہ دن تھا جب دیوبند سے تھانہ بھون کے لئے روانگی ہوئی۔ دل کی خواہش تو یہ تھی کہ نانوتہ، بھون اور گنگوہ میں ہر جگہ کئی کئی روز گذارے جاتے۔ لیکن مدت قیام کم تھی اس لئے ایک ہی دن میں تینوں مقامات پر حاضری دینی تھی اور اس سفر کی سب سے پہلی منزل نانوتہ تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نانوتہ دیوبند سے مغرب میں ۱۶ میل اور سہارنپور سے جنوب میں ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنی زرعی پیداوار اور دور دور تک پھیلے ہوئے باغات اور کھیتوں کی بنا پر تو زرخیز ہے ہی، لیکن یہاں سے علم و فضل اور طہارت تقویٰ کے جو آفتاب نمودار ہوئے ان کے اعتبار سے مردم خیز بھی ہے۔

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو علمی اعتبار سے تمام علمائے دیوبند کے جدّ امجد ہیں، اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاگرد خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے پیدائش بھی یہی ہے اور ان کے علاوہ مظاہرہ العلوم سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد منیر نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ سب اسی قصبے کے باشندے تھے۔

ہم نانوتہ پہنچ کر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مزار بستی سے کچھ دور شمال میں سہارن پور جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ ایک سرسبز شاداب باغ کے کنارے چھوٹی سی چار دیواری ہے جس میں چند کچی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں مغربی جانب میں سب سے پہلی قبر حضرت مولانا قدس سرہ ہی کی ہے۔ مزار مبارک پر حاضری ہوئی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے خاص استاذ ہر علم و فن میں اعلیٰ درجے کے فضل و کمال کے ساتھ ساتھ انتہائی سادہ، متواضع اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ حضرت تھانوی کے موعظ و ملفوظات آپ کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا انور الحسن صاحب شیرکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی سوانح حیات ''سیرت یعقوب و مملوک'' کے نام سے مرتب فرمادی ہے جو مکتبۂ دارالعلوم سے شائع ہو چکی ہے۔

اس وقت آپ کا وہ واقعہ یاد آیا جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بار ہا سنا تھا اور ''سیرت یعقوب و مملوک'' میں بھی نظر سے نہیں گذرا۔ حضرت مولانا چونکہ دارالعلوم دیوبند

کے استاذ ہونے کے علاوہ شیخ طریقت اور مرجع خلائق بھی تھے۔ اس لئے آپ کے پاس عام لوگوں کی آمد رفت بہت رہتی تھی۔ اس وجہ سے بعض اوقات درس گاہ میں پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا محمد رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے۔ انہوں نے یہ دیکھا تو دارالعلوم کے سرپرست قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ سے شکایت کی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے پہلے تو حضرت مولانا محمد یعقوب کو سمجھایا کہ۔

''مولانا یہ نہ سمجھئے کہ آپ خدمت خلق میں مصروف رہنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ جن لوگوں کی آپ خدمت کرتے ہیں وہ تو مقامی ہیں۔ لیکن یہ طلباء جو دور دراز سے تحصیل علم کے لئے آئے ہیں ان کا وقت خراب ہوگا تو آخرت میں آپ سے ان کی باز پرس ہوگی'' حضرت مولانا نے سن کر سر جھکا دیا۔ لیکن اس کے بعد آپ نے حضرت مہتمم صاحب کو بلا کر فرمایا۔

> ''میں نے مولوی محمد یعقوب صاحب کو پابندی وقت کے لئے کہہ تو دیا ہے۔ لیکن اگر آئندہ کبھی ان سے اس قسم کی شکایت پیش آئی تو آپ اس کی زیادہ فکر نہ کریں، کیونکہ خدا کی قسم! مولوی محمد یعقوب صاحب کا مقام یہ ہے کہ اگر وہ مدرسے میں ایک بھی سبق نہ پڑھائیں اور دن میں مدرسے کا صرف ایک ہی چکر لگا جایا کریں تب بھی مدرسے کے لئے کافی ہے اور ان کی تنخواہ کی قیمت وصول ہے''۔

آپ کی وفات کا یہ واقعہ بھی حضرت والد صاحب ہی سے سنا تھا اور آپ کی مطبوعہ سوانح میں موجود نہیں ہے کہ دیوبند کے اطراف میں ہیضے کی وباء کا آغاز ہو رہا تھا حضرت مولانا کو اس بارے میں کوئی کشف ہوا ہوگا۔ آپ نے دیوبند میں یہ اعلان کرایا کہ:۔

> ''ہیضے کی شدید وباء گھر گھر پھیلنے والی ہے لوگوں کو چاہئے کہ وہ کثرت سے صدقہ و خیرات دیں اور اپنی مملوکات میں سے ہر چیز سے صدقہ نکالیں۔ روپیہ میں سے روپیہ، غلے میں سے غلہ، کپڑے میں سے کپڑا، شاید اللہ تعالیٰ ان صدقات کی برکت سے اس بلا کو روک دیں''۔

www.freepdfpost.blogspot.com

لیکن دیو بند کے بعض شیخ زادوں نے سنا تو انہوں نے اس پر توجہ دینے کے بجائے استہزا کا انداز ہ اختیار کیا اور کہنے لگے کہ:۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے میں چندے کی کمی ہوگئی ہے جسے پورا کرنے کے لئے مولوی صاحب یہ اعلان کر رہے ہیں'' حضرت کو یہ جملہ پہنچا تو جوش میں آ کر فرمایا۔

''اچھا تو اب وبا آ کر رہے گی اور ایک ایک گھر سے کئی کئی جنازے اٹھیں گے''۔

حاضرین میں سے کسی نے کہا ''حضرت! آپ بھی تو یہی مقیم ہیں''۔ فرمایا:۔

''ہاں! یعقوب اور یعقوب کی اولاد بھی اسی وبا میں جائے گی''۔ چنانچہ وہ شدیدی وبا آئی اور حضرت مولانا کی وفات بھی اسی وبا کے دوران ہوئی ۔ پھر یہ بھی مشہور ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی قبر کی مٹی کو اس وبا کے مریضوں کے لئے سامان شفا بنا دیا، جس گھر میں کسی کو ہیضہ ہوتا۔ مولانا کی قبر سے کچھ مٹی اٹھا کر لے جاتا اور اس کے استعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ مریض کو شفا بخش دیتے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے بازو میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک ہے۔ آپ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے رشتے کے بھائی تھے۔ اور جہاد شاملی میں آپ کے دست بازوں رہے ہیں ۱۳۱۱ھ سے ۱۳۱۳ھ تک آپ دارالعلوم دیو بند کے مہتمم بھی رہے ہیں۔ نہایت باخدا اور صاحب دیانت وتقویٰ بزرگ تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے ''ارواح ثلاثہ'' میں انہی کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مدرسے کے ڈائی سو روپے لے کر مدرسے کی روداد چھپوانے کے لئے دہلی تشریف لے گئے ۔ اتفاق سے وہاں روپے چوری ہوگئے۔ آپ نے کسی کو چوری کی اطلاع نہیں کی اور اپنے مکان واپس آ کر اپنی کوئی زمین فروخت کی اور اس کی قیمت سے ڈائی سو روپے لے کر دوبارہ دہلی پہنچے اور روداد چھپوا کر لے آئے۔ کچھ دنو بعد اس واقعے کی اطلاع اہل مدرسہ کو ہوئی۔ ان کو اندازہ تھا کہ حضرت مولانا محمد منیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے کہنے سے یہ رقم واپس نہیں لیں گے۔ اس لئے دارالعلوم دیو بند کے سرپرست قطب الارشاد

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کو سارا واقعہ لکھ کر ان سے مسئلہ دریافت کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ ''مولوی صاحب کے پاس وہ رقم بطور امانت تھی۔ اور روپیہ چونکہ اس کی کسی زیادتی کے بغیر ضائع ہوا ہے، اس لئے وہ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں''۔

اہل مدرسہ نے حضرت مولانا محمد منیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ دکھا کر درخواست کی کہ آپ روپیہ واپس لے لیجئے۔ حضرت مولانا محمد منیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا:۔

''کیا میاں رشید نے فقہ میرے لئے ہی پڑھا تھا اور کیا یہ سارے مسائل میرے ہی لئے ہیں؟ ذرا خود اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپے لے لیتے؟ جاؤ اس فتوے کو لے جاؤ' میں ہرگز دو پیسے بھی نہیں لوں گا''۔

نانوتہ سے روانہ ہوئے تو اگلی منزل تھانہ بھون تھی۔ وہ تھانہ بھون جس کے لذیذ پر کیف تصور ہی سے جسم وجان میں عقیدت ومحبت کی پھواریں پھوٹتی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ تھانہ بھون جس کے تذکروں کی فضا میں اس ناچیز نے آنکھ کھولی اور جس کا ذکر جمیل صبح وشام حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ورد زباں پایا۔ وہ تھانہ بھون جس سے پھوٹنے والے انوار بھی زندگی کی پر پیچ راہوں میں مجھ جیسے نہ جانے کتنے بھٹکنے والوں کی رہبری کا واحد ذریعہ ہیں آج میں عالم حقیقت میں اسی چشمہ خیر اور اسی دکان معرفت کا رخ کر رہا تھا اور قلب وروح کی کائنات اشتیاق ومسرت کے کچھ نرالے زمزموں سے لبریز تھی۔

اس سے پہلے تو تصور نے تھانہ بھون اور اس کی خانقاہ کے نا جانے کتنے خاکے بنائے تھے لیکن جب کچی گلیوں سے گزر کر ہمارا یہ مختصر سا قافلہ خانقاہ کے دروازے پر پہنچا تو خانقاہ ان تمام خاکوں سے زیادہ سادہ مختصر اور دل کش تھی۔ اپنی یاد میں یہ خانقاہ اشرفیہ کی پہلی حاضری تھی، لیکن اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے سالہا سال کی واقفیت ہے اسے دیکھتے ہوئے زمانہ گذرا ہے۔

حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے پاکستان آ جانے کے بعد حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس خانقاہ کا انتظام سنبھالا تھا اور انہوں نے

www.freepdfpost.blogspot.com

اس کی ایک ایک چیز کو اسی انداز میں باقی رکھنے کی پوری کوشش فرمائی تھی جیسی وہ حکیم الامت مجدد ملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے زمانے میں تھی۔ اب مولانا کے صاحبزادے مولانا نور الحسن صاحب مہتمم خانقاہ ہیں۔ آپ کا اصلاحی تعلق مولانا مسیح اللہ خانصاحب مدظلہم العالی سے ہے اور نوعمری کے باوجود آپ نے یہاں کا نظم ونسق ایس طرح برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد اس کے ایک ایک گوشے سے یہ صدا آتی معلوم ہوتی ہے کہ ۔

میرے دل وارفتہ حیرت کو ہے اب تک
اس نازش صد ناز کی ایک ایک اداباد

یہ خانقاہ ابتدا شیخ العرب العجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرکز فیض تھی۔ یہ تینوں بزرگ جو ''اقطاب ثلاثہ'' کہلاتے تھے۔ مدتوں یہاں اصلاح و ارشاد میں مشغول رہے۔ اور انہی کی وجہ سے اسے ''دکانِ معرفت'' کہا جانے لگا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے جہاد میں جب حضرت حافظ صاحب شہید ہوگئے اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکّہ مکرمہ ہجرت فرما گئے تو خالی ہوگئی۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کو مکّہ معظمہ میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رہتا تھا کہ یہ خانقاہ دوبارہ آباد ہو۔ چنانچہ جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی تو آپ کی دوررس نگاہوں نے اس مرکز معرفت کو آباد کرنے کیلئے ان اکا انتخاب فرمایا اور ان کو یہ تاکید کی کہ جب کبھی آپ کانپور سے تدریس کی خدمت ترک کریں تو کسی اور مدرسے میں جانے کے بجائے خانقاہ تھانہ بھون کو آباد فرمائیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے کانپور سے ترک تعلق کے بعد اس خانقاہ کو از سر نو آباد فرمایا اور پھر یہاں سے علم ومعرفت کی جو خوشبو پھوٹی اس نے ایک عالم کو مہکا دیا۔

مولانا نور الحسن صاحب خانقاہ کے مختلف حصے دکھاتے جارہے تھے اور چشم تصور اڑتیس

سال کا فاصلہ طے کرکے یہاں وہ مقدس بزم سجی ہوئی دیکھ رہی تھی جس کے میر محفل حکیم الامت مجدد الملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ تھے اور جس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوریؒ، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ، حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ، عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ اور نہ جانے کیسے کیسے نادر روزگار حضرات اس شمع محفل کے گرد پروانہ وار تشریف فرما رہے اور یہاں سے نکل کر بقول مرشدی حضرت عارفی مدظلہم ان میں سے ایک ایک فرد کا یہ حال ہوگیا ہے کہ ۔

مری آنکھوں میں چشم ست ساقی کا وہ عالم ہے
نظر بھر کر جسے بھی دیکھ لوں مے خوار ہوجائے

مسجد کے صحن میں بیٹھ کر خیال آیا کہ سیدی ومرشدی ڈاکٹر اعبدالحئی صاحب عارفی مدظلہم نے اپنی کتاب ''مآثر حکیم الامت'' کے آغاز میں خانقاہ کا پورا نقشہ اور اس کی تمام جزوی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ کتاب کے اس حصے کو یہاں بیٹھ کر پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ ہم سب رفقاء نے وہاں بیٹھ کر اس کا اجتماعی مطالعہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت مدظلہم العالی کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائے اور آپ کو بایں فیوض تادیر سلامت رکھے، آپ نے جس والہیت اور عاشقانہ جزرسی کے ساتھ اس خانقاہ کا نقشہ کھنچا ہے اس کی صحیح قدر وقیمت وہیں پہنچ کر معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی چونکہ خانقاہ کی بیشتر چیزیں اسی نقشے کے مطابق ہیں۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حضرت مدظلہم اس وقت ہم سے مخاطب ہیں اور تمام تفصیلات سمجھا رہے ہیں۔ اس خانقاہ کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ایسی نہیں ہے جو اس نقشے میں بیان ہونے سے رہ گئی ہو۔ اس تفصیل اور دقیقہ رسی کے ساتھ یہ منظر کشی صرف عشق ہی کرا سکتا ہے۔ یہ عقل وخرد کے بس کا روگ نہیں۔

دیکھنے میں یہ چھوٹی سی مسجد ہے جس کے اندرونی حصے میں کل تین صفیں ہوتی ہیں، صحن

www.freepdfpost.blogspot.com

اور برآمدے بھی کچھ زیادہ کشادہ نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹی سی جگہ سے کیا عظیم الشان کام لیا کہ یہاں سے ایک ہزار کے لگ بھگ اعلیٰ درجہ کی تصانیف تیار ہوئیں، وعظ وارشاد کا ایک نرالا رنگ وجود میں آیا۔ حقائق ومعرفت کے دریا بہائے گئے۔ طریقت وتصوف کی تجدید ہوئی، علمی وعملی مشکلات کی گتھیاں سلجھائی گئیں علوم نبوت کے عقدے وا ہوئے، ہزا رہا انسانوں کو حسن اخلاق ومعاشرت کے دل کش سانچوں میں ڈالا گیا۔ شرافت و انسانیت کو نئی زندگی ملی، شریعت، عقل اور عشق کی حدیں قائم کی گئیں اور تینوں کے حسین وتوازن امتزاج سے وہ مذاق زندگی وجود میں آیا جو اس کی آخری دور میں کتاب وسنت کی عملی تفسیر کی عمل کا دوسرا نام ہے۔ ان تمام باتوں کے تصور نے حضرت والد صاحب کی وہ نظم ذہن میں تازہ کردی جو اسی خانقاہ کے بارے میں کہی گئی تھی۔

کبھی یہ جگہ منزل اولیاء تھی فرشتوں کی محفل تھی، بزمِ ہدیٰ تھی
یہ مسکن تھا اک دن حکیم امتؒ کی ہوا اس کی، ہراک مرض کی دوا تھی
یہ چھوٹی سی بستی، یہ چھوٹی سی مسجد
یہ چھوٹی سی مجلس خدا جانے کیا تھی؟

خانقاہ سے نکل کر قبرستان کا رخ کیا، راستے میں پہلے ایک چار دیواری کے درمیان حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید قدس سرہ کا مزار تھا، وہاں حاضری ہوئی، یہ بڑے صاحب مقام بزرگ تھے جنہوں نے اپنے حالات ومقامات کو ظرافت کے پردے میں چھپایا ہوا تھا۔ ساری عمر خانقاہ میں بیٹھ کر اصلاح وارشاد میں گذاری اور جب س ۱۸۵۷ء میں اللہ کے لئے جان وتن کی بازی لگانے کا وقت آیا تو خانقاہ کا یہ بوریہ نشین مجاہدین کی صف میں اپنے سر کا نذرانہ لئے سب سے آگے آگے تھا یہاں تک کہ اسی جہاد میں جام شہادت نوش کرکے یہاں آسودہ ہوگیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہاں سے ذرا آگے بڑھ کر وہ قبرستان شروع ہوجاتا ہے جو خود حضرت حکیم الامت

قدس سرہ نے وقف فرمایا تھا۔ اس قبرستان کے مغربی سرے پر ایک چبوترا ہے جس پر تین کچی قبریں بنی ہوئی ہیں ان میں سے پہلی قبر میں وہ مجددِ وقتؒ محو آرام ہے جس کے فیوض وبرکات نے اس چھوٹی سی بستی کو آخر دور میں رشک صد گلزار بنادیا۔ اس مزار مبارک کے سامنے بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا کے سارے غم وآلام کافور ہوگئے ہیں اور پورا وجود سکینت وطمانیت کی آغوش میں چلا گیا ہے۔ واردات کیفیات اور حالات ومقامات تو بڑوں کی بات ہیں۔ ہم جیسے بد ذوق اور کور دل افراد کو ان کی تو کیا ہوا لگتی؟ لیکن حضرتؒ کے قدموں میں بیٹھ کر جو سکون خاطر نصیب ہوا ہے وہ میرے لئے اس سفر کی سب سے بڑی متاع تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ؎

کرتی جاتی ہے سرایت جان وتن میں ان کی بار
رفتہ رفتہ جانے کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں میں

نماز ظہر کا وقت قریب تھا واپس خانقاہ کی مسجد میں آکر نماز ظہر ادا کی، نماز کے بعد دفعتہً خیال آیا کہ یہی وقت حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی مجلس عام کا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ قدم بے ساختہ حضرتؒ کی نشست گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر مجلس کی جگہ بیٹھا رہا اور اس دل پر جو گذری اس کا اظہار لفظ وبیان کے ذریعے ممکن نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس مقام پر ۳۸ سال گزر جانے کے باوجود سکینت وطمانیت، سوز وگداز اور انوار وبرکات کا یہ حال ہے وہاں اس وقت کا کیا عالم ہوگا جب یہ مجلس جہاں آرا زندہ تابندہ تھی ؎

ترے وصال کا عالم نہ جانے کیا ہوگا؟
ترے فراق کی لذت سے مر گئے ہیں لوگ

دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ یا اللہ! آپ نے اس مجلس کی بدولت ہزار ہا انسانوں کی زندگیاں بدلی ہیں۔ ہزاروں دلوں میں انقلاب پیدا فرمایا اور یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا فرمائے جنہوں نے اپنے فیوض وبرکات سے ایک عالم کو سیراب کیا۔ ہم اگرچہ ایسے وقت یہاں پہنچے ہیں جب یہ پاکیزہ مجلس برخاست ہوچکی، وہ جلوہ جہاں تاب روپوش ہوچکا۔ لیکن یا اللہ! اس مجلس کو یہ تاثیر بخشنے والے آپ ہی تھے۔ اس مجلس کو انقلاب

www.freepdfpost.blogspot.com

انگیز آپ ہی نے بنایا تھا اور آپ کی ذات حی وقیوم ہے آپ کی وہ رحمت آج بھی زندہ و پائندہ ہے جو اس مجلس کے حاضرین پر نازل ہوتی ہے۔ اپنے فضل وکرم سے اس مجلس کے فیوض و برکات کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرما دیجئے اور ہم خستہ حالوں کو اس رحمت سے محروم نہ فرمایئے۔ آمین یارب العالمین۔

اور اس دعا کے ساتھ ہی سید ومرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی کے یہ اشعار یاد آ گئے۔

وہ نظر آتا ہے دیکھ اے دل سوادِ کوئے دوست
گوشے گوشے سے جہاں سے آ رہی ہے بوئے دوست
آج آساں ہوگئی دشواریٔ منزل مجھے
کھینچ لایا مجھ کو میرا جذبہ دِل سوئے دوست
اے وفورِ شوق اتنی فرصت نظارہ دے
جذب کرلوں دیدہ و دل میں بہارِ رُوئے دوست
جذبہ کرلے میری ہستی اپنے ہر انداز میں
ہاں مجھے بھی رنگ لے اپنے رنگ میں اے خوئے دوست

.....☆.....☆.....☆.....

(۳)

تھانہ بھون سے رخصت ہونے کے بعد کچھ دیر جلال آباد میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری دی، آپ اس وقت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز ترین خلفاء میں سے ہیں۔ جلال آباد میں آپ کی زیر سرپرستی ایک عظیم الشان مدرسہ ہے جو آپ کی برکت سے خانقاہ بھی بنا ہوا ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں افریقہ، یورپ اور امریکہ میں بھی آپ کی فیوض جاری ہیں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

حضرت نے حسب معمول نہایت شفقت کا معاملہ فرمایا۔ آپ کی صحبت میں چند لمحات بھی ایک گراں قدر نعمت تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے سرفراز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ رحمت تادیر بعافیت سلامت رکھے۔ آمین۔

جلال آباد سے روانہ ہو کر تقریباً چالیس منٹ میں ہم گنگوہ پہنچے۔ یہ وہ عظیم بستی ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے (دسویں صدی ہجری) سے اہل اللہ کا مرکز رہی ہے اور تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہاں امامِ ربانی قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی جو مسند ارشاد آراستہ ہوئی اس نے نہ صرف پورے علاقے کو بلکہ پورے برصغیر کو انوارِ علوم نبوت سے جگمگا دیا۔

گنگوہ کی بستی سے باہر گھنے درختوں کے سائے میں ایک کچے چبوترے پر حضرت گنگوہی قدس سرہ کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے؟ بظاہر ایک سادہ سی کچی قبر ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلال و جمال کی ایک کائنات یہاں فروکش ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ ہمارے تمام بزرگان دیوبند کے سرتاج و قافلہ سالار ہیں۔ آپ کی پوری زندگی اتباعِ سنت کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ آپ ہی نے مروجہ بدعات کے خلاف احیائے سنت کا علم بلند کر کے دیوبند کے مسلک کو ممتاز فرمایا۔ دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم حاصل کرنے کے بعد آپ ایک مرتبہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب سے مناظرہ کے لئے تھانہ بھون تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ سے ملاقات ہوگئی جس کے نتیجے میں مناظرہ تو دھرا ہی رہ گیا۔ آپ اسی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوگئے اور بیالیس دن وہی خانقاہ میں مقیم رہے صرف ایک جوڑا بدن پر رہ گیا تھا اسی کو دھوتے اور دوبارہ پہن لیتے۔ بیالیس دن کے بعد جب وہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے خلافت عطا کی اور فرمایا:۔

''میاں مولوی رشید! جو نعمت اللہ تعالیٰ نے مجھے دی تھی، وہ آپ کو دے دی''۔

www.freepdfpost.blogspot.com

گنگوہ پہنچ کر مدتوں استغراق کا عالم طاری رہا۔ کسی نے حضرت حاجی صاحبؒ سے شکایت کی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:۔

''میاں غنیمت جانوں کہ وہ آبادی میں ہیں۔ ان پر جو عالم گذرا ہے۔ اگر حق تعالیٰ کو ان کی اصلاح خلق کا کام لینا نہ ہوتا تو خدا جانے کس پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھے ہوتے''۔

ایک مرتبہ خود حضرت حاجی صاحبؒ نے خط لکھ کر حال دریافت کیا اس کے جواب میں آپ نے جو حالات بیان فرمائے ان سے آپ کے مقام کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ فرمایا کہ:

''شریعت طبیعت بن گئی ہے۔ مدح وذم یکساں معلوم ہوتی ہے اور کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا''۔

احقر نے یہ جملہ بارہا حضرت والد صاحبؒ سے اور سید و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی مدظلہم سے سنے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ جب یہ مکتوب حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسے سر پر رکھ لیا اور فرمایا: ''اللہ اکبر! ہمیں تو اب تک یہ حالات حاصل نہیں ہوسکے''۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ کے مزار مبارک پر حاضری اس سفر کی اہم حاصلات میں سے تھی، علم وعمل ورع وتقویٰ اور جہد وعمل کا یہ پیکر جمیل جس زمین پر آسودہ ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انوار و برکات کی کیا کیا بارشیں برستی ہوں گی؟ اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں لیکن اتنی بات کا احساس ہم جیسے بھی کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ؎

خاک قبرش ازمن و تو زندہ تر

عصر کی اذان ہوچکی تھی چنانچہ مزار مبارک کے پاس بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں نماز ادا کی اور اس کے بعد خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جو بستی کے بیچوں بیچ محلہ سرائے میں واقع ہے یہ خانقاہ در اصل حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خانقاہ ہے جو دسویں ہجری کے مشہور و معروف اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور آپ کا

مزار مبارک بھی اسی خانقاہ کے احاطے میں واقع ہے۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب قدوس سرہ کی یہ خانقاہ بالکل اجاڑ اور ویران ہوچکی تھی اور اس میں اصطبل بنایا گیا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ نے اپنے ہاتھ سے اسے صاف کر کے از سر نو آباد فرمایا۔ پھر یہیں اپنے خرچ سے سہ دری تعمیر فرمائی۔ اور اس میں دورۂ حدیث کا درس شروع فرمایا۔ کچھ دنوں بعد بعض حاسدین نے حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب قدس سرہ کے سجادہ نشینوں کے کان بھرے ہوں گے کہ یہ اس خانقاہ پر قابض ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ حضرت ایک وفد بنا کر آئے اور عرض کیا کہ ''آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں''۔ اس وقت حضرت اپنے خرچ سے سہ دری تعمیر فرما چکے تھے۔ اطراف وکناف سے دورۂ حدیث کے طلباء وہاں مقیم تھے۔ صحاح ستہ کا درس جاری تھا اور یہ خانقاہ تین سو سال بعد آباد ہوئی تھی۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو سجادہ نشینوں کے اس مطالبے پر جنگ وجدل یا کم از کم مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ سکتی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو خانقاہ پر قبضہ باقی رکھنے کے لئے دین ہی کے نام پر نا جانے کتنی تاویلات ذہن میں آتیں۔ خدمت دین اور تحفظ مسلک کی نہ جانے کتنی دہائیاں دی جاتیں اور لڑائی جھگڑے کے کتنے ہی جواز فراہم ہوجاتے لیکن وہاں تو ''شریعت طبیعت بن چکی تھی''۔ اور سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی سامنے تھا۔

أنا زعيمه ببيت في وسط الجنته لمن ترک المراء وهو محقّ.

جو شخص حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا ترک کردے میں اس کے لئے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت نے ان سجادہ نشین سے پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھا کہ۔

''جب حضرت شیخ کا یہ حجرہ گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا اس وقت آپ حضرات کہا تھے؟ بلکہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر فرمایا:۔

''اس کام کے لئے کسی جماعت کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی آپ کسی ایک شخص سے بھی کہلا بھیجتے تو میں جگہ خالی کر دیتا''۔ چنانچہ آپ نے فوراً وہاں سے منتقل

www.freepdfpost.blogspot.com

ہونے کی تیاری شروع کردی۔ اطراف واکناف سے آئے ہوئے جاں نثار شاگردوں کا جم غفیر اس واقعے پر سخت مشتعل تھا۔ لیکن آپ نے انہیں سختی سے فرمایا کہ: جو شخص اس فیصلے کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکالے گا وہ میرا دوست نہیں دشمن ہوگا''۔

چنانچہ تھوڑی دیر میں آپ نے اپنا سامان وہاں سے اٹھا کر قریبی مسجد میں منتقل فرمالیا اور اللہ کے گھر میں فروکش ہوگئے۔

اس بے مثال ایثار، للّٰہیت اخلاص اور ضبط وتحمل کا ثمرہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ چند ہی روز گذرے تھے کہ سجادہ نشین حضرت اپنے عمل پر پشیمان ہوئے اور دوبارہ آکر درخواست کی کہ آپ اب وہیں تشریف لے جائیں اور خانقاہ کو دوبارہ آباد فرمائیں حضرتؒ نے ابتداء انکار فرمایا، لیکن جب ان کا اصرار دیکھا تو دوبارہ وہیں تشریف لے گئے اور پھر آخر وقت تک اسی خانقاہ میں رونق افروز رہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حضرت شیخ الہند قدس سرہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ سے لے کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تک کتنے آفتاب ومہتاب اس خانقاہ سے فیض حاصل کرتے رہے اور اس خاموش گوشہ تبلیغ نے دعوت تبلیغ سے لے کر جہاد وقتال تک کتنے عظیم منصوبوں کو جنم دیا۔ اس کی تاریخ بڑی طویل ہے اور یہ مختصر صفحات اس کی تفصیل کے لئے ناکافی۔

احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہ، حضرت گنگوہی قدس سرہ کے عاشق راز تھے اور اکثر مدرسے کی چھٹی کے ایام میں اسی خانقاہ کی کشش انہیں دیوبند سے پیدل یہاں تک کا سفر کرنے پر مجبور کردیا کرتی تھی۔ چشم تصور ان سب بزرگوں کو یہاں جلوہ آرا دیکھتی رہی یہاں تک کہ شام ہونے لگی اور ہم خانقاہ سے رخصت ہوکر حضرت گنگوہی قدس سرہ کے پوتے مولانا حکیم مسعود احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کا مکان خانقاہ کی پشت پر واقع ہے۔ حضرت مولانا نے انتہائی

شفقت ومحبت کا برتاؤ فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے پاس ان کے آخری ایام علالت میں حضرت حکیم صاحب موصوف کا ایک گرامی نامہ آیا تھا۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اس وقت خود جواب لکھنے کے معذور تھے۔ اس لئے احقر کو جواب لکھنے کا حکم دیا۔ احقر کو جواب لکھنے میں کچھ اپنی غفلت اور کچھ اپنی مصروفیات کی بنا پر ایک دن کی تاخیر ہوگئی۔ چنانچہ اگلے روز حضرت والد صاحبؒ نے اس کے جواب کے بارے میں پوچھا تو احقر نے جواب دیا کہ ''ابھی تک جواب نہیں لکھ سکا۔ انشاء اللہ آج لکھ دوں گا''۔ اس پر آپ نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''بندہ خدا! اس کام کو تو سب سے مقدم سمجھ کر کرنا تھا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کس کا خط ہے؟ میرے ایسے نصیب کہاں تھے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے پوتے کا خط میرے نام آتا'' اور یہ کہہ کر آپ کی آنکھ پرنم ہوگئیں۔

اگرچہ حضرت حکیم صاحب موصوف نے دارالعلوم میں حضرت والد صاحب نے پڑھا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرتؒ کا شاگرد کہتے ہیں لیکن حضرت گنگوہیؒ کی نسبت سے حضرت والد صاحبؒ ان کے ساتھ ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے ساتھ۔ تھوڑا سا وقت ان کی خدمت میں گذار کر ہم دل میں کیف وسرور کی ایک ناقابل بیان کیفیت لئے ہوئے دیوبند کی طرف واپس ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دن اس سفر کا اصل حاصل تھا اور حرمین شریفین کے بعد روئے زمین کی کسی بھی دوسری جگہ جاکر وہ سرور وکیف اور سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اس روز عطا فرمایا۔

فللّٰہ الحمد اولہ و آخرہ.

دیوبند کے بعد ایک دن سہارنپور بھی جانا ہوا۔ برصغیر کے دوسرے بڑے علمی مرکز مدرسہ مظاہر العلوم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بفضلہٖ تعالیٰ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کی برکت سے یہاں اب بھی اپنے قدیم بزرگوں کے انداز و ادا کی جھلکیاں نظر آئیں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہم کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب اور حضرت مولانا محمد شاہد صاحب نے انتہائی شفقت ومحبت کا

www.freepdfpost.blogspot.com

معاملہ فرمایا۔ اساتذہ کرام سے بھی مختصر ملاقات رہی۔ کتب خانے کی بھی زیارت ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے طبیعت سیر نہ ہوسکی لیکن احقر کے لئے یہ مختصر سی ملاقات بھی بڑی نعمت تھی۔

سہارنپور کے بعد دہلی میں بھی چار دن قیام رہا۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہم العالی کیا زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جناب قاری محمد ادریس صاحب مدظلہم کے یہاں قیام رہا۔ مرکز تبلیغ نظام الدین بھی حاضری ہوئی۔ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مدظلہم العالی کی زیارت وملاقات سے سعادت ملی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شاہ نصیرالدین چراغ دہلوی قدس سرّہم کے مزار پر بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے مشہور معروف روزنامے ''الجمعیۃ'' کے فاضل ایڈیٹر جناب ناز انصاری سے پاکستان ہی میں نیاز حاصل ہو چکا تھا اور ان کے حسن اخلاق اور دلکش باتوں کا تأثر پہلے ہی سے دل پر قیام تھا۔ انہوں نے کرم فرمایا اور یہاں پر بھی ملاقات کا شرف بخشا، بلکہ ''الجمعیۃ'' کا وہ خصوصی شمارہ بھی عنایت فرمایا جس جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس قبل وہ دارالعلوم کراچی پر تفصیل سے ایک مضمون ''الجمعیۃ'' کے ایک شمارے میں شائع فرما چکے تھے جو انشاء اللہ البلاغ کی کسی قریبی اشاعت میں نقل کیا جائے گا۔ ہمارے ایک محترم عزیز جناب محمود عثمانی نے، جو ہمدرد دواخانے کے پبلسٹی مینیجر ہیں دہلی کے قیام کے دوران خصوصی کرم فرمایا اور غیر ملکیوں کو جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان میں بیحد مدد فرمائی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیرا۔ اسی دوران دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری میں مسلمانوں سلاطین کے مآثر جامع مسجد، لال قلعہ، تاج محل اور دوسرے تاریخی مقامات بھی بصد حسرت ویاس دیکھے اور پانچ دن بعد یہاں سے الہ آباد کیلئے روانگی ہوئی۔

الہ آباد میں بعض اعزہ سے ملاقات کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضری کا بھی بڑا شوق تھا۔ آپ حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے اکابر خلیفاء میں سے تھے اور آپ نے الہ آباد میں اپنے شیخ کے طرز پر مدرسہ و

خانقاہ قائم فرما کر اصلاح وارشاد کا نہایت مفید نظام قائم فرمایا ہوا تھا۔ جس سے خلق خدا کو بے حد نفع پہنچا۔ اس علاقے میں آپ سے پہلے نہ کوئی قابل ذکر مدرسہ تھا نہ کوئی تربیت گاہ تھی اور دین سے نہ واقفیت کے سبب بدعات و رسوم کو دور دورہ تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ سے یہاں دین کی نشر اشاعت کا جو کام لیا وہ حیرت انگیز ہے، سینکڑوں لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا اور بے شمار افراد کو صحیح فہم دین کی توفیق ہوئی۔ حضرت مولاناؒ سفر حجاز کے دوران راستے ہی میں راہی آخرت ہوئے۔ یہاں تک کہ نعش مبارک بھی سمندر کی نذر ہوئی۔

نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

حضرت مولانا وصی للہ صاحب قدس سرہ کے خاص خلیفۂ مجاز اور آپ کے داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب مدظلہم آجکل اس مدرسے کے خانقاہ کے نگران ہیں۔ آپ سے دیوبند میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور خانقاہ میں حاضری کے وقت تو انہوں نے شفقتوں کی انتہا کردی۔ بحمد اللہ! یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مدرسہ اور خانقاہ اب بھی آباد ہیں، اصلاح وتربیت کا سلسلہ قائم ہے۔ حضرت مولاناؒ قدس سرہ کے مواعظ و ملفوظات جو نہایت تاثیر کے حامل ہیں یہاں سے شائع ہورہا ہیں اور ایک ماہنامہ رسالہ ''وصیت العرفان'' کے نام سے جاری ہے۔ جو زیادہ تر حضرت مولانا قدس سرہ کے افادات ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ بحمد اللہ اس خانقاہ میں کئی بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

علماء وصلحاء اور اہل اللہ کے اس اجتماع کو دیکھ کر یہ اطمنان ہوا کہ ؎

ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کا شہر میں دوسرا مرکز ایک مسجد تھی جو چھوٹی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ بحمد اللہ وہاں بھی حضرتؒ کے دوسرے داماد مولانا قمرالزماں صاحب کی زیر نگرانی ایک مدرسہ سرگرم عمل ہے، اور وہاں سے بھی حضرت مولاناؒ کے فیوض کی اشاعت ہورہی ہے۔ یہاں سے ''معرفت حق'' کے نام سے ایک ماہنامہ حضرت کے افادات کی نشر اشاعت میں مصروف ہے۔ بحمد اللہ یہاں بھی حاضری ہوئی،

www.freepdfpost.blogspot.com

اور دیگر علماء وصلحاؒ کی محفل سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان حضرات نے بھی جس شفقت و عنایت کا معاملہ فرمایا وہ دل پر نقش ہے جب، احقر لکھنو جانے لگا تو مولانا قمر الزماں صاحب اور مولانا عمار صاحب رات کے چار بجے اسٹیشن پر پہنچے اور نہ صرف رخصت کے وقت اپنی زیارت کا شرف بخشا، بلکہ ناشتے کا سامان بھی ساتھ لائے جو بذات خود ایک نعمت تھا، چہ جائے ایسے صالح اور محب اور مشفق ہاتھوں سے ملے۔

الہ آباد کے قیام میں ایک اور عظیم نعمت جو احقر کو حاصل ہوئی وہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی دامت برکاتہم کی زیارت و ملاقات تھی۔ حضرت مولانا مدظلہم ان گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کے تصور سے عہد حاضر کے افلاس کا احساس کم ہوتا ہے۔ آپ ایک واسطے سے حضرت شاہ فضلِ رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہ کے خلیفہ ہیں، حضرت شاہ صاحب کے خلفاء میں سے ایک بزرگ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شیخ تھے جن کی صحبت میں رہ کر آپ نے ریاضت و مجاہدات اور تربیت باطن کی منزلیں طے فرمائیں یہاں تک کہ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ:۔

''اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا لائے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ، احمد میاں (یعنی مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی) کو لایا ہوں''۔۔۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہم (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) سے پوچھا کہ سلسلہ نقشبندی میں اس وقت قوی النسبۃ بزرگ کون ہیں''؟ تو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہم نے حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہم ہی کا نام لیا۔ آپ کو صاحب نسبت ولی اللہ ہونے کے ساتھ شعر گوئی کا بھی بڑا نفیس ذوق و ملکہ حاصل ہے اور آپ کا مجموعہ کلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے حال ہی میں طبع کرادیا ہے۔

احقر نے سیدی و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہم العالی اور حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا تذکرہ تو بارہا سنا تھا اور اسی وقت سے

زیارت کا اشتیاق بھی تھا۔ لیکن یہ اشتیاق بفضلہٖ تعالیٰ اس سفر میں پورا ہوا۔ حضرت مولانا کا اصل قیام پرتاب گڑھ میں رہتا ہے لیکن بکثرت الہ باد بھی تشریف لاتے رہتے ہیں۔ احقر کے خسر محترم جناب شرافت حسین صاحب مدظلہم نے جو بحمد اللہ بزرگوں کی زیارت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے بتایا کہ حضرت مولانا آجکل الہ آباد ہی میں تشریف فرما ہیں۔ چنانچہ احقر کے ہمراہ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو لمحات آپ کی صحبت میں نصیب ہوئے، وہ بلاشبہ زندگی کی یادگار نعمتوں میں سے تھے، اپنے بزرگوں کی ساری ادائیں وہاں جلوہ گر تھیں۔ وہی سادگی، وہی بیساختگی، وہی تواضع، وہی عبدیت و فنائیت کا رنگ، وہی سوز و گداز، نہ کوئی شان و شوکت نہ معروف پیروں کا سا ٹھاٹھ باٹھ اور نہ مصنوعی درویشی کا تکلف سر سے پاؤں تک مجسم شفقت و رحمت آنے والے کو دین کی کوئی نہ کوئی بات پلانے کی لگن، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سیدی و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہم العالی کی نسبت سے اس ناکارہ پر بیحد الطاف و عنایات کا معاملہ فرمایا، اس وقت طبیعت ناساز تھی لیکن نہایت انبساط کے ساتھ گفتگو بھی فرمائی۔ بہت سی گراں قدر نصیحتیں بھی کیں، بحمد اللہ اس قیام میں دو مرتبہ حضرت مدظلہم کی خدمت میں حاضری ہوئی اور وہ مبارک سراپا ہمیشہ کے لئے دل و نگاہ میں بس گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کو بعافیت تمام ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ہمیں استفادے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

الہ آباد کے بعد ایک دن لکھنؤ میں قیام رہا، لکھنؤ کے سفر کا مقصد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی زیارت اور حضرت مولانا سید عبدالحسن علی صاحب ندوی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہم العالی کی صحبت و زیارت سے استفادہ تھا۔ برادر محترم مولانا برہان صاحب سنبھلی (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ و استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے کرم فرمایا اور اسٹیشن سے اپنی رہنمائی میں دارالعلوم لے گئے، وہاں حضرت مولانا محمد اشرف خاں صاحب (صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی) پہلے سے قیام پذیر تھے۔ دوپہر کو کھانے پر اہل علم کا بڑا اچھا اجتماع ہوگیا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم بھی

www.freepdfpost.blogspot.com

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہم سے ملاقات کے لیے وہاں تشریف لے آئے اور اس طرح پہنچتے ہی حضرت موصوف کی زیارت ہوگئی۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی رائے بریلی میں تشریف فرما تھے۔ آپ سے دیوبند میں ملاقات کے دوران احقر اپنے قصد لکھنؤ کا ذکر کر چکا تھا اور پختہ ارادہ یہی تھا کہ ایک دن لکھنؤ سے رائے بریلی جا کر حضرت مولانا مدظلہم کی خدمت میں حاضری ہوگی، لیکن عرفت ربی بفسخ العزائم بعض ناگریز وجوہات کی بنا پر فوراً پاکستان لوٹنا پڑا اور لکھنؤ میں ایک دن سے زائد قیام کا موقع نہ ملا۔ وہ ایک دن بھی دفتری کاروائیوں اور سیٹ وغیرہ کا اطمینان کرنے کی نذر ہوگیا۔ احقر رائے بریلی حاضر ہونے سے محروم رہا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم کی خدمت میں حاضری کی بھی حسرت رہ گئی۔

تاہم بحمداللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے فاضل اساتذہ اور اہل علم کی مختصر صحبت نصیب ہوئی۔ ندوہ جیسا علمی مرکز اب تک نہیں دیکھا تھا۔ بحمداللہ اس کی زیارت ہوگئی۔ اس کا عظیم کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا، مسند عبد بن حمید کا مخطوط پہلی بار یہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ اور بہت سی نادر کتابیں نظر سے گذریں۔

ندوہ کی عملی و دینی فضا دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئی اور حوصلہ بڑھا، ندوہ بقول اکبر مرحوم مسلمانوں کی ''زبان ہوش مند'' تو ہمیشہ سے تھا لیکن ''دل دردمند'' کی جو کسر بیان کی جاتی تھی وہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب مدظلہم نے پوری فرمادی ہے۔ خاص طور پر حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی کی فکر و بصیرت، جہد و عمل اور سوز و گداز کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہم نے اس ادارے کو حیاتِ نو بخش دی ہے۔ مختصر سے وقت میں یہاں جو کچھ دیکھا اور جن حضرات اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں، بحمداللہ ان کی روشنی میں ادارے سے بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور مختلف شعبوں میں دینی خدمات کا مستقبل روشن نظر آیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مدظلہم کے وجود باجود کو مسلمانوں پر تادیر سایہ فگن رکھے، ان کے زیر سایہ اس ادارے کو مزید ترقیات سے نوازے اور اس کے

آثار طیبہ کو دوسرے دینی و علمی اداروں تک متعدی فرمائے۔ آمین

اگلے روز صبح ناشتے پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ حضرت مولانا مدظلہم کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ کی تحریری اور تبلیغی خدمات سے پورا برصغیر مستفید ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان علمی اور عملی کمالات کے ساتھ بے نفسی کی جو دولت آپ کو عطا فرمائی ہے، اس کی مثالیں اب خال خال ہیں۔ آپ اجلاس دیوبند تشریف نہیں لا سکے تھے، اس لئے اگر لکھنؤ حاضری نہ ہوتی تو آپ کی زیارت سے محروم جانا پڑتا۔ بفضلہ تعالیٰ لکھنؤ کے سفر کا یہ مقصد حاصل ہوگیا۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے حضرت مولانا مدظلہم کی صحبت کا شرف ملا۔ بہت سی ضروری باتیں معلوم ہوئیں۔ آپ نے اپنی بعض نو طبع شدہ تالیفات عنایت فرمائیں اور یہ فائدہ تو ان سب بزرگوں کی صحبت کا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہم جیسوں کیلئے مجسم درس ہوتی ہے، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کے اخلاقِ کریمانہ، ان کے نہاں خانۂ دل کی تڑپ اور دین کے راستے میں ان کی محنتیں دیکھ کر کم از کم شرم تو آتی ہی ہے کہ یہ حضرت بہت دور کے نہیں۔ اسی دور کے حضرات ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ اور پھر ان کی کسی نہ کسی درجے میں نقل اُتارنے کا جذبہ کچھ دیر کے لئے پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ اگر یہ جذبہ بار بار بیدار ہوتا رہے تو کیا بعید ہے کہ کسی وقت استحکام اختیار کرلے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت مولانا مدظلہم کی خدمت میں قیامِ لکھنؤ کا بہترین وقت گذارنے کے بعد واپسی ہوئی، اور اسی روز جمعہ کے بعد امرتسر کیلئے روانگی ہوگئی۔

.....☆.....☆.....

ہندوستان کا یہ پچیس روزہ قیام احقر کے لئے جن گوناگوں فوائد کا حامل تھا، ان کا اجمالی ذکر پچھلے صفحات میں ہوگیا، آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہمسایہ ملک اور بارہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کا وطن ہونے کی حیثیت سے وہاں کے مجموعی حالات کے بارے

www.freepdfpost.blogspot.com

میں چند تاثرات بھی عرض کر دیئے جائیں۔

ہندوستان میں بعض ایسی قابل تعریف باتیں نظر آئیں جو ہم اہل پاکستان کے لئے درسِ آموز ہیں، مثلاً یہ کہ جن جن علاقوں میں احقر کا جانا ہوا، کم از کم وہاں ظاہری شان و شوکت اور تکلفاتِ زندگی کی دوڑ ہمارے مقابلے میں کم محسوس ہوئی۔ وہاں حکومتوں کی پالیسی شروع سے یہ رہی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات پر انحصار کم سے کم کیا جائے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دے کر زیادہ سے زیادہ اشیاء میں خود کفیل ہونے کی کوشش کی جائے، چنانچہ آج وہاں صرف کاریں ہی نہیں، ہوائی جہاز اور ٹینک بھی بن رہے ہیں۔ بازاروں میں غیر ملکی مصنوعات شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ سارے ملک میں کوئی ایسی کار آپ کو نظر نہیں آئے گی جو کسی دوسرے ملک کی بنی ہوئی ہو۔ پورے ملک میں ہر جگہ صرف ایک ہی کار استعمال ہو رہی ہے جو ہندوستان میں بنتی ہے اور امراء و حکام سے لے کر نیچے تک کے تمام افراد وہی کار استعمال کرتے ہیں۔ سڑکوں پر بھی کاریں کم اور رکشہ وغیرہ زیادہ نظر آتے ہیں، معیشت میں سادگی زیادہ ہے، اور ٹیپ ٹاپ نسبتاً کم۔ اس کے علاوہ یہ بات نمایاں محسوس ہوتی ہے کہ حکومت نے جس قسم کا قومی شعور عوام میں پیدا کرنا چاہا تھا، اس میں وہ خاصی کامیاب رہی ہے۔ لوگوں میں اپنے ملک سے محبت اور دوسروں پر اس کی برتری ثابت کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہندی زبان باوجودیکہ اکثریت کیلئے نامانوس تھی لیکن اب اس کا عام چلن نظر آتا ہے اور اس کو تیزی سے پھیلانے میں حکومت کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ان قابل تعریف باتوں کے جو مفید نتائج عوام کی زندگی میں برآمد ہونے چاہئیں وہ بالکل نظر نہیں آتے، بلکہ نتائج بالکل برعکس نظر آتے ہیں۔ مثلاً خود کفیل ہونے کا نتیجہ عوام کی خوش حالی کی صورت میں نکلنا چاہئے تھا، لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ فقر و افلاس وہاں پاکستان سے زیادہ نظر آتا ہے۔ چند گنے چنے علاقوں کے سوا خوش حالی کی رونق چہروں پر نظر نہیں آتی۔ اس کے بجائے چہرے فلاکت سے مرجھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح قومی و ملکی شعور کا تقاضہ یہ تھا کہ رشوت ستانی، جرائم، لاقانونیت اور دوسری بدعنوانیاں کم ہوتیں، لیکن اس معاملے میں ہندوستان ہمارے ملک

سے چند قدم آگے ہو تو ہو، کم کس طرح نہیں۔ قیمتوں کا معیار اگر پاکستان سے کچھ کم ہو تو اُجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ کم ہے۔ غرض مذکورہ قابل تعریف باتوں کا کوئی بہتر عملی نتیجہ نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔

جہاں تک ہندوستان مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی یہ ہمت قابل صد ستائش ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھنے کی جان توڑ کوشش کی ہے، خاص طور سے وہاں کے بعض علماء نے مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور ان کو سہارا دینے کیلئے بڑی قربانیاں دی ہیں، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے دین کا جتنا تحفظ وہاں رہتے ہوئے کیا جا سکتا تھا، بحمد اللہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔

لیکن انفرادی کوششوں کے مقابلے میں حالات کا جو سیلاب مسلمانوں کو مخالف سمت میں دھکیل رہا ہے وہ کافی تشویشناک ہے۔ تعلیم گاہوں میں خدا رسول کے نام کا تو ظاہر ہے کوئی سوال نہیں، لیکن اس کے برعکس ذہنیت پلائی جا رہی ہے۔ اردو کا بیج مارا جا چکا ہے اور بعض شہروں میں میلوں چلنے کے بعد بھی اردو کا کوئی بورڈ مشکل سے نظر آتا ہے۔ رسم الخط تبدیل کر کے نئی نسل کا رشتہ ماضی کے ورثے سے بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ چنانچہ نئی نسل کے نوجوانوں میں ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے جو اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ظاہر ہے کہ کسی دینی پروگرام کا کیا سوال ہے۔ ادھر ہندی فلمیں اور رسالے عُریانی اور فحاشی میں یورپ اور امریکہ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک شریف آدمی کیلئے کسی بک اسٹال پر چند لمحے کھڑا ہونا ممکن نہیں۔ پاکستان میں بھی ہم عُریانی اور فحاشی کا دن رات رونا روتے ہیں۔ اور بلاشبہ اس لعنت میں ہم بھی گرفتار ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں پاکستان ہندوستان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہے، اور غرباء تک اس عادت میں مبتلا ہیں۔ ایک ذمے دار ہندو آفیسر سے گفتگو کے دوران احقر نے پوچھا کہ ''بہت سی اشیاء میں خود کفیل ہونے کے باوجود بھارت میں اتنا شدید افلاس کیوں ہے؟'' ان صاحب نے جواب دیا کہ:

''اس ملک میں شراب نوشی کی وباء تیزی سے پھیل رہی ہے، اس کی موجودگی میں

www.freepdfpost.blogspot.com

یہاں کے باشندے کتنا ہی کما لیں ان کا افلاس دور نہیں ہو سکتا۔"

پھر ایک انتہائی تشویشناک بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان کا مذہبی امتیاز رفتہ رفتہ بہت کم ہوتا جا رہا ہے اور اسے ختم کرنے کی باقاعدہ منظم کوشش کی جا رہی ہے۔ انتہاء یہ ہے کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادی کے واقعات بھی ہونے لگے ہیں۔ اور الہ آباد کی ایک مسلمان طالبہ نے مجھے بتایا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادی ہو تو، حکومت اس پر انعام دیتی ہے، جسے "مخالف فرقے سے شادی کا انعام" (Intercaste Marriage Prize) کہا جاتا ہے۔

ہم پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ماحول کی دینی ابتری اور بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے صبح و شام شاکی رہتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جا کر وہاں کا عام ماحول اور مسلمانوں کے حالات قریب سے دیکھنے کے بعد پاکستان کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی اور اندازہ ہوا کہ یہ ملک ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے۔

اگر ہم اس ملک کی خلوص، للّٰہیت، جذبے اور لگن کے ساتھ تعمیر کر سکیں تو یہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے بہترین سہارا ہے، بحمد اللہ ہم یہاں بہت سی ان بلاؤں سے محفوظ ہیں جو ہندوستان میں عام ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ہم اس مقصد کو پورا کریں جس کیلئے یہ ملک معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ان برائیوں کا قلع قمع کریں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں اور اس ملک کو دینی اعتبار سے ایک مثالی ملک بنانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم یہاں کسی غیر مسلم حکومت کے ہاتھوں مجبور نہیں ہیں، بلکہ اپنے پورے نظامِ زندگی کو ٹھیک ٹھیک اپنے دین کے مطابق استوار کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اگر ہم نے اس نعمت کی ناشکری کی اور اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا تو ہمارے لئے دنیا و آخرت میں تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس نعمت کی قدر پہچاننے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جنوبی افریقہ
کے دو سفر

(۱) ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ نومبر ۱۹۸۰ء
(۲) ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ ستمبر ۱۹۸۲ء

www.freepdfpost.blogspot.com

(۱۱)

جنوبی افریقہ

پہلا سفر

جنوبی افریقہ کے بعض مخلص مسلمانوں سے ایک مدت سے یہ اصرار چل رہا تھا کہ برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور یہ ناکارہ اس ملک کا دورہ کریں۔ پچھلے دنوں ہماری مصروفیات اس قسم کی رہیں کہ اس فرمائش کی تعمیل کی نوبت نہ آسکی۔ بالآخر ۲۲ رذی الحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۲ رنومبر ۱۹۸۰ء کو سفر کی نوبت آئی۔ تقریباً دس گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد ایک رات کینیا کے دارالحکومت نیروبی میں گزاری اور ۳ رنومبر کی صبح وہاں سے برٹش ایرویز کے ذریعے روانہ ہوکر ساڑھے بارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ پہنچے۔ ہوائی اڈے پر اطراف کے مسلمانوں اور اہل علم کا بڑا مجمع موجود تھا، جوہانسبرگ سے تقریباً تیس میل دور ایک بستی آزادول میں جناب احمد حسن لہر صاحب کے مکان پر قیام ہوا۔

جنوبی افریقہ اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے، قدرت نے اس علاقے کو معدنی اور زرعی وسائل سے مالا مال فرمایا ہے۔ یہاں سونے، پلاٹینم، چاندی اور یورینیم کی کانیں ہیں، اور کہتے ہیں کہ دنیا کا تقریباً تین چوتھائی سونا اس ملک سے پیدا ہوتا ہے۔ آب وہوا، قدرتی مناظر اور زرعی پیداوار کے لحاظ سے بھی یہ خطہ دنیا کے ممتاز علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اصل میں یہ ملک مختلف سیاہ فام افریقی قبائل کا مسکن تھا، پھر اس پر انگریزوں نے قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کی، اور ایک مدت کے بعد ڈچ قوم نے اسے بزورِ شمشیر انگریزوں سے چھین کر وہاں اپنی حکومت قائم کرلی جو اب تک

www.freepdfpost.blogspot.com

چلی آتی ہے اور اسی طرح رہوڈیشیا (موجودہ زمبابوے) کے آزاد ہونے کے بعد پورے براعظم افریقہ میں صرف یہی ملک ایسا ہے، جو ابھی تک گوروں کے زیر تسلط ہے اور جہاں ابھی تک مقامی باشندوں کی حکومت قائم نہیں ہوسکی۔ اور حاکم قوم نے اس ملک کو تمدنی اور صنعتی اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے معیار پر لانے کیلئے جتنی کوشش یہاں کی ہے وہ کسی اور ملک میں نہیں، چنانچہ یہاں کے بڑے شہر جوہانسبرگ، پریٹوریا اور ڈربن تمدنی اور قدرتی حسن کے لحاظ سے لندن اور نیویارک سے زیادہ ہوں تو ہوں، کم کسی طرح نہیں ہیں۔

یہ ملک چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ ٹرانسوال، نٹال، اورنج فری اسٹیٹ اور کیپ پراونس۔ ان میں سے اورنج فری اسٹیٹ تو خالصتاً گوروں کا صوبہ ہے جس میں کسی اور قوم کو بسنے کی اجازت نہیں، باقی تین صوبوں میں پانچ قسم کی اقوام آباد ہیں۔ (۱) گورے: جو برسراقتدار قوم ہیں۔ اور ان میں یہودی اور عیسائی دونوں مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ (۲) کالے: جو ملک کے اصل باشندے ہیں اور ملک میں بھاری اکثریت انہی کی ہے۔ لیکن حقوق کے لحاظ سے وہ اس ملک کی مظلوم ترین قوم ہے، ان کی اکثریت عیسائی ہے۔ (۳) کلرڈ: یعنی رنگین قوم، جو گوروں اور کالوں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ (۴) انڈین: جو اصلاً ہندوستان کے باشندے تھے، لیکن تجارت اور کاروبار کی غرض سے یہاں آباد ہوگئے۔ ان میں زیادہ تر بمبئی، سورت اور گجرات وغیرہ کے حضرات ہیں۔ مدارس اور کیرالہ کے بھی ہندو بھی اس زمرے میں آتے ہیں، لیکن ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پانچویں قوم ملائی کہلاتی ہے یہ اصلاً ملایا کے باشندے ہیں، اور جس زمانے میں انگریز بیک وقت ملایا اور جنوبی افریقہ دونوں پر برسراقتدار تھا، اُس وقت انہوں نے کچھ ملائی مسلمانوں کو قیدی بنا کر یہاں بھیج دیا تھا، اُن سے یہ نسل چلی، یہ بیشتر مسلمان ہیں اور ان کی بڑی تعداد کیپ پراونس میں آباد ہے۔

ہمیں دعوت دینے والے انڈین مسلمان تھے، یہ زیادہ تر گجرات اور سورت کے آس پاس کے رہنے والے حضرات ہیں، ان کے آباء واجداد نے کسی زمانے میں جنوبی افریقہ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ یہ حضرات بنیادی طور پر نہایت دین دار، علماء اور اہل اللہ سے وابستہ اور دین کی غیر معمولی طلب رکھنے والے لوگ ہیں۔ جنوبی افریقہ کا تمام ماحول کفر وفسق کی تاریکیوں میں

ڈوبا ہوا ہے، لیکن ان حضرات نے بڑی محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ اس مشکل ماحول میں اپنے دینی تشخص اور دینی زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان حضرات کی بھاری تعداد اپنی دینی تصلّب کے معاملے میں شاید بہت سے اسلامی ملکوں کے عام مسلمانوں سے بھی آگے ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے خالص مغربی ماحول میں یہاں کے مسلمانوں میں اکثر وبیشتر رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل پیرا ہونے کا قابل رشک جذبہ نظر آتا ہے، اور غور کرنے سے ظاہر اسباب میں اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، اور وہ یہ کہ ان حضرات نے جنوبی افریقہ میں آباد ہونے کے بعد اپنا مسلسل رابطہ ہندوستان اور پاکستان کے اکابر علماء اور بزرگوں سے استوار رکھا ہے، یہاں کے بیشتر مسلمان خط وکتابت کے ذریعے ہندوستان یا پاکستان کے کسی نہ کسی بزرگ سے وابستہ ہیں اور ان سے اصلاح وتربیت کا تعلق رکھتے ہیں، اس کے علاوہ برصغیر کے علماء اور بزرگوں کو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ دعوت دیتے رہتے ہیں، اور ملک بھر میں ان کے مواعظ وملفوظات اور خصوصی مجلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کی بڑی تعداد جوق در جوق شریک ہوتی ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ احقر کے والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم وقتاً فوقتاً یہاں دورے کرتے رہے ہیں اور ان حضرات کے فیوض وبرکات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اب کچھ عرصے سے بفضلہ تعالیٰ تبلیغی جماعت کا کام بھی یہاں بہت پھیل گیا ہے، اور اس سے فضا میں اور زیادہ خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں میں تبلیغی جماعت کا کام بڑا عظیم فائدہ ظاہر ہوا ہے اور اب بستی بستی میں یہ مبارک کام پھیل رہا ہے۔

آج سے تقریباً چودہ سال پہلے احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے یہاں کا ایک تفصیلی دورہ کیا تھا، اور بفضلہ تعالیٰ ڈیڑھ ماہ کے اس دورے کے حیرت انگیز اثرات اب تک کھلی آنکھوں نظر آتے ہیں۔ نہ جانے کتنی زندگیوں میں اس دورے کی بدولت انقلاب برپا ہوگیا، کتنے بھٹکے ہوئے لوگ دین کے راستے پر لگ گئے، کتنوں کے دل کی دنیا بدل گئی،

www.freepdfpost.blogspot.com

فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے کتنے لوگ ہمیشہ کیلئے تائب ہوگئے اور ان کی زندگی استوار ہوگئی۔ ایسے لوگ اب بھی وہاں موجود ہیں جو برملا یہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی زندہ کرامت ہے۔ پھر ان حضرات کی ایک بڑی تعداد مسلسل خط و کتابت کے ذریعے حضرت والد صاحبؒ سے وابستہ رہی اور آپ سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم رکھا۔ انہی میں سے بعض ہمارے داعی اور میزبان تھے۔

ایک مہینے کے اس قیام میں جنوبی افریقہ کے دو صوبوں ٹرانسوال اور نیٹال کے بیس سے زائد شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا، جن میں جوہانسبرگ، پریٹوریا، کروگرس ڈروپ، لینیشیا، رسٹمن برگ، روشنی، بنونی، مڈل برگ، باربٹن، نیلس پرٹ، ہیک پورٹ، برنز، ڈربن، پیٹر میرنز برگ اور نونگاتھ وغیرہ کے نام اس وقت یاد رہ گئے ہیں اور بہت سے شہروں کے نام یاد نہیں رہے۔ بیشتر مقامات پر برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی یا احقر کو عام جلسوں اور خصوصی اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، تقریباً ہر جگہ مسلمانوں کا دینی ذوق وشوق اور جذبہ قابل دید تھا، لوگ وعظ میں شرکت کیلئے بعض مرتبہ سو ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے آئے اور ان کے سوالات سے ان کی طلب کا اندازہ ہوتا تھا۔

کچھ عرصے سے وہاں کے مسلمانوں میں ایک تشویشناک مسئلہ یہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہاں کے نوجوان رفتہ رفتہ اردو اور گجراتی زبان سے بالکل بے خبر ہوتے جارہے ہیں، گھروں کی عام زندگی انگریزی ہوچکی ہے، بچے کے پیدا ہونے کے بعد ماں باپ بھی اس سے انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بچوں کی مادری زبان انگریزی بن چکی ہے اور اردو یا گجراتی نہیں سمجھتے، اور چونکہ اس علاقے میں مسلمانوں تک دینی معلومات کے پہنچنے کا راستہ اردو یا گجراتی ہی تھا، اس لئے اب جو نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ دینی معلومات سے دور ہوتی چلی جارہی ہے، اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے اب وہاں کے علماء بھی مسجدوں میں انگریزی ہی میں تقریر کرنے لگے ہیں، اور مکاتب و مدارس میں درس بھی انگریزی ہی میں ہونے لگا ہے۔

ہمارے خطابات عام طور سے عشاء کے بعد مسجدوں میں ہوئے اور وہ بیشتر اردو ہی

میں تھے، لیکن کچھ نوجوانوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جو لوگ اُردو میں وعظ پوری طرح نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے الگ نشستیں انگریزی میں رکھی جائیں، چنانچہ بہت سے شہروں میں عصر کے بعد ایک نشست ایسے نوجوانوں کیلئے الگ رکھی گئی، اس میں احقر نے انگریزی میں خطاب کیا، اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ مغرب تک رہا۔ احقر انگریزی کی شد بد رکھنے کے باوجود انگریزی میں برجستہ تقریر کا عادی نہیں، لیکن ضرورت کے پیش نظر اس آزمائش کو قبول کیا اور یہ وہاں کے حضرات کے دینی جذبے کی برکت اور اُن کی طلب کی سچائی تھی کہ انہوں نے احقر کی ان ٹوٹی پھوٹی گزارشات کو نہ صرف برداشت کیا، بلکہ احقر کی ہمت افزائی بھی فرمائی۔

برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم نے عمومی جلسوں سے خطاب کے علاوہ تقریباً ہر جگہ خصوصی مجالس سے بھی خطاب فرمایا اور اس میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ، حضرت والد صاحبؒ، اور مرشدی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات و ارشادات سنانے کا سلسلہ جاری رکھا، جس سے بحمد اللہ بہت فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد شہروں میں خواتین کے بہت سے اجتماعات سے بھی خطاب فرمایا، اور وہاں کے حالات کے مناسب نہایت مفید ہدایتیں فرمائیں، جن کا بحمد اللہ خوشگوار اثر ظاہر ہوا۔

سفر کے آخر میں جمعیت علماء ٹرانسوال کی طرف سے جوہانسبرگ کی مسجد نیوٹاؤن میں علماء کا ایک خصوصی اجتماع بھی رکھا گیا، جس میں صوبے کے اطراف سے تقریباً چالیس علماء شریک ہوئے۔ اس مجلس میں جنوبی افریقہ کے بہت سے دینی، تبلیغی اور فقہی مسائل پر مفید تبادلۂ خیال ہوا۔

.....☆.....☆.....

پہلے انڈین حضرات گوروں کے شہروں میں ملے جلے رہتے تھے، لیکن کچھ سال پہلے جنوبی افریقہ کی حکومت نے ''گروپ ایریا ایکٹ'' کے نام سے نیا قانون نافذ کیا جس کی رُو سے ہر بڑے شہر کے ساتھ انڈین حضرت کیلئے الگ شہر بسانے کا حکم دیا گیا، اس نئے

www.freepdfpost.blogspot.com

قانون کے تحت کوئی انڈین گوروں کے کسی شہر میں نہیں رہ سکتا، چنانچہ انڈین حضرات اپنے آبائی مکانات فروخت کر کے نئے شہروں میں مکانات بنانے پر مجبور ہوئے، اور اب کئی سال گزرنے کے بعد انتقالِ آبادی کا یہ عمل قریب التکمیل ہے، اور ہر بڑے شہر سے کچھ فاصلے پر ایک انڈن شہر آباد ہے۔ جہاں جنوبی افریقہ کے صرف ہندی الاصل باشندے سکونت پذیر ہیں۔ انتقالِ آبادی کا یہ عمل شروع میں تو ہندی الاصل باشندوں پر بہت گراں گزرا، کیونکہ برسوں کے رسے بسے لوگ اس قانون کی بناء پر اپنے مکانات چھوڑنے اور نئے مکانات تعمیر کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن دینی اعتبار سے مآلِ کار یہ بات مسلمانوں کیلئے مفید ہی ثابت ہوئی۔ انڈین حضرات میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس لئے ان علیحدہ آبادیوں میں ان کیلئے اپنے اسلامی شعائر اور اسلامی آداب و معاشرت کا تحفظ زیادہ آسان ہوگیا۔ ملی جلی آبادیاں خاص طور سے بچوں اور نئی نسلوں کیلئے بہت مضر ہوسکتی تھیں، اور گوری قوموں کے اختلاط سے مسلمان بچوں کا دینی مستقبل خطرے میں تھا، ان علیحدہ آبادیوں کی وجہ سے مسلمان اپنے دینی شعائر کا تحفظ زیادہ اہتمام کے ساتھ کر سکتے ہیں، نیز بچوں کی تربیت بھی نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔ یہاں مسلمانوں نے جو عالیشان اور خوبصورت مسجدیں تعمیر کی ہیں، بہت سے ملکوں میں ایسی صاف ستھری اور خوبصورت مسجدیں نہیں ملیں گی، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ مسجدیں صرف ظاہری حسن ہی کے اعتبار سے معیاری نہیں ہیں، بلکہ بحمد للہ وہ نمازیوں سے آباد ہیں، صرف عمر رسیدہ افراد نہیں، بلکہ نوجوان اور نوخیز لڑکے بھی مسجدوں میں حاضر ہوتے ہیں، وہاں تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں، عشاء کے بعد تبلیغی نصاب کا اجتماعی مطالعہ ہوتا ہے، اور دینی سرگرمیوں کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ ان اسلامی شعائر کے اہتمام کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اپنی ظاہری وضع قطع کو موافق سنت بنانے کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے، نوجوانوں میں بھی ایک بڑی تعداد کے چہروں پر خوبصورت داڑھیاں ہیں اور کسی بڑے مجمع میں جائیں تو وہاں باریش مسلمانوں کا تناسب شاید پاکستان سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔

بچوں کی دینی تعلیم اس قسم کے غیر مسلم ممالک میں سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے، لیکن

ماشاء اللہ یہاں کے علماء نے اس مسئلے کو بھی خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، ہر مسلمان آبادی میں ایک ابتدائی دینی مدرسہ قائم ہے جس میں ظہر سے عصر تک تعلیم ہوتی ہے۔ بچے سرکاری اسکولوں سے فراغت کے بعد یہاں آتے ہیں اور عصر تک پڑھتے ہیں۔ ان مدارس میں قرآنِ کریم حفظ و ناظرہ، تعلیم الاسلام، اردو اور ابتدائی دینیات پڑھانے کا انتظام ہے اور سات سال کے نصاب میں قرآنِ کریم اور دین کی ضروری معلومات فراہم کردی جاتی ہیں۔ ان مدارس کا انتظام ٹرانسوآل میں جمعیت علماء ٹرانسوآل کرتی ہے۔ اور اسی کی نگرانی میں امتحانات وغیرہ ہوتے ہیں۔ جمعیت علماء ٹرانسوآل کے ناظم اعلیٰ مولانا ابراہیم میاں صاحب ہیں۔ جنہوں نے پریٹوریا سے کچھ فاصلے پر واٹر فال کے مقام پر ایک فارم میں اپنا مرکز قائم کیا ہوا ہے، مولانا ابراہیم میاں صاحب، میاں برادر کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے امام العصر حضرت مولانا سیّد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں کے زیرِ سایہ علم و دین کی گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ اب وہ واٹر فال کے اسلامی مرکز کے ذریعے ٹرانسوآل میں دین کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں، اور ان کی مبارک جدوجہد کے آثار نہ صرف پورے صوبے بلکہ پورے ملک میں محسوس ہوتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے جس شہر میں بھی جانا ہوا، وہاں مدارس نظر آئے، اور ان میں پڑھانے والے مساجد کے ائمہ و خطباء تمام تر دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل یا ان کے فیض یافتہ دوسرے مدارس کے فارغ التحصیل حضرات ہیں، اور ہر جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دیوبند کے چشمہ خیر نے دنیا کے کیسے دور دراز کے گوشوں تک فیض پھیلایا ہے۔ اس ملک میں جو جنوب کے اندر دنیا کے بالکل آخری سرے پر واقع ہے، اور جہاں کفر و فسق کی گرم بازاری اپنے عروج پر ہے، وہاں دین کا کلمہ انہی بوریہ نشینوں کی خاموش جدوجہد کے ذریعے زندہ و سربلند ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کا بایں فیوض سلامت رکھے اور مسلمانوں کو ان سے بیش از بیش مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین

جنوبی افریقہ میں متوسط تعلیم کے دو دینی مدرسوں میں بھی حاضری ہوئی، ایک مدرسہ تو واٹر فال میں ہے اور اس کے مہتمم مولانا ابراہیم میاں صاحب ہیں، اس مدرسے میں

www.freepdfpost.blogspot.com

قرآنِ کریم حفظ و ناظرہ اور ابتدائی اردو دینیات کے علاوہ عربی زبان اور درسِ نظامی کی متوسط کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، طلبہ کیلئے دارالاقامہ بھی ہے اور ایک دارالافتاء بھی ہے جس کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم سنجالوی صاحب ہیں۔ یہاں سے مختلف دینی موضوعات پر انگریزی زبان میں مفید لٹریچر کی نشر و اشاعت کا بھی انتظام ہے، اور مسلمانوں کی دینی ضروریات سے متعلق رسائل و کتب کا بڑا ذخیرہ یہاں سے شائع ہوا ہے۔ اس مدرسے میں تقریباً تمام دن گزارنے کا موقع ملا اور اساتذہ و طلبہ سے علمی و دینی مذاکرہ ہوتا رہا۔

دوسرا مدرسہ صوبہ نیٹال میں نیوکاسل کے مقام پر ہے اور اس کا نام دارالعلوم ہے، اس کے منتظمِ اعلیٰ مولانا محمد اسحاق سیمہ صاحب ہیں، اور یہاں بھی مشکوٰۃ المصابیح کے معیار تک درسِ نظامی کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہ مدرسہ شہر کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر واقع ہے، اور ایک چرچ کی عمارت خرید کر قائم کیا گیا ہے، یہاں بھی ایک دارالاقامہ ہے اور جنوبی افریقہ کے تمام صوبوں کے طلباء یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مولانا محمد اسحاق سیمہ صاحب ڈابھیل کے فارغ التحصیل ہیں اور مدرسے کے دوسرے اساتذہ پاکستان کے دینی مدرسوں کے فضلاء ہیں، انہی میں سے ایک استاد مولانا محمد یونس صاحب ہمارے دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور چند سال قبل یہاں سے فارغ ہو کر گئے ہیں۔

صوبہ نیٹال میں نیوکاسل کے علاوہ ڈربن، ٹونگاٹھ اور پیٹر میرٹز برگ بھی جانا ہوا۔ ڈربن اس صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے اور بحرِ ہند کے کنارے واقع ہے، جنوبی افریقہ کے جتنے شہر ہم نے دیکھے ان میں یہ شہر اپنے حسین قدرتی مناظر اور معتدل آب و ہوا کے لحاظ سے سب سے زیادہ خوبصورت ہے، یہاں بھی جمعیت علماء نیٹال کے نام سے علماء کی ایک تنظیم قائم ہے، اس کے سیکریٹری جنرل مولانا محمد یونس پٹیل دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور نوجوان ہونے کے باوجود بڑی فعال اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں، جمعیت کو حضرت مولانا بخاری اور حضرت مولانا عبدالحق عمرجی جیسے تجربہ کار علماء کی سرپرستی حاصل ہے۔ مولانا احمد عمر صاحب جن کے یہاں ہمارا قیام ہوا، ان کا تعلق بھی جمعیت سے ہے اور انہوں نے پُرخلوص میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر

عطا فرمائیں۔ آمین

ڈربن میں جنوبی افریقہ کے ہندی الاصل باشندوں کے لئے ایک الگ یونیورسٹی بھی قائم ہے، یہاں کے اسلامیات اور اسلامی تاریخ کے شعبوں میں حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اعلیہ کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان ندوی اور معروف اہلِ قلم پروفیسر حبیب الحق ندوی صاحب پروفیسر ہیں۔ ان دونوں حضرات نے بھی ڈربن کے قیام کے دوران اپنی مخلصانہ رفاقت کا شرف بخشا۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور خاص طور پر کتبہ خانہ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب کی رہنمائی میں دیکھا۔

.....☆.....☆.....

جنوبی افریقہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ وہاں کی سیاہ فام مقامی آبادی کا ہے، اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام آبادی سیاسی اعتبار سے دنیا کی سب سے مظلوم قوم ہے۔ جنوبی افریقہ کے اصل باشندے اور اسّی فیصد اکثریت ہونے کے باوجود یہ لوگ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم ہیں، ووٹ دینا اور پارلیمنٹ میں نمائندگی تو بڑی بات ہے جس کا یہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کیلئے شہروں میں رہنا بھی ممنوع ہے، دن بھر جن شہروں میں محنت مزدوری کرتے ہیں، وہاں نہ صرف یہ کہ اپنا کوئی مکان نہیں بنا سکتے، بلکہ وہاں رات گزارنا بھی ان کیلئے جائز نہیں، ان کی رہائش کیلئے عام شہروں سے کافی فاصلے پر الگ بستیاں آباد ہیں، اور ان بستیوں کا حال یہ ہے کہ جس ماحول میں جوہانسبرگ اور پریٹوریا وغیرہ اپنی ظاہری چمک دمک کے اعتبار سے لندن اور نیویارک کو مات کر رہے ہیں وہاں سیاہ فام باشندوں کی بعض بستیاں بجلی تک کی سہولت سے محروم ہیں، جو لوگ بڑے شہروں میں کام کرتے ہیں وہ پو پھٹتے ہی اپنی بستیوں سے روانہ ہوتے ہیں اور رات گئے واپس پہنچتے ہیں، اگر کسی شخص کو شہر میں مکان خریدنے یا کرائے پر لینے کی استطاعت ہو تو وہ بھی قانونی پابندی کی وجہ سے شہروں میں نہیں رہ سکتا۔ ملک بھر میں سفید فام نسل اور ہندی الاصل باشندوں کے لئے تعلیم مفت ہے، لیکن سیاہ فام باشندوں کی تعلیم پر فیس مقرر ہے۔ ایک ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

معیار کا کام سفید فام کرتے تو اس کی تنخواہ زیادہ اور سیاہ فام کرے تو اس کی تنخواہ نصف ہے۔ نہ جانے کتنے پبلک مقامات ایسے ہیں جہاں سفید فام نسل کے کتے جا سکتے ہیں لیکن سیاہ فام افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔ سیاہ فام افراد پر یہ پابندی ہے کہ وہ ہر وقت اپنا پرمٹ اپنے ساتھ رکھیں، پولیس والے کسی بھی وقت کسی کالے آدمی کو پکڑ کر اس کا پرمٹ مانگ سکتے ہیں، اور اگر وہ اس کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو مزید تحقیق کے بغیر اس کو حوالات میں بند کر دیتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ساری دنیا میں قیدیوں کی تعداد یہاں سب سے زیادہ ہے۔

یہ انسانیت سوز اندھیر گردی اس ملک میں ہو رہی ہے جسے ''مہذب'' اور ''ترقی یافتہ'' ملک کہا جاتا ہے، اور یورپ اور امریکہ کے وہ ''مہذب'' ممالک جو صبح و شام ''عوام کی حکمرانی'' اور ''آزادی و حق خود اختیاری'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، اور جنہوں نے ساری دنیا میں اپنے آپ کو ''جمہوریت'' کا علمبردار باور کرایا ہوا ہے، وہ ظلم و استبداد کے یہ لرزہ خیز مناظر کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں، لیکن اُن کے دل میں ''انصاف پسندی'' کی کوئی لہر اس معاملے میں نہیں اُٹھتی۔ افریقہ اور ایشیاء کے غریب ممالک نے جنوبی افریقہ کی موجودہ حکومت کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے۔ لیکن یورپ اور امریکہ کے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں، اور سونے کی کانوں نے حق و انصاف کی ہر آواز کے لئے ان کے کان بند کر رکھے ہیں۔

جنوبی افریقہ کا اصل مسئلہ اس مظلوم و مقہور اور دھتکاری ہوئی قوم تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے، ان لوگوں کی اکثریت عیسائی ہے اور ان کی ہم مذہب حکمران قوم نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس کے باوجود عیسائی مشنریاں ان کی بستیوں میں سرگرمی سے کام کر رہی ہیں، اگر مسلمان مبلغین اُن کو دینِ حق سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ محبت و اُلفت اور عدل و مساوات بھی فراہم کر سکے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے تو یہ قوم جسے دوسری نسلوں کی طرف سے نفرت و حقارت اور ظلم و جور کے سوا کچھ نہیں ملا، یہ بہت جلد اسلام کی طرف آ سکتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اپنی قابلِ رشک اسلام دوستی کے باوجود اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی، اور تکلیف دہ بات یہ ہے

کہ ان کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ عام طور سے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ حکمران قوم کے رویے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سیاہ فام آبادی ہندی الاصل مسلمانوں کے بارے میں بھی وہی تاثرات رکھتی ہے جو سفید فام قوم کے بارے میں اس کے تاثرات ہیں۔

یہ صورتِ حال ایک اہم دینی فریضے سے غفلت تو ہے ہی، خود جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کے مستقبل کیلئے بھی نہایت خطرناک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سفید فام قوم کی طرف سے ملک کے اصلی باشندوں پر ظلم و ستم کی یہ حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی، ایک نہ ایک دن وہاں استعمار کا سورج اسی طرح غروب ہو کر رہے گا جیسے زمبابوے، موزنبیق، اور دوسرے افریقی ملکوں میں ہوا ہے۔ خود جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنے قوانین میں بتدریج نرمی کرنے پر مجبور ہو رہی ہے، لہٰذا ایک نہ ایک دن یہ مجبور و مقہور اکثریت استعمار کے ایوانوں کو ڈھا کر اس ملک کی زمامِ اقتدار سنبھالے گی۔ اور اگر یہاں کے مسلمانوں نے اُن میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کو عام نہ کیا، اور اُن کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کیا جو اسلامی عدل و مساوات کا تقاضہ ہے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ یہ بپھری ہوئی اکثریت مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی؟

برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور احقر جنوبی افریقہ کے مسلمان عوام، اداروں اور انجمنوں کی خدمت میں ہر جگہ یہ گزارش کرتے رہے کہ وہ اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ دیں۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ اب یہ احساس مسلمانوں میں پیدا ہو رہا ہے، اور بعض مقامات پر اس سمت میں کوششیں شروع بھی ہو گئی ہیں، لیکن یہ کام اتنا بڑا، اتنا دیر طلب اور اتنا صبر آزما ہے کہ محض چند اشخاص یا اداروں کے بس کا نہیں ہے۔ لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ممالک کی حکومتوں کو اس طرف توجہ دینی چاہئے، اگر مسلمان ممالک، بالخصوص سعودی عرب اور پاکستان اس معاملے میں اپنے فرائض کو محسوس کر کے اس علاقے میں تبلیغ و دعوت پر مستقل طور پر اپنے وسائل صرف کریں تو انشاء اللہ بڑے فوائد کی توقع ہے۔ کاش کہ مسلمان ممالک اس قابل ہو سکیں کہ وہ اپنے مخصوص مسائل سے ہٹ کر

www.freepdfpost.blogspot.com

دوسرے اُن ممالک کے حالات کی طرف بھی توجہ دے سکیں، جہاں انسانیت اسلام کے پیامِ عدل ومساوات کے لئے تڑپ رہی ہے۔

.....☆.....☆.....

ناسپاسی ہوگی اگر آخر میں جنوبی افریقہ کے اُن احباب اور بزرگوں کا ذکر نہ کروں جنہوں نے اس سفر کے دوران اپنے خلوص ومحبت اور مہمان نوازی کے انمٹ نقوش دل ودماغ پر ثبت کئے، یوں تو وہاں کا ہر مسلمان ہمیں خلوص ومحبت کا پیکر نظر آیا۔ لیکن خاص طور پر جن حضرات کا ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے، اُن میں جناب احمد حسن لہر صاحب اور ان کے صاحبزادے عبدالحق صاحب تو ہمارے براہِ راست میزبان تھے، جن کا مکان ہمارے قیام کے دوران چہل پہل کا مرکز رہا اور انہوں نے میزبانی کا حق ادا کردیا۔ نیز برادرِ محترم محمد اسماعیل کھرا صاحب کا یہ خلوص ہر شکریے سے بالاتر ہے کہ انہوں نے ایئرپورٹ پر پہلی ملاقات سے لے کر رخصت کے آخری وقت تک مسلسل اپنی پُرلطف رفاقت سے ہمیں محظوظ کیا، اور راحت رسانی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، اور اس غرض کیلئے ایک ماہ تک ملازمت اور اپنی گھریلو مصروفیات سب سے دستبردار رہے۔ وراچھیہ فیملی بالخصوص سلیمان وراچھیہ، امین وراچھیہ اور ابوبکر وراچھیہ صاحبان تو ہمیشہ سے ہمارے لئے حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں اور اس موقع پر انہوں نے اس اخوت کا حق ادا فرمایا۔ ان کے علاوہ کروگرس ڈروپ اور آزادول میں محمد ہاشم لونات صاحب، ابراہیم دسو صاحب، احمد پٹیل صاحب، احمد بدات صاحب، یوسف ایبجی صاحب، اویوسف نانا بھائی صاحب، مڈل برگ کے حافظ محمد سعید صاحب، رشید بھائجی اور رشید چوتھیا صاحبان اور ڈربن کے مولانا محمد عمر صاحب بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔ جن کی محبت اور خلوص کے اظہار کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دنیا وآخرت میں ظاہری وباطنی ترقیات عطا فرمائیں اور عافیت دارین کی دولت سے نوازیں۔ آمین ثم آمین

.....☆.....☆.....

جنوبی افریقہ سے واپسی پر ایک رات نیروبی میں گزاری، اور وہاں سے براہِ خرطوم

عمرہ کیلئے مکہ مکرمہ حاضری کی توفیق ملی، چار دن مکہ مکرمہ اور پانچ دن مدینہ طیبہ میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی، اور ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ؎

اگر جنت بریں رُوئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

.....☆.....☆.....

دوسرا سفر

رمضان المبارک کے آغاز کی بات ہے کہ جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ سے مجھے اپنے دوست ابوبکر وراچھیا کا ایک تار موصول ہوا۔ اس تار میں کہا گیا تھا کہ کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں قادیانیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک درخواست دائر کرکے عبوری حکم امتناعی حاصل کرلیا ہے، اس مقدمے میں مسلمانوں کی طرف سے جوابی کارروائی میں مدد دینے کیلئے آپ کی فوری حاضری ضروری ہے، تار میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکم امتناعی کی توثیق کیلئے ۶ راگست کی تاریخ مقرر ہوئی ہے، چونکہ پاکستان سے فون یا ٹیلیکس کے ذریعے جنوبی افریقہ سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہیں، اس لئے میں نے تار ہی کے ذریعے جواب دیا، اور مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر آنے کا وعدہ کرلیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک اور ٹیلی گرام سے معلوم ہوا کہ اب حکم امتناعی کی توثیق کی تاریخ بڑھ گئی ہے، نیز یہ کہ کیپ ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے احباب نے فون پر بار بار مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اس دوسرے تار کے جواب میں احقر نے اپنے پاسپورٹ وغیرہ کی تفصیلات جنوبی افریقہ روانہ کردیں، تاکہ وہاں ویزا کیلئے کوشش کی جاسکے۔

حکم امتناعی کی توثیق کی نئی تاریخ ۹ ستمبر مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران معلوم ہوا کہ کیپ ٹاؤن کے بعض مسلمانوں نے حکومت پاکستان، رابطۂ عالم اسلامی اور بعض دوسرے حضرات سے بھی اس مقدمے میں مدد کی درخواست کی ہے۔ مسئلے کی اہمیت ہر مسلمان کو مسلّم تھی، اس لئے جس جس شخص سے اس بارے میں مدد کی فرمائش کی گئی وہ فوراً

www.freepdfpost.blogspot.com

جانے کیلئے تیار ہوگیا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جنوبی افریقہ سے سفارتی تعلقات نہ ہونے کے سبب ویزا وہیں سے آسکتا تھا، اور ۴ ستمبر تک کسی ایک شخص کا بھی ویزا موصول نہیں ہوا تھا، تاریخ کے قریب آنے کی وجہ سے اب پاکستان میں مزید انتظار ممکن نہ تھا، اس لئے رائے یہ ہوئی کہ یہاں سے روانہ ہوکر نیروبی پہنچ جائیں اور وہاں سے فون پر رابطہ قائم کرکے ویزا حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ۸/افراد کا ایک قافلہ سفر کیلئے تیار ہوگیا۔ ان میں سے احقر نجی دعوت کی بنیاد پر جارہا تھا، اُدھر مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے مولانا عبدالرحیم اشعر، مولانا مفتی زین العابدین، حاجی غیاث محمد صاحب (سابق اٹارنی جنرل پاکستان) اور ریاض الحسن گیلانی ایڈوکیٹ بھی جانے کیلئے تیار تھے۔ تیسرے رابطۂ عالم اسلامی کی طرف سے مولانا ظفر احمد انصاری اور (ریٹائرڈ) جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب کو نامزد کیا گیا، مولانا ظفر احمد صاحب انصاری نے سفر میں اپنی مدد کیلئے جناب عبدالمجید صاحب کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

اس طرح ۵/ستمبر کی شام کو سات بجے نو افراد کا یہ قافلہ پی آئی اے کے طیارے سے نیروبی روانہ ہوا، اور راستے میں دبئی رکتا ہوا مقامی وقت کے مطابق رات کے ایک بجے نیروبی پہنچا، یہاں کینیا میں پاکستانی سفیر بریگیڈیئر اشرف صاحب اپنے عملہ کے ساتھ استقبال کیلئے موجود تھے، رات کو ہوٹل ہلٹن میں قیام ہوا، اور اگلا سارا دن جنوبی افریقہ سے فون پر رابطہ قائم کرکے ویزا کے حصول کی کوشش میں صرف ہوا، بالآخر شام چار بجے جوہانسبرگ سے ابوبکر وراچھیا صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ ویزا کا انتظام ہوگیا ہے، اور انشاء اللہ تمام حضرات کو جوہانسبرگ کے ایئرپورٹ پر ویزا مل جائے گا۔

چنانچہ منگل ۷ ستمبر کی صبح کو نو بجے کے ایل ایم کے طیارے کے ذریعے ہم نیروبی سے روانہ ہوئے اور تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد مقامی وقت کے مطابق ساڑھے بارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ کے جان اسمٹس ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہاں احباب کا ایک بڑا مجمع استقبال کیلئے موجود تھا۔ طے یہ ہوا کہ آج کا دن جوہانسبرگ ہی میں ٹھہر کر مقدمے کی تفصیلات معلوم کی جائیں، واٹرفال کے مدرسے کے مہتمم مولانا ابراہیم میاں صاحب

نے سب حضرات کے قیام کا انتظام اپنے مدرسہ میں کیا، انتہائی مستعدی کے ساتھ مقدمے کے کاغذات کی کاپیاں ہم سب کو فراہم کیں، اور عصر کے بعد کچھ مقامی وکلاء کو جمع کرلیا تاکہ وہ اس ملک کے عدالتی طریق کار کے بارے میں ہمیں ضروری معلومات فراہم کرسکیں۔

جنوبی افریقہ کا عدالتی طریق کار ہمارے ملک کے طریق کار سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں مدعی مدعا علیہ پر اصل مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ہی اپنی شکایت کو مختصراً بصورتِ درخواست عدالت کے سامنے پیش کرکے عبوری حکم حاصل کرسکتا ہے، اس غرض کے لئے اُسے ایک بیانِ حلفی داخل کرنا پڑتا ہے، جس میں وہ مختصراً اپنی شکایت بیان کرکے اپنے اس ارادے کا اظہار کرتا ہے کہ میں اس شکایت کی بنیاد پر مدعا علیہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والا ہوں، لیکن چونکہ مقدمے کی کارروائی میں دیر لگنے کا امکان ہے۔ اس لئے مجھے اس مدت کیلئے عبوری حکم مطلوب ہے۔ اگر عدالت سمجھے کے بادی النظر میں مقدمے کی کوئی بنیاد ہے تو وہ فریق ثانی کا مؤقف سنے بغیر یکطرفہ طور پر بھی عبوری حکم امتناعی جاری کرسکتی ہے، لیکن اس کے بعد فریق ثانی سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا مؤقف ظاہر کرنے کیلئے بیانِ حلفی داخل کرے، پھر ایک معین تاریخ پر دونوں فریقوں کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اُس یکطرفہ حکم امتناعی کو ختم کیا جائے یا اس کی توثیق کی جائے۔ حکم امتناعی کی توثیق یا عدمِ توثیق کا فیصلہ ہونے کے بعد مدعی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایک معین مدت تک اپنا اصل کیس دائر کرے، جسے یہاں کی اصطلاح (Main Actin) کہتے ہیں۔ اس ایکشن کی صورت میں فریقین کے گواہان کی پیشی اور مقدمے کی تفصیلی کارروائی کے بعد مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے جس میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔

کیپ ٹاؤن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چھبیس ہزار ہے اور مرزائیوں کی تعداد دو سو سے بھی کم ہے۔ یہاں انہوں نے ''احمدیہ انجمن لاہور'' کی ایک شاخ ''احمدیہ انجمن اشاعت اسلام'' کے نام سے قائم کی ہوئی ہے۔ اواخر شعبان میں اس انجمن نے کیپ ٹاؤن کے پانچ دینی رہنماؤں کے خلاف کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں یہ درخواست دائر کی

www.freepdfpost.blogspot.com

کہ وہ ہمارے ارکان کو غیر مسلم قرار دیتے ہیں، چنانچہ نہ وہ ہم کو مسجدوں میں عبادت کرنے دیتے ہیں، نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ہم چونکہ اس سلسلے میں مدعا علیہم کے خلاف مفصل مقدمہ دائر کرنے والے ہیں جس کا فیصلہ ہونے میں کافی دیر لگ سکتی ہے، اس لئے مدعا علیہم کے خلاف اصل مقدمے کے فیصلے تک عبوری حکم امتناعی جاری کیا جائے، اُس وقت کے جج نے اپنے قواعد کے مطابق ان کو یکطرفہ طور پر حکم امتناعی دے دیا، شروع میں اس حکم امتناعی کی توثیق کیلئے ۶ راگست کی تاریخ مقرر ہوئی بعد میں اسے بڑھا کر ۹ رستمبر کر دیا گیا۔

اس دوران پانچوں مدعا علیہم کی طرف سے مفصل حلفی بیانات تیار کئے گئے اور ماہرین کے طور پر واٹر فال کے حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم سنجالوی اور ڈربن کے ڈاکٹر حبیب الحق ندوی نے بھی حلفی بیانات داخل کئے۔

.....☆.....☆.....

ان حلفی بیانات میں مرزائیت کی تاریخ، مرزا غلام احمد قادیانی کی حقیقت، اس کے درجہ بدرجہ دعوؤں اور عقیدۂ ختم نبوت کی تشریح کی گئی تھی، نیز یہ واضح کیا گیا تھا کہ مرزائیوں نے خواہ وہ قادیانی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں، یا لاہوری گروپ سے، کس طرح عقیدۂ ختم نبوت کی کھلم کھلا مخالفت کر کے اپنے آپ کو ملت اسلامیہ سے الگ کر لیا ہے، اور دنیائے اسلام نے کس طرح یک زبان ہو کر انہیں کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

جنوبی افریقہ میں رہتے ہوئے مرزائیت کے بارے میں جو بنیادی معلومات جمع کی جاسکتی تھیں۔ ان بیاناتِ حلفی میں وہ بڑی حد تک بیان کر دی گئی تھیں۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے موقع پر مسلمانوں کی طرف سے جو بیان حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر احقر اور مولانا سمیع الحق صاحب نے مرتب کیا تھا، اور جو "ملت اسلامیہ کا مؤقف" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ احقر کے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب نے کیا ہے، اور وہ مکتبہ دارالعلوم سے (Qadianism on Trial)

..... کے نام سے شائع ہوا ہے، دو سال پہلے دورۂ افریقہ کے دوران یہ کتاب میں اپنے بعض احباب کو دے کر آیا تھا، ان بیاناتِ حلفی کی ترتیب میں اس کتاب سے بھی کافی مدد لی۔

البتہ مقدمے کی تفصیلات اور یہاں کے عدالتی طرق کار کے پیش نظر یہ بات واضح تھی کہ فی الوقت سب سے اہم مسئلہ اُس حکم امتناعی کا انخلاء ہے جو تین ماہ پیشتر عدالت نے جاری کیا تھا، اور جس کی رو سے مسلمانوں پر یہ پابندی عائد ہو گئی تھی کہ وہ مقدمے کے دوران مرزائیوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے اور مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اس حکم امتناعی کے خلاف جو قانونی نکات اُٹھانے ضروری تھے ان کا ان بیاناتِ حلفی میں ذکر نہیں تھا۔

چنانچہ باہمی مشورے سے جو نکات ذہن میں آئے وفد کے معزز رکن جناب حاجی غیاث محمد صاحب سابق اٹارنی جنرل پاکستان نے اُن کو قلمبند کر کے ٹائپ کرا لیا۔

صبح آٹھ بجے ہم لوگ جوہانسبرگ سے بذریعہ طیارہ کیپ ٹاؤن کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً دس بجے کیپ ٹاؤن پہنچ گئے۔ ایئرپورٹ پر کیپ ٹاؤن کے علماء و مشائخ، مسلمان جماعتوں کے ذمہ دار حضرات اور عام مسلمانوں کی بڑی تعداد استقبال کیلئے موجود تھے۔

یہاں پہنچ کر مسلمانوں کے وکیل مسٹر اسماعیل محمد ایڈووکیٹ سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ جوہانسبرگ سے یہاں تک ہر شخص ان کی قانونی قابلیت، وکالت میں مہارت اور ذہانت و ذکاوت کے بارے میں رطب اللسان تھا۔ ملاقات کے دوران ہم نے واقعتاً انہیں ایسا ہی پایا۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس مقدمے سے ان کی دلچسپی صرف پیشہ ورانہ فرائض کی حد تک محدود نہیں، بلکہ وہ ذاتی جذبے اور اپنے ضمیر کی آواز کے تحت اس مقدمے کی پیروی کر رہے ہیں۔

وفد کی طرف سے جو نکات مرتب کئے گئے تھے، جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب اور حاجی غیاث محمد صاحب نے اسماعیل محمد صاحب سے اُن کی وضاحت کی، ان تمام نکات کو اُنہوں نے دلچسپی اور جذبہ تشکر کے ساتھ سنا، اور اپنی بحث میں اُن سے نہ

www.freepdfpost.blogspot.com

صرف پورا فائدہ اُٹھایا، بلکہ اپنے زورِ بیان اور مؤثر اندازِ تخاطب سے اُنہیں چار چاند لگا دیئے۔

۹ ستمبر کی صبح ساڑھے نو بجے کے قریب مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تھی، لیکن ۹ بجے سے ہی کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھر چکا تھا، یہاں تک کہ سامعین کی کثرت کی بنا پر کمرۂ عدالت تبدیل کرنا پڑا، اور ایک بڑے کمرے میں مقدمہ منتقل کیا گیا، جہاں جگہ بھی کشادہ تھی اور اوپر سامعین کیلئے ایک وسیع گیلری بھی موجود تھی، لیکن مقدمہ کا آغاز ہوتے ہوتے یہ کمرۂ عدالت اور گیلری بھی دونوں پوری طرح بھر گئے اور کہیں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ رہی، اس مقدمے سے مسلمانوں کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ دو دن تک صبح دس بجے سے شام ساڑھے چار بجے تک کارروائی جاری ہی، اور ربیبیوں افراد بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کے باعث پورے عرصے کھڑے رہ کر کارروائی سنتے رہے، حد یہ ہے کہ گیلری میں مسلمان خواتین بچوں کو گود میں انتہائی صبر واستقلال کے ساتھ بیٹھی رہیں۔

جج ایک عیسائی عورت تھی، مرزائیوں کی طرف سے دو یہودی وکیل پیروی کر رہے تھے۔ اور ایک نوجوان مرزائی وکیل ان کی مدد کر رہا تھا، مسلمانوں کی طرف سے اصل وکیل اسماعیل محمد ایڈووکیٹ تھے۔ پہلے دن مرزائیوں کے یہودی وکیل مسٹر ینگ کو حکم امتناعی کی توثیق کیلئے دلائل پیش کرنے تھے، لیکن اپنے دلائل پیش کرنے سے پہلے اُس نے کھڑے ہو کر یہ درخواست پیش کہ اس مقدمہ میں درخواست ''انجمن اشاعت اسلام لاہور'' کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اب ایک شخص مسٹر پیک کو اس درخواست کے شریک کی حیثیت میں مقدمے کا فریق بنایا جائے۔

اس درخواست کی منشاء دراصل اپنے مقدمے کی ایک قانونی کمزوری کو دور کرنا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اصل درخواست چونکہ ایک انجمن کی طرف سے پیش ہوئی تھی جو صرف ایک شخص قانونی (Legal Person) کی حیثیت رکھتی تھی، اور انسان نہیں تھی، اس لئے وہ نہ بحیثیت انجمن ہتکِ عزت کی دعویدار بن سکتی تھی، اور نہ قبرستان

میں دفن ہونے اور مسجد میں داخلے کا مطالبہ کر سکتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے اس درخواست کے خلاف ایک قانونی نکتہ یہ بھی پیش ہونے والا تھا۔

اس ممکنہ قانونی اعتراض کو دور کرنے کیلئے مرزائیوں کی طرف سے یہ درخواست پیش کی گئی تھی کہ تاکہ مسٹر پیک ایک حقیقی شخص کی حیثیت میں مذکورہ درخواست کا حق دار قرار پا سکے، اور اگر انجمن کی درخواست مسترد ہو تو کم از کم مسٹر پیک کی درخواست باقی رہ جائے۔

جج نے اس موقع پر مسلمانوں کے وکیل سے پوچھا کہ اس درخواست کے بارے میں آپ کا مؤقف کیا ہے؟ مسلمانوں کے وکیل نے کہا کہ مقدمے کے اس مرحلے پر درخواست ہمارے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے، اس لئے کہ اب تک کی ساری کارروائی انجمن کی درخواست کی بنیاد پر ہوئی ہے اور اسی کے جواب دہی کیلئے تیاری کی گئی ہے۔ لہٰذا اس نئے شخص کو اس مرحلے پر فریق بنانا ہمارے لئے انصاف کے خلاف ہوگا۔ جج نے اس مرحلے پر درخواست کو مسترد کر کے مرزائیوں کے وکیل مسٹر ینگ کو دلائل پیش کرنے کیلئے کہا۔

جمعرات ۹ ستمبر کو سارا دن مرزائیوں کے وکیل مسٹر ینگ ہی کی بحث میں گذر گیا، وہ بار بار ایک ہی بات دہراتا کہ مرزائی چونکہ مسلمان ہیں، اور توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کو کافر قرار دے، یا ان کو مسجدوں میں داخل ہونے یا قبرستان میں دفن ہونے سے روک سکے۔ جج نے اُسے بار بار ٹوکا کہ اس وقت میرے لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے، اور نہ یہ میرے فرائض منصبی میں داخل ہے کہ مرزائی مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ جب خود آپ کے اعتراف کے مطابق سالہا سال سے مسلمان آپ کو غیر مسلم سمجھتے آ رہے ہیں اور خود آپ کے اعتراف کے مطابق سالہا سال سے آپ کا کوئی فرد مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہوا تو آج وہ کونسی ہنگامی ضرورت پیش آ گئی ہے جس کی بناء پر اچانک آپ نے حکم امتناعی حاصل کرنے کی درخواست دے دی ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

مسٹر ینگ اپنی طویل تقریر کے باوجود اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ البتہ ایک مرحلے پر اُس نے کہا کہ ''حکم امتناعی کیلئے ہماری ہنگامی ضرورت یہ ہے کہ اگر کیپ ٹاؤن کے علماء اور مشائخ کو ہمیں کافر کہنے سے نہ روکا گیا تو گھر برباد ہو جائیں گے، اور احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان تمام نکاح کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔''

اس پر جج نے کہا: ''لیکن ریکارڈ پر ایسا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے جس سے کسی احمدی کا غیر احمدی سے نکاح کرنا ثابت ہو۔''

مسٹر ینگ نے جواب میں کہا کہ: ''جناب اس بات کے ریکارڈ پر ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو اس بات کا جوڈیشل نوٹس لینا چاہئے کہ مسلمان، مسلمان سے نکاح کرتا ہے اور احمدی چونکہ مسلمان ہیں، اس لئے ان کے آپس میں ضرور نکاح ہوئے ہوں گے۔'' اس پر جج نے برجستہ کہا: ''آپ چاہتے ہیں کہ اس طرح میں آپ کے مسلمان ہونے کا پہلے ہی فیصلہ کر دوں؟ اور پھر مسلمانوں کے ساتھ آپ کے نکاح کا جوڈیشل نوٹس لوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میرا جوڈیشل نوٹس تو یہ ہے کہ مسلمان مسلمان سے نکاح کرتا ہے اور احمدی، احمدی سے نکاح کرتا ہے۔''

غرض اس طرح کی دلچسپ نوک جھونک دن بھر جاری رہی اور شام کو پونے چار بجے کے قریب جب عدالت کا وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے، جج نے مسلمانوں کے وکیل اسماعیل محمد صاحب کو دلائل پیش کرنے کی دعوت دی۔ وقت چونکہ مختصر تھا، اس لئے انہوں نے تفصیلی دلائل شروع کرنے سے پہلے باقی ماندہ پندرہ منٹ میں اپنے نکات کا نمبروار خلاصہ بڑے مؤثر انداز میں بیان کر دیا، اور ساتھ ہی اپنے دلائل ایک مفصل تحریری شکل میں جج کے حوالے کر دیئے اور کہا کہ ان نکات پر مفصل بحث میں کل کروں گا۔ اس پر اُس دن عدالت کا اجلاس برخاست ہوگیا۔

اگلے دن اسماعیل محمد صاحب کو اپنے دلائل کا آغاز کرنا تھا، لیکن اس سے پہلے مسٹر ینگ نے کھڑے ہو کر دوبارہ اپنی وہی درخواست نظر ثانی کیلئے پیش کی کہ اس مقدمے میں مسٹر پیک کو فریق بنایا جائے۔ اور یہ درخواست ''انجمن اشاعت اسلام'' کے علاوہ مسٹر پیک

کی طرف سے بھی سمجھی جائے۔

جج نے اس درخواست پر غور کو ملتوی کر کے اسماعیل محمد صاحب سے کہا کہ وہ اپنے دلائل شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر شروع کی، اور تمام متعلقہ نکات کو بڑی خوبصورتی حسن ترتیب اور زور بیان کے ساتھ اپنی تقریر میں سمو دیا۔

یہاں اسماعیل محمد صاحب کی پوری تقریر اور اس کے تمام دلائل و نکات کو نقل کرنا ممکن نہیں، البتہ اس کے تین اہم نکات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ان کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ متعدد قانونی نظائر کی روشنی میں درخواست گذار کو حکم امتناعی کا استحقاق صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب بادی النظری طور پر مقدمہ اس کے حق میں ہو، اور اس کا کیس سنگین شکوک و اعتراضات سے خالی ہو، اس کے برعکس یہاں درخواست گذار کا کیس بادی النظری طور پر ہی غلط اور سنگین اعتراضات سے لبریز ہے۔ بیاناتِ حلفی سے ظاہر ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کو دائرۂ اسلام سے خارج اور کافر قرار دیتے ہی، اسی بنیاد پر پاکستان میں جہاں مرزائیت کا ہیڈ کوارٹر قائم ہے، قومی اسمبلی اور سینیٹ نے ان لوگوں کو صفائی کا پورا موقع دینے اور ضروری تحقیق کے بعد متفقہ طور پر انہیں غیر مسلم قرار دیا، اور اس کے مطابق دستور پاکستان میں ترمیم کی۔ اسی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم رابطۂ عالم اسلامی نے پورے عالم اسلام کی ۱۴۰ سے زائد سربرآوردہ تنظیموں کے ایک مشترکہ اجلاس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے متبعین کو بیک آواز غیر مسلم قرار دیا۔ اور جنوبی افریقہ کے تمام مسلمان انہیں ہمیشہ غیر مسلم قرار دیتے اور ان کے ساتھ غیر مسلموں کا معاملہ کرتے آئے ہیں، جس کا اعتراف خود درخواست گذار کے بیانِ حلفی میں موجود ہے۔

مسلمانوں کے بیاناتِ حلفی میں مرزا صاحب کی کتابوں کے مفصل اقتباسات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا، بلکہ اپنے آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام سے تمام شان سے بڑھ کر بتایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کی، اور اپنے آپ کو (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ کا بروزِ ثانی اور آپ ﷺ کا

www.freepdfpost.blogspot.com

ہمسر و مظہر اتم بتایا اور پھر انہی بیاناتِ حلفی میں قرآن و حدیث اور ماہرین اسلامی علوم کے واضح حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی بھی مفہوم میں کسی بھی قسم کی نبوت کا دعویدار کبھی مسلمان نہیں ہوسکتا۔

اس کے برعکس مرزائیوں کے بیانِ حلفی میں نہ ان کے مسلمانوں ہونے کی کوئی دلیل بیان کی گئی ہے نہ اسلامیات کے کسی ماہر کا کوئی بیان ان کی حمایت میں پیش کیا گیا ہے، اس لئے بادی النظری طور پر مقدمہ ہرگز ان کے حق میں نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ درخواست گذار نے اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ وہ ''احمدیہ انجمن لاہور'' کی ایک شاخ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ''احمدیہ انجمن لاہور'' کے ارکان کو پاکستان کے دستور نے غیر مسلم قرار دے دیا ہے، لہٰذا اس کے ارکان مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کا حق نہیں رکھتے اور لاہور کی انجمن نے اپنی اس پوزیشن کو کبھی وہاں کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا، اب اسی انجمن کی ایک ذیلی شاخ اپنی اصل انجمن کے بالکل برخلاف پوزیشن کا کیونکر دعویٰ کرسکتی ہے؟ اس لحاظ سے بھی بادی النظری طور پر مقدمہ اس کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف ہے۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ حکمِ امتناعی کا فیصلہ کرنے کیلئے عدالت کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ توازنِ سہولت (Balance of Convenience) کس فریق کے حق میں ہے؟ یعنی حکم امتناعی جاری کرنے سے مدعا علیہ کے جیتنے کی صورت میں اس کا زیادہ نقصان ہوگا؟ یا جاری نہ کرنے سے مدعی کے جیتنے کی صورت میں مدعی کا؟

یہاں صورتحال یہ ہے کہ کیپ ٹاؤن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چھبیس ہزار ہے، جبکہ مرزائیوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے دو سو سے زائد نہیں۔ اب اگر ان چھبیس ہزار مسلمانوں کو حکم امتناعی کے ذریعے اس بات کا پابند کا ی جائے کہ وہ مرزائیوں کو غیر مسلم سمجھنے کے باوجود اپنی مسجدوں میں عبادت اور اپنے قبرستانوں میں تدفین کی اجازت دیں تو جب تک اصل مقدمے کا تصفیہ نہ ہو انہیں اپنے عقیدے، اپنے ضمیر اور اپنے دین کے احکام کے بالکل برخلاف ایسے کام پر مجبور ہونا پڑے گا جس سے وہ شدید نفرت

کرتے ہیں، اور اس سے ان کے مذہبی جذبات کو زبردست ٹھیس لگے گی، مقدمہ جیت جانے کے بعد اس کی تلافی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر حکم امتناعی جاری نہ کیا جائے تو اس سے مرزائیوں کا کوئی ناقابل تلافی نقصان نہیں ہوگا۔ مرزائیوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ چودہ سال سے اُن کا کوئی مردہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہوا۔ اب اگر مقدمے کے فیصلے تک دو تین سال مزید یہی صورتحال برقرار رہی تو اس سے کوئی ناقابل تلافی نقصان لازم نہیں ہوتا۔ اس لئے ''توازنِ سہولت'' کا اصول بھی واضح طور پر مسلمانوں کے حق میں اور مرزائیوں کے خلاف ہے۔

تیسرا نکتہ وہی تھا کہ زیر بحث مقدمے میں درخواست کسی انسان نے نہیں بلکہ ایک انجمن نے پیش کی ہے۔ یہ انجمن نہ مسجد میں داخل ہوسکتی ہے، نہ قبرستان میں تدفین کی اہل ہے، اس لئے انجمن کی یہ درخواست محل نظر ہی سے ناقابل سماعت ہے۔ اس موقع پر اسماعیل محمد نے ازراہِ تفنن یہ بھی کہا کہ ''اگر یہ انجمن زمین میں دفن ہوسکتی تو ہم بہت خوش ہوتے، لیکن کیا کریں کہ قبرستان میں دفن ہونے کیلئے انسان ہونا ضروری ہے۔'' اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ مرزائیوں کے وکیل مسٹر ینگ اپنے مقدمے کی کمزوری سے پوری طرح واقف ہیں، اور کل اور آج انہوں نے مسٹر پیک کو فریق بنانے کی درخواست دی ہے، وہ ان کی طرف سے واضح اور واشگاف الفاظ میں اپنی شکست کا اعتراف ہے، وہ جانتے ہیں کہ انجمن کی طرف سے یہ درخواست قانونی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے اپنے مقدمے کو بالکل آخر وقت میں تباہی سے بچانے کیلئے وہ مسٹر پیک کو فریق بنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر اس آخری مرحلے پر ان کی اس درخواست کو منظور کیا گیا تو یہ ہمارے ساتھ شدید ناانصافی ہوگی۔ ہمارے تمام بیانات انجمن کے دعوے کے جواب میں مرتب کئے گئے ہیں، اگر ابتداء میں دعویٰ مسٹر پیک کی طرف سے ہوتا تو ہمارے جوابی بیاناتِ حلفی میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا، اس لئے گیارہ بج کر انسٹھ منٹ پر فریق بنانے کی یہ درخواست کسی بھی لحاظ سے منظور ہونے کے لائق نہیں۔

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے، اور جمعہ کا وقت ہوا چاہتا تھا، جج نے اس موقع پر

www.freepdfpost.blogspot.com

فریق بنانے کی درخواست کو مسترد کر کے عدالت کو دو بجے تک کیلئے برخاست کر دیا۔

جمعہ کے بعد دو بجے اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو مرزائیوں کے دوسرے وکیل نے اسماعیل محمد کے جواب میں بحث شروع کی اور تقریباً وہی باتیں دُہرائیں جو مسٹر ینگ کہہ چکے تھے، یہاں تک کہ شام چار بجے جب عدالت کا وقت ختم ہونے لگا تو جج نے فیصلے کے دلائل کو مؤخر کر کے اپنا مختصر حکم سنا دیا کہ عدالت کی طرف سے جو حکم امتناعی جاری کیا گیا تھا وہ واپس لیا جاتا ہے۔ اور مقدمہ کا خرچ بھی درخواست گذار (یعنی مرزائی انجمن) کو دینا ہوگا۔ البتہ اخراجات کا تعین بعد میں کیا جائے گا۔

اس فیصلے کے اعلان کے بعد کمرۂ عدالت کا منظر قابل دید تھا، تمام مسلمان آپس میں گلے مل مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے، اسماعیل محمد صاحب کی درخواست پر کیپ ٹاؤن کے شیخ تظیم نے دعا کرائی اور اس طرح یہ مرحلہ بحمد للہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس فیصلے کے بعد اکیس دن تک مرزائی صاحبان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا اصل مقدمہ دائر کریں۔ اس مدت کے دوران اگر انہوں نے مقدمہ دائر نہ کیا تو بات بالکلیہ ختم ہوگئی۔ لیکن اگر انہوں نے اس مدت میں اصل مقدمہ دائر کر دیا تو بظاہر یہ کیس طول کھینچے گا، اس میں ماہرین کی گواہیوں کی بھی ضرورت پڑے گی، اور اس کے فیصلے میں دو تین سال بھی لگ سکتے ہیں۔ لیکن حکم امتناعی کے مسترد ہونے کے بعد مقدمے کا طول کھینچنا مسلمانوں کیلئے انشاء اللہ مضر نہیں ہوگا۔

.....☆.....☆.....

مقدمے سے فراغت کے چوبیس گھنٹے مزید کیپ ٹاؤن میں قیام رہا۔ یہ وقت یہاں کے خاص خاص مقامات دیکھنے اور یہاں کے علماء و مشائخ اور دینی تنظیموں سے ملاقات میں گذرا۔

کیپ ٹاؤن جنوب میں افریقہ کے براعظم کا آخری سرا ہے یہ جنوبی افریقہ کا سب سے پرانا شہر ہے اور اسکے سب سے بڑے صوبے ''راس امید'' (Cape of Good Hope)

کا دارالحکومت ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے پندرہویں صدی کے آخر میں مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا۔ ہندوستان میں اپنی تجارت اور اس کے پردے میں اپنی سیاست.....کو فروغ دینے کیلئے مغربی ممالک مدت سے کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھے جو مسلمانوں کی تگ و تاز سے مامون ہو، اس غرض کیلئے انہوں نے مختلف بحری مہمات روانہ کیں، یہاں تک کہ جب ۱۴۸۷ء میں برتلمانی ڈائز افریقہ کے جنوبی سرے تک پہنچ کر واپس آیا تو پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے افریقہ کے اس جنوبی سرے کی دریافت کو آئندہ مہمات کیلئے اُمید افزا سمجھ کر اس کو ''راس امید'' (Cape of Good Hope) کا نام دیا، اور دس سال بعد اسی ''راس امید'' کے راستے واسکوڈی گاما، ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اسی وجہ سے یہ صوبہ اب تک ''راس امید'' کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔

چونکہ بعد میں ''راس امید'' مغربی ممالک کے تجارتی سفروں کیلئے اہم ترین منزل بن چکا تھا، اس لئے وہ اس علاقے پر مدت سے دانت لگائے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ہالینڈ کی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۹۵۲ء میں اس پر قبضہ جمالیا۔ انہوں نے مقامی سیاہ فام آبادی پر غلبہ پانے کیلئے یہاں سفید فام آبادی کو بڑھانے کی تدبیریں شروع کیں۔ ہالینڈ کے باشندے یہاں آباد ہونے کیلئے تیار نہ تھے، لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (مقالہ: کیپ پراونس) میں لکھا ہے کہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا شوقِ استعمار پورا کرنے کیلئے ہالینڈ کے یتیم خانوں سے یتیم لڑکیاں اکٹھی کر کے یہاں بھیجیں، دوسری طرف جلاوطنی کے سزایاب لوگ زبردستی یہاں دھکیلے گئے، اس طرح رفتہ رفتہ یہاں سفید فام افراد کی تعداد بڑھی، اور انکی نسل پھیل کر علاقے کا ایک قابل لحاظ آبادی بن گئی۔

ڈچ استعمار کے اسی دور (سترہویں صدی) میں جنوبی افریقہ کی سرزمین میں پہلی بار، کیپ ٹاؤن ہی راستے اسلام کی روشنی داخل ہوئی۔ یہاں اسلام اور مسلمانوں کے داخلے کی داستان بھی بڑی پُر اثر ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف نے ہر خطے میں اسلام کی اشاعت اور تحفظ و بقا کے لئے کیسی عظیم قربانیاں دی ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سترہویں صدی میں ہالینڈ کی ڈچ قوم نے ایک طرف تو جنوبی افریقہ پر اپنا تسلط جمالیا تھا، اور دوسری طرف ملایا اور اس کے قرب و جوار کے جزیروں کو بھی اپنے استعمار کے شکنجے میں کسا ہُوا تھا۔ ملایا اور اس کے قریبی جزیروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور وہاں بار بار مسلمانوں کی طرف سے جہادِ آزادی کی تحریکیں اُٹھتی رہتی تھیں۔ ان تحریکوں کو ڈچ قوم نے ہمیشہ اپنی عادت کے مطابق جبر وتشدد کے ذریعے دبایا، اور وہاں کے بہت سے مسلمان مجاہدین کو گرفتار کر کے غلام بنالیا۔ غلام بنانے کے باوجود چونکہ یہ خطرہ تھا کہ یہ لوگ کسی بھی وقت آمادۂ بغاوت نہ ہوجائیں۔ اس لئے ڈچ حکومت نے ان کو جلاوطن کر کے کیپ ٹاؤن بھیج دیا تھا، تاکہ اپنے وطن سے ہزارہا میل دور رہ کر یہ بالکل بے دست وپا ہوجائیں۔

چنانچہ ملایا اور اس کے قرب و جوار کے تقریباً تین سو مسلمان مجاہدین غلام بنا کر پابہ زنجیر کیپ ٹاؤن لائے گئے اور یہاں بھی چونکہ اُن کی قوتِ ایمانی سے ہر وقت ڈچ قوم کو خطرہ رہتا تھا اس لئے اُن کو اپنے دین سے منحرف کرنے اور ان کی نسلوں کو ایمان کے نور سے محروم کرنے کی پوری کوشش کی گئی، چنانچہ اُن ستم رسیدہ مسلمانوں کو نماز پڑھنا تو کجا، کلمہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ان سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی اور اگر کوئی شخص نماز پڑھنے یا ذکر الٰہی کرنے کی کوشش کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

لیکن آفرین ہے ان خدامست مجاہدین پر کہ غریب الوطنی، اور جبر وتشدد کے ان اقدامات کے باوجود انہوں نے اپنے دین کو سینے سے لگائے رکھا، دن بھر محنت ومشقت کی چکی میں پسنے کے بعد یہ اولوالعزم مجاہدین جب رات کو اپنی قیام گاہوں پر پہنچتے تو تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنے نگرانوں کے سونے کا انتظار کرتے رہتے، اور جب وہ سوجاتے تو رات کی تاریکی میں چھپ کر ایک پہاڑی پر چڑھتے اور وہاں دن بھر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔ کیپ ٹاؤن کے ایک عالم شیخ عبدالمجید مجھے اپنی کار میں اس پہاڑی پر لے گئے اور وہ جگہ دکھائی جہاں اللہ کے یہ اولوالعزم بندے رات کی تاریکیوں میں سربسجود ہوتے تھے۔ یہ جگہ قدیم شہر سے

خاصے فاصلے پر ہے اور دن بھر شدید محنت کی تھکن سے چور ان مسلمانوں کا روزانہ یہاں آکر نماز پڑھنا ایک ایسا مجاہدہ ہے جس کا تصور ہی آنکھوں کو پُرنم کردیتا ہے۔ رحمھم اللہ تعالیٰ و رحمتہ واسعۃ۔

سالہا سال تک اللہ کے یہ بندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے اور ایسے مشکل حالات میں بھی انہوں نے ایمان کی شمع نہ صرف یہ کہ اپنے سینوں میں فروزاں رکھی بلکہ یہ امانت اپنی آنے والی نسلوں تک بھی پہنچائی۔

تقریباً اَسّی سال ان مسلمانوں پر ایسے گزرے ہیں کہ نہ انہیں مسجد بنانے کی اجازت تھی، نہ نماز پڑھنے کی۔ بالآخر برطانیہ کے گوروں نے کیپ ٹاؤن پر حملہ کر کے یہ علاقہ ڈچ قوم سے چھیننا چاہا اور ایک زبردست فوج لے کر راس امید کے ساحل تک پہنچ گئے۔ اس جنگ میں ڈچ قوم کو ایسے جانباز سپاہیوں کی ضرورت تھی جو اپنی جان پر کھیل کر ان انگریزوں کا راستہ روکیں اور جان کی قربانی دینے کیلئے ان غریب الوطن مسلمانوں سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ڈچ حکومت نے ان مجبور ومقہور مسلمانوں کو جنگ میں آگے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اس موقع پر اللہ کے ان بندوں نے اپنے ظالم وجابر آقاؤں کا اقتدار بحال رکھنے کیلئے حملہ آور انگریزوں سے جنگ بھی لڑی، اس جنگ میں شامل ہوکر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے وقت انہوں نے ڈچ حکمرانوں سے نہ کسی روپے پیسے کا مطالبہ کیا، نہ اپنے لئے کوئی اور راحت طلب کی، البتہ صرف ایک شرط کی اور وہ یہ کہ اس جنگ کے صلے میں ہمیں کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی جائے، چنانچہ اس طرح بیسیوں مسلمانوں نے اپنی جان دے کر یہاں ایک مسجد بنانے کی اجازت حاصل کرلی، یہ جنوبی افریقہ کی پہلی مسجد تھی جو ان مجبور ومقہور ملائی باشندوں نے تعمیر کی۔

میرے دوست احمد چوہان ایڈووکیٹ مجھے جنوبی افریقہ کی یہ پہلی مسجد دکھانے کے لیے لے گئے تھے، کم وبیش تین سو سال پہلے بنی ہوئی یہ مسجد آج بھی اسی ڈھانچے پر برقرار ہے، محراب ابھی تک جوں کی توں ہے اور اس کے در و دیوار سے اس کے بنانے والوں

www.freepdfpost.blogspot.com

کے جذبہ اخلاق کی شہادت ملتی ہے۔ اتفاق سے کیپ ٹاؤن تمدنی ترقی میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا، لیکن یہ مسجد اپنی اسی سادگی پر برقرار ہے، اور یہاں کے ائمہ مساجد آج بھی اسی خاندان سے مقرر ہوتے ہیں جسے ابتدائی تعمیر کے وقت امام بنایا گیا تھا۔ صرف ایک فرق واقع ہے اور وہ یہ کہ جن بے سروسامان مسلمانوں نے ابتدائیہ مسجد بنائی تھی اُن کے پاس قبلے کی صحیح سمت معلوم کرنے کیلئے مناسب آلات نہیں تھے، اس لئے شاید انہوں نے اندازے سے قبلے کا رُخ متعین کر کے اس پر محراب بنادی تھی، لیکن اب آلات کی کی مدد سے پتہ چلا کہ محراب قبلے کے صحیح رُخ سے کافی ہٹی ہوئی ہے، چنانچہ اب صفیں محراب کے رُخ پر بچھانے کے بجائے ترچھی کر کے قبلے کے رخ پر بچھائی جاتی ہیں۔

اسی مسجد کے صحن میں ایک کھجور کا درخت ہے چونکہ کیپ ٹاؤن میں آس پاس کہیں کھجور کے درخت نظر نہیں آتے، اس لئے اسے دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مسجد کے کوئی امام صاحب حج کے لئے حجاز مقدس گئے تو واپسی میں مدینہ طیبہ کی کھجوریں لائے تھے، انہوں نے ایک گٹھلی یہاں بودی تھی، اس سے یہ درخت لگا ہے۔

ان ملائی مسلمانوں نے اس طرح بیش بہا قربانیاں دے کر اس علاقے میں اسلام پھیلایا ہے، اب بفضلہٖ تعالیٰ کیپ ٹاؤن میں دسیوں مسجدیں ہیں، اور ہزار ہا مسلمان آباد ہیں، جن میں اکثریت ملائی نسل کے مسلمانوں کی ہے، بعد میں کچھ ہندوستانی باشندے بھی یہاں آکر آباد ہوگئے، چونکہ یہ ملائی مسلمان مسلکاً شافعی تھے، اس لئے ان کا زیادہ تر رابطہ مصر اور شام کے علماء سے رہا، اور وہ یہاں سے اپنی اولاد کو علم دین کے حصول کے لئے مصر اور شام بھیجتے رہے، چنانچہ یہاں عموماً مصر کے تعلیم یافتہ مشائخ دینی خدمات انجام دیتے رہے، اور اب بھی یہاں کے علماء میں شیخ نجار، شیخ نظیم اور شیخ عبدالمجید وغیرہ جامعہ ازہر ہی کے فارغ التحصیل ہیں۔ البتہ اب وہاں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء بھی پہنچ گئے ہیں، انہی فضلائے دیوبند میں مولانا یوسف کران صاحب افریقی نژاد عالم ہیں جو ماشاء اللہ اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور مقامی بانتو زبان کے علاوہ فرنچ، ڈچ اور جرمن زبان سے بھی واقف ہیں، اور کیپ ٹاؤن کی باغ و بہار

شخصیت ہیں۔ قادیانیوں کے اس مقدمے کے سلسلے میں انہوں نے خاموشی سے بڑی خدمات انجام دیں، اور ہم لوگوں کے سفر کے انتظامات میں مؤثر حصہ لیا۔

کیپ ٹاؤن اپنے قدرتی مناظر اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز شہر ہے۔ یہاں کی ٹیبل ماؤنٹین ایک شہرۂ آفاق پہاڑی ہے جس کی چوٹی ایک مربع میز کی طرح ہے۔ کیپ ٹاؤن اسی کے دامن میں آباد ہے، اور یہاں سے تقریباً اسّی نوے کلومیٹر کے فاصلے پر براعظم افریقہ کا وہ سرا ہے جس پر اس سمت میں نہ صرف افریقہ، بلکہ دنیا کی آبادی ختم ہوگئی ہے، اور یہاں سے بحر منجمد جنوبی تک پانی ہی پانی ہے، یہ جگہ کیپ پوائنٹ کہلاتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں دنیا کے دو عظیم سمندروں بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا سنگم ہے اور کہتے ہیں کہ اگر دھوپ تیز ہو تو دونوں سمندروں کے درمیان ایک خط نظر آتا ہے جو مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کا منظر پیش کرتا ہے۔ فضا کے ابر آلود ہونے کی بنا پر ہم یہ خط تو نہ دیکھ سکے، لیکن حسین پہاڑوں اور سرسبز جنگلات کے دونوں طرف دنیا کے دو عظیم سمندروں کے بہاؤ اور پھر ایک مثلث جزیرے کی نوک پر ان دونوں کے یک جان ہونے کا منظر ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

کیپ ٹاؤن سے واپسی پر ہمارے بیشتر رفقاء تو واپس روانہ ہوگئے، لیکن مولانا مفتی زین العابدین صاحب، مولانا عبدالرحیم اشعر صاحب، اور احقر پانچ چھ روز مزید جنوبی افریقہ میں رہے، اس دوران جوہانسبرگ، کروگرس ڈرورپ، اور آزادویل جانا ہوا۔ یہاں کے قدیم احباب اور بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ایک دن کیلئے ڈربن بھی جانا ہوا، جس کیلئے مولانا احمد عمر صاحب اور ان کے والد جناب سلیمان عمر صاحب کا بے حد اصرار تھا، یہاں جمعیت علماء نٹال مولانا عبدالحق عمر جی، مولانا یونس پٹیل، اور برادرِ محترم جناب ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب سے ملاقات رہی۔ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اور ڈربن کی یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے سربراہ ہیں۔ اس مرتبہ ان کے چہرے پر

www.freepdfpost.blogspot.com

بڑی پُرنور اور حسین داڑھی دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ اپنے کہولت کے دور میں واپس آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عافیت اور سلامتی کے ساتھ دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

جمعرات ۱۶ر ستمبر کی شام کو ہم جوہانسبرگ سے نیروبی روانہ ہوئے، نیروبی کینیا کا دارالحکومت ہے، اور یہاں پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، میں یہاں دو مرتبہ پہلے بھی آ چکا ہوں، لیکن اس مرتبہ یہاں کے ایشیائی باشندوں کو شدید خوف و ہراس کا شکار دیکھا۔ وجہ یہ تھی کہ تقریباً ایک ماہ قبل یہاں کے سیاہ فام باشندوں نے پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں کے خلاف ایک ایسا فساد برپا کیا تھا جس میں لوٹ مار قتل و غارت گری اور خواتین کی بے حرمتی کے ایسے لرزہ خیز واقعات پیش آئے کہ ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان فسادات کے نتیجے میں بہت سے بڑے مسلمان تاجر بالکل فلاش ہو کر رہ گئے، بہت سے بے گھر ہو گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت سی خواتین پر مجرمانہ حملے کے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ اب یہاں کے غیر مقامی مسلمان بُری طرح سہمے ہوئے ہیں۔

یہاں کے پاکستانی باشندوں نے ایک رات کھانے کی دعوت پر یہ تمام واقعات بڑے پُراثر انداز میں سنائے اور یک زبان ہو کر بتایا کہ اب اس ملک میں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے اور ہر وقت ہماری جان، مال اور آبرو خطرے میں ہے، لہٰذا ہم واپس پاکستان میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔

یہ واقعات سن کر بہت دل دُکھا اور بلاشبہ اب حالات اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ جہاں ان حضرات کی یہ پریشانی بالکل بجا اور برحق ہے۔ اور مسلمان حکومتوں کو ان کے اس مسئلے پر پوری ہمدردی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی احقر نے ان دوستوں سے یہ عرض کیا کہ ہمیں اس پہلو پر بھی سوچنا چاہئے کہ سالہا سال تک اس ملک میں مقیم رہنے کے باوجود نوبت اس المناک سانحے تک کیوں پہنچی؟ مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ دنیا کے جس کسی خطے میں گئے ہیں،

انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق، بلند کردار اور محبت و اُلفت کے ذریعے ہمیشہ مقامی آبادی کے دل جیتے ہیں۔ لیکن اب جگہ جگہ سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ مسلمان تارکین وطن ہر جگہ مقامی آبادیوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں، ابھی کچھ عرصہ پہلے یوگنڈا میں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا تھا، اور انہوں نے وہاں سے کینیا میں پناہ لی تھی، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کینیا کی زمین بھی ان پر تنگ ہو رہی ہے۔

اگر حقیقت پسندی سے اس صورتحال کے اسباب تلاش کئے جائیں تو اس کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ مقامی آبادی کی پسماندگی اور جہالت وغیرہ کی بناء پر ہمارا طرزِ عمل ان کے ساتھ حقارت آمیز ہو جاتا ہے، اُن کے ساتھ ہمارا برتاؤ وہ نہیں ہوتا جس کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے، ہم بھی ان ملکوں میں جا کر دولت سازی میں منہمک ہو جاتے ہیں اور دوسری غیر مسلم اقوام کی طرح مقامی آبادیوں کے ساتھ تحقیر اور استحصال کا معاملہ کرتے ہیں، اگر ہم ان کو محبت و اُلفت فراہم کر سکتے، اگر ہم ان کے دُکھ درد میں اُن کا ہاتھ بٹا سکتے، اگر ہم اُن کی پسماندگی کو دور کرنے اور ان کو اسلامی اخلاق سے آراستہ کرنے کیلئے کوئی محنت کر سکتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے دل میں ہمارے خلاف نفرت کے پہاڑ کھڑے ہوتے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان ممالک کے وسائل سے پورا مادّی فائدہ اُٹھانے کے باوجود اس ملک کے پسماندہ باشندوں پر الا ماشاء اللہ۔ کوئی رقم، اور کئی محنت خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے، جن حضرات کو غریبوں کی امداد کا ذوق ہوتا ہے، عام طور سے ان کی امدادی رقوم بھی مقامی آبادی پر خرچ ہونے کے بجائے، ان کے آبائی وطنوں میں خرچ ہوتی ہیں، مقامی آبادی ہمارے گھروں اور دکانوں میں ملازم کے طور پر کام کرتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ان کے ساتھ محبت و اُلفت کا سلوک کر کے ان کو اسلامی تعلیمات اور اخلاق سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے ہوں، اور جب ہم خود اسلامی تعلیمات سے عملاً بیگانہ ہوں گے تو دوسروں کو کیا تلقین کر سکیں گے؟

میری نظر میں ان مسلمانوں کو جو حصولِ معاش کی تلاش میں دوسرے ممالک میں قیام پذیر

www.freepdfpost.blogspot.com

ہیں، یوگنڈا اور کینیا کے ان حالات سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ کسی ملک سے وسیع پیمانے پر انتقالِ آبادی آسان نہیں ہوتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ بیرونی ممالک میں رہنے والے تمام حضرات واپس آ کر اپنے آبائی وطن میں رہائش اختیار کرلیں۔ لیکن وہ اپنی زندگیوں پر نظرِ ثانی کر کے مقامی آبادی کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کو ضرور بدل سکتے ہیں۔ مسلمان کا مقصدِ زندگی صرف حصولِ معاش سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اصل مقدس زندگی خود مسلمان بننا اور دوسروں کو مسلمان بنانا ہے، جب تک مسلمانوں نے اپنے اس مقصد کو پیش نظر رکھا، وہ جہاں گئے، ہر دلعزیز ہو کر رہے، اور جب سے انہوں نے اس مقصد کو نظر انداز کر کے صرف کھانے کمانے پر اکتفا کیا، اس وقت سے اس قسم کے سانحات جگہ جگہ پیش آنے لگے، اب بھی اگر ہم اپنے مقصدِ حیات کی طرف لوٹ آئیں تو یہی ہمارے دین کا تقاضہ بھی ہے، اور یہی ہماری راہِ نجات بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حقیقت کا صحیح ادراک عطا فرما کر اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نیروبی میں جمعہ کا دن گزارنے کا موقع ملا، اس کی مرکزی مسجد میں احقر کو جمعہ کے موقع پر انگریزی میں چند دینی گذارشات بھی پیش کرنے کا موقع ملا، پھر جمعہ ہی کی رات کو وہاں سے روانہ ہو کر بفضلہٖ تعالیٰ حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ کی بھی سعادت ملی اور دو ہفتے حرمین شریفین کے مبارک سائے میں گذارنے کے بعد یکم اکتوبر کو واپس کراچی پہنچنا ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس سفر میں سرزد ہونے والے سیئات کو اپنے کرم سے معاف فرما کر اسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائیں۔ آمین۔

.....☆.....☆.....☆.....

دیارِ مغرب
میں تین ہفتے

(کینیڈا، امریکہ، فرانس)

صفر ۱۴۰۹ھ اکتوبر ۱۹۸۸ء

www.freepdfpost.blogspot.com

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

(۱۲)

دیارِ مغرب میں تین ہفتے

کینیڈا دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد اب آباد ہوگئی ہے۔ یہاں کے مختلف مسلمانوں نے کئی بار احقر کو آنے کی دعوت دی، لیکن بوجوہ احقر اس پر عمل نہ کرسکا۔ بالآخر کچھ حضرات نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم العالی سے رابطہ قائم کرکے احقر کو دعوت دینے کیلئے انہیں واسطہ بنایا۔ حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم العالی سے احقر کو دیرینہ نیاز حاصل ہے۔ انہوں نے حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہٗ کی خدمت وصحبت سے خوب خوب فیض اُٹھایا ہے۔ عرصۂ دراز تک سعودی عرب میں مقیم رہے، اور اب کینیڈا کے شہر واٹرلو میں قیام پذیر ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم نے احقر کو خط میں ان حضرات کی خواہش کا ذکر فرمایا اور کینیڈا کے مسلمانوں کے بعض مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی۔ احقر نے حاضری کا وعدہ کرلیا۔ شروع میں شوال کا مہینہ طے ہوا، لیکن مجھے کچھ اعذار پیش آگئے اس لئے بالآخر صفر کے وسط میں احقر نے حاضری کا وعدہ کرلیا۔

۱۲؍صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۳؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کا دن گزارنے کے بعد رات کو تین بجے میں ایئرفرانس کے طیارے کے ذریعے روانہ ہوا۔ یہ سفر پیرس کے راستے طے پایا تھا۔ جہاں مجھے چوبیس گھنٹے قیام بھی کرنا تھا۔ کراچی سے پیرس تک یہ براہِ راست پرواز آٹھ گھنٹے میں پیرس کی فضا میں پہنچی۔ پاکستان میں اس وقت

www.freepdfpost.blogspot.com

دن کے گیارہ بجے ہوں گے، لیکن یہاں سات بجے کا وقت تھا۔ جہاز اپنے مقررہ وقت پر پیرس پہنچا، لیکن جب اُترنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ فضا میں شدید لہر کی وجہ سے اُترنا ممکن نہیں، چنانچہ جہاز مزید دو گھنٹے فضا میں چکر کاٹتا رہا، اور نو بجے اسے اُترنے کی اجازت ملی۔ اس طرح یہ سفر مسلسل دس گھنٹے کا ہو گیا۔

ایئرپورٹ کے مراحل سے فارغ ہونے اور ہوٹل تک پہنچنے میں مزید تین گھنٹے لگ گئے اور اس طرح میں بارہ بجے ہوٹل تک پہنچ سکا۔ پیرس میں قیام کے دوران میرا ارادہ ایک لائبریری دیکھنے کا تھا، نیز میں جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ لیکن رات بھر کی بے خوابی اور تھکن کے بعد اب ہمت نہ رہی اور میں نے عصر تک ہوٹل ہی میں آرام کرنا ضرور سمجھا۔ عصر کے وقت ایک الجزائری دوست مجھے یہاں کے تبلیغی مرکز ''مسجد رحمت'' میں لے گئے۔ تبلیغی احباب سے ملاقات ہوئی۔ نمازِ مغرب بھی وہیں پڑھی۔ ایک دوست مجھے واپس ہوٹل پہنچا گئے۔

اگلی صبح نو بجے ہی میں ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہو گیا۔ یہاں سے ایئرپورٹ کا فاصلہ کافی تھا، اور صبح کے وقت پیرس کی مصروف سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے گاڑیوں کو رینگ رینگ کر چلنا پڑتا ہے، اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہ مسئلہ لوگوں کیلئے ایک عذاب بنا ہوا ہے، اور اسی بنا پر لوگ ان بڑے شہروں میں کاروں کے مالک ہوتے ہوئے بھی زیرِ زمین ریل کے ذریعے سفر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، کیونکہ اس میں اتنا وقت صرف نہیں ہوتا۔

بہرکیف! ٹیکسی نے شہر کا مصروف علاقہ رینگ رینگ کر طے کیا، اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں چارلس ڈیگال ایئرپورٹ پہنچا۔ ٹیکسی کو ایک سو ساٹھ فرانک کرایہ ادا کیا جو پاکستانی روپے میں ایک ہزار روپے سے کچھ کم بنتا ہے۔ پیرس کی گرانی کا عالم یہ ہے کہ ہم جیسا شخص دو چار دن ہی میں بآسانی دیوالیہ ہو سکتا ہے۔

ساڑھے ۱۲ بجے دوپہر ایئرفرانس کا طیارہ ٹورنٹو کیلئے روانہ ہوا اور سات گھنٹے مسلسل بحر اوقیانوس پر پرواز کرنے کے بعد مانٹریال اُترا تو ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا تھا۔

یہاں جہاز تقریباً ایک گھنٹے رُکا، چلنے سے ذرا پہلے میں نے عصر کی نماز پڑھی۔

یہاں سے ٹورنٹو ایک گھنٹے کا سفر اور تھا اور مقامی وقت کے مطابق شام کے ۵ ۱/۲ بج رہے تھے، جب جہاز ٹورنٹو پر اُترا۔ ایئرپورٹ پر حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب، میرے میزبان جناب محمد شمیم صاحب دہلوی، عبدالحئی پٹیل صاحب میرے ہم زُلف سکندر صاحب اور کچھ اور دوست استقبال کیلئے موجود تھے۔

ٹورنٹو سے تقریباً اَسّی کلومیٹر کے فاصلے پر واٹرلو کے نام سے ایک شہر ہے۔ حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب وہاں پر مقیم ہیں۔ میزبان حضرات نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ ٹورنٹو میں اپنی مصروفیات شروع کرنے سے پہلے ایک دن واٹرلو میں حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی قیام گاہ پر کسی معین مصروفیت کے بغیر گذارا جائے۔ تاکہ وہاں کچھ آرام بھی ہو جائے، وہاں کی مسجد و مدرسہ کا معائنہ بھی اور یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ گفتگو بھی۔ چنانچہ ہم ایئرپورٹ سے واٹرلو روانہ ہو گئے۔

اس علاقے میں سردیوں کی آمد آمد تھی، اور موسم کافی ٹھنڈا مگر خوشگوار تھا، کار صاف شفاف اور کشادہ ہائی وے پر دوڑتی رہی، دونوں طرف حدِ نظر تک سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی جگہ خشک اور سبزے سے خالی نظر نہیں آتی۔ اور سب سے زیادہ حسن اُن خوبصورت درختوں نے پیدا کر دیا تھا، جن پر خزاں کی علامت کے طور پر بہار آئی ہوئی تھی۔ شمالی امریکہ کے متعدد علاقوں میں خودرو درختوں پر قدرت کا یہ عجیب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ خزاں سے پہلے اُن کے سبز پتے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتے ہیں اور درختوں کا کچھ حصہ زرد اور کچھ حصہ سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ زردی اور سرخی بھی کہیں ہلکی اور کہیں گہری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پورا درخت مجموعی طور پر حسین رنگوں کا ایک دلکش مجموعہ ہو جاتا ہے۔ جن جنگلات میں درختوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، وہاں خاص طور پر یہ رنگا رنگ درخت انتہائی حسین منظر پیش کرتے ہیں، اور لوگ اس منظر کو دیکھنے کیلئے دور دور سے سفر کر کے جاتے ہیں۔ موسم خزاں کے آغاز پر درختوں کی یہ بہار میں میں نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

یہاں راستوں کے بعض مقامات پر موسم بتانے کیلئے برقی تھرمامیٹر نصب ہیں، جو روشن ہندسوں کے ذریعے درجہ حرارت بتاتے ہیں۔ایک ایسا ہی بورڈ اس وقت درجہ حرارت ایک سینٹی گریڈ بتا رہا تھا۔

مغرب کیوقت ہم واٹرلو پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا شہر ہے، جس کی آبادی پچیس تیس ہزار کی ہوگی۔اس میں ہزار بارہ سو مسلمان بھی ہیں۔اور ایک مسجد بھی موجود ہے جس میں حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کے صاحبزادے امامت اور بچوں کی تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔اسی مسجد کے قریب حضرت ڈاکٹر صاحب کا مکان بھی ہے۔اسی مکان میں قیام ہوا۔عشاء کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو یہاں نو بجے تھے لیکن پیرس کے حساب سے رات کے دو اور پاکستان کے حساب سے صبح سے چھ بج چکے تھے، اور تھکن کی وجہ سے ذہن چکرا رہا تھا۔اوقات کے فرق کی وجہ سے انسان جب مشرقی ممالک سے سفر کر کے امریکہ یا کینیڈا جائے تو ایک دو دن تک اس کے سونے جاگنے کا نظام مختل ہو جاتا ہے، دن کے وقت نیند آنے لگتی ہے، اور رات کو نیند غائب ہو جاتی ہے۔

بہرکیف! اس رات کھانے کے بعد جلد ہی سو گئے۔اگلے روز بھی دن کے وقت کوئی خاص پروگرام نہیں رکھا گیا تھا، ناشتہ کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب اور احقر کے میزبان محمد شمیم صاحب جو ٹورنٹو سے ساتھ ہی یہاں آ گئے تھے، کینیڈا اور یہاں کے مسلمانوں کے حالات و مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

کینیڈا، روس کے بعد رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔اس کے مختلف علاقوں میں تین ٹائم جاری رہتے ہیں، یہ مشرق میں بحر اوقیانوس اور مغرب میں بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے۔شروع میں یہ انگریزوں کی نوآبادی تھی۔کسی زمانے میں فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کیا اور اب پھر انگریزی بولنے والوں کے تسلط میں آ گیا۔لیکن فرانسیسی بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد یہاں آباد ہے۔صوبہ کوبک میں تو اکثریت انہی کی ہے اور صدر ٹروڈو کے زمانے سے پورے ملک کی دوسرکاری زبانیں قرار دے دی گئی ہیں۔ایک انگریزی اور ایک فرنچ۔

مسلمان بھی اس ملک میں کافی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ٹورنٹو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے اور سب سے زیادہ مسلمان یہیں آباد ہیں۔یہاں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے، جن میں دنیا کے تقریباً ہر خطے سے آئے ہوئے مسلمان شامل ہیں

ان حضرات سے مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی جو رفتہ رفتہ انشاء اللہ آگے سامنے آئیں گے۔

عصر کے بعد ہم لوگ واٹرلو سے روانہ ہوئے، یہاں سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کیمبرج کے نام سے ایک اور شہر ہے، یہاں بھی ایک مسجد ہے، جس میں حضرت ڈاکٹر صاحب کے دوسرے صاحبزادے امامت و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد یہاں احقر کی تقریر کا پروگرام تھا۔چنانچہ مغرب ہم نے یہیں پڑھیں اور پھر عشاء تک احقر کا بیان ہوا۔۔۔احقر نے سورۃ الملک کی یہ آیت پڑھی:

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور.

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو رام کر دیا، پس تم اس کی بلند جگہوں میں چلو، اور اس کے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیت کی روشنی میں احقر کی گذارشات کا موضوع یہ تھا کہ رزق کی تلاش میں دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچنا اس آیت کی رو سے جائز ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو اس کی عطا سمجھ کر اس کا قولی اور فعلی شکر ادا کیا جائے اور یہ بات ہر آن پیش نظر رکھی جائے کہ لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے، اگر یہ باتیں ذہن میں مستحضر رہیں تو دوسرے ملکوں میں بھی انسان اپنے ایمان اور عمل کو سلامت رکھے گا۔

عشاء کے بعد کیمبرج میں ایک دوست کے گھر پر کھانا تھا۔کھانے کے بعد ہم ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔اور راس کو ساڑھے ۱۱/۱ بجے کے قریب ٹورنٹو پہنچے۔

ٹورنٹو میں

اگلا دن جمعہ تھا اور نماز جمعہ ٹورنٹو کی سب سے بڑی مسجد ''مسجد المدینۃ'' میں ادا کرنی تھی۔چونکہ جمعہ کے دن یہاں چھٹی نہیں ہوتی اور لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے

www.freepdfpost.blogspot.com

میں نماز کیلئے آتے ہیں۔ اس لئے ان علاقوں میں معمول یہ ہے کہ نمازِ جمعہ سے پہلے کی تقریر بہت مختصر تقریباً دس منٹ کی ہوتی ہے۔ آج یہ تقریر احقر کو کرنی تھی۔ اجتماع کافی تھا، مسجد بھری ہوئی تھی۔ احقر نے اس مختصر تقریر میں اپنے گھروں اور بیوی بچوں کی دینی تربیت پر زور دیا۔ پھر اسی کا خلاصہ عربی خطبے میں بیان کیا اور نمازِ جمعہ پڑھائی۔

ہمارے قیام کا انتظام مسجد کے قریب ہی فرنیک ڈیل ایونیو میں احمد داؤد صاحب کے مکان پر ہوا۔ وہ خود اس مکان کے نچلے حصے میں مقیم رہے اور اوپر کے تین کمرے ہمیں دے دیئے۔ اس طرح ملنے جلنے کیلئے آنے والوں کو بھی سہولت ہوگئی۔

عشاء کے بعد اسی مسجد المدینہ میں مفصل تقریر کا اعلان تھا۔ اس مجلس میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور احقر نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں صبح ہی کے موضوع کو قدرے تفصیل سے بیان کیا اور نیک صحبت کی فکر کی تاکید کی۔

ہفتے کے دن صبح سے دوپہر تک لوگ ملاقات کیلئے آتے رہے۔ دوپہر کو کھانا شمیم صاحب کے یہاں تھا۔ ہفتہ چونکہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لئے اس روز یکے بعد دیگرے تین تقریریں رکھ دی گئی تھیں اور تینوں یہاں کی جامع مسجد میں ہونی تھیں۔

''جامع مسجد'' ٹورنٹو کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کے آس پاس عرب حضرات کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ حضرات سنیچر کو ظہر کے بعد کوئی نہ کوئی دینی اجتماع منعقد کرتے ہیں، آج انہوں نے احقر کو خطاب کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ظہر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ احقر نے ان سے عربی میں خطاب کیا۔ حاضرین میں تقریباً تمام عرب ملکوں کے حضرات موجود تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ عرب حضرات میں دینی معاملات کے اندر عقلی حکمتوں کو فیصلہ کن حیثیت دینے کا رواج عام ہے اس لئے احقر کے خطاب کا موضوع یہی تھا کہ دین میں عقل کا مقام کیا ہے؟ اور اس کے استعمال کی کیا حدود ہیں؟ الحمدللہ اس خطاب سے بہت سے حضرات کے شبہات دور ہوئے۔ خطاب کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوالات زیادہ تر فقہی نوعیت کے تھے۔ اور کینیڈا کے مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل سے متعلق تھے۔ احقر نے بیچ میں یہ سلسلہ ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن

حاضرین نے کہا کہ ابھی سیری نہیں ہوئی، اس لئے تقریباً پون گھنٹے مزید یہ سلسلہ جاری رہا، اور بفضلہٖ تعالیٰ مفید ثابت ہوا۔

مغرب کے بعد اسی مسجد میں تبلیغی اجتماع تھا، اس سے بھی مختصر خطاب ہوا اور عشاء کے بعد یہیں مفصل اردو خطاب کا اعلان تھا جو تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ حاضرین میں جو حضرات اردو دان نہیں تھے، ان کے لئے ساتھ ساتھ ایک گوشے میں انگریزی ترجمہ ہوتا رہا۔

اگلا دن اتوار تھا، اور ظہر کے بعد اسکاربرو کمیونٹی سینٹر کے ہال میں مردوں اور عورتوں کا باپردہ اجتماع رکھا گیا تھا۔ اور اسی روز رات کو عشاء کے بعد ایک اور مسجد میں خطاب تھا۔

اتفاق سے پیر کے دن بھی سرکاری تعطیل تھی۔ یہاں دستور یہ ہے کہ جب فصلیں کٹ جاتی ہیں تو سرکاری طور پر ''یومِ تشکر (Thanks Giving Day) منایا جاتا ہے۔ چنانچہ پیر کو یومِ تشکر منایا جارہا تھا۔ اس لئے اس روز بھی تین پروگرام رکھے گئے تھے۔

شمالی امریکہ (ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا) میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اور نمایاں تنظیم اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ سمجھی جاتی ہے جو یہاں ''اسنا'' (ISNA) کے نام سے مشہور ہے۔ جناب محمد اشرف صاحب اس کی کینیڈا کی شاخ کے چیئرمین ہیں، انہی کے ایک دوست جناب پرویز نسیم صاحب نے یہاں کے مسلمانوں کیلئے مکانات کی خریداری کیلئے ایک ہاؤسنگ کوآپریٹو کارپوریشن قائم کی ہوئی ہے۔ اسنا کے دفتر ہی میں اس کا مرکز بھی ہے، پیر کی صبح دس بجے ان دونوں حضرات نے احقر کو اس اسکیم کے مختلف پہلوؤں پر شرعی نقطہ نظر سے غور کرنے کیلئے گفتگو کی دعوت دی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں تھا۔

امریکہ اور کینیڈا میں مکانات کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جسے حل کرنے کیلئے یہاں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ بینک اس غرض کیلئے سودی قرض دیتا ہے، جو کئی سال کی مدت میں واجب الادا ہوتا ہے، یہاں مکان کے کرائے

www.freepdfpost.blogspot.com

اتنے زیادہ ہیں کہ اس سودی قرض کی ماہانہ قسط کی ادائیگی مکان کے کرائے کے قریب قریب پڑ جاتی ہے۔ اس لئے لوگ کرائے کے مکانوں میں رہنے کے بجائے بینک سے قرض لے کر مکانات حاصل کر لیتے ہیں اور یہ قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دین کی فکر عطا فرمائی ہے، وہ اس طریق کار سے اس لئے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے کہ اس طرح انہیں سودی کاروبار میں ملوث ہونا پڑتا ہے جو حرام ہے۔

اس صورتحال کے پیش نظر پرویز نسیم صاحب نے اَنسا کے تعاون سے اسلامک کوآپریٹو ہاؤسنگ کارپوریشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو سود کے بغیر مکانات کے حصول کیلئے کوئی مناسب راستہ مہیا کیا جائے۔ لیکن جس اسکیم پر یہ کارپوریشن عمل کر رہی ہے، یہاں کے علماء نے اسے بھی ناجائز قرار دیا ہے، اس لئے کینیڈا آنے کے بعد اس کے بارے میں تقریباً ہر مجلس میں مجھ سے بھی سوالات ہوتے رہے۔ لہٰذا یہ مجلس اس لئے منعقد کی گئی تھی کہ میں کارپوریشن کے ذمہ دار حضرات سے اس کا طریق کار سمجھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کروں۔

چنانچہ احقر حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم کی معیت میں ان حضرات کے دفتر میں حاضر ہوا۔ بارہ بجے تک ان کے قواعد وضوابط اور معاملات کی تفصیل دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ فی الوقت شرعی نقطہ نظر سے اسکیم میں متعدد خامیاں موجود ہیں، لیکن ان کا ازالہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ میں کارپوریشن کا مطبوعہ مواد اور عملی مسائل کا جائزہ لے کر کسی اور نشست میں وہ ترمیمات پیش کروں، جن کے ذریعے یہ خامیاں دور ہو سکیں۔ چنانچہ آئندہ پیر کی شام کو اگلی میٹنگ طے کر کے یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

نمازِ ظہر کے بعد ۲ بجے کیوٹی سینٹر ہال ویمبلے میں اور عشاء کے بعد ویمبلے ہی کی مسجد میں خطاب ہوا۔ درمیان کا وقت مفتی محمد یوسف صاحب کے مکان پر گذرا۔ مفتی محمد یوسف صاحب گجرات کے ای مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں اور انہوں نے جلال آباد میں حضرت

مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم العالی مدرسہ میں افتاء کی تربیت حاصل کی ہے، اب یہاں ایک مدرسے میں تدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور کینیڈا میں لوگ دینی مسائل کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے ہیں اور وہ فتویٰ کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ سلیم الطبع، متواضع اور سادہ مزاج نوجوان ہیں۔ انہوں نے اپنی محبت سے احقر کی بڑی عزت افزائی کی۔ ٹورنٹو کے قیام کے دوران بکثرت ساتھ رہے اور یہاں کے فقہی مسائل پر گفتگو فرماتے رہے۔ ان کا مکان بھی چونکہ اسی علاقے میں ہے، اس لئے سہ پہر سے عشاء تک انہی کے یہاں قیام رہا۔ رات کا کھانا بھی انہی کے یہاں تھا۔

اگلے دن ۱۱ر اکتوبر کی صبح کو ہم پاکستان کے قونصل خانے گئے۔ یہاں پاکستان کے قونصل جنرل افضال اکرم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ انہیں خوش اخلاق، ملنسار اور فعال پایا۔ ٹورنٹو کے پاکستانی حضرات اُن کی کارکردگی سے خوش ہیں۔ اُن سے پاکستان کی بعض نئی خبریں بھی معلوم ہوئیں۔

نیاگرا آبشار

اسی روز احقر کے میزبانوں نے دنیا کی مشہور ترین آبشار نیاگرا کی سیر کا پروگرام رکھا تھا۔ نیاگرا ٹورنٹو سے قریباً سوا سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب اور عبدالقادر صاحب ہم سفر تھے۔ نمازِ ظہر کے بعد ہم ٹورنٹو سے روانہ ہوئے، سڑکیں نہایت کشادہ اور صاف تھیں، لیکن ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے یہ سفر تقریباً دو گھنٹے میں طے ہوا، نیاگرا ایک مستقل شہر ہے اسی کے کنارے وہ شہرۂ آفاق آبشار واقع ہے جو اپنے قدرتی حسن کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے، اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

اس کرشمۂ قدرت کی شہرت تو بچپن سے سنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا دلکش منظر جسے دیکھ کر انسان بے ساختہ فتبارک اللہ احسن الخالقین پکار اُٹھتا ہے، پہلی بار نظر نواز ہوا۔

نیاگرا دراصل ایک دریا ہے جو امریکہ کی چار مختلف قدرتی جھیلوں سے مرکب ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جن کے طاس کا مجموعی رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے۔ یہ دریا امریکہ اور کینیڈا کے درمیان حد فاصل کا کام بھی کرتا ہے اور شمال سے جنوب میں بہتا ہوا کینیڈا کی مشہور جھیل اونٹاریو میں آ گرتا ہے۔

جس مقام پر دریا نے دنیا کے مشہور ترین آبشار کی شکل اختیار کی ہے، وہاں اس دریا کے راستے میں ایک نہایت گہرا اور طویل و عریض نالہ حائل ہو گیا ہے، اور جب یہ دریا ایک وسیع رقبے میں زور و شور سے بہتا ہوا اس نالے کے کنارے پہنچتا ہے تو اس کے پانی کا زبردست ریلا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اس نالے میں گرتا ہے اور اس طرح پورے کا پورا دریا ایک آبشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس نالے کا مغربی سرا کینیڈا میں ہے اور اس کی شکل گھوڑے کی نعل کی سی ہے اسی لئے اس کو (Horseshoe Falls) پہلے یعنی ''نعلی آبشار'' کہا جاتا ہے، اور دریا کا بیشتر حصہ یہیں سے نالے میں گرتا ہے، دوسری طرف یہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر نالے کا جنوبی کنارا امریکہ میں ہے اور پانی کا باقی ماندہ حصہ چکر کاٹ کر اس کنارے سے نیچے گرتا ہے جسے امریکی آبشار کہا جاتا ہے۔

کینیڈا کا ''نعلی آبشار'' ہلالی نصف دائرے کی شکل میں ہے۔ اس نصف دائرے کا قطر دو ہزار چھ فٹ ہے۔ اور نالے کی سطح سے اس کی اونچائی ایک سو بانسٹھ فٹ ہے۔ گویا یہاں سے دریا کا بیشتر پانی نصف دائرے کی شکل میں پچاس میٹر سے زائد کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے جس کا شور دور سے سنائی دیتا ہے اور اس کی اُڑتی ہوئی چھینٹیں نالے کی نچلی سطح سے بلند ہو کر دریا کی اصل سطح سے بھی اونچی چلی جاتی ہے اور ان چھینٹوں کی وجہ سے ہر وقت آبشار کے سامنے ایک سفید بادل حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے پانی ۶ کروڑ گیلن فی منٹ کے حساب سے گرتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پانی کی یہ زبردست سیلاب اس جگہ کروڑوں سال سے اسی زور و شور کے ساتھ گر رہا ہے، لیکن یہ قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ نالے کا وہ کنارہ جہاں سے یہ لاکھوں ٹن پانی اس خوفناک دباؤ کے ساتھ گرتا ہے، لاکھوں صدیوں سے اس کا صرف چند فٹ حصہ اب تک گھس کر جھڑ سکا ہے، باقی جوں کا توں قائم ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

یہاں آبشار کا نظارہ کرنے کیلئے ایک طویل سڑک اور اس کے کنارے ایک فٹ پاتھ ہے۔ جو نعلی آبشار کے دہانے سے شروع ہو کر نالے کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی ہے۔ یہاں سے کھڑے ہو کر جنوب کی طرف سے دریا کا سفر اور پھر اچانک نالے میں گرنے کا نظارہ اتنا دلفریب اور مسحور کن ہے کہ انسان اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس سڑک کے نیچے سے ایک سرنگ نکالی گئی ہے جو نالے کی اُس نچلی سطح تک لے جاتی ہے جہاں آ کر یہ دیوہیکل دریا گرتا ہے، وہاں ایک پلیٹ فارم بنا ہوا ہے، جہاں سے لوگ برساتی پہن کر آبشار کے اپنے سامنے گرنے کا نظارہ کرتے ہیں۔ برساتی پہننا اس لئے ضروری ہے کہ دریا کی طوفانی چھینٹوں سے بچاؤ اس کے بغیر ممکن نہیں۔

پھر اس نالے کے کنارے کنارے سڑک پر مشرق کی طرف چلیں تو کچھ دور چل کر نالے کے جنوبی کنارے پر امریکی آبشار گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ آبشار سیدھا ہے اس کا عرض ایک ہزار فٹ ہے اور یہ ایک سو سڑسٹھ فٹ کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے۔ اس کی چوڑائی بھی کینیڈین آبشار کے مقابلے میں کم ہے اور سیدھا گرنے کی وجہ سے پانی کی مقدار اور اسکے بہاؤ کا زور بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کینیڈا کے ''نعلی آبشار'' کے مقابلے میں ماند معلوم ہوتا ہے۔ کچھ اور مشرق میں چلیں تو نالے کے اوپر ایک خوبصورت پُل بنایا گیا ہے جو ''دھنک پُل'' (Rainbow Bridge) کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہی پُل شمالاً جنوباً کینیڈا اور امریکہ کو ملاتا ہے۔ اس پُل کے بیچوں بیچ امیگریشن پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ اور اگر پاسپورٹ ساتھ ہو تو اس پل کے ذریعے امریکہ کے سیاح کینیڈا کا حصہ اور کینیڈا کے سیاح امریکہ کا حصہ دیکھنے کیلئے آ جاتے ہیں۔

آبشار کے شمال میں نیاگرا کی تفریح سے لطف اندوز ہونے کیلئے بڑے حسین پارک، رہائش گاہیں، ریستوران اور تفریحات کے بہت سے مراکز ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس جگہ کو دنیا کی حسین ترین تفریح گاہ قرار دیا جاتا ہے، جہاں لوگ کئی کئی ہفتے گزارتے ہیں، لیکن اس وقت موسم سرد تھا۔ اس لئے بہت کم سیاح آئے ہوئے تھے، اور اسی بنا پر ہم جیسے لوگ یہاں اطمینان سے کچھ وقت گذار سکے۔ ورنہ ہجوم کے زمانے میں یہاں جو طوفانِ بدتمیزی

www.freepdfpost.blogspot.com

برپا ہوتا ہے اس کی موجودگی میں یہاں زیادہ ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہیں پر ایک ہیلی کاپٹر سروس بھی ہے جو ہیلی کاپٹر کے ذریعے علاقے کی سیر کراتی ہے۔ ہمارے رہنما عبدالقادر پٹیل صاحب نے اصرار کر کے ہمیں اس ہیلی کاپٹر میں بھی سوار کر دیا۔ اس میں پائلٹ کے علاوہ چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ لیکن ہم تین ہی افراد اس میں سوار ہوئے۔ یہ ہیلی کاپٹر کی سواری کا پہلا اتفاق تھا۔ جو کھڑے کھڑے فضا میں بلند ہو گیا اور تقریباً دس منٹ تک نیاگرا آبشار اور اس کے ملحقہ علاقوں پر پرواز کرتا رہا۔ یہاں سے نیاگرا دریا، دونوں آبشاروں، امریکہ اور کینیڈا کے ملحقہ سبزہ زاروں کا منظر واقعۃً اتنا دلکش تھا کہ زمین سے اس کا لطف محسوس نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف! یہ شہرۂ آفاق آبشار جو دنیا کے عجائب میں شمار ہوتا ہے اور جس کی شہرت بچپن سے سنتے آئے تھے، آج اُس کی سیر بڑی پُرلطف رہی۔ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا میں ایسے حسین نظارے پیدا فرمائے ہیں تو جنت کے نظاروں کا عالم کیا ہوگا جس کے بارے میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

> ''میں نے اپنے بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جنہیں کسی
> آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی بشر کے دل میں
> اس کا تصور تک نہیں گذرا۔''

ہم نے نمازِ مغرب آبشار کے سامنے ایک سبزہ زار میں ادا کی غروبِ آفتاب کے بعد آبشاروں پر ایک قریبی ٹاور سے مختلف رنگوں کی روشنیاں ڈالی جاتی ہیں، جن سے دریا آبشاروں اور ملحقہ علاقوں کا منظر اور زیادہ حسین ہو جاتا ہے، لیکن اس روز کسی وجہ سے روشنیاں بند تھیں۔ ہم نمازِ مغرب کے بعد وہاں سے واپس ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔

اگلے دن زیادہ تر قیام گاہ پر ہی رہنا ہوا، دو مخصوص نشستیں تھیں جن میں مختلف حلقہ ہائے خیال کے حضرات سے ملاقات اور مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

سائنس سینٹر

جمعرات یکم ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ کو صبح سے بارہ بجے تک قیام گاہ پر ہی ملاقاتوں

کا سلسلہ رہا۔ ۱۲ بجے ہمارے میزبان احمد داؤد صاحب ٹورنٹو کے سائنس سینٹر لے گئے۔ یہ عوام کے لئے سائنسی معلومات اور سائنسی مظاہروں کا بڑا عظیم الشان مرکز ہے، اور کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں منفرد ہے۔

یہ مرکز ایک وسیع و عریض چار منزلہ عمارت میں واقع ہے، اور اس کے تمام حصوں کو ایک پورا دن صرف کر کے دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم نے تقریباً چار گھنٹے یہاں گذارے اور بمشکل اس کا نصف حصہ سرسری انداز میں دیکھ پائے۔ اس مرکز میں سائنس کے مختلف شعبوں کی معلومات کو نقشوں، کمپیوٹروں، آلات کے عملی استعمال اور مظاہروں کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے۔

پہلی منزل پر نو شعبے ہیں، ایک شعبہ ایٹم سے متعلق ہے۔ جس میں ایٹم کی دریافت اور اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں۔ دوسرا ٹیکنالوجی کے زیرِ عنوان ہے، جس میں مختلف آلات اور مشینوں کا استعمال دکھایا گیا ہے۔ تیسرا مواصلات سے متعلق ہے جس میں مختلف وسائل سفر کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، چوتھا سائنس کی نمائش ہے، جس میں مختلف سائنسی آلات کے ذریعے آواز اور روشنی وغیرہ پیدا کرنے کے مختلف کھیل رکھے گئے ہیں، پانچواں شعبہ رسل و رسائل کا ہے، جس میں ٹیلیفون، ٹیلی پرنٹر، وائرلیس، ریڈیو اور ٹی وی کے دلچسپ مظاہرے دکھائے گئے ہیں۔ چھٹا حصہ ''زندگی'' سے متعلق ہے جس میں حیوانات کے مختلف مراحل خورد بینوں وغیرہ کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ ساتواں شعبہ اُن فطری قوتوں کے مظاہرے کا ہے جو زمین پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ آٹھواں حصہ کینیڈا کے قدرتی وسائل کے بارے میں ہے اور نواں حصہ توانائی کے بارے میں معلوم فراہم کرتا ہے۔

دوسری منزل پر خلا کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مثلاً پوری کائنات کا ایک ماڈل بنا کر دکھایا گیا ہے کہ اس میں سیارے کس طرح گردش کرتے ہیں، چاند، سورج اور زمین کا تعلق واضح کیا گیا ہے، سورج کی روشنی سے دن رات پیدا ہونے کا منظر دکھایا گیا ہے اسی طرح مختلف سیاروں کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ چاند کے سفر وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اسی منزل پر ایک حصہ ''مالیکیول'' (Molecule) کے بارے میں ہے جس میں مختلف اشیاء کے مالیکیول اور ان کے خواص کا مظاہرہ کرایا جاتا ہے۔ یہیں ایک حصے میں لیزر شعاعوں کی نمائش کی جاتی ہے، یہ ایک خاص قسم کی شعاع ہے جس سے آج کے دور میں بہت سے کام لئے جارہے ہیں، یہاں تک کہ اسے آپریشن میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ شعاع رنگین چیز پر اثر کرتی ہے، لیکن سفید یا بے رنگ اشیاء پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہاں انہوں نے اس کا مظاہرہ کرایا کہ ایک رنگین غبارے پر یہ شعاع ڈالی گئی تو وہ پھٹ گیا، پھر سفید غبارے پر وہی شعاع ڈالی وہ اپنی جگہ صحیح وسالم رہا۔ پھر سفید غبارے کے اندر ایک سرخ غبارہ رکھ کر اس پر شعاع ڈالی گئی تو یہ حیرت انگیز نظر آیا کہ اندر کا سرخ غبارہ پھٹ گیا اور باہر کا سفید غبارہ صحیح وسالم رہا۔

اسی منزل پر زمین اور اس پر پیدا ہونے والی مختلف غذاؤں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ باقی دو منزلیں زیادہ تر نمائش گاہوں اور اجتماعات اور دفاتر وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

چار گھنٹے اس سائنسی مرکز میں پلک جھپکتے گذر گئے یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی قدرتِ کاملہ سے کیا کیا عجائب پیدا فرمائے ہیں۔ اور انسان کو عقل وفکر اور ہمت وتدبیر کی کیسی قوتیں عطا فرمائی ہیں جن کے ذریعے وہ ان عجائب قدرت کی دریافت اور ان کے استعمال کے طریقہ معلوم کرتا ہے اور وہ ہزار ہا سال سے اس کام میں مصروف ہیں لیکن ابھی تک اس کائنات کا کروڑواں حصہ بھی دریافت نہیں کرسکا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

یہاں سے فارغ ہوتے ہوئے عصر کا وقت تنگ ہونے والا تھا، ہم نے یہیں پر باجماعت نمازِ عصر ادا کی، اسی روز مجھے مانٹریال روانہ ہونا تھا، چنانچہ قیام گاہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی ایئرپورٹ روانہ ہوگیا۔

مانٹریال میں

رات کے آٹھ بجے جہاز مانٹریال کے لئے روانہ ہوا اور ایک گھنٹے کے سفر کے

بعد مانٹریال پہنچا۔ مانٹریال کینیڈا کا دوسرا بڑا شہر ہے اور اس کے جنوبی مشرقی صوبے کیوبیک (Quebec) کا دارالحکومت بھی ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک وسیع وعریض دریا سینٹ لارنس بہتا ہے جس کا پاٹ یہاں ایک میل یا اس سے بھی زائد ہے یہ دریا مانٹریال کو بحراوقیانوس سے ملاتا ہے اور اسی دریا پر کینیڈا کی اہم ترین بندرگاہ بھی واقع ہے۔ دریا اتنا وسیع وعریض اور گہرا ہے کہ اس میں بڑے جہاز آرام سے آجاتے ہیں۔

کیوبیک صوبہ کی بیشتر آبادی فرنچ ہے، اسی لئے یہاں کی سرکاری زبان بھی فرانسیسی ہے۔

رات نو بجے میں مانٹریال ایئرپورٹ پر اُترا تو احقر کے میزبان جناب سمیع اللہ صاحب اور یہاں کے اسلامک سینٹر کے صدر جناب محمد صدیق صاحب وغیرہ استقبال کیلئے موجود تھے۔ قیام جناب محمد صدیق صاحب کے مکان پر ہوا۔ اگلا دن جمعہ تھا اور جمعہ کی نماز احقر کو اسلامک سینٹر پر پڑھانی تھی، لیکن میری خواہش کے مطابق میزبانوں نے جمعہ سے پہلے میکگل یونیورسٹی دکھانے کا پروگرام رکھا تھا۔ چنانچہ ساڑھے ۹ ۱/۲ کے قریب سمیع اللہ صاحب مجھے لینے کیلئے آگئے۔

میکگل یونیورسٹی

مانٹریال میں کئی بڑی یونیورسٹیاں ہیں، جن میں بعض کی زبان انگریزی اور بعض کی فرنچ ہے۔ لیکن میکگل یونیورسٹی سے احقر کی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ اس یونیورسٹی کا ''اسلامی علوم کا شعبہ'' دنیا بھر میں مشہور ہے۔ عصر حاضر کے متعدد مشہور مستشرقین اسی یونیورسٹی سے پیدا ہوئے اور بہت سے مسلمان اسکالر بھی یہاں سے اسلامی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرکے فخر محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ عالم اسلام کے بہت سے تجدد پسند مصنفین جو مستشرقین جیسی فکر کے حامل تھے، یہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔

میکگل یونیورسٹی قدیم مانٹریال شہر کے گنجان آباد علاقے میں واقع ہے۔ جمعہ تک

www.freepdfpost.blogspot.com

وقت اتنا نہیں تھا کہ یہاں کے نظام ونصاب کا تفصیلی جائزہ لیا جاسکتا۔ اس لئے میں نے پہلے یہاں کی اسلامی علوم کی لائبریری دیکھنے کو ترجیح دی، کیونکہ مشہور یہ ہے یہ لائبریری براعظم امریکہ میں اسلامی علوم کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لائبریری میں اسلامی علوم کی کتابوں کا بڑا اگر انفدر ذخیرہ موجود ہے کتابوں کی کل تعداد نوّے ہزار ہے۔ دنیا بھر سے تقریباً نو سو ۹۰۰ مجلّات ورسائل کا ریکارڈ محفوظ ہے اور ۳۳۰ مجلّات باقاعدگی سے آتے ہیں۔ ۱۶۵ مخطوطات بھی ہیں کتابوں میں قدیم ترین مخطوطہ علامہ خیالیؒ کی شرح العقائد النسفیہ کا ہے جو ۸۹۹ھ میں لکھا گیا اور مطبوعہ کتابوں میں قدیم ترین وہ سولہ کتابیں ہیں جو استنبول میں پریس کے موجد ابراہیم متفرقہ نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں طبع کی تھیں، اس کے علاوہ خطاطی کی ایک قدیم ترین نمونہ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔

کتابوں کے ذخائر میں عربی، فارسی، اردو، ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں اسلامی علوم کی اہم کتابیں شامل ہیں اور اگر اس کا انتظام صحیح ہو تو یہ ایک نفیس کتب خانہ ہے۔ ہم نے دور دور سے بڑی شہرت سنی تھی کہ مغرب ممالک میں کتب خانوں کی ترتیب وتنسیق مثالی انداز کی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کتابوں کی تلاش کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ اس لائبریری کے بارے میں بھی قیاس یہی تھا اور بہت سے وہ لوگ جو یہاں سے پڑھ کر جاتے ہیں اس کتب خانے کے نہ صرف ذخیرے بلکہ ترتیب کے بھی تعریف کرتے ہوئے آتے ہیں۔ لیکن کتب خانہ دیکھنے کے بعد بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

واقعہ یہ ہے کہ کتابوں کی ترتیب اور درجہ بندی کے لحاظ سے یہ اس قدر ناقص اور بے ہنگم کتب خانہ ہے کہ اس دور میں کسی باوقار علمی ادارے کے اندر شاید اس سے زیادہ بے ڈھب ترتیب کا تصور مشکل ہو۔ مجھے جب پہلی بار پہلی الماری میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں گڈ مڈ نظر آئیں تو میں نے سمجھا کہ اتفاق سے اس الماری میں ایسا ہو گیا ہوگا لیکن اگلی الماری

کا بھی یہی حال تھا، اور پھر شروع سے آخر تک اوپر کی منزل کی تمام الماریاں چھاننے کے بعد اندازہ ہوا کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ فقہ کی کتابوں کے ساتھ تاریخ کی، تفسیر کے ساتھ رجال کی، حدیث کے ساتھ فلسفے کی، کلام کے ساتھ جغرافیہ کی کتابیں ایسی گڈ مڈ رکھی ہیں کہ ان کا مروّجہ درجہ بندی کے کسی زاویے سے کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

میں نے نیچے آ کر کتب خانے کی فہرست سے ترتیب کا اندازہ لگانا چاہا، لیکن فہرستیں تین ہیں۔ ایک مروّجہ کیٹلاگ کی صورت میں ایک رجسٹر کی صورت میں اور ایک کمپیوٹر میں۔ کچھ کتابوں کا اندراج کیٹلاگ میں ہے، کچھ کا رجسٹر میں اور کچھ کا کمپیوٹر میں، اور یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کس قسم کی کتب کہاں تلاش کی جائیں۔ میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ فقہ کے تحت کون کونسی کتب موجود ہیں تو فقہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی عنوان تینوں فہرستوں میں سے کہیں نہیں تھا۔ جو خاتون کتابوں کی تلاش میں مدد دینے پر مامور تھیں، ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کتابوں کی فہرست میں ''فقہ'' کا کوئی عنوان ہونا چاہئے۔

بالآخر میں اس معمے کے حل کیلئے لائبریری کے انتظامی سربراہ کے پاس گیا۔ مسٹر ایڈگام گاسک لائبریری کے منتظم اعلیٰ ہیں اور بڑے خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ انہوں نے نشان دہی کی کہ فقہ کا موضوع کمپیوٹر میں ''اسلامک لا'' کے زیر عنوان موجود ہے، پھر انہوں نے خود کمپیوٹر میں یہ موضوع نکال کر دکھایا اب میں نے اس کے ذیلی عنوانات دیکھے تو سب سے پہلا ذیلی عنوان ''الفروسیہ'' نظر آیا جس میں علامہ ابن قیمؒ کی مشہور کتاب ''الفروسیہ'' درج تھی۔ اب یہ سمجھ میں نہ آ سکا کہ کہ درجہ بندی کرنے والے نے فقہ میں سب سے پہلا اہم عنوان ''فروسیہ'' کو کس بنیاد پر قرار دیا؟ میں نے مسٹر ایڈم گاسک سے اس کی وجہ پوچھی تو ان کو ''فروسیہ'' کا مطلب یاد نہیں تھا، اس لئے انہوں نے کوئی جواب دینے سے معذرت ظاہر کی۔ پھر میں نے اُن سے کتب خانے کی بے ترتیبی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے اوّل تو مختلف ناکافی جوابات دیئے، لیکن بالآخر خاصی جرح کے بعد اصل وجہ یہ معلوم ہوئی کہ مشہور مستشرق ڈاکٹر ولفریڈ کینٹول اسمتھ نے اس ادارے کا انتظام سنبھالا تو انہوں نے کتب خانے کی درجہ بندی کی اسکیم بھی خود بنائی جو مروّجہ اسکیموں سے مختلف تھی۔ یہ اسکیم موضوعات یا حروف تہجی سے

www.freepdfpost.blogspot.com

زیادہ عالم اسلام کے مختلف علاقوں کی بنیاد پر تھی، مثلاً مصر میں لکھی ہوئی کتابیں ایک جگہ شام کی دوسری جگہ، وعلی ہذا القیاس۔

بعد میں لائبریری کے منتظمین نے اس اسکیم کو بدل کر لائبریری آف کانگریس کی اسکیم پر کرنا چاہا، لیکن عملاً وہ بھی پوری طرح اختیار نہ کی جاسکی، اور نتیجہ اس بے ترتیبی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

میں نے مسٹر ایڈم گاسک کو بتایا کہ ہمارے دار العلوم کا کتب خانہ اگرچہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے آپ کے کتب خانے سے نصف کے قریب ہے (یعنی نوّے ہزار کے بجائے تقریباً پچاس ہزار کتابیں) لیکن الحمدللہ ترتیب اور درجہ بندی ایسی ہے کہ کتاب کی تلاش میں ایک آدھ منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا اور ہر موضوع کی کتابیں اپنی منطقی ترتیب کے ساتھ مہیا ہیں۔

بہرکیف! اگر اس کتب خانے کی ترتیب ہو تو بلاشبہ یہ ذخیرۂ کتب کے لحاظ سے ایک اچھا کتب خانہ ہے۔ یہاں سے ادارے کے طلبہ اور اساتذہ کو کتب مستعار بھی دی جاتی ہیں۔ اور باہر کے جو لوگ فیس ادا کر کے ممبر بن جائیں، ان کو بھی کتابیں جاری کی جاتی ہیں۔

کتابیں مستعار دینے کیلئے انکی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ پہلی قسم کی کتب زیادہ سے زیادہ دو ہفتے تک مستعار لی جاسکتی ہیں۔ دوسری قسم کی کتابیں دو دن کیلئے لی جاسکتی ہیں۔ رسالوں کے مجلد فائل صرف رات بھر کیلئے جاری کئے جاتے ہیں۔ باقی کتابیں صرف لائبریری میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ باہر نہیں لے جائے جاسکتیں۔ مقررہ وقت پر کتابیں واپس نہ ہوں تو جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔

کتب خانے کے بعد ادارے کے تدریسی شعبے میں بھی جانا ہوا، وقت کی کمی کے باعث ادارے کا نظام پوری طرح سمجھنے کا تو موقع نہیں تھا۔ لیکن تدریسی موضوعات کا ایک سرسری خاکہ سامنے آیا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی جماعتوں میں مختلف موضوعات کے علاوہ عربی زبان اور اس کے ساتھ عالم اسلام کی کسی ایک دوسری زبان (مثلاً فارسی، ترکی، یا اردو وغیرہ) کا پڑھنا بھی لازم ہے۔ لیکن فرنچ یا جرمن یا دونوں زبانوں کو سیکھنا بھی ضروری

ہے۔ اوپر کی جماعتوں میں مندرجہ ذیل موضوعات کی تدریس نصاب میں شامل ہے:

(۱) مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ (۲) بیسویں صدی کے عربوں کے افکار (۳) مسلم ہندوستان کی تاریخ (۴) اسلامی روایت جس میں قرآن کریم، سیرت طیبہ، عقائد، اعمال اور اداروں کا تاریخی مطالعہ شامل ہے۔ (۵) اسلامی تہذیب کے کلاسیکی عہد کی تاریخ (۶) فاطمیوں کی تاریخ (۷) قرونِ متوسطہ میں اسلامی تہذیب کی تاریخ (۸) اسلامی افکار کے ارتقاء کا جائزہ۔ اس کے علاوہ تفسیر قرآن، اسلامی فلسفے، اسلامی اصولِ فقہ، تصوف شیعہ افکار، اسماعیلی فکر اور ادب، عرب، ایران اور پاکستان میں اسلامی ارتقاء، احیاء اسلام کی تحریکیں، بنیاد پرستی کی تحریک، مسلمان ملکوں میں سماجی اور معاشی تغیرات جیسے موضوعات بھی تعلیم کے مختلف مراحل میں شامل نصاب ہیں۔

یہ بات تو واضح ہی ہے کہ اس ادارے کا مقصد اسلام کو دین برحق سمجھ کر اس کی ہدایات وتعلیمات سے استفادہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں اساتذہ کی بیشتر تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے اور وہ روزانہ اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مغرب میں اسلام پر ''ریسرچ'' کرنے والے ان اداروں کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات کے بیج بونا اور مسلمان ملکوں میں مغربی مفادات کا تحفظ کرنے والوں کو علمی ہتھیار فراہم کرنا ہے۔ اور اگر بہت زیادہ خوش گمانی سے کام لیا جائے تو ''علم برائے علم'' ہے۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''علم برائے علم'' جو محض ''جاننے'' کی حد تک محدود رہ کر ''ماننے'' اور ''جھکنے'' سے نا آشنا ہو، انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ایسا علم کائنات میں سب سے زیادہ ابلیس کو حاصل ہے۔ لیکن وہ اُسے ''کفر'' اور ''جہنم'' سے بھی نہیں بچا سکا۔ اور جو علم انسان کو اپنے خالق و مالک تک پہنچا کر اُسے ایمان بھی نصیب نہ کر سکے، اُس پر خواہ مرغوب کن ڈگریوں کا کیسا دلفریب خول چڑھا ہوا ہو، کارزارِ حیات میں وہ انسان کے کسی کام کا نہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اور یہیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ کریم جیسی کتاب ہدایت بھی اگر سینے میں ''طلب حق'' کی کسک پیدا کئے بغیر پڑھی جائے تو انسان کو ہدایت نہیں پہنچاتی، بلکہ اگر ''طلب حق'' کے بجائے دل میں ''استکبار'' اور ''خودرائی'' ہو تو اسی کتاب سے ہدایت کے بجائے گمراہی حصے میں آتی ہے، اور انسان منزل کا پتہ حاصل کرنے کے بجائے اپنی فکری اور عملی بے راہ روی میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے فرمایا ہے:

یُضلِّ بہ کثیرا وَ یھدی بہ کثیراً

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سوں کو
گمراہ کرتا اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔

مستشرقین کے ان اداروں کا مقصد اور خواہ کچھ ہو، لیکن طلب حق نہیں ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دن رات قرآن وسنت کا مشغلہ رکھنے کے باوجود اس کے حقیقی نور سے محروم ہیں، اور مقامِ عبرت ہے کہ کفر تک کی ظلمتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔

لیکن اس سے زیادہ عبرتناک مسلمان ملکوں کا یہ طرزِ فکر ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود انہوں نے اسلامی علوم کے بارے میں بھی انہی اداروں کی ڈگریوں کو اپنے معاشرے میں بڑا اونچا مقام دے رکھا ہے اور مسلمانوں کو بھی مجبور کر رکھا ہے کہ اگر سرکاری سطح پر اسلامی علوم میں اپنی قابلیت منوانی ہے تو انہی اداروں میں پڑھ کر آؤ، اور اُن لوگوں کے معیار پر پورے اُترو جو ان اسلامی علوم سے ایمان اور عمل صالح کی دولت حاصل کرنا نہیں چاہتے، گویا اسلام کا بھی وہی علم معتبر ہے، جسے اسلام کی حقانیت سے انکار کرنے والے یہ غیر مسلم صحیح قرار دیں۔ ذہنی غلامی اور غیرت کے دیوالیہ پن کی یہ انتہاء ہے جو آج بہت سے مسلم ملکوں میں ایک فیشن بنی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر دین اور دین کے علوم میں مہارت وقابلیت کو جانچا جا رہا ہے اور ان سے کوئی یہ کہنے والا موجود نہیں کہ ؎

کرمک ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

بہرکیف! استشراق کی تحریک، اس کے مقاصد اور اس کے طریق کار پر تبصرہ

ایک مستقل موضوع ہے، جس کی تفصیلات سے اس سفرنامے کو بوجھل نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ چند تاثرات تھے جو اس ادارے کے معائنے کے دوران دل ودماغ پر چھائے رہے۔

اب جمعہ کا وقت قریب تھا، یہاں سے ہم مانٹریال کی مرکزی مسجد ''مسجد الاسلام'' پہنچے جو ''اسلامک سینٹر'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہلے دس منٹ اردو میں احقر کا خطاب ہوا، پھر اسی کا خلاصہ احقر نے عربی خطبے میں عرض کیا۔ نماز جمعہ کے بعد مرکز کا معائنہ ہوا۔ ماشاء اللہ یہ بڑی اچھی مسجد ہے جس کے ساتھ تعلیمی اور تبلیغی خدمات کے متعدد شعبے موجود ہیں، بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے اور مرکز کا انتظام برصغیر اور عرب ممالک کے مسلمان مل جل کر انجام دیتے ہیں۔

اسی روز مغرب کے بعد ویسٹ آئی لینڈ کی ایک مسجد میں بھی مفصل تقریر ہوئی، خواتین بھی پردے کے انتظام کے ساتھ موجود تھیں اور تقریر کے بعد دیر تک سوال وجواب کا بھی سلسلہ رہا۔

اگلے دن صبح ۱۰ بجے احقر کی قیام گاہ یعنی جناب محمد صدیق صاحب کی قیام گاہ ہی پر سوال وجواب کی ایک نشست تھی جس میں مختلف حلقہ ہائے خیال کے حضرات نے خاصی بڑی تعداد میں دلچسپی کے ساتھ شرکت کی اور سلسلہ ۱۲ بجے دن تک جاری رہا۔

معہد الرشید الاسلامی

بارہ بجے ہم مانٹریال سے تقریباً سو کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر کورن وال (Cor n Wall) کیلئے روانہ ہوئے۔ یہاں ایک دینی مدرسہ ''معہد الرشید الاسلامی'' کے نام سے قائم ہے۔ اسے دیکھنا اور وہاں کے حضرات سے ملنا مقصود تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کورن وال پہنچے یہ مدرسہ ایک دریا کے کنارے بڑے پُرفضاء مقام پر واقع ہے۔ ماشاء اللہ مدرسے کو بڑی وسیع زمین ملی ہوئی ہے اور ایک بہت بڑی عمارت جو پہلے کسی ہسپتال کی عمارت تھی۔ اپنی بہت سی تنصیبات کے ساتھ سستے داموں دستیاب ہوگئی ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

مدرسے کے مہتمم مولانا مظہر عالم صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے فارغ التحصیل ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ کوئی عالم دین براعظم امریکہ کو اپنا مستقر بنا کر وہاں دین کی تعلیم وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں اور وہاں کوئی ایسا ادارہ قائم کریں جو اس علاقے کی ضروریات کے مطابق نہ صرف بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کرے، بلکہ رفتہ رفتہ ایسے علماء تیار کرے جو امریکہ میں مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کرسکیں۔ اس غرض کیلئے آپ نے مولانا مظہر عالم صاحب کا انتخاب کیا اور انہیں کنیڈا بھیجنے کا انتظام فرمایا۔ مولانا جب کنیڈا آ کر اُترے تو ان کی یہاں کوئی خاصی واقفیت نہیں تھی۔ انگریزی زبان سے بھی واقف نہیں تھے۔ اس لئے ابتدا میں بڑی قربانیوں کے ساتھ وقت گذارا، یہاں تک کہ کئی روز تک ایئرپورٹ ہی پر بھوکے پیاسے پڑے رہے، لیکن بالآخر حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہٗ کے دل کی تڑپ اور مولانا کی قربانیاں رنگ لائیں اور اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد فرمائی اور ہوتے ہوتے یہ عظیم الشان مدرسہ وجود میں آ گیا۔ مولانا نے یہاں پہنچنے کے بعد ہی انگریزی سیکھی اب وہ انگریزی میں بے تکلف تقریریں فرماتے ہیں اور اس مدرسہ کو اس معیار تک پہنچانے کے لئے بڑی غیر معمولی ہمت، استقامت اور محنت کا مظاہرہ فرمایا۔

اب ماشاء اللہ اس مدرسہ میں کنیڈا اور امریکہ کے مختلف علاقوں کے بہت سے بچے مقیم ہیں، مقامی بچے بھی زیر تعلیم ہیں۔ ابھی چونکہ آغاز ہی ہے۔ اس لئے فی الحال قرآنِ کریم، حفظ وناظرہ اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ مروجہ عصری تعلیم بھی اس کے ساتھ ساتھ جاری ہے اور مدرسہ کی سند سرکاری طور پر منظور شدہ ہے۔ جوں جوں یہ بچے تعلیم میں آگے بڑھیں گے، انشاء اللہ اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہوتا جائے گا۔

یہ مدرسہ..... جسے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کی کرامت ہی کہنا چاہئے، دیکھ کر بہت دل خوش ہوا کہ ماشاء اللہ اس علاقے میں مسلمانوں کے دین کے تحفظ کیلئے یہ بڑا قابل قدر ادارہ قائم ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہری و باطنی ترقیات عطا فرمائیں اور دین کی زیادہ خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین

دوپہر کا کھانا مولانا مظہر عالم صاحب کے یہاں کھایا۔ انہوں نے بڑی محبت سے مدرسہ دکھایا اور اس کے مختلف کاموں کا تعارف کرایا۔ نمازِ عصر مدرسہ ہی میں ادا کر کے ہم واپس مانٹریال کیلئے روانہ ہوئے۔

مغرب کی نماز کے بعد مانٹریال کی ایک مضافاتی بستی ساؤتھ شور کی مسجد میں احقر کا خطاب تھا اور عشاء کے بعد یہاں کے ایک متدین تاجر جناب احمد شیخ صاحب کے مکان پر کھانا اور اس کے بعد سوال وجواب کی نشست تھی جو رات دس بجے برخاست ہوئی۔

واپسی میں احقر کے میزبان جناب محمد صدیق صاحب دن بھر کی تھکن کے بعد تفریح کیلئے مانٹریال شہر سے ہوتے ہوئے یہاں کے مشہور پہاڑ مونٹ لارنس لے گئے۔ یہ بڑا خوبصورت اور سرسبز وشاداب پہاڑ ہے جس کے دامن میں پورا مانٹریال شہر آباد ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ''مانٹریال'' دراصل ''مونٹ لارنس'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے پورے شہر کا منظر بڑا دلفریب ہے۔ پہاڑ کے دامن میں حدنظر تک روشنیوں کی ایک فصیل اُگی ہوئی نظر آئی ہے۔ اور سینٹ لارنس کے پانی میں ان روشنیوں کا عکس بہتے ہوئے سونے کا منظر پیش کرتا ہے۔ سحتری نے ایک تالاب کے کسی ایسے ہی منظر کو دیکھ کر کہا تھا۔

إذا النّجوم تراءت فی جوانبها[1]
لیلا، حسبت سماء رکّبت فیها

اولمپک اسٹیڈیم

اگلا دن تو ارتھا اور مغربی ممالک میں عام طور سے لوگوں کا معمول یہ ہے کہ ظہر تک اپنے گھروں میں رہتے ہیں اور کوئی اجتماع یا تقریب ہو تو ظہر کی نماز کے بعد ہوتی ہے جس میں لوگ اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج ظہر کی نماز کے بعد اسلامک سینٹر

[1] جب رات کے وقت ستارے اس کے مختلف گوشوں میں نظر آنے لگتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے آسمان اس میں پیوست ہوگیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

میں احقر کی مفصل تقریر رکھی گئی تھی اور ظہر تک کا وقت خالی تھا۔ احقر کے میزبان جناب سمیع اللہ صاحب مجھے دس بجے کے قریب لینے کیلئے آ گئے اور درمیانی وقت میں مانٹریال کا مشہور اولمپک اسٹیڈیم دکھانے لے گئے۔ چند سال پہلے یہاں کھیلوں کے عالمی مقابلے منعقد ہوئے تھے، یہ اسٹیڈیم اور اس کی ملحقہ عمارتیں اس وقت تعمیر ہوئی تھیں۔ اور چونکہ فن تعمیر کے لحاظ سے یہ عمارتیں منفرد خصوصیات کی حامل ہیں، اس لئے اب یہ ایک تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔

یہ جگہ مانٹریال کے مشرق میں واقع ہے اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے مانٹریال کا حسین ترین علاقہ ہے، یہاں پہلے سے ایک وسیع پارک موجود تھا، لیکن ۱۹۷۶ء میں جب اس جگہ کا انتخاب اولمپک کھیلوں کیلئے کیا گیا تو تقریباً ۱۲ کروڑ ڈالر کے خرچ سے یہاں اسٹیڈیم کی یہ عمارت تعمیر ہوئی جو دنیا بھر میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ایک ستار کی شکل میں بنایا گیا ہے جس کا پیٹ اسٹیڈیم کا اصل گراؤنڈ ہے اور اس پر ایک ڈھکے ہوئے پیالے کی شکل میں ایک فولڈنگ چھت ہے جسے جب چاہیں۔ اوپر سے اُٹھایا جاسکتا ہے۔ چھت اوپر موجود ہو تو یہ ایک وسیع و عریض گول ہال ہے اور چھت اُٹھالی جائے تو یہ ایک میدان ہے۔ اس فولڈنگ چھت کا رقبہ دو لاکھ مربع فٹ ہے اور یہ مجموعی طور پر ۱۹۰ ٹن وزنی چھت کے کنارے پر ستار کے مسطول کی شکل میں ایک ۵۵۶ فٹ بلند ٹاور ہے جو ۵۰ منزلہ عمارت کے برابر ہے اور انتہائی بلندی پر اس کے میلان کا زاویہ ۴۵ ڈگری ہے۔ اس ٹاور سے اسٹیل کی مضبوط رسّیاں اسٹیڈیم کی چھت کی طرف لٹکائی گئی ہیں، جو ایک طرف جھکے ہوئے ٹاور کا توازن برقرار رکھتی ہیں اور دوسری طرف چھت کو اوپر اُٹھانے کے کام آتی ہیں اور اس طرح یہ دیوہیکل چھت ۴۵ منٹ میں اوپر اُٹھ جاتی ہے یہ ٹاور جو اس ستار نما عمارت کے مسطول کے طور استعمال ہوتا ہے، دنیا کا سب سے بلند و ترچھا ٹاور ہے۔ اس میں اوپر تک لے جانے کیلئے ایک کیبل کیبن لگایا گیا ہے جو دو منزلہ ہے اور ترچھے زاویے سے اوپر چڑھنے کے باوجود پورے راستے سیدھا رہتا ہے۔ اس میں ۹۰ افراد بیک وقت سفر کر سکتے ہیں اور دو منٹ میں اوپر پہنچا دیتا ہے اور راستے میں اس کی

شیشے کی دیوار سے گرد و پیش کا حسین منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔

یہ عمارت بلاشبہ فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے اور متعدد جہتوں سے بڑی حیرت انگیز عمارت ہے۔ لیکن اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ کروڑوں ڈالر کی یہ خطیر اور ہزارہا انسانوں کی ذہنی اور عملی توانائیاں کس مقصد پر خرچ ہوئی ہیں۔ تو یہ انسانیت کیلئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کھیل جسمانی ورزش اور تفریح طبع کیلئے ایک فراغت کا مشغلہ تو ہوسکتا ہے لیکن جس طرح اسے مقصد زندگی بنا کر اُس پر تن من دھن کی بازی لگائی جارہی ہے اور فقر و افلاس میں ڈوبی ہوئی اس دنیا میں اُس پر جس طرح اربوں کھربوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ عقل و خرد اور حق و انصاف کی نظر میں کیا اس کا کوئی جواز ہے؟..... لیکن اس ''ترقی یافتہ'' زمانے میں اس قسم کے لمحات فکریہ فرسودگی اور دقیانوسیت کی علامت بن گئے ہیں۔ ہم کون ایسی فرسودہ باتوں پر کان دھرے؟

ظہر سے ذرا پہلے ہم اسلامک سینٹر پہنچ گئے اور نماز ظہر کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب ہوا مردوں اور عورتوں کا اچھا بڑا اجتماع تھا۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کی بھی طویل نشست ہوئی۔

میرے ایک عزیز جناب شمیم صاحب مانٹریال ہی میں مقیم ہیں، لیکن اب تک ان کے یہاں جانا نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے اُن کے مکان پر جانا ہوا۔ وہاں بھی بہت سے دوست پہنچ گئے یہاں تک کہ ایئرپورٹ کے لئے روانگی کا وقت آ گیا۔ مغرب کی نماز میں نے ایئرپورٹ پر ادا کی اور واپس ٹورنٹو کیلئے روانہ ہوگیا۔

ٹورنٹو میں اگلے دن اسنا (ISNA) کے صدر جناب اشرف صاحب اور ہاؤسنگ کارپوریشن کے چیئرمین جناب پرویز نسیم صاحب سے شام کا وقت طے تھا کہ اس میں ہاؤسنگ اسکیم کے صحیح شرعی طریقے پر گفتگو ہوگی۔ لیکن میں مسلسل سفر کی وجہ سے اب تک اسکیم کی تفصیلات کا کماحقہٗ مطالعہ کر کے اپنی تجاویز مرتب نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ میں نے صبح سے دوپہر تک اسی اسکیم پر غور اور متبادل تجاویز کی تیاری میں وقت گذارا، بیچ بیچ میں لوگ بھی ملنے کیلئے آتے رہے۔ عصر کے بعد ہم اسنا (ISNA) کے دفتر کیلئے روانہ ہوئے، نماز مغرب

www.freepdfpost.blogspot.com

بھی وہیں ادا کی۔ رات کا کھانا بھی وہیں ہوا۔ اور اسکیم کے مختلف پہلوؤں پر رات گیارہ بجے تک گفتگو ہوتی رہی۔ پرویز نسیم صاحب نے اسکیم کی تفصیلات اور احقر کی تجاویز کے اور احقر کی تجاویز کے بارے میں عملی مسائل پیش کئے۔ بالآخر الحمدللہ احقر کی تجاویز سے انہوں نے اتفاق کرلیا اور یہ طے ہوگیا کہ وہ طریق کار میں ترمیم کیلئے اپنے بورڈ سے منظوری لیں گے۔ اس کے بعد ان تبدیلیوں کی روشنی میں اپنے معاہدات ازسرنو مرتب کرکے میرے پاس کراچی بھیجیں گے۔

اگلا دن منگل تھا، صبح کے وقت کچھ ضروریات کی خریداری کا پروگرام تھا۔ چنانچہ اس قیام کے دوران پہلی بار بازار جانا ہوا۔ اٹین سینٹر (Eaton Centre) یہاں کی بہت بڑی سپر مارکیٹ جو کئی منزلوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور بجائے خود قابل دید ہے۔

اِدھر ٹورنٹو میں آتے جاتے تقریباً روزانہ یہاں کا شہرۂ آفاق سی این ٹاور نظر آتا رہتا تھا۔ جو اس وقت دنیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے۔ رفقاء نے وہاں بھی لے جانے کا پروگرام بنایا اور اٹین سینٹر سے وہاں لے گئے۔ یہ ٹاور ۵۳۳٫۳۳۸ میٹر (۱۸۱۵ فٹ ۵ انچ) بلند ہے، جس کی اونچائی تقریباً ایک سو اکیاسی منزل کے برابر ہے اوپر کے حصے میں آلاتِ رصد نصب ہیں اور ۱۴۶۵ فٹ کی بلندی پر سب سے اونچی تماشگاہ بنی ہوئی ہے، لیکن اس روز ہواؤں کے تیز جھکڑوں کی وجہ سے اس منزل کو بند کیا ہوا تھا۔ اس سے نیچے ۱۱۳۶ فٹ کی بلندی پر ایک گھومتا ہوا ریستوران ہے۔ یہاں شیشے کی دیواروں سے پورے شہر کا منظر عجیب وغریب ہے۔ سامنے ایک طرف اونٹاریو جھیل جو کنیڈا کی سب سے بڑی جھیل ہے، حدنظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور باقی اطراف میں ٹورنٹو اور اس کے مضافاتی علاقے پھیلے ہوئے ہیں۔ نیچے سڑکوں پر چلتی ہوئی گاڑیاں اور رینگتے ہوئے انسان چیونٹیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ مجھے اپنے والد ماجد کی بات یاد آ گئی کہ جب اتنی سی بلندی پر پہنچ کر دنیا کی چیزیں اتنی چھوٹی اور حقیر نظر آنے لگتی ہیں تو جو ذات (ﷺ) ساتوں آسمان اور اس سے بھی اوپر جنت وجہنم کے

نظارے کرکے آئی، اگر وہ دنیا کو مچھر کے پَر سے بھی زیادہ بے حقیقت قرار دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

اسی روز نمازِ مغرب کے بعد ایک دوست جناب نعیم صاحب کے یہاں اُن حضرات کا ایک خصوصی اجتماع تھا، جو ٹورنٹو کے مختلف حصوں میں درسِ قرآن وغیرہ کے حلقے قائم کرتے ہیں۔ وہاں احقر کا خطاب بھی ہوا اور رات گئے تک یہاں کے تبلیغی اور دعوتی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہا۔

اُدھر امریکہ کے مشہور شہر شکاگو سے مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے متعدد فون آئے وہ چاہتے تھے کہ چند روز کیلئے احقر شکاگو بھی حاضر ہو۔ چنانچہ بدھ ۷ ربیع الاوّل (۱۹ اکتوبر) سے ہفتہ ۱۰ ربیع الاوّل تک ترین روز کے لئے شکاگو کا دورہ طے ہوگیا تھا۔

شکاگو میں

چنانچہ اگلے دن صبح ۷ بجے میں قیام گاہ سے ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوا۔ ۱۰ بجے امریکن ایئرلائنز کا طیارہ روانہ ہوا۔ یہاں اوّل تو ہر جگہ ہی ایئرپورٹ کا انتظام نہایت سادہ اور آسان ہے مشرقی ممالک کی طرح ایئرپورٹ پر بہت سے صبر آزما مراحل سے گذرنا نہیں پڑتا بلکہ اکثر ایک ہی کاؤنٹر پر بیشتر مراحل طے ہوجاتے ہیں اور خاص طور سے یہ سہولت یہاں پہلی بار دیکھنے میں آئی کہ جو امیگریشن اور کسٹم کی کارروائی امریکہ پہنچ کر ہونی چاہئے تھی وہ ٹورنٹو ہی کے ایئرپورٹ پر ہوگئی اور جب ہم جہاز میں سوار ہوئے تو تمام معاملات سے ایسے فارغ تھے جیسے کسی ملکی پرواز پر سفر کررہے ہوں۔

ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز شکاگو کے ہوائی اڈے پر اُترا جو دنیا کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ہے، اور جہاں رن وے کے اُفق پر اکثر آٹھ آٹھ دس دس طیارے چیلوں کی قطار کی طرح زمین پر اُترنے کیلئے تیار نظر آتے ہیں۔

ایئرپورٹ پر مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب استقبال کیلئے موجود تھے۔ کراچی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے مولانا یعقوب باوا اور مولانا منظور حسین صاحب بھی ان دنوں

www.freepdfpost.blogspot.com

شکاگو میں تھے اور وہ بھی ایئرپورٹ پر تشریف لائے تھے۔ قیام مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے مکان پر ہوا۔ مولانا حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہم کے قریبی عزیز ہیں اور احقر کے برادرعم زاد مولانا خورشید عالم صاحب (دیوبند) کے برادرِ نسبتی۔ کئی سال سے شکاگو میں مقیم ہیں اور ماشاءاللہ یہاں انہوں نے تعلیم وتبلیغ کا نہایت مفید سلسلہ جاری کیا ہوا ہے، ان علاقوں میں کسی مستند عالم دین کا وجود بہت بڑی نعمت ہے، اور ماشاءاللہ مولانا یہاں بہت اچھا کام کررہے ہیں۔

انہوں نے مغرب کے بعد اپنے مکان پر شکاگو کے اسلامی مراکز کے چیدہ چیدہ ذمہ دار حضرات کو مدعو کیا ہوا تھا، جن میں سے مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر یاد رہ گئے ہیں۔

سوڈان کے ایک جلیل القدر عالم شیخ محمد نور مالکی یہاں ایک مسجد فاؤنڈیشن کے صدر ہیں، اور ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ماشا۔اللہ وہ صاحب استعداد عالم ہیں، اور اس علاقے میں گرانقدر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر احمد صقر اصلاً ایک سائنس دان ہیں، لیکن دین سے اپنے گہرے لگاؤ کے باعث مطالعے کے ذریعے بقدرِ ضرورت دینی معلومات کے حامل ہیں۔ مغرب میں جو غذائیں اور دوائیں عام طور پر استعمال ہوتی ہیں ان کے اجزاء ترکیبی پر انہوں نے بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی ہے جن میں ان اجزاء کی حلت اور حرمت سے بحث کی ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ کون سی غذاؤں سے پرہیز رکھیں۔ یہ کتاب امریکہ کے مسلمانوں میں کافی مقبول ہے۔

ایم سی سی (مسلم کمیونٹی سینٹر) یہاں مسلمانوں کا ایک ممتاز ادارہ ہے جس کے تحت مسجد مدرسہ اور متعدد سماجی خدمات کا انتظام ہے۔ زیادہ تر برصغیر کے مسلمان اس ادارے کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن بہت سے عرب حضرات بھی اس میں شریک ہیں۔ اس ادارے کے صدر فخرالدین صاحب سے بھی اس اجتماع میں ملاقات رہی۔

جناب عبداللہ انصاری صاحب حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ عرصۂ دراز سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں اور انہوں نے ''اقرأ فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے، جس کے تحت انہوں نے بچوں کی دینی تعلیم کیلئے آسان انگریزی میں نصابی

کتب تیار کی ہیں، جو بڑی سہل، سادہ اور عصر حاضر کے تعلیمی اسلوب کے مطابق ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ انگریزی میں علمی اور تحقیقی کتب کی تالیف اور اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کچھ عرصے وہ جدہ میں بھی رہے ہیں اور ان سے جدہ میں بھی اس منصوبے کی کچھ تفصیلات سننے میں آئی تھیں۔

جناب عبدالقوی صاحب ایم سی سی کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور امریکی مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی شکاگو اور اس کی مضافات کے بااثر مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد سے اس عشائیے میں ملاقات ہوئی، اور یہاں کے مسائل کی تفصیلات معلوم ہوئیں اور رات گئے تک مختلف مسائل کے لئے باہمی تعاون کے طریقوں پر گفتگو ہوتی رہی۔

اگلا دن جمعرات تھا، اور عشاء کے بعد مسلم کمیونٹی سینٹر کے ہال میں ایک عشائیہ اور خطاب کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن دن کے وقت فارغ تھا۔ مجھے واپسی میں پیرس اُترنے کیلئے فرانس کا ویزا لینا تھا، چنانچہ جناب مولانا عبداللہ سلیم صاحب مجھے فرانس کے قونصل خانے لے گئے جو شکاگو شہر کے وسط میں واقع ہے، یہاں سے فرانس کا ویزا حاصل کیا۔ یہیں کچھ فاصلے پر شکاگو کی شہرۂ آفاق عمارت سیئرز بلڈنگ (Sears Building) واقع ہے چنانچہ مولانا احقر کو وہاں بھی لے گئے، سیئرز بلڈنگ اس وقت دنیا کی سب سے بلند عمارت ہے۔ پہلے نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جو ۱۰۲ منزلہ ہے، دنیا کی بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نیویارک ہی میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر تعمیر ہوا جو ۱۱۰ منزلہ ہے لیکن اب شکاگو کی یہ سیئرز بلڈنگ جو ۱۱۵ منزلوں پر مشتمل ہے، ان دونوں عمارتوں پر بھی سبقت لے گئی ہے، یہ عمارت سطح زمین سے ۱۴۵۴ فٹ بلند ہے اور اگرچہ ٹورنٹو کا سی این ٹاور اس سے زیادہ اونچا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ جس کی ہر منزل مختلف دفاتر وغیرہ میں مشغول ہے۔ لہٰذا اگر سی این ٹاور دنیا کا بلند ترین مینار ہے، تو یہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔

گراؤنڈ فلور سے اوپر لے جانے کیلئے ایک انتہائی تیز رفتار لفٹ استعمال ہوئی ہے۔ جو ۵۰ سیکنڈ میں ۱۰۳ منزل تک پہنچا دیتی ہے، یہاں ایک تماشگاہ بنی ہوئی ہے جس کے

www.freepdfpost.blogspot.com

چاروں طرف شیشے کی دیواریں ہیں اوران کے ساتھ دوربینیں نصب ہیں۔ یہاں سے شکاگو کا پورا شہراوراس کے پس منظر میں مشی گن جھیل حدنظر تک پھیلی نظر آتی ہے۔

اسی روز عشاء کی نماز مسلم کمیونٹی سینٹر کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد ایم سی سی کی طرف سے ایک استقبالی عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں شہر کے مختلف حصوں اور مختلف جماعتوں کے تقریباً سو کے قریب مسلمان مدعو تھے۔ عشائیہ کے بعد ایم سی سی کے چیئرمین جناب فخرالدین صاحب کی طرف سے خیرمقدمی تقریر ہوئی اوراس کے بعد احقر کا خطاب۔ آخر میں سوال وجواب کی نشست دیر تک جاری رہی۔

اگلا دن جمعہ تھا اور جمعہ کی نماز بھی اسی کمیونٹی سینٹر کی مسجد میں ادا کرنی تھی۔ نماز سے پہلے احقر نے چند منٹ خطاب کیا۔ اس کے بعد عربی خطبے میں اسی کا خلاصہ پیش کیا۔ کیونکہ یہاں حاضرین میں عربوں کی تعداد کافی تھی۔

شکاگو میں اُردن کے ایک عالم شیخ علاؤالدین خروفہ بھی قیام پذیر ہیں۔ گذشتہ رات کے عشائیہ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اورانہوں نے جمعہ کے بعد اپنے مکان پر کھانے کی دعوت دی تھی وہ بھی نمازِ جمعہ میں تشریف فرما تھے۔ چنانچہ نماز کے بعد ان کے ساتھ ان کے مکان پر جانا ہوا۔ شیخ خروفہ بڑے خوش اخلاق، ذہین وزیرک اور ملنسار عالم ہیں ان کے ساتھ یہاں پیش آنے والے فقہی مسائل پر دیر تک گفتگو رہی۔ نمازِ عصر بھی انہی کے ساتھ پڑھی اور یہاں سے شہر کی بالکل مخالف سمت میں جانا تھا، جہاں مغرب کے بعد سیرتِ طیبہ کے موضوع پر احقر کی تقریر کا اعلان تھا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک دوسرے ادارے ''مسلم فاؤنڈیشن'' کے زیرانتظام تھا۔ اس ادارے کے تحت بھی ایک مسجد، ایک مدرسے اور مسلمانوں کی دوسری سماجی اور دعوتی خدمات کا انتظام ہے۔ اور مولانا عبداللہ سلیم صاحب اسی ادارے میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں جو ماشاءاللہ یہاں بہت مقبول ہے۔

یہاں بھی مردوں، عورتوں دونوں کے علیحدہ اجتماع کا انتظام تھا، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی بعد میں سوال وجواب کا سلسلہ بھی رہا۔ عشاء کی نماز بھی یہیں ادا کی اوراس کے بعد قیام گاہ پر واپسی ہوئی۔

اگلے روز صبح ۵ بجے ہی ٹورنٹو واپسی کیلئے ایئرپورٹ پہنچنا تھا، مولانا عبداللہ سلیم صاحب نے ایئرپورٹ پر بڑی محبت سے رخصت کیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ٹورنٹو پہنچا آج ہی شام کو واپس کراچی کیلئے روانگی تھی۔ بردارِ محترم جناب محمد ولی رازی صاحب کے ایک رفیق جناب فرید صاحب نے پہلے ہی سے یہ وعدہ لے رکھا تھا کہ اس دن ان کے یہاں قیام رہے گا۔ وہ ایئرپورٹ پر آگئے تھے اور اپنے مکان پر لے گئے۔ ٹورنٹو کے دوسرے احباب بھی وہیں تشریف لے آئے۔

۴ بجے شام کو ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوئے۔ ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کیلئے بہت سے احباب موجود تھے جن میں ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب، مسجد المدینہ کے مولانا خلیل صاحب، مفتی محمد یوسف صاحب، ہمارے میزبان جناب عبدالحئی پٹیل صاحب، مجلس تحفظ ختم نبوت کے حافظ سعید صاحب اور ٹورنٹو کے اور بھی متعدد احباب موجود تھے۔

ٹورنٹو کے دوستوں کا اصرار تھا کہ ابھی کم از کم ایک ہفتہ مزید کنیڈا میں قیام رہے، اِدھر ویسٹ انڈیز اور امریکہ کی بعض دوسری ریاستوں سے بھی فون آئے تھے کہ چند روز وہاں بھی حاضری ہو، لیکن احقر نے اس سفر کیلئے جو تین ہفتے مختص کئے تھے وہ پورے ہو چکے تھے، اور کراچی میں بعض ضروری مصروفیات کا تقاضہ تھا کہ اب جلد واپسی ہو۔ اس لئے معذرت کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور یہاں کے احباب نے جس محبت اور خلوص کا معاملہ فرمایا، اس کا نقش دل پر لئے میں سات بجے شام پیرس کیلئے روانہ ہوگیا۔

آخری دن پیرس میں

ٹورنٹو سے پیرس تک تقریباً آٹھ گھنٹے کی پرواز تھی۔ اور دونوں ملکوں کے اوقات میں پانچ گھنٹے کا فرق ہے، اس طرح مقامی وقت کے مطابق میں ساڑھے ۹½ بجے صبح پیرس پہنچا۔ یہاں ایک دوست سعید صاحب جو پیرس میں تجارت کرتے ہیں، ایئرپورٹ پر موجود تھے، وہ اپنے مکان پر لے گئے۔ دوراتوں کی بے خوابی کے بعد چند گھنٹے آرام سے سونے کیلئے ملے تو بڑی نعمت معلوم ہوئے۔ ظہر تک آرام کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا، اس کے بعد سعید صاحب نے شہر کے بعض قابل دید مقامات سے ہوتے ہوئے ایئرپورٹ لے جانے کا پروگرام بنایا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

پیرس اپنے حسن اور رعنائی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے، اور اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا سرسبز و شاداب اور قدرتی اور تمدنی حسن سے مالا مال شہر ہے، اس کی عمارتوں میں قدامت اور جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نہایت مہنگا شہر ہونے کے باوجود اَب بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے۔ یہاں کا مرکزی علاقہ شانزالیزے دنیا کے حسین ترین بازاروں میں شمار ہوتا ہے جو اپنی وسعت، صفائی، ستھری، عمارتوں کی روایتی خوبصورتی اور دلکشی درختوں کی دورویہ قطاروں کے لحاظ سے واقعۃً ایک منفرد علاقہ ہے، جسے چہل قدمی کیلئے بھی موزوں سمجھا جاتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ایسے مقامات فسق و فجور کے بھی سب سے بڑا مراکز ہوئے ہیں اور اُن کی ظلمت ہم جیسے کور دل بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شانزالیزے کی سڑک اُس چوک پر ختم ہوئی ہے جس کے سامنے فرانس کی پارلیمنٹ کی شاندار عمارت واقع ہے، اسی چوک میں انقلابِ فرانس کے وقت بادشاہ کو پھانسی دی گئی تھی۔

چوک کے دائیں جانب مشہورِ زمانہ ایفل ٹاور واقع ہے جو ۱۹۳۰ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی، بعد میں جب نیویارک میں اس سے بھی اونچی عمارتیں بنیں تو اس کی یہ حیثیت تو ختم ہوگئی۔ لیکن اپنی خوبصورت اور تکنیک کے اعتبار سے اب بھی اس کا شمار دنیا کی حسین ترین تعمیرات میں ہوتا ہے اور آج بھی یہ سیاحت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ ۹۸۴ فٹ بلند یہ ٹاور تمام تر لوہے سے بنا ہوا ہے۔

یہ ٹاور انقلابِ فرانس کی یادگار کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جب فرانس کی حکومت نے ۱۸۸۹ء میں انقلاب کی یادگار تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو ملک بھر کے انجینئروں سے یادگار کے نمونے طلب کر کے ان کا ایک کھلا مقابلہ منعقد کیا گیا۔ تقریباً ۱۰۰ سو مختلف نقشے سامنے آئے۔ لیکن بالآخر متعلقہ کمیٹی نے مشہور سول انجینئر الیگزینڈر گستاف ایفل (Gustav Eiffel) کا نقشہ منظور کیا اور اسی کے نام پر اس یادگار کا نام ''ایفل ٹاور'' رکھا گیا۔

یہ پورا ٹاور لوہے کا بنا ہوا ہے، اس کے پائے جس پر ٹاور کھڑا ہے بڑے وسیع و عریض اور بلند ہیں، اور ان کو چار محرابوں کی شکل میں ایک دوسرے سے مربوط رکھا گیا ہے، اس کے بعد ٹاور لوہے کے ایک مخروطی ڈھانچے کی شکل میں بلند چلا گیا ہے۔ اب اس میں ایک لفٹ بھی لگ گئی ہے جو ہر وقت اس ٹاور کے درمیان کہیں نہ کہیں حرکت کرتی نظر آتی ہے، کہتے ہیں کہ لوہے کا یہ حسین ڈھانچہ چندہ ماہ میں تیار ہوگیا تھا، اس میں انسانی محنت اور روپیہ دونوں کا خرچ دنیا کی دوسری مشہور یادگاروں کے مقابلے میں بہت کم ہوا تھا۔

ایفل ٹاور کے نیچے اور گرد و پیش میں خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں۔ قریب ہی دریائے سین بہہ رہا ہے جو پیرس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، اور دونوں حصوں کو ملانے کیلئے جگہ جگہ خوبصورت پل بنے ہوئے ہیں۔

سعید صاحب نے ان سارے علاقوں کا نظارہ ایئرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں کار کے ذریعے ہی کرا دیا۔ ایفل ٹاور کے نیچے ایک پارک میں ہم نے نمازِ عصر ادا کی اور ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔

نمازِ مغرب میں نے ایئرپورٹ پر ادا کی۔ رات ۹ بجے ایئرفرانس کا طیارہ کراچی کے لئے روانہ ہوا، اور ۷ گھنٹے کی پرواز کے بعد جب کراچی اُترا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ وطن کی مٹھاس کا صحیح اندازہ کچھ عرصے وطن سے باہر رہ کر ہی ہوتا ہے۔ زرق برق مغربی ملکوں کے طویل سفر کے بعد اپنا یہ سادہ اور بظاہر بے رنگ ماحول اتنا دلکش اور اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ترقی یافتہ ملکوں کی آب و تاب ہیچ نظر آتی ہے۔ اور جب بحیرۂ عرب کی سمت سے مشرق میں خشکی کے آثار اور اس پر کراچی کی بے ترتیب آبادی بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے تو قلب و نظر میں محبت اور سرور کی عجیب پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ اور بیساختہ دل سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے۔

اللّٰھُمَّ أعط أرضنا زینتھا وسکنھا وبرکتھا ولاتحرمنا برکۃ ماأعطیتنا یا ارحم الراحمین.

www.freepdfpost.blogspot.com

مجموعی تاثرات

اب تک میں نے مغربی ملکوں کے چار سفر کئے ہیں، جن میں سے دو براعظم امریکہ کے تھے، مغربی ممالک کی زندگی اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں کے بارے میں اپنے تاثرات میں اپنے امریکہ کے پہلے سفرنامے میں لکھ چکا ہوں۔

اشاریہ

(انڈکس)

ترتیب :

محمد عمران اشرف عثمانی

محمد یحییٰ عاصم

www.freepdfpost.blogspot.com

اشاریہ (انڈکس)

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۸، ۱۴، ۳۳، ۴۰، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴،
۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۹۰، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۶۸
۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰
۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳
۲۰۴، ۲۰۶، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴
۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۸، ۲۹۹
۳۰۰، ۳۱۹، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۷، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۸، ۳۸۳
۳۹۵، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶
۴۸۳، ۵۰۱، ۵۲۷، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۸۶۔

"الف"

آثار البلاد واخبار العباد (للقزوینی) ۶۵، ۶۷، ۱۰۷، ۲۰۸

آداب الشافعی ومناقبہ (لابنا أبی حاتم) ۱۳۲

آدم علیہ السلام ۲۸۴

آرتھوڈوکس چرچ ۳۴۴، ۳۴۵

آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس ۹، ۱۰، ۱۱

(او، آئی، سی تنظیم اسلامی کانفرنس) ۳۱۴، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۵۲

آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد ۲۱۸

آزاد ویل ۸، ۵۴۱، ۵۵۲، ۵۶۹

آلآستانہ۔ دیکھئے استنبول

www.freepdfpost.blogspot.com

آسٹریلیا ۳۷۷
آغا حسن ۳۲۸
آگرہ ۵۱۲، ۵۳۰
آلِ عثمان ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۴۰، ۳۵۶
ابرھۃ (کنیز) ۲۶۷، ۲۶۸
اَلابلّتہ ۲۵۵
ابان بن سعید بن العاص ۳۹۸، ۴۰۳
(حضرت) ابراہیم علیہ السلام ۱۶۷، ۱۸۹، ۲۰۶، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۴، ۲۹۳، ۲۹۴۔
ابراہیم (والد امام ابو یوسفؒ) ۳۶
(مسٹر) ابراہیم یان چینگ زین ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲۔
ابراہیم دستو ۲۵۲
ابراہیم متفرقہ ۳۵۴، ۵۹۰
ابراہیم، مخدوم ۳۷۸
ابراہیم میاں، مولانا ۵، ۵۴۷، ۵۵۴
اِبن حجر العسقلانی و دراستہ مُصنفاتہ (للدکتور شاکر) ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۱
ابوظبی ۴، ۳۹۶
اَبوالمساکین (جعفر طیّار) ۲۳۹
اَبوالہول ۸۷، ۸۸
اتاترک ۳۴۷
اَت میدان (ترکی) ۳۳۵
اٹاری ۴۹۷
اٹلی ۳۴۴، ۳۶۱
اجلاس دیوبند ۵۳۵
اجنادین۔ دیکھئے۔ جنگِ اجنادین
اُحد (جبل) ۵۱، ۵۳، ۵۸، ۱۶۷، ۱۶۸، ۳۰۸، ۵۱۱۔
اَحسن التقاسیم فی معرفۃ الأقالیم ۲۲۱
احسان رشید ڈاکٹر ۱۸۳، ۱۸۴
اَلأحکام (لعبدالحق) ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲
احمان ۴۴۸
(سلطان) احمد ۳۳۲
احمد امین ۱۶۲
احمد بدات ۵۵۲
احمد پٹیل ۵۵۲
احمد چوہان (ایڈوکیٹ) ۵۶۷
(امام) احمد بن حنبلؒ ۳۸، ۵۳، ۱۹۶، ۲۰۵
(شیخ) احمد الخضر (مفتی مصر) ۴۹۳
احمد داؤد ۵۸۰، ۵۸۷
(علامہ) احمد شاکر ۱۵۲
احمد شیخ ۵۹۷

احمد صقر، (ڈاکٹر) ۶۰۲
احمد بن طولون ۲۲۴
احمد عمر، مولانا محمد ۵۸۴، ۵۵۲، ۵۶۹
احمدیہ انجمن لاہور ۵۵۵، ۵۶۲
احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ۵۵۵
اختصار الرشاطی ۱۰۲
اخشیدیوں ۱۲۲، ۱۲۸، ۱۴۲
اخوان المسلمین ۱۶۳
ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد) ۳۸۹
ادب القاضی ۴۵
(حضرت) ادریس علیہ السلام ۸۴
ادریس، قاری محمد ۵۳۰
اذرح ۱۸۱
اردن ۱۱، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۸۸، ۳۰۷، ۳۹۶، ۶۰۴۔
ارونگ، ڈاکٹر ۳۵۴
ارسطو ۳۱۵
ارشمید (فلسفی) ۳۱۵
ارض القرآن ۱۸۸، ۲۱۸
ارض مبارک، ارض مقدس۔ دیکھئے فلسطین
ارطغرل ۳۲۱، ۳۲۲
ارواحِ ثلاثہ ۵۱۸
ازبک ۴۱۴
ازدی، حارث بن عمیر ازدی
ازمیر ۳۷۱
(جامعہ) ازھر ۶، ۷، ۱۱۷، ۱۳۵، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۲۵۲، ۴۹۳، ۵۶۸
ازھر یونیورسٹی۔ دیکھئے جامعہ ازھر
اسامہ بن منقذ (جرنیل) ۲۲۳
استنبول (ترکی) ۳۱۴، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۸، ۳۴۱، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۵۹۰
استنبول وحضارۃ الخلافۃ الاسلامیۃ ۳۶۳
اسحاق سلیم، مولانا محمد ۵۴۸
اَسد الغابۃ ۱۴۴، ۲۶۰
اسرائیل ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۹۶

www.freepdfpost.blogspot.com

(بنو) اسرائیل ۱۸۶، ۱۸۷، ۲۲۹، ۲۹۱، ۲۹۶۔
اسرائیلی روایات ۲۸۴
اسفی ۱۰۸
اسکار بروکیونٹی سینٹر (کینیڈا) ۵۸۱
اسکندریہ ۱۴۰۔۱۴۱، ۱۴۲، ۴۹۴
اسکوتاری ۳۵۹
اسکو دار (ایشیائی استنبول) ۳۴۸، ۳۵۹، ۳۶۹، ۳۷۰
اسلام، دین ۵۱، ۵۲، ۴۰۹
اسلام آباد ۸۱، ۱۲۱، ۴۱۰، ۴۱۸
اسلام آباد ائیر پورٹ ۴۰۹
اسلامک ایسوسی ایشن (چائینا) ۴۲۲، ۴۲۵
اسلامبول۔ دیکھئے۔ استنبول
اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۹۹
اسلامک سینٹر (مانٹریال) ۵۸۹، ۵۹۴، ۵۹۷، ۵۹۹
اسلامک فاؤنڈیشن (بنگلہ دیش) ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲
اسلامک کواپریٹو ہاؤسنگ کارپوریشن (کینیڈا) ۵۸۲
اسلامی ثقافتی مرکز (ترکی) ۳۱۴
اسلامی فقہ اکیڈمی (جدہ) دیکھئے مجمع الفقہ الإسلامی
ألإسلام والغزو الثقافی ۹۳
(حضرت) اسماء بنتِ عمیسؓ ۲۳۳، ۲۷۱، ۲۷۲، ۳۳۴
(حضرت) اسماء بنت یزید ۲۷۰
اسماعیل، ڈاکٹر محمد ۴۷۵، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۸۲، ۵۸۳، ۶۰۵
اسماعیل بن حماد جوھری۔ دیکھئے الجوھری
اسماعیل خدیو پاشا ۳۶۸
اسماعیل صفوی ۳۴۱
اسماعیل محمد (ایڈوکیٹ) ۵، ۶، ۷، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۶۰، ۵۶۴
اسماعیل بن عبداللہ ۲۰۵
اسماعیل کھرا۔ محمد ۵۵۲
اسمتھ، ولفریڈ کینٹول ۵۹۱
اسناد۔ دیکھئے اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ
أسنی المطالب ۱۳۸
(شاہ) اسنیفرو ۸۴
اسوان ۸۸
اسوان بند ۸۸
اسودرائیؒ ۱۷۴، ۱۷۵

اسود عنسی (مدعی نبوت) ۲۹۳، ۲۹۴
اشبیلیہ ۱۰۰، ۲۸۶
اشرف صاحب ۵۹۹
اشرف صاحب (بریگیڈیئر) ۵۵۴
اشرف خان، مولانا محمد ۵۳۳، ۵۳۴
اشعۃ اللمعات ۴۲۱
اشعر، مولانا عبدالرحیم اشعر ۵۵۴، ۵۶۹
ألإصابہ فی تمییز الصحابہؓ ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۳۸، ۲۵۶، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۱، ۲۹۲، ۳۵۶، ۳۹۹، ۴۰۴
أصحاب الأیکۃ ۱۸۸، ۱۸۹
أصحاب کہف ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۴۴
اصغر حسینؒ، مولانا سید میاں ۵۱۴
اصفہانی امام راغب اصفہانی ۲۳
اصفہانی، امام ابونعیم اصفہانی ۲۵، ۲۷، ۲۹، ۲۹۰،
ألإعتبار ۳۲۳
(ابن) الأعرابی ۱۹۶
اعزاز علیؒ شیخ الادب حضرت مولانا ۵۰۲
اعظمیہ ۴۰، ۴۲
ألأعلام (للزرکلیؒ) ۲۸۰، ۲۸۶، ۳۰۷
أعلام النساء ۲۵۷
أغوار ۱۹۰، ۲۰۶، ۲۴۴
افریقہ ۸۸، ۹۰، ۹۲، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۱۶، ۳۶۲
۵۲۴۔۵۴۲، ۵۵۰، ۵۶۴، ۵۶۹
افریقی قبائل ۵۴۱
افسس (طرسوس، ترکی) ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۲
افضال اکرم ۵۸۳
(ملک) افضل ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۲۵
افضل چیمہ، جسٹس محمد ۴، ۴۰، ۵۵۴
۵۵۷
افغانستان ۹۶، ۹۷، ۴۱۱، ۵۰۷
افلاطون (فلسفی) ۳۱۵
اقبال، علامہ اقبال شاعر ۹۳، ۲۶۱
۲۶۲، ۳۱۳
أقرب الموارد ۱۰۴
اقرأ فاؤنڈیشن (شکاگو) ۶۰۲
اکبر مرحوم ۵۳۴
اکبر آبادی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۳۹۶، ۵۰۹
اکبر علی، حضرت مولانا ۳۹۱

www.freepdfpost.blogspot.com

اکمل الدین احسان اوگلو، ڈاکٹر ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۵۰، ۳۵۲
اکوڑہ خٹک ۵۰۹
اکیدر ۱۸۱
الہ آباد ۵۱۲، ۵۳۰، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۸
الجزائر ۱۱، ۸۱، ۸۲، ۹۰، ۹۲، ۹۳
۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۰۳، ۱۰۴
۱۰۵، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۵
۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۲۸۹، ۳۵۳
الجزائر ائیر لائنز ۹۰، ۱۲۰
الجزائر العاصمۃ۔ (دارالحکومت الجزائر)
۹۰، ۱۲۰
(حضرت) الیاس علیہ السلام ۴۱۳
الیاس، الحاج محمد ۴۱۳
الیگزینڈر گستاف العیل ۶۰۶
(امّ المومنین حضرت) امّ حبیبہؓ ۲۶۵، ۲۶۶
۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰
(ام حرام بنت ملحان (صحابیہ) ۳۱۹، ۳۲۰
ام سلمہؓ ۲۷۰
امرتسر ۴۹۷، ۵۳۵
امریکن ائیر لائنیز ۶۰۱
امریکہ ۸۵، ۳۱۵، ۳۸۳، ۵۲۴
۵۳۷، ۵۴۲، ۵۵۰، ۵۷۸، ۵۸۱
۵۸۳، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۹۰، ۵۹۶
۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۵، ۶۰۸
امریکہ آبشار ۵۸۴، ۵۸۵
الأمیری الأستاذ عمر بہا الأمیری ۳۹۶
امین ۱۸
امین اشرف نور، مولانا ۱۶۷، ۱۷۸
۱۸۴، ۲۵۱، ۲۸۹، ۳۰۷
امین سراج شیخ ۳۳۲، ۳۶۴
امین اللہ وشیر، ڈاکٹر ۳۷۵
(بنو) امیہ ۴۲، ۲۵۴، ۲۷۲
اناضول حصار ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۶۸
اناطولیہ (ایشیائی ترکی) ۳۲۲، ۳۴۶
۳۴۸، ۳۷۰
انجمن اشاعت اسلام ۵۵۸، ۵۶۰
اندلس ۹۱، ۹۲، ۱۰۰، ۱۱۲، ۲۱۵
۲۷۴، ۲۸۶، ۳۵۲
انڈونیشیا ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹
۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳
(حضرت) انسؓ ۱۷۳، ۱۷۴، ۳۱۹
انسائیکلو پیڈیا ۱۳
انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۱۶۴، ۱۴۷
۱۸۴، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۷، ۲۵۳
۴۴۶، ۵۶۵
الأنساب لسمعانی ۲۹۰

انصاری، حضرت ابوایوب انصاریؓ ۳۲۰
۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶
انصاری شیخ الاسلام زکریا انصاری ۱۳۵
۱۳۶، ۱۳۹
انصاری جناب عبداللہ انصاری ۶۰۲
انصاری، مولانا ظفر احمد انصاری ۴، ۵۵
۵۵۴
انصاری ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری ۴
انصاری جناب ناز انصاری ۵۳۰
انظر شاہ، مولانا ۵۱۴
انقرہ (ترکی) ۳۲۲، ۳۷۱
انقلاب فرانس ۶۰۶
انگلینڈ ملاحظہ ہو۔ برطانیہ
انیس ۶۳
اورنج فری اسٹیٹ ۵۴۲
اولمپک اسٹیڈیم (مانٹریال) ۵۹۷، ۵۹۸
اوقیانوس۔ دیکھئے بحر اوقیانوس
اوگلو، ڈاکٹر اکمل الدین احسان۔ دیکھئے
اکمل الدین احسان
اونٹاریو ۵۸۴، ۶۰۰
الأہرام الصادقۃ۔ دیکھیے اہرام مصر
۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶
۸۷، ۸۸، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۴۰، ۳۱۴
اہل بیت ۵۰، ۲۵۷
اہل حجاز ۱۳۱
اہل عراق ۱۳۱
اہل مکہ ۳۹۸، ۴۰۳
اے گریٹ ٹرائل ان چائنیز ہسٹری
۴۶۱
ایاس بن سلمہ ۳۹۸
ایاصوفیا ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۳، ۳۳۵
۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸
ایتھنز (یونان) ۳۱۴، ۳۱۶، ۳۱۹
ایڈم گاسک، مسٹر ۵۹۱، ۵۹۲
ایران ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۴
۶۲، ۲۴۵، ۲۶۴، ۳۴۱، ۳۴۶
۳۶۰، ۴۱۴، ۵۹۳، ۶۰۷
ائیر فرانس ۵۷۵، ۵۷۶، ۶۰۷
ایسٹ انڈیا کمپنی ۵۶۵
ایشیا (براعظم) ۳۱۵، ۳۲۵، ۳۴۸
۳۶۲، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۶، ۳۸۳، ۵۵۰
ایشیائے کوچک ۲۱۷، ۳۲۲، ۳۴۳
ایفل ٹاور (پیرس) ۶۰۶، ۲۰۷
ایلہ، خلیج عقبہ ۱۸۱، ۲۱۸
ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ (نیویارک) ۶۰۳

www.freepdfpost.blogspot.com

ایمریگان پارک ۳۷۶
انجلز، فریڈرک ۴۵۸
ایوان تحفظ (بیجنگ) ۴۲۴
ایوان ہم آہنگی (بیجنگ) ۴۲۳
ایوب آئن بن شواں ۴۵۰
ایوبی سلطان صلاح الدین ایوبی ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۴۳، ۲۱۳، ۲۲۳، ۲۴۷، ۲۷۷، ۲۸۰، ۲۸۱۔

"ب"

بابل ۶۵
باب الأزج (بغداد) ۲۰
باب البنو والفوقنہ (بجایہ) ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲
باب توما (دمشق) ملاحظہ ہو.....
الباب الصغیر۔
باب الجابیہ (شام) ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴
باب الدیر (بغداد) ۲۴
باب السعادۃ (استنبول) ۳۳۷
الباب الشرقی (بغداد) ۴۳، ۲۸۳
الباب الصغیر (دمشق) ۲۴۷، ۲۵۷، ۲۶۰، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۹۳، ۳۰۴
باب الظاہر (دیوبند) ۵۰۱:
الباب العالی..... دیکھئے استنبول
باب الوراقین (کوفہ) ۷۴
باتو ۳۸۳
باربٹن ۵۴۴
باربروسا، خیرالدین ۱۱۲، ۲۵۲
بازنطینی ۲۲۰، ۲۵۴، ۲۸۱، ۳۰۲، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۳۵، ۳۳۶
باسفورس، آبنائے۔ ۳۱۷، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۴۴، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۲، ۳۵۵، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱
بانٹوزبان ۵۶۸
باہلی، قتیبہ بن مسلم باہلی ۴۱۴
بائیبل ۲۰۸، ۲۴۴، ۲۵۳، ۲۹۶
بایزید یلدرم ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۶۸
ببر ۶۵
البجائی، عبدالحق البجائی ۱۰۰
البجائی علی بن الفتح البجائی ۲۸۶
بجایہ (الجزائر) ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۹
بحتری، شاعر ۶۱، ۵۹۷
بحر اٹلانٹک (اوقیانوس) ۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۲۵۴، ۴۷۶، ۵۶۹، ۵۷۶، ۵۷۸، ۵۸۹
بحرِ احمر ۳۱۴
بحرِ اسود ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۴۸
بحرِ اوقیانوس۔ دیکھئے۔ بحر اٹلانٹک
البحر الرائق ۴۲۲
بحر روم ۹۳، ۱۴۰، ۲۰۸، ۳۵۲
بحر ظلمات۔ دیکھئے۔ بحر اٹلانٹک
بحر الکاہل ۵۷۸
بحر متوسط ۹۰، ۹۲، ۱۰۵، ۱۱۱، ۲۰۸
بحر محمد جنوبی ۵۶۹
بحر میت ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۴۴
بحر ہند ۷، ۲۵۴، ۳۶۲، ۳۷۷، ۵۴۸، ۵۶۹
بحرین ۷
بحرۂ عرب ۶۰۷
بحر لوط۔ دیکھئے۔ بحر میت
بحرۂ مرمرہ ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۳۳، ۳۴۸
بحرۂ یوحائی ۳۴۶
بخاری صاحب، مولانا ۵۴۸
بخاری صحیح ۵۳، ۱۴۶، ۱۵۷، ۱۶۰
۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۷، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۹
۲۶۳، ۳۲۰، ۵۱۴
البخاری شیخ علی بن القاضی عماد الدین ۴۱۸
بخت نصر ۱۴۰
بختیار کاکی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ۵۳۰
البدایۃ والنہایۃ (لابن الأثیر) ۱۹۵، ۱۹۹، ۲۹۸، ۲۷۴، ۲۰۱،
بدر ۵۲، ۵۳، ۵۱۱
بدر علی شاہ، مولانا سید ۵۳۲
بدھ مذہب ۳۷۷
بربری قبیلہ ۹۱
برتلمائی ۵۶۵
برٹانیکا ائیر بک ۴۶۴
برٹز ۵۴۴
برٹش ائیرویز ۴، ۵۴۱
برج غلاطہ ۳۵۸
برج القاہرۃ ۱۲۱، ۴۹۴
بردہ، نہر، (دمشق) ۲۵۴
(حافظ) برزالی ۲۹۸
برطانیہ ۴۷۵، ۴۹۴، ۵۶۷
برما ۴۱۱
برنارڈ لوئس ۳۶۳
برہان الدین بن خضر ۱۶۰
ابرہان شیخ محمد ہشام البرہانی ۲۴۴
بشر بن سحیم ۳۲۰
بشیر احمد، قاری ۱۵، ۴۴، ۷۷، ۱۶۷

www.freepdfpost.blogspot.com

۱۷۶،۱۷۹،۱۸۲،۲۲۶،۲۵۱،۲۸۹
۳۶۰۔
بصائر وعبر ۲۲۵
بصریٰ (شام) ۲۲۸
بصرہ (عراق) ۱۷،۶۶،۶۷
بطریرک ۳۱۹،۳۴۳،۳۴۴
بعث پارٹی ۳۰۸
بغ ۱۷
بغداد ۱۵،۱۶،۱۷،۱۸،۱۹،۲۰
۲۴،۲۷،۴۲،۴۴،۴۵،۴۶،۶۴
۱۳۰،۱۳۱
بغداد، حضرت جنید بن محمد بغدادیؒ ۲۴،
۲۹،۳۲
بغداد، خطیب بغدادی ۱۸،۱۹،۲۷
۳۴،۴۲،۷۴،۷۵
بغیۃ الملتمس (للضبی) ۱۰۱
بقری، ابو جناح ۱۱۳،۱۱۴
بقیع ۴۹
(حضرت ابو) بکر (صدیق) رضی اللہ عنہ
۱۵۴،۱۷۸،۱۹۴،۱۹۵،۲۰۱،۲۰۲
۲۰۴،۲۲۲،۲۵۸،۲۵۹،۲۷۱
۲۹۴،۳۴۷
بکر ابو زید شیخ ۱۱
(ابو) بکر بن آبی طالب ۲۵
(قاضی ابو) بکر ابن العربی ۲۸۵
(ابو) بکر عطار ۳۲
البکریؒ (علامہ) ۶۵،۲۰۸
البلاغ (ماہنامہ) ۵۱۵،۵۳۰
(حضرت) بلال حبشیؓ ۲۵۸،۲۵۹،۲۶۰
۲۶۱،۲۶۲،۲۹۰،۲۹۲،۲۹۳،
بلال حضرت حاجی ۵۱۵
بلالی مسلمان ۴۷۷
بلخوجہ شیخ محمد الحبیب بلخوجہ ۱۱،۳۹۶
بلقان ۳۴۳
بلقاء ۱۸۰،۱۸۶،۲۲۱
بلقینی علامہ ابن عمر ارسلان البقینی ۱۵۶
۱۵۷
بمبئی ۵۴۲
بنکا ۳۷۸
بنگال ۳۷۷،۳۸۷،۳۸۸
بنگلہ دیش ۳۷۷،۳۸۷،۳۸۸
۳۸۹،۳۹۰،۳۹۱،۳۹۲،۵۰۷
۵۰۹،۵۱۳
بنوری حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ
۵۴۳۔۵۵۶
بورژوا ۴۵۴

بورصہ ۳۷۱
بورنیو ۳۷۸
البوطی، ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
۳۰۰،۳۹۶
بونا پارٹ نپولین۔ دیکھئے۔ نپولین
بوہری فرقہ ۱۵۸
بنی مچھلی ۷۷
بھارت۔ دیکھئے۔ ہندوستان
بھٹی، انور بھٹی (سفیر پاکستان) ۴۱۸
۴۱۹،۴۲۵
بہراء (قبیلہ) ۲۳۰
بہرہ شیر ۴۷
بھوٹان (مالدیپ) ۴۱۱
بیت اللہ ۹،۲۱،۳۵،۲۳۷،۲۴۰
۲۵۹،۳۳۳،۳۳۹،۴۹۴،۵۱۳
بیت المقدس ۶۸،۱۹۰،۲۱۳
۲۴۶،۲۸۰،۳۴۴
بیجنگ ۴۱۰،۴۱۱،۴۱۲،۴۱۵،۴۱۷
۴۱۹،۴۲۲،۴۲۳،۴۳۱،۴۳۳،۴۳۷
۴۵۲،۴۵۹،۴۶۰،۴۶۶،۴۶۸،۴۷۰
بیجنگ ایئر پورٹ ۴۵۳
بیجنگ یونیورسٹی ۴۲۵،۴۶۸
بیروت ۲۰۹،۲۸۸
بیزنطی ۲۱۹
بیزنطیہ ۳۱۸،۳۴۴
بیعت رضوان ۲۹۲
بیلیب ۸۷

"پ"

پاکستان ۳،۱۰،۱۱،۲۱،۳۶،
۴۳،۴۵،۸۲،۹۴،۹۵،۹۶،۱۴۵
۱۸۳،۲۱۵،۲۴۵،۲۸۲،۳۰۰
۳۰۱،۳۰۳،۳۱۸،۳۳۱،۳۵۴
۳۶۴،۳۷۵،۳۷۶،۳۸۸،۳۸۹
۴۰۹،۴۱۰،۴۱۱،۴۱۸،۴۲۵،۴۳۱
۴۳۲،۴۳۹،۴۴۷،۴۶۷،۴۷۱
۴۷۵،۴۷۷،۴۹۸،۵۰۷،۵۰۹
۵۱۳،۵۱۹،۵۳۰،۵۳۴،۵۳۶
۵۳۷،۵۳۸،۵۴۳،۵۴۶،۵۴۸
۵۵۱،۵۵۳،۵۵۴،۵۶۱،۵۶۲
۵۷۰،۵۷۵،۵۷۸،۵۸۳،۵۹۳
پاکستانی سفارت خانہ ۸۲،۱۲۰،۲۵۱
۳۰۳،۳۰۷،۴۱۸
پاک لیبیا دوستی کا مرکز ۳۳۱
پاؤان (چین) ۴۱۴
پایان ہار (کوہ) ۴۳۶
پٹرا (اردن) ۲۱۸

www.freepdfpost.blogspot.com

پرتاب گڑھ ۵۳۳
پرتگال ۵۶۵
پرتگیزی ملاح ۵۶۵
پرویز نسیم ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۹۹
۶۰۰
پریٹوریا ۵۴۲، ۵۴۴، ۵۴۷، ۵۴۹
پریفیکچر (چائنا) ۴۳۳، ۴۳۹، ۴۴۴
پشاور ۴۰۹
پشاور یونیورسٹی ۵۳۳
پنجہ شیلا ۳۷۹، ۳۸۱
پنوراما ۶۲، ۶۳
پوپ (پاپا) ۳۴۴
پورس ۲۶۲
(درہ) پیاؤ (چائنا) ۴۲۶
پی آئی اے (پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز)
۴، ۸۲، ۹۵، ۳۷۱، ۳۷۵، ۴۰۹
۴۷۶، ۵۵۴
پیپلز اسکوائر (بیجنگ) ۴۱۹، ۴۳۱
۴۵۹
پیپلز ڈیلی ۴۲۱
پیٹر میر نزبرگ ۵۴۴، ۵۴۸
پیٹر یارک ۳۴۴
پیر جھنڈو ۱۰۰
پیرزادہ شریف الدین پیرزادہ ۳۱۴، ۳۳۲
پیرس ۱۱۴، ۱۱۵، ۴۷۶، ۵۷۵، ۵۷۶
۵۷۸، ۶۰۳، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷
پیک، مسٹر ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰
۵۶۳
پیکنگ۔ دیکھئے۔ بیجنگ

"ت"

تاتار ۲۴، ۷۷، ۴۱۴
تاج العروس ۲۹۹
تاجک ۴۱۴
تاج محل (آگرہ) ۵۳۰
التارزی استاذ مصطفیٰ کمال التارزی ۳۹۶
تاریخ اسلام ۶۶
تاریخ اسلام، مولانا معین الدین ندوی ۲۷۹
تاریخ بغداد۔ (خطیب بغدادیؒ) ۱۸، ۲۷
۳۴، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۳، ۵۹
۶۱، ۷۵، ۷۶
تاریخ خاندان عثمانیہ ۳۲۴
تاریخ الخمیس (للدیار بکری) ۱۷۳
تاریخ دمشق (لابن عساکر) ۲۵۳
تاریخ دولت عثمانیہ ۳۲۴، ۳۵۶
التاریخ الصغیر (للبخاری) ۲۰۶
تاریخ الطبری ۱۰۷
تاریخ مکہ (للأزرقی) ۲۵۹
تبرکات ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰
تبلیغی جماعت ۱۶۳
تبلیغی نصاب ۵۴۶
تبوک ۱۶۸، ۱۷۵، ۱۷۷
۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۸
تحفۃ الأشراف ۲۹۸
ترک قوم ۳۶۷
ترک مجاہدین ۳۴۹
ترکی ۱۱، ۱۱۲، ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۲۶
۲۴۸، ۲۸۲، ۳۰۱، ۳۰۶، ۳۱۳
۳۱۶، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۴۰
۳۴۲، ۳۴۷، ۳۵۰، ۳۵۳، ۳۵۹
۳۶۴، ۳۶۷، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲
۳۹۵، ۵۹۰، ۵۹۲
ترکی جرنیل ۳۴۲
ترکی ریسٹورنٹ ۱۱۷
ترکی زبان ۳۲۹
(امام) ترمذیؒ ۳۲
ترمذی جامع ۵۱، ۹۹، ۱۹۴، ۲۰۱
۲۰۲، ۳۱۴
تعلیم الاسلام ۵۴۷
تغلیق التعلیق ۱۵۵
تفسیر ابن جریر ۲۱۸
تفسیر قرطبی ۲۲۲
تقریب التہذیب ۲۹۸
تقریر بخاری شریف ۵۰۳
تقریر ترمذی شریف ۵۰۳
تکملہ ردالمحتار ۳۰۶
تکملہ فتح الملہم (للأستاذ محمد تقی العثمانی) ۱۵۱
التکملہ للصلۃ ۹۹
التلخیص ۱۵۵
تلمسان ۱۰۸
تنبیہ الطالب ۲۷۶
تنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی (للتھانویؒ)
۲۸۷
تنبیہ الغبی بتبرئۃ ابن العربی (للسیوطی)
۲۸۶
تنزیل الرحمٰن ڈاکٹر جسٹس ۴۷۵، ۴۸۲
تنظیم اسلامی کانفرنس دیکھئے۔ آرگنائزیشن
آف اسلامک کانفرنس
تنقیح القال للمامقانیؒ ۶۹
تنگ کوا (چائنا) ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲
توپ دروازہ (استنبول) ۳۲۷
توپ کاپے سرائے (استنبول) ۳۲۷
۳۲۸، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۰

www.freepdfpost.blogspot.com

توحید احمد (قونصل جنرل پاکستان) ۲۵۱
۲۵۲،۲۵۳،۲۸۹،۳۰۰،۳۰۷
توضیح تلویح ۲۲
تونس ۱۱،۹۰،۱۰۴،۱۰۶،۱۱۱
۱۱۷،۳۹۶
تونسی، علامہ شیخ محمد بیرم تونسی ۱۱۵،۱۱۶
تھانوی، مولانا احتشام الحق ۵۴۳
تھانوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳۱،۲۸۷،۳۹۲،۵۰۲،۵۱۴،۵۱۶
۵۱۸،۵۲۰،۵۲۱،۵۲۹،۵۳۰
۵۴۵۔
تھانوی مولانا شبیر علی تھانوی ۵۱۹
تھانوی، مولانا شیخ محمد ۵۲۰،۵۲۵
تھانہ بھون ۵۱۱،۵۱۵،۵۱۹
۵۲۰،۵۲۴
(دریائے) تھاؤخہ (چائنا) ۴۳۹
تھاؤشوزیں، مسٹر ۴۵۰
تہذیب تاریخ ابن عساکر ۲۵۷،۲۶۹
۲۷۴،۲۷۵،۲۹۲،۲۹۳،۲۹۴
تہذیب التہذیب ۶۹،۱۳۲،۱۳۳،
۱۴۴،۱۵۵،۲۹۱
تہذیب الکمال ۲۹۸
تہوذ (قلعہ) ۱۱۰
تھیوڈوسیس ۲۲۰
تیان آن من.....ملاحظہ ہو۔ پیپلز اسکوائر
تیسیر ظبیان، محمد ۲۱۵،۲۱۸،۲۱۹
۲۲۲،۲۲۳،۲۲۴
تیماء ۱۷۷،۱۷۸
تیمور لنگ ۳۲۲
(ابن) تیمیہ، علامہ ۲۹۸
(دریائے) تے تھون ۴۵۲
"ٹ"
ٹاؤن ہال (بجایہ) ۹۳
ٹراجان (بادشاہ) ۲۲۰
ٹرانسوال ۴،۷،۵۴۴،۵۴۷
ٹرکش ایئرویز ۳۷۱
ٹروڈو، صدر ۵۷۸
ٹورنٹو ۵۷۶،۵۷۷،۵۷۸،۵۷۹
۵۸۳،۵۸۶،۵۸۷،۵۹۹،۶۰۰
۶۰۱،۶۰۳،۶۰۵
ٹونگانھ ۵۴۴،۵۴۸
ٹیبل ماؤنٹین ۵۶۹
"ث"
ثابتؓ ۴۱
(حضرت) ثابت بن اقرم ۲۳۳
ثقافتی انقلاب (چائنا) ۴۱۵،۴۲۰

۴۲۲،۴۵۰،۴۵۲،۴۵۷،۴۵۹
۴۶۰،۴۶۱،۴۶۲،۴۶۵،۴۶۹
ثقافتی جنگ بذریعۂ نظام تعلیم ۹۳
ثقفی، مختار بن عبید ثقفی ۷۱
(قوم) ثمود ۱۷۶
ثنیۃ الوداع ۲۲۹
(امام ابو) ثور ۲۹
"ج"
(حضرت) جابر بن عبداللہؓ ۵۵۔۵۸
جابیہ۔ دیکھئے باب الجابیہ
جاپان ۴۵۳
(شیخ) جادالحق علی جادالحق (شیخ الأزھر) ق ۱۵۱
جالندھری، مولانا خیر محمد ۵۲۱
جامع آیا صوفیا (استنبول) ۳۴۶
جامع الامام الأعظم ابوحنیفہؒ (عراق) ۴۰
جامع اموی (دمشق) ۱۵۲،۲۷۱،۲۷۴
۲۷۵،۲۷۶،۲۷۷،۲۷۸،۲۸۰
"الجامع الأموی" بتحقیق محمد مطیع الحافظ
(دار ابن کثیر دمشق) ۲۷۶
جامع ابوایوب انصاری (استنبول)
۳۵۴،۳۵۵،۳۵۶،۳۵۷
جامع أبی یوسف (بغداد) ۳۶
جامع الحاکم (قاھرہ) ۱۵۲،۱۵۸
جامع الحسین (قاھرہ) ۱۵۲
جامع زیتونہ (تونس) ۱۱۷،۲۵۲
جامع سلیمانیہ (ترکی) ۳۵۹،۳۶۱
۳۶۳،۳۶۴
جامع السلیمانیہ انشاء وخصائصہ ۲۶۲
جامع شافعیؒ (مصر) ۱۳۹
جامع عمرو بن العاصؓ (قاھرہ) ۸۸،۸۹
جامع الکبیر ۱۰۲
جامع کوفہ ۶۷،۶۹،۷۰،۷۱،۷۳
جامع مسجد تنگ کوا (چائنا) ۴۵۱،۴۵۲
جامع مسجد دونگ سی (چائنا) ۴۲۱
جامع مسجد دیوبند ۵۱۳
جامع مسجد سلمان فارسیؓ (مدائن) ۵۶،۶۴
جامع موتہ ۲۲۷
جامعہ ازھر.....دیکھئے.....ازھر
جامع اسلامیہ (اسلام آباد) ۱۲۱
جامعہ دمشق (دمشق یونیورسٹی) ۲۵۲
۲۷۶،۲۸۱،۳۰۷
جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) ۳۷۵
جامعۃ القاھرۃ ۱۲۱
جامعہ قرآنیہ لال باغ (ڈھاکہ) ۳۵۲
جامعہ نعیمہ لاہور ۴۰۹
جان اسمتھس ایئرپورٹ (جوہانسبرگ) ۵۵۴

www.freepdfpost.blogspot.com

جان دوم، (بادشاہ) ۵۶۵
جاوا ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۳
جبِ دانیال علیہ السلام ۶۵
(حضرت) جبرائیل علیہ السلام ۱۴۶، ۴۹۹
جبل الرقیم ۲۲۲
جبل المقطم ۱۲۹، ۱۴۴
جبہۂ مبارکہ ۳۳۸
جدہ ۸، ۱۰، ۱۶۷، ۲۸۹، ۳۱۴
۶۰۳
جدہ ائیر پورٹ ۸، ۱۶
جذام (قبیلہ) ۲۰۳
جرباء ۱۸۱
جرمن ماہر نسلیات ۳۷۸
جرمنی ۲۷۸، ۳۱۵، ۵۶۸، ۵۹۰
۵۹۶
الجزائر ۱۱، ۸۱، ۸۲، ۹۰، ۹۲
۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۰۳
۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹
۱۲۱، ۲۸۹، ۳۵۲
الجزائر ائیر لائنز ۹۰، ۱۲۰
الجزائر العاصمہ (دار الحکومت الجزائر)
۹۰، ۱۲۰
جزائر شرق الہند ۳۷۸
جزری، علامہ ابن الاثیر جزری ۲۷۸
جزریہ ۳۰۵
جزیرہ ۱۴۱، ۱۴۳
جزیرۃ الضاعتہ ۱۲۷
جزرۃ عرب ۵۱۳، ۳۹۵
جزیرۂ مصر ۱۲۲
جسٹن (رومن بادشاہ) ۲۲۴
جشن صد سالہ ۵۱۰
(ابو) جعفر حفری ۷۴
(حضرت) جعفر صادقؒ ۳۲، ۴۱
(حضرت) جعفر طیار (ابن ابی طالب) ۲۲۸
۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۶۷
۲۷۱۔
جکارتہ ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۰، ۳۸۳
(حضرت شاہ جلال مجرد السلہٹیؒ ۳۹۱
جلال آباد ۵۹۲، ۵۱۲، ۵۲۴
جلالین، تفسیر ۴۱۵، ۴۲۱، ۴۵۰
۴۷۰۔
الجماعۃ المحمدیہ ۳۷۹
جمال عبد الناصر ۱۶۳
جمعیات الاخوۃ ۳۳۰
الجمعیہ ۵۳۰

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ ۳۳۰، ۳۳۱
۳۳۲، ۳۵۲
جمعیۃ علماء ٹرانسول ۴، ۵۴۵، ۵۴۷
جمعیۃ علماء بنگال ۵۴۸، ۵۶۹
جمہوریہ الجزائر۔ دیکھئے۔ الجزائر
جنۃ البقیع ۷۴
جنت کا دریا ۱۴۶
جنگِ اجنادین ۲۰۰
جنگِ صفین ۶۹
جنگ قادسیہ ۶۲، ۶۳
جنگ یرموک۔ دیکھئے۔ غزوۂ یرموک
جنگِ یمامہ ۲۰۰
جنوبی افریقہ ۳، ۵۴۱، ۵۴۳
۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸
۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳
۵۵۵، ۵۵۶، ۵۶۱، ۵۶۴، ۵۶۵
۵۶۷، ۵۶۹
الجواھر واللدرر ۱۵۵، ۱۵۶
(علامہ ابن) الجوزیؒ ۲۰، ۲۵، ۳۳
جوزیفس مؤرخ ۲۰۹
جوکھان لو، کاؤنٹی (چائنا) ۴۴۱
جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) ۴، ۵، ۸،
۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۹
۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۷، ۵۶۹، ۵۷۰
جوہر الکاتب ۱۴۲، ۱۴۹
الجوہری، اسماعیل بن حماد ۳۵۹
جہاد شاملی ۵۱۸
(ابو) جہل ۵۲، ۲۶۱، ۲۶۵
جیانگ چنگ ۴۵۸، ۴۶۰، ۴۶۲
(مسٹر) جیانگزن ۴۳۵
جی ٹی روڈ ۵۰۴، ۵۰۵
جیحان ۱۴۶
جیزہ ۸۴، ۸۷، ۱۲۲، ۱۴۰، ۱۴۳
جیسٹینین، قیصر ۳۴۴
جیلانی (گیلانی)، حضرت شیخ عبد القادر
جیلانیؒ ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۵۹۰
جین، مذہب ۳۷۹

"چ"

چانگام ۳۹۰
چارکاٹولہ ۴۵۹، ۴۶۰
چارلسٹن ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۸، ۴۸۳
چارلس ڈیگال ائیر پورٹ (پیرس) ۵۷۶
چانگ ین اسٹریٹ ۴۱۲، ۴۱۹، ۴۲۰
چائنا اسلامک ایسوسی ایشن ۴۱۲
۴۱۳، ۴۱۵، ۴۱۸، ۴۲۲، ۴۲۵، ۴۳۶
۴۳۷، ۴۴۵، ۴۵۰، ۴۵۳، ۴۷۰
۴۷۱

www.freepdfpost.blogspot.com

چائنا ایئر لائینز ۴۳۶
چن شہ ہوانگ تی ۴۲۶
چنگ خاندان ۴۳۲
چنگیزی ۳۲۱
چوای چن ۴۲۹
چواین لائی ۴۵۸، ۴۵۹
چھان چھیں۔ دیکھئے، دیوار چین
چھینگ ھائی ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۴۵،
۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱،
۴۵۲، ۴۶۶، ۴۶۹
چیانگ کائی شیک ۴۱۳
چیمہ، جسٹس محمد افضل ملاحظہ ہو۔ افضل چیمہ
چین ۱۷، ۴۰۹، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳،
۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۸، ۴۲۰، ۴۲۲، ۴۲۳،
۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۸، ۴۳۰، ۴۳۱،
۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۸،
۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۹، ۴۵۱، ۴۵۴،
۴۵۵، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴،
۴۶۵، ۴۶۶، ۴۱۷
چین کا مکہ ۴۴۰
چین کا ناسور۔ ملاحظہ ہو۔ دریائے زرد
چینی تاریخ کا عظیم مقدمہ ۴۶۱
چینی ترکستان ۴۱۱
چینی حجاج ۴۳۱
چینی زبان ۴۲۱
چینی سفارتخانہ ۴۱۸
چینی نژاد ۴۷۸

"ح"

حاتم طائی ۱۷۸
حارثہ ۲۳۶، ۲۳۷
حارۃ الشافعی ۱۲۹
حافظ الأسد ۳۰۸
حاکم ۵۳، ۱۹۳
حاکم بامر اللہ ۱۴۹، ۱۵۸
حالہ عمار ۱۸۲
الحاوی ۱۰۲
(ابن) حبان ۳۸
حبشہ ۱۹۲، ۲۰۰، ۲۳۹، ۲۶۱، ۲۶۶،
۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۱، ۳۴۳
حبہ بن جوین العرنی ۶۹
حبیب الرحمٰن، حضرت مولانا ۵۰۲
حج ۳۳، ۵۶، ۵۷، ۲۳۶، ۲۸۶،
۴۰۹، ۴۳۹، ۴۴۷، ۵۷۲
حجاج بن غلاطہ ۱۷۳
حجاج بن یوسف ۶۶، ۶۷
حجاز مقدس ۳۳، ۵۶، ۲۲۲، ۳۳۸،
۴۳۱، ۴۹۳، ۴۹۴، ۵۶۸

(حافظ ابن) حجرؒ ۶۹، ۱۳۵، ۱۴۴،
۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷،
۱۶۰، ۱۶۱، ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۳۸، ۲۹۸،
حجر اسود ۳۳۹
حجۃ الوداع ۲۷۱
حدائق الحنفیہ ۴۱
حدیبیہ صلح ۱۷۰، ۲۶۸، ۲۹۲، ۳۹۸،
۴۰۳
حذافین احمد ۳۵۹
(حضرت) حذیفہ بن یمانؓ ۴۷، ۵۲،
۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۶۱،
(شیخ) حذیفی (امام حرم) ۹
حران ۲۵۳
الحرکان، شیخ محمد علی الحرکان ۳۹۶
حرم شریف۔ دیکھئے۔ بیت اللہ
حرم مکہ۔ ملاحظہ فرمائے۔ بیت اللہ
حرمین شریفین ۱۵، ۶۷، ۱۶۷، ۲۸۶،
۳۳۸، ۴۹۴، ۵۲۹، ۵۷۲
(حضرت) حزقیل علیہ السلام ۲۹۰، ۲۹۶،
۲۹۷
حسان ۱۸۱
(حضرت) حسین رضی اللہ عنہ ۶۹، ۷۲،
۷۴، ۲۵۶، ۲۵۹
حسن، حضرت مولانا مفتی محمد ۵۲۱
(شاہ) حسن ۲۴۸
حسن جاوید، مسٹر ۴۳۶، ۴۴۲
حسن المحاضرۃ (للسیوطی) ۸۴، ۸۶
۸۹، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۵۶، ۱۵۸
حسنۃ ۲۰۰
(حضرت) حسینؓ ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲،
۷۵، ۷۶، ۱۵۲، ۱۵۶، ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۷۶
(شاہ) حسین ۲۴۸
حسین پاشا ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶
حصکفی محمد علاء الدین حصکفی ۳۰۶
حصن کیفا ۳۰۶
(حضرت ابو) الحصینؓ ۳۳۹
حضرت موت ۱۸۹
حضرمی، علامہ بن الحضرمیؒ ۳۹۵
حطیم ۲۳۸
(نبو) حفص ۱۱۲
حکومت پاکستان ۲۹۵، ۴۰۹، ۴۳۹،
۴۷۵، ۴۹۷، ۵۵۳
حکومت چین ۴۷۱
حکومت عراق ۵۶، ۶۲
حکومت ہند ۴۹۷
(حضرت) حکیمؓ بن حزام ۲۳۶

www.freepdfpost.blogspot.com

حلب ۲۶۰
حلبی، علامہ برہان حلبی ۱۵۷
حلّہ ۶۵، ۶۶
حلیۃ الأولیاء (الأبی نعیم) ۲۵، ۲۷
۲۸، ۲۹، ۱۹۶، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۹۱
۲۹۴
حمادی سلطان حمادی ۹۹، ۱۰۰
حمادی، منصور حمادی ۹۱
حمادی خاندان ۹۱
حماسہ، دیوان ۱۷۸
الحموی، شیخ سعید الحموی (شیخ القرأ)
۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۱۶۱، ۲۰۸
۲۲۱، ۲۵۵، ۲۹۰، ۲۹۸
حمید اللہ، حضرت مولانا ۳۹۳
حمید اللہ ڈاکٹر محمد ۵۷۶
حمیدیہ، بازار ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۰۲
۳۰۴
(ابو) حنیفہؒ، حضرت امام ۹۱، ۳۶
۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳
۶۶، ۷۰، ۱۳۰
حنبلی، مذہب ۱۵۹
حنفی، مذہب ۱۵۹
الحواری، احمد بن ابی الحواری ۲۹۱
حواری بومدین ائیر پورٹ (الجزائر)
۹۰، ۱۱۱
حیرہ ۱۷
حیی بن اخطب ۱۷۳
"خ"
خادم الحرمین الشریفین ۳۳۸
(شاہ) خالد مرحوم ۱۰
خالد اسحاق ایڈوکیٹ ۴۷۵، ۴۸۲
حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ ۲۶۷
خالد بن عبد السلام ۱۳۵
(حضرت) خالد بن عرفطہؓ ۶۱
(علامہ) خالد محمود ۴
(حضرت) خالد بن ولیدؓ ۱۸۱، ۱۹۵، ۲۰۰
۲۳۳، ۲۳۹، ۲۸۲، ۲۸۳
خان شادین ۴۴۷
خانقاہ اشرفیہ ۵۱۹
(حضرت) خبابؓ ۲۰۱
(ام المومنین حضرت) خدیجہؓ ۲۳۶، ۲۶۳
خدیجہ انسٹی ٹیوٹ (انڈونیشیا) ۳۸۱
الخراج ۴۵
خرشچیف ۴۵۵
خرطوم ۵۵۲
(بنو) خزرج ۲۰۱، ۳۵۵

خسرو پرویز ۲۴۵
الخشنی، ابو الخشنی ۲۹۲
(بنو) خشین ۲۹۲
خصاف، امام ۴۵
(حضرت) خضر علیہ السلام ۱۸۷
خطِ استواء ۳۷۸، ۳۸۳
الخطط المقریزیۃ ۸۳، ۸۴، ۸۶
۸۸، ۱۲۹، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۴۷
خطِ کوفی ۲۲۴، ۳۵۱
خطِ یونانی ۲۲۴
خطیۃ النساء ۲۷۰
خضرے ۸۵، ۸۶، ۸۷
الخلاصۃ للخزرجی ۳۳
خلافت عثمانیہ ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶
۲۷۵، ۳۰۶، ۳۱۹، ۳۲۱، ۳۲۲
۳۲۹، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۷
خلافیات ۲۰
خلال، حضرت ابو علی خلّال ۳۴
(ابن) خلدون ۹۱، ۹۸، ۹۹
۱۵۹،
خلفاءؓ راشدین ۲۷۵، ۳۳۹
خلیج بنگال ۳۷۵
خلیج طرابیہ ۳۱۷، ۳۴۶
خلیج فارس ۳۹۵
خلیج عقبہ۔ ملاحظہ کیجئے۔ ایلہ
خلیل صاحب ۶۰۵
خلیل میاں سید ۵۱۵
خمارویہ ۲۲۴
خمینی ۷۳
خوارج ۳۵۵
خوارزم ۳۲۱
خوبن، مسٹر ۴۲۵، ۴۳۵
خورشید احمد، پرفیسر ۴
خورشید عالم، مولانا ۵۰۰، ۶۰۲
خوفو (بادشاہ) ۸۵، ۸۶
خولانی، ابو مسلم خولانی ۲۹۳، ۲۹۴
۲۹۵
(آقائے) خوی ۷۳
خیالی، علامہ ۵۰۹
خیبر ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۳
۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۸
خیبر بن قانیہ ۱۶۹
خیتارث ۶۵
خیر اللہ حدیثی ۵۵
خیر اللہ ومری ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۷
۳۶۱، ۳۶۴، ۳۶۷، ۳۷۱

www.freepdfpost.blogspot.com

خیرالدین باربروسا۔ ملاحظہ ہو۔ باربروسا
خیزران ۴۰

"د"

دارا ۲۶۲
دارانی حضرت ابوسلیمان دارانی ۲۹۰
۲۹۱،۲۹۲
دارایا ۲۶۰،۲۸۹،۲۹۰،۲۹۲
۲۹۳،۲۹۵،۲۹۶،۲۹۷
دارالاعتصام ۲۱۶
دارالامارۃ ۷۱،۷۲
دارالبشیر ۱۸۳
دارالحکومت ۱۵،۱۸،۳۲،۴۷
۵۰،۶۴،۹۰،۱۱۱،۱۴۰،۳۱۹
۳۷۸،۳۹۵،۴۴۵،۴۷۶،۵۴۱
۵۶۵،۵۷۰،۵۸۹
دارالسلام (قلعہ خیبر) ۱۶۹،۱۷۱
دارالاستفادہ۔ دیکھئے۔ استنبول
دارالعلوم ۴۲۲،۴۵۲،۴۶۳،۴۹۷
۵۰۰،۵۰۱،۵۰۴،۵۰۵،۵۰۶
۵۰۹،۵۱۷،۵۲۹،۵۴۸،۵۹۲
دارالعلوم دیوبند ۵۰۰،۵۰۲،۵۰۳
۵۱۰،۵۱۱،۵۱۶،۵۱۸،۵۳۲،۵۴۷
۵۴۸،۵۶۸

(جامعہ) دارالعلوم کراچی ۴۵،۲۱۵
۳۱۴،۳۵۳،۳۹۳،۵۳۰
دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) ۵۳۳
۵۳۴
دارالعلوم ہالٹ ۴۹۹
دارالمعارف (مصر) ۱۴۸
(حضرت) دانیال علیہ السلام ۶۵
(حضرت) داؤد علیہ السلام ۳۳۸
(ابو) داؤد، سنن ۱۹۶،۲۰۲
۲۶۸،۲۹۱،۳۰۰
(علامہ) داؤدی ۳۰۶
دائرہ معارف القرآن ۱۰۹
دبئی ۸۲،۴۷۶،۵۵۴
دجلہ (دریاء عراق) ۳،۱۷،۱۸،۲۴
۲۶،۴۷،۵۶،۶۰،۶۴،۶۵،۷۷
درخیبر ۱۷۱
الدراسات الاسلامیہ ۸۱
(حضرت) ابوالدرداءؓ ۸۸،۲۰۶
درعہ (شام) ۲۴۹،۲۵۰
الدرالمختار ۳۰۵،۳۰۶
دریائے اردن ۱۹۰،۱۹۱،۲۰۶
۲۰۸،۳۱۰،۲۴۳،۲۴۴
۲۴۵
دریائے سوات ۲۴۵

الدربنی دکتور فتحی الدربنی ۲۵۲،۳۰۰
دعوت اسلامی کالج ۳۳۰
دمشق (شام) ۱۴۴،۱۵۲،۱۵۶
۲۰۰،۲۵۱،۲۲۱،۲۲۵،۲۲۷
۲۴۱،۲۴۳،۲۵۰،۲۵۱،۲۵۲،
۲۵۳،۲۵۴،۲۵۵،۲۵۶،۲۵۷
۲۶۵،۲۶۹،۲۷۰،۲۷۲،۲۷۳،۲۷۴
۲۷۶،۲۸۱،۲۸۲،۲۸۳،۲۸۴
۲۸۶،۲۸۹،۲۹۳،۲۹۵،۲۹۷
۲۹۸،۳۰۰،۳۰۱،۳۰۲،۳۰۴
۳۰۶،۳۰۷،۳۰۹
دمشق ایئرپورٹ ۳۰۸
دمشق الجدیدۃ ۲۸۵
دمشق یونیورسٹی، دیکھئے۔ جامعۂ دمشق
دندان مبارکؐ ۳۳۸
الدوالیبی، ڈاکٹر معروف الدوالیبی ۳۹۶
دوحہ/ دوہا (قطر) ۳۹۵
الدررالکامنہ (لابن حجر) ۱۵۹
دورۂ افریقہ ۵۵۷
دومۃ الجندل ۱۸۱
دونگ سی۔ دیکھئے۔ جامع مسجد دونگ سی
دہلوی، حضرت شاہ نصرالدین دہلوی ۵۳۰
دہلی ۵۱۲،۵۱۸،۵۳۰

دھنک پل ۵۸۵
دیلم ۱۹
دینِ ابراہیمی ۴۸
دینور ۵۴
دیوارِ چین ۴۲۵،۴۲۶،۴۲۷
دیوبند (انڈیا) ۴۹۷،۴۹۸،۴۹۹
۵۰۰،۵۰۴،۵۰۶،۵۰۷،۵۰۸
۵۰۹،۵۱۲،۵۱۴،۵۱۶،۵۱۷
۵۱۸،۵۲۵،۵۲۸،۵۲۹،۵۳۱
۵۳۴،۵۴۷،۶۰۲

"ڈ"

ڈائز افریقہ ۵۶۵
ڈابھیل ۵۴۷،۵۴۸
ڈچ حکومت ۵۶۷
ڈچ زبان ۵۶۸
ڈچ قوم ۵۴۱،۵۶۶
ڈربن ۵۴۲،۵۴۴،۵۴۸،۵۴۹
۵۵۲،۵۵۶،۵۶۹
ڈھاکہ ۳۷۷،۳۸۷،۳۸۸،۳۸۹
۳۹۲
ڈھاکہ ایئرپورٹ ۳۹۰،۳۹۳
ڈھاکہ ریڈیو ۳۹۰
ڈھاکہ یونیورسٹی ۳۹۰

www.freepdfpost.blogspot.com

ڈیپارٹمنٹل اسٹور ۱۱۹
ڈیسمنڈ اسٹیورٹ ۸۵
ڈینگ ژیانگ پنگ ۴۵۸،۴۵۹،
۴۶۰
ڈاکار ۱۱

"ذ"

ذہبی حافظ شمس الدین ذہبی ۵۵،۶۹
۱۰۰،۱۵۴،۲۶۹،۲۷۰،۲۹۹
(حضرت ابو) ذر غفاریؓ۔ دیکھئے۔غفاری
ذعر ۲۰۹
ذوالحلیفہ ۲۷۱
ذوالقرنین ۱۰۹،۲۵۳
ذیل طبقات الحفاظ (للسیوطی) ۱۵۴

"ر"

(استاذ) رانج بونار ۹۲
رابطۃ العالم الإسلامی ۴،۸،۱۱
۳۵۲،۵۵۳،۵۵۴،۵۶۱
راجہ ظفر الحق ۸۲،۱۲۱،۱۴۵
راز، محمد ولی رازی ۵۵۶،۶۰۵
راس امید ۷،۵۶۴،۵۶۵
رائس الرجاء الصالح ۷
رافضی تبرائی ۱۶۰
رامسیس ہوٹل ۱۲۱
راون رحمت، حضرت ۳۷۸
راوندی ۱۷
رائے بریلی ۵۳۳
رائے پوری، مولانا عبدالرحیم رائے پوری ۵۲۸
ربض ۷۳
الربض (قلعہ) ۲۴۷
ربعی بن عامر ۶۱
الرتاج ۴۵
رجیب ۲۹۱،۲۲۱
رحلۃ ابن جبیر ۲۷۴
رحمانی، مولانا منت اللہ رحمانی ۵۰۸
ردّالمحتار ۳۰۴،۳۰۵،۳۰۶،۴۲۲
۴۳۸
الرسالۃ ۱۳۱
رسمٹن برگ ۵۴۴
رشید بھامجی ۵۵۲
رشید چوتھیا ۵۵۲
(سید) رشید رضا ۱۶۲
رصافہ ۱۸،۳۲
(سید) رضوان علی، دکتور ۳۶۳
الرفاعی، شیخ یوسف ہاشم الرفاعی ۳۹۶
رفیع الدین مولانا ۵۰۰،۵۱۷
رفیق الرجانی (ماہر آثار قدیمہ) ۲۹۱،۲۲۱

۲۲۳،۲۲۴
رقہ ۱۷
رقیم ۲۱۸،۲۲۰،۲۲۱
رمثاء (بستی) ۲۴۳،۲۴۹
رملہ ۲۶۵
روافض ۷۴،۳۰۸
(استاذ سید) روحان امبائی ۱۱
روح المعانی ۲۹۷
روس ۴۵۴،۴۵۵،۵۷۸
روسی جارحیت ۵۰۷
روڈیشیا (جنوبی افریقہ) ۵۴۴
الروض الأنف للسہیلی ۱۷۳،۲۳۰
روضہ ۱۲۲،۱۲۸
روضۂ اقدس ﷺ ۲۵۹،۳۲۹
روم ۵۹،۶۲،۱۲۲،۱۲۶،۱۸۰
۱۸۱،۲۲۸،۲۳۰،۲۴۵،۲۵۴
۲۷۰،۲۷۲،۲۹۶،۳۱۵،۳۱۸
۳۲۰،۳۲۲،۳۴۴،۳۴۶،۳۸۹
۴۹۳
روم جدید ۳۱۸
رومن کیتھولک ۳۴۴
رومن کیتھولک چرچ ۳۴۴
رومی حکومت ۲۱۸،۳۵۸
رومی فوج ۲۷۱
رومیلی حصار ۳۲۳،۳۲۵،۳۸۴
۳۶۸
رہوڈیشیا ۵۴۲
ریاستہائے خلیج ۱۱
ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ دیکھئے امریکہ
ریاض النفوس ۱۰۹
ریجنسی پیلیس ہوٹل۔ (اردن) ۲۴۴
ریڈ گارڈز ۴۵۷۔۴۵۸
ریشمی رومال کی تحریک ۵۰۱
(مسٹر) رین جیانگزن ۴۳۲

"ز"

زارغرار ۳۱۸
(حضرت) زبیر بن عوامؓ ۸۸،۱۴۱
الزحیلی، دکتور مصطفیٰ الزحیلی ۳۰۰
الزحیلی دکتور وھبۃ الزحیلی ۳۰۰
(دریائے) زرد ۴۳۶،۴۳۷
زرقاء (اردن) ۲۴۳
الزرقاء مصطفیٰ زلزرقاء ڈاکٹر ۲۴۴،۳۹۶
زرغاریہ ۱۰۴
زکریا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ۵۰۷
۵۲۹،۵۳۲،۵۷۵،۵۹۶
زمبابوے ۵۴۲،۵۵۱

www.freepdfpost.blogspot.com

زمزم، آب ۱۵۴، ۱۵۶
زنگی، عمادالدین زنگی ۲۷۸
زنگی نورالدین زنگی ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱
(شیخ) زھاوی، امجد زھاوی ۲۲
زیارت مدینہ منورہ ۵۷۲:
زیادؓ بن اَبی سفیان ۶۸
زید بن حارثہؓ ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹
(ابو) زید ظریف ۷۴
زید بن واقد ۲۷۵
زیلعیؒ حافظ جمالی الدین ۱۰۰
زینان (معمار) ۳۵۹، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳
(سیدہ) زینب بنت علیؓ ۲۵۶، ۲۵۷
زین العابدین، مفتی مولانا ۵۵۴، ۵۶۹

"س"

سادات، صدر انور سادات ۱۶۳، ۴۹۳
ساروغ ۲۱۷
ساسانی حکومت ۴۷
سالار قوم ۴۴۸
سالار کاؤنٹی ۴۱۴، ۴۴۶، ۴۴۸
السالوس علی احمد ۲۴۴
سائبریا ۴۵۳
سائنس سینٹر ۵۸۶، ۵۸۷
ساؤتھ شور ۵۹۷
سبکی حافظ سبکیؒ ۲۹۸
سپریم پیپلز کورٹ ۴۳۲، ۴۳۳
سپریم کورٹ ۳، ۴، ۴۳۲، ۴۳۶
۵۵۳، ۵۵۵
سخاوی، حافظ سخاویؒ ۱۳۸، ۱۵۹
سدرۃ المنتہیٰ ۱۴۶
سدالصہباء (جبل) ۱۷۳
سدوم ۲۰۸، ۲۰۹
سراج الحق ڈاکٹر ۳۰۹
السرائی، محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن السرائی ۴۲۱
سربراہ کانفرنس ۱۶
سرپنٹ کالم ۳۳۵
سرما (دریائے) ۳۹۲
سرمایہ دارانہ نظام ۴۶۶
سروکار ۳۶۹
سریانی زبان ۲۱۷
سرّی سقطیؒ، حضرت ۲۴، ۲۷، ۲۸
۲۹، ۳۰
(ابن) سعدؒ ۵۲، ۷۴، ۲۶۸

(حضرت) سعد بن ابی وقاصؓ ۱۶، ۶۲
۶۶، ۶۸، ۶۹، ۷۱
سُعدیٰ ۲۳۶
(امام) سعدی ۴۵
(شیخ السلام ابو) السعود آفندیؒ ۳۵۹
سعودی ایئر لائنز ۸، ۳۱۴
سعودی عرب ۳، ۸، ۱۱، ۴۴
۶۴، ۹۰، ۱۶۷، ۱۸۲، ۲۵۰، ۲۸۹
۳۱۷، ۳۳۲، ۳۶۴، ۳۹۵، ۳۹۶
۴۷۷، ۴۹۴، ۵۵۱، ۵۷۵
سعید ۶۰۵، ۶۰۷
(حافظ) سعید ۵۵۲، ۵۵۴، ۶۰۵
سعید حافظ بھائی جی ۵۰۷
(شیخ) سعید حسن ۴۴۷
سعید بن عامر ۲۲۲
(حضرت ابو) سفیانؓ ۲۶۵، ۲۶۶
۲۶۸، ۲۶۹
(حضرت) سفیان ثوریؒ ۷۰
سقراط ۳۱۵
سقیفۂ بنی ساعدہ ۱۹۴
سکم ۴۱۱
سکندر صاحب ۵۷۷
سکندر رومی ۲۶۲
سکندر مقدونی۔ دیکھئے۔ مقدونی
(حضرت) سکینہؓ ۲۵۶
سلاویسی ۳۷۸
(حافظ) سلامہ ۱۶۳
السلامی، شیخ مختار سامی ۱۰۴
سلنک ۳۴۴
سلجوری ترکی ۳۲۱، ۳۲۲
سلطان احمد ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴
سلطان مسجد ۳۸۳
سلطنت روما (روم) ۳۱۹، ۳۲۸
سلطنت عثمانیہ ۳۲۱، ۳۳۷، ۱۳۶۱
لسقینی شیخ ابراہیم السقینیؒ ۳۰۰، ۳۰۷
(حضرت) سلمان فارسیؓ ۴۷، ۴۸
۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۶، ۵۷
۶۴، ۶۹، ۲۰۶
سہلٹ ۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲
(حضرت) سلیمان علیہ السلام ۳۴۴
(شیخ) سلیمان ۴۲۵، ۴۳۶
سلیمان اعظم ۳۵۹، ۳۶۰
۳۶۱، ۳۶۲
سلیمان عمر صاحب ۵۶۹
سلیمان ملا ابراہیم اغلوص ۳۶۲
(سلطان) سلیم اوّل ۳۳۸، ۳۴۱

www.freepdfpost.blogspot.com

سلیم کلام ۹۸، ۱۰۰
سائرا ۳۷۷، ۳۷۸
سمرقند ۴۴۸
السمک المزکوف ۷۷
سموءبن عادیا ۱۷۸
سمیع اللہ صاحب ۵۸۹، ۵۹۸
سمیع الحق، مولانا ۵۰۹، ۵۵۶
سنبھلی مولانا برہان الدین ۵۰۹
۵۳۳
سنجالوی حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم
۵۴۸، ۵۵۶
سنکیانگ ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۳۵
۴۳۶، ۴۵۳
سنگاپور ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷
۳۸۳
سنگاپور ائیر لائنز ۳۷۷
سنگ ستارہ ۳۴۴
سواد ۶۵
سوڈان ۶۰۲
سورابایا ۳۸۰، ۳۸۱
سورستان ۶۶
سورالعیون ۱۲۸
سورۂ آل عمران ۲۴۴
سورۃ الاحزاب ۲۳۵، ۲۳۸
سورۃ البقرۃ ۶۵، ۲۹۶
سورۃ الروم ۲۴۵
سورۃ عبس ۲۶۳
سورۃ القریش ۵۳۱
سورۃ القصص ۱۸۸
سورۃ الکہف ۱۸۷، ۲۱۶
سورۃ محمد ۳۳
سورۃ الملک ۵۷۹
سورۃ النساء ۲۶۳
سوریا۔ ملاحظہ کیجئے۔ شام
سورید (بادشاہ) ۸۳
سوق۔ الحمیدیہ۔ دیکھئے۔ حمیدیہ (بازار)
سوق وردان ۱۴۱
سوندا ۳۷۸
سوویت یونین ۴۱۱
سوہارتو ۳۷۹
سوئیکارنو ۳۷۹
سویز (نہر سویز) ۳۱۴، ۳۲۰
سہانپور (انڈیا) ۴۹۷، ۴۹۹
۵۱۶، ۵۲۹، ۵۳۰
سہانپوری خلیل احمد مولانا ۵۲۸
سیاسی مشاورتی کمیٹی ۴۵۰

سی این ٹاور ۶۰۰، ۶۰۳
سیبویہ ۱۵۹
سیحان ۱۴۶
سید عسل ۱۵۳
(ابن) سید الناسؒ ۹۹، ۱۸۱، ۲۷۵
۲۹۸
سیدی عقبہ ۱۱۱
سیرت ابن ہشام ۲۳۰، ۲۳۱
۲۳۲، ۲۳۴
سیرت کانفرنس ۳۹۵
سیرت یعقوب مملوک ۵۱۶
سیر اعلام النبلاء ۵۵، ۱۰۱، ۱۰۶
۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۹۶، ۱۹۷
۱۹۹، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵
۲۰۶، ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۶۹، ۲۷۰، ۳۵۳
سیف الدولہ ۶۵
سیکولر حکومت ۳۷۹، ۳۸۱
۳۸۳
سینٹر آف ریسرچ آن اسلامک ہسٹری
کلچر اینڈ آرٹس ۳۳۰
سینٹ رومانوس ۳۲۷، ۳۲۸
۳۲۹، ۳۳۶
سینٹ صوفیا ۳۴۶، ۳۵۰
سینٹ لارنس ۵۸۹، ۵۹۷
سین، دریائے ۶۰۷
سینیٹ ۵۶۱
سینیگال ۱!
سیوطیؒ، جلال الدین سیوطیؒ ۷۲
۸۴، ۸۹، ۱۲۸، ۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۸
۲۸۶
Seven Sleepers، ۲۱۷
سیوہارویؒ، حفظ الرحمٰن مولانا ۱۸۹
۲۱۸
سیئر زبلڈنگ ۶۰۳

"ش"

شاخ زرین۔ دیکھئے۔ گولڈن ہارن
شاذلی، شیخ محمد الشاذلی النیفر ۹۰
شاطبیہ ۳۰۵
شافعیؒ ڈاکٹر حسن عبدالطیف شافعی
۱۲۱، ۱۲۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۸، ۱۵۲
۱۵۳، ۱۵۹
شافعیؒ امام محمد بن ادریس ۱۸
۱۹، ۲۰، ۲۹، ۴۲، ۴۳، ۱۲۹
۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۶
۱۳۹، ۱۴۳، ۵۶۸
شافعی (مذہب) ۱۵۹، ۱۶۰

www.freepdfpost.blogspot.com

(ڈاکٹر) شاکر محمود عبدالمنعم ۱۵۳
شام ۶، ۱۷، ۴۸، ۵۱، ۷۷، ۱۵۶
۱۶۷، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۶۸، ۱۸۱
۱۸۳، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۴، ۱۹۵
۱۹۷، ۱۹۷۸، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۵
۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۲۶
۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۴۳
۲۴۴، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۴
۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۸۰، ۲۸۱
۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۰
۲۹۵، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲
۳۶۴، ۳۹۶، ۴۱۸، ۴۴۳، ۴۵۳
۴۷۶ـ۴۷۷، ۵۳۱، ۵۶۸
شامیؒ علامہ محمد امین ابن عابدین شامیؒ
۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۴۲۲
شامی لیرا ۲۸۲، ۲۸۸
شانگ تونگ ۴۳۶
شانزالیزے ۲۱۳، ۶۰۶
(درہ) شان ہے (چین) ۴۲۶
شاہد محمد مولانا ۵۲۹
شاہد حسن، مولانا ۵۱۲
شبان المسجد ۳۸۲
شداد (بادشاہ) ۸۴
شذرات الذھب (لابن العماد) ۱۳۹
۱۵۷، ۲۸۷
شرافت حسین صاحب ۳۷۲، ۵۳۳
شرح البہجۃ ۱۳۸
(حضرت شرجیل بن حسنہؓ ۲۰۰، ۲۰۱
شرح تہذیب ۲۲
شرح جامی ۲۲، ۴۲۱
شرح عقائد ۴۲۱، ۴۷۰، ۵۹۰
شرح وقایہ ۴۱۶، ۴۲۱، ۴۳۸
۴۵۱، ۴۷۰
شرق اردن ۲۲۰، ۲۲۱
الشریعۃ (اردن) ۲۱۵
شریف، ڈاکٹر محمد ۱۵، ۲۲۰، ۳۳۲
شریف مکہ ۴۳۳
(جناب) شریف نیا ۴۳۸
شطی، حبیب شطی ۱۱
شعب بوان ۲۵۵
شعبۂ اسلامیات ۵۶۹
شعبۃ التخطیط ۱۲
شعبۃ الدراسات والبحوث ۱۲
شعبی، حضرت عامر بن شراحیل شعبی ۴۱
شعرانی، امام ۲۰، ۲۱، ۲۷
شعرانی، عبدالوہاب شعرانی ۱۳۵، ۱۳۷
۱۳۸، ۲۸۵

(حضرت شعیب علیہ السلام ۱۸۸، ۱۸۹
۱۹۰، ۲۰۹، ۲۹۶
(حضرت مولانا مفتی محمد) شفیع صاحبؒ ۹،
۱۶۷، ۲۱۵، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۱۸
۲۶۱، ۳۰۲، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲
۴۹۸، ۵۰۱، ۵۰۳، ۵۱۳، ۵۱۴
۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۹، ۵۲۱
۵۲۲، ۵۲۶، ۵۲۹، ۵۳۳
شکاگو ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴
شمالی امریکہ ۵۷۷، ۵۸۱
شمیم محمد ۵۷۷، ۵۷۹، ۵۸۰
(مسٹر) شن لینگ ۴۵۰
شنگ ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۵۰، ۴۵۲
۴۷۰
الشوفۃ الجویۃ (اغوار) ۱۹۰، ۱۹۱
شوفۃ شمالیۃ ۲۰۱
شہر ممنوعہ ۴۲۳
شہید کربلا ۱۵۲
شہید، شیخ برہان شہیدی ۴۱۸، ۴۱۹
۴۲۵
شیانگ ۴۱۴
شیبانی، امام محمد بن الحسن الشیبانی ۳۸
۷۰، ۱۳۰، ۱۳۱
شیخ الأزھر ۱۴۸، ۱۵۱
(حضرت) شیخ الہندؒ ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۱۳
۵۲۸
شیرکوٹی، مولانا انوار الحسن ۵۱۶
شیرکوہ ۲۸۰
شیفرن ۸۶
شین زیادی ۴۱۳

"ص"

صاحب السّر ۵۴
صالح شیخ ۴۲۲، ۴۴۷
صالح طوع، ڈاکٹر ۱۱، ۳۷۰
(حضرت) صالح علیہ السلام ۱۷۶
ضائع، علامہ ابن ضائع (حنفی) ۸۹
صحابہؓ کرام ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۵
۵۹، ۶۳، ۶۶، ۶۹، ۱۲۴، ۱۴۰، ۱۴۴
۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵
۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۵، ۱۹۰
۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۶
۲۰۷، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۴
۲۵۴ـ۲۵۷، ۲۶۰، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۹
۲۹۸، ۳۲۰، ۳۵۷، ۳۹۸، ۳۹۹
۴۰۰، ۴۰۲، ۴۰۴، ۴۰۵، ۵۱۱
صحاح ستہ ۱۰۲، ۲۹۸، ۵۲۷

www.freepdfpost.blogspot.com

صحراء النفوذ ۱۷۵
صدّام حسین (صدر) ۱۹
صدر الشہید ۴۵
صدر صوبائی چائنا مسلم ایسوسی ایشن ۴۳۹
صدقۃ بن منصور ۶۵
صدیق، محمد ۵۸۹، ۵۹۷
صفد ۲۵۵
صفۃ الصفوۃ ۲۵، ۲۷، ۳۳، ۳۴
صفوۃ الاعتبار بمستودع الآمصار والاقطار (للشیخ) محمد بیرم ۱۱۶
صفین ۴۴، ۶۹
(ام المؤمنین) حضرت صفیہؓ ۱۷۳، ۱۷۴
صقرہ ۸۴
صلیب ۳۶۱
صہباء ۱۷۰، ۱۷۴
صہیونی ۲۰۶

"ض"

(حضرت حافظ) ضامن شہیدؒ ۵۲۰، ۵۲۲
ضحّی۔ علامہ ابن عمیرہ ضحّی ۱۰۱
(حضرت) ضرار بن ازوار ۲۰۰
الضوء اللامع (للسخاوی) ۱۳۸، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۰
(صدر پاکستان جنرل محمد) ضیاء الحقؒ ۴۲۲
(صدر) ضیاء الرحمٰن ۳۸۹

"ط"

طاعون عمواس ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۶
(ابو) طالب ۲۳۹
(حضرت) طالوت ۲۴۴
طائف ۱۰
طبرانی ۴۵
طبری علامہ ابن جریر طبری ۱۰۷
الطبقات الکبریٰ (الابن سعد) ۵۲، ۵۸، ۱۸۰، ۱۹۳، ۱۹۷، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۴۱، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۸، ۲۹۹
الطبقات الکبریٰ (للشعرانی) ۲۰، ۲۱، ۲۷، ۲۹، ۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷
طبرابلس ۳۰۷، ۳۳۰
طرابیہ ۳۱۶، ۳۱۷
طرابیہ ہوٹل ۳۴۸، ۳۴۹
طرسوس (آفس) ملاحظہ ہو۔ آفس
طریق الہجرۃ ۹
طفا ۷۵، مزید دیکھئے کربلا
(مولانا محمد) طلحہ ۵۲۹
الطن ۳۳۰
طوفانِ نوح ۲۵۳
طہماسپ ۳۶۰
(بنو) طیئ (قبیلہ) ۷۴، ۱۷۷
الطی ۳۳۰
طیار، حضرت طیارؓ ۲۳۹
(حضرت قاری) طیب صاحبؒ ۳۹۱، ۵۰۰، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۴۳

"ظ"

(سلطان) ظاہر بیبرس ۲۴۷
ظاہر دمشق۔ ملاحظہ ہو۔ الباب الصغیر
ظاہر الکوفۃ ۷۳، ۷۵
(ابو) ظبی۔ دیکھئے، ابوظبی
ظہر الکوفۃ۔ دیکھئے ظاہر الکوفۃ
ظہور الحسن مولانا ۵۱۹

"ع"

(حاجی) عابد حسین ۵۰۳
(قوم) عاد ۸۴
عارفی، حضرت ڈاکٹر عبدالحسیٰ عارفی ۳۷۲، ۵۲۱، ۵۲۳، ۵۲۶، ۵۳۲، ۵۴۵
عاصم، محمد یحییٰ عاصم۔ دیکھیں۔ پیش لفظ
العاقبہ ۱۰۲
عالمی کونشن ۱۰
(حضرت) عائشہ ام المومنین ۱۹۴، ۲۹۹
(حضرت) عبادہ بن صامتؓ ۸۸، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۷، ۲۲۲، ۳۲۰
عبادی عبدالسلام عبادی ڈاکٹر، سکرٹری وزارۃ الاوقاف اردن ۱۱، ۲۴۴، ۲۴۷
(حضرت) عباسؓ ۷۶
(بنو) عباس، ۱۷
عباسی، الحاج محمد عباس خان عباسی ۳۷۵
عباسی خلافت ۴۲
عباسی خلفاء ۴۲، ۷۷، ۳۳۸
عبداللہ ابراہیم، ڈاکٹر ۱۱
(حضرت) عبداللہ ابن ابی اوفی ۶۹
(حضرت) عبد بنؓ ام مکتوم ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴
عبداللہ الکبریٰؒ ۱۷۲
عبداللہ بن ثوب ۲۹۳، ۲۹۴
عبداللہ بن جابر ۴۸، ۵۲، ۵۵، ۵۶، ۵۸
عبداللہ بن جابر الانصاری البیاضی ۵۵
عبداللہ بن جعفر ۲۵۶
عبداللہ بن الحارث ۶۹
(ابو) عبداللہ بن حاطی ۲۷
عبداللہ بنؓ رواحہ ۲۴، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۵
عبداللہ بن سلامؓ ۳۰۶
عبداللہ سلیم، قاری ۶۰۱، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵

www.freepdfpost.blogspot.com

(شیخ) عبداللہ شان شین کوئی ۴۴۶، ۴۵۱
(شیخ) عبداللہ عارف ۳۷۸
(حضرت) عبداللہ بن عباسؓ ۳۱۸
۲۲۲، ۲۹۶
عبداللہ بن عمرؓ ۱۷۸، ۲۳۲
عبداللہ فاضل ۴۴
(شیخ) عبداللہ کنون ۳۹۶
عبداللہؒ بن مبارک ۶۶، ۷۰، ۳۰۳
عبداللہ بن محمد عبدالقادر مکی ۲۴
عبداللہ بن مسعودؓ ۶۶، ۶۷، ۶۹
۲۰۶
عبداللہ میمن، مولانا ۳۷۲
(شیخ) عبدالباسط عبدالصمد ۵۰۵
عبدالحق صاحب ۵۵۲
(علامہ) عبدالحق اشبیلی ۹۹، ۱۰۰
۱۰۲، ۱۰۳
عبدالحق عمر جی حضرت مولانا ۵۴۸
۵۶۹
(سلطان) عبدالحمید ۳۶۹
عبدالحئی، ڈاکٹر۔ دیکھئے۔ عارفی
عبدالحئی پٹیل ۵۷۷، ۶۰۵
عبدالرحمٰن ۴۴۸
عبدالرحمٰن باہ (الحاج سید) ۱۱
عبدالرحمٰن بن بلجم ۷۴
(الاستاذ) عبدالرحمٰن شیبان ۱۱
عبدرزاق ۱۹، ۴۳
(شیخ) عبدالعزیز المبارک ۳۹۶
عبدالعزیز بن مروان ۸۸
عبدالغنی حضرت مولانا شاہ ۵۲۱
عبدالفتاح ابوغدر (شیخ) ۳۳۲، ۳۹۶
عبدالقادر پٹیل ۵۸۳، ۵۸۶
عبدالقوی ۶۰۳
(شیخ محمد) عبدالکریم المدرس ۲۲
(شیخ) عبداللطیف آل سعد ۲۴۴
عبدلی ۱۸۳
(سلطان) عبدالمجید ۳۳۶، ۳۳۷
۳۴۱، ۳۴۹، ۳۵۰
(شیخ) عبدالمجید ۵۵۴، ۵۶۶، ۵۶۸
(شیخ) عبدالمحسن العباد ۳۹۶
عبدالمطلب ۳۳۷
عبدالملک بن عمیر اللیثی ۷۱
عبدالملک بن مروان ۶۶، ۷۱، ۷۲
۲۲۰، ۲۲۴، ۳۰۲
(شیخ) عبدالمنعم النمر ۳۹۶
(مفتی محمد) عبدہ ۱۶۲
عبرانی زبان ۱۶۹

(بنو) عبس ۵۲
العبسی عبدالرحمٰن بن احمد بن عطیہ
دیکھئے..... دارانی
(مولٰنا) عبیداللہ ۵۳۳۰
عبداللہ بن جحش ۲۶۵
عبیداللہ بن زیاد ۷۱
عبیدالحق، مولٰنا ۳۹۰
(حضرت) ابوعبیدہؓ بن جراح ۱۹۱، ۱۹۲
۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸
۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۴۶، ۲۵۴
۲۸۲، ۲۸۳
عتر، شیخ نورالدین عتر ۳۰۰، ۳۰۷
عتیق الرحمٰن، مولانا مفتی ۵۳۰
عثمان ثانی (سلطان) ۳۳۴
سلطان عثمان خان ۳۵۶
(حضرت) عثمان غنیؓ ۵۲، ۵۵، ۷۱
۳۲۰، ۳۳۷، ۳۸۹، ۳۹۹، ۴۰۳
۴۱۴
عثمانی محمد تقی عثمانی، مولٰنا جسٹس ۱۱
۴۴۸
عثمانی مولٰنا محمد رفیع عثمانی ۵۴۱، ۵۴۴
۵۴۵، ۵۵۱
عثمانی، مولانا محمد سہول عثمانی ۳۹۱
عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی ۵۲۱
عثمانی، محمد عمران اشرف عثمانی۔ دیکھیں پیش لفظ
عثمانی، مولانا محمود اشرف عثمانی ۳۰۴
عثمانی، جناب مخمور عثمانی ۵۳۰
عجائب گھر ۱۸، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۳۵
۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۸
عجلون ۲۴۷
عجلونی، علامہ اسماعیل بن محمد ۲۴۷
(استاذ) عجیل جاسم النشمی ۱۱
عراق ۳، ۱۵، ۱۷، ۲۳، ۲۹، ۳۶
۴۲، ۴۵، ۴۶، ۴۸، ۵۴، ۵۶، ۵۷
۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۷۱، ۱۹۵
۲۵۶، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۰
عراقی ائیرویز ۱۶
عراقی دینار ۴۴
عراقی قہوہ ۶۴
عراقی، زین الدین عراقی ۱۵۴، ۱۵۶،
عرب ۴۸، ۵۹، ۵۱، ۶۳، ۶۴
۶۶، ۶۹، ۱۶۶، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۰
۱۹۱، ۱۹۵، ۲۲۱، ۲۴۸، ۲۶۱، ۲۹۴
۴۱۴، ۵۰۸، ۵۶۸
عربی زبان ۶۱، ۳۵۰، ۳۵۸، ۳۶۵
۳۶۶، ۴۹۱، ۴۲۱، ۴۳۷، ۴۴۳، ۵۴۸

www.freepdfpost.blogspot.com

عرفات ۵۰۵،۵۰۹
عرینہ ۶۹
عزیز، ڈاکٹر محمد ۳۲۴،۳۵۶
عزیز باللہ ۱۵۸
عزیز الرحمٰن، حضرت مولانا مفتی ۵۰۲
(ابن) عساکر ۵۷،۲۶۹،۲۷۵،۲۷۶
۲۹۳،۲۹۵،۲۹۶،۳۰۰
عشرۂ مبشرہ ۷۱،۱۹۲
عصا ۶۸
عطار، ابوبکر ۳۲
عطاء الرحمٰن مولوی ۱۶۷،۱۷۶،۱۸۲
۲۱۴،۲۲۶،۲۵۱،۲۸۹،۳۰۷
عقبہ ۲۲۲
عقبہؓ بن عامر ۱۳۹،۱۴۳،۱۴۴،۱۴۵
۱۵۳
(حضرت) عقبہ بن نافعؓ ۹۰،۱۰۵،۱۰۶
۱۰۷،۱۰۸،۱۰۹،۱۱۰،۱۱۱
عقیدۂ ختمِ نبوت ۵۵۶
عکاظ ۲۳۶
(سلطان) علاء الدین ۳۲۲
علاء الدین خروفہ، شیخ ۶۰۴
(علامہ) علاء الدین ابنِ عابدین ۳۰۶
علماءِ ازھر ۱۶۲
علمِ اصول ۱۳۲
علماء نافی العراق ۲۳
علمِ حدیث ۶۷،۱۳۲،۱۵۴
علمِ عقائد ۲۳،۴۱
علمِ فقہ ۶۷،۱۳۲
علمِ کلام ۴۱
علمِ میراث ۱۴۴
(حضرت) علیؓ ۳۳،۶۶،۶۷،۶۸
۶۹،۷۰،۷۱،۷۲،۷۳،۷۴،۷۵
۱۷۱،۱۷۲،۲۳۹،۲۵۴،۲۵۶
۲۷۱،۲۹۲،۳۰۳،۳۴۷،۳۵۱،۳۵۵
علی اکبرؓ
علی پاشا ۳۴۲
علی بن الفتح البجائی۔ دیکھئے۔ البجائی
علی بن موسیٰ الرضا ۱۲۵
علوی، سعید الرحمٰن مولانا ۵۱۳
(علامہ ابن) العماد ۱۳۹
(مولانا) عمار صاحب ۵۳۲
(حضرت) عمار بن یاسرؓ ۳۳۹
عمالقہ ۱۶۹،۱۸۶،۱۸۷،۲۴۴
عمان (اردن) ۱۸۳،۱۸۴،۱۸۵
۱۸۶،۲۱۴،۲۱۵،۲۱۸،۲۲۰،۲۲۱
۲۲۲،۲۲۵،۲۲۷،۲۴۱،۲۴۲،۲۴۳
۲۴۴،۲۴۷،۳۰۸

عمدۃ الرعایہ ۳۰۴،۳۰۸
(حضرت) عمر بن عبدالعزیز ۲۷۳
۲۷۸،۳۰۳،۳۲۱
(حضرت) عمرو بن عبسہؓ ۲۵۸
(حضرت) عمر فاروقؓ ۱۷،۵۱،۵۴
۶۶،۶۷،۷۱،۸۸،۱۲۷،۱۲۹،۱۴۰
۱۴۲،۱۴۴،۱۹۴،۱۹۵،۱۹۶،۱۹۷
۱۹۸،۲۰۲،۲۰۴،۲۰۵،۲۴۰،۲۵۴
۲۵۹،۲۶۰،۲۶۴،۲۷۰،۲۸۲،
۲۹۴،۳۴۷،۳۹۹،۴۰۴
العمری، علامہ شہاب الدین بن فضل اللہ العمری
۲۷۶
(حضرت) عمر بن جمورحؓ ۵۸
(حضرت) عمر بن عاصؓ ۸۸،۱۰۶،۱۲۲
۱۲۳،۱۲۹،۱۴۰،۱۴۱،۱۴۲
عمرۃ القضاء ۲۴۰
عمواس ۱۹۹،۲۰۱
عمورہ ۲۰۸،۲۰۹
عموریہ ۴۸
عمید کلیۃ الشریعۃ ۱۱
عنایت صاحب (سیکنڈ سیکرٹری
سفارت خانہ پاکستان ۲۵۳،۲۵۵
۲۵۶،۲۵۷،۲۸۲،۲۸۵،۳۰۳
عنوان الدرایۃ فیمن عرف من العلماء
فی المائۃ السابعۃ بجایۃ ۹۲،۱۰۱،۱۰۲
(حضرت) عیسیٰ علیہ السلام ۲۵،۳۰۹
۲۱۷،۲۷۷،۵۶۱
عیسائی ۲۵،۴۸،۱۱۲،۱۱۷،۲۲۶
۲۷۲،۲۷۳،۲۷۴،۲۸۰،۳۱۹
۳۷۹،۳۸۱،۵۴۲،۵۴۴،۵۵۰
عیسیٰ البابی ۱۴۸
عین علیؓ ۱۷۲
عینی بدر الدین العینیؒ ۱۵۹،۱۶۰،۱۶۱
عیون الأثر (لابن سید الناس) ۹۹،۱۷۵
۱۷۷،۱۸۱،۲۳۱

"غ"

غازی مولانا حامد الأنصاری غازی ۶۰۲
(سلطان) غازی عثمان ۳۲۱،۳۲۲
غازی، احمد غازی، پروفیسر ۴
غبرینی، علامہ ابوالعباس الغبرینی
۹۲،۱۰۱
غرناطہ (اسپین) ۱۱۲
غزالیؒ، امام ۱۹،۲۸۷
غزوہ احد ۵۱،۵۳،۵۸،۱۹۳
۲۳۱،۲۶۵

www.freepdfpost.blogspot.com

غزوہ احزاب ۵۱، ۵۳
غزوۂ بدر ۵۱، ۵۲، ۹۳، ۱۹۲
۲۰۲، ۲۳۱، ۲۶۵، ۳۰۰، ۳۳۸
غزوۂ تبوک ۱۶۸، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۸۲
غزوہ حنین ۲۰۲
غزوہ خندق ۱۶۹، ۲۶۵
غزوہ خیبر ۲۳۹، ۲۹۲
غزوۂ موتہ ۲۵۱، ۲۲۷، ۲۲۸
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۷۱
غزوہ یرموک ۱۹۵، ۲۰۰، ۲۷۰
۳۰۰
غسانی، شرجیل بن عمرو غسانی ۲۲۸
غفاری، حضرت ابوذر غفاریؓ ۸۸، ۱۷۶
غلاطہ ۳۵۸
غوطہ ۲۵۵، ۲۵۶
(حاجی) غیاث محمد ۴، ۵۵۴، ۵۵۷

"ف"

فاتح عراق ۶۶
فاتح نماز گاھی ۳۵۷
فارلم، مسٹر ۵، ۶
فاروق حمید (اسٹیشن منیجر) ۸۲
(حضرت) فاطمۃ الزہراؓ ۷۴، ۲۵۶
۲۷۱
فاطمی حکمران ۱۵۲
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۵۰۱
فتح الباری شرح البخاری ۱۴۶، ۱۵۵
۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۰
فتح پور سیکری ۵۳۰
(شیخ) فتح اللہ ۳۷۸
فتح مکہ ۲۶۵
فتوح البدان للبلاذری ۲۷۳
فتوح الشام للواقدی ۲۰۰، ۲۲۲
فخر الدین ۴۰۲، ۴۰۴
(دریائے) فرات ۳، ۱۷، ۶۵، ۷۶
۱۴۶
فراعنہ ۸۴، ۸۵، ۱۴۰، ۱۵۹
فرانس ۹۴، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۱۳
۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۸، ۲۷۸، ۳۴۲
۵۶۸، ۵۷۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۲
۶۰۳، ۶۰۶
فرانسیسی جرنیل ۳۴۲
فرانک ۵۷۶
فردوسی ۳۲۹
الفرفور، شیخ صالح الفرفور ۲۸۹
۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۰۷
الفردوسیہ ۵۹۱

فرہاد پاشا ۳۶۲
فریجیا ۳۴۴
فرید صاحب ۶۰۵
فرید آبا ۳۹۲
فرید وجدی ۱۰۹
فریڈرک اینجلز۔ دیکھئے اینجلز
فریکفرٹ (جرمنی) ۴۷۶
فسطاط ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۳
۱۵۰
فصوص الحکم ۴۲۱
حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی
۵۳۲
فقہاء صحابہؓ ۱۴۴
فقہ شافعی ۱۳۸
فلسطین ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱
۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۱۷، ۲۴۴
۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۸
فندق البستان ۲۵۲
فندق الحمادیین ۹۲، ۹۳
فندق الرشید ۱۶
فندق السفیر ۹۰
فوات الوفیات للکتبی ۲۸۶
(شاہ) فہد ۱۱
فہرست تراجم ۳۳۱
فیشاغورس ۳۱۵
فیڈریشن آف اسلامک اسیوسی ایشنز
(ایف آئی اے) ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷
فے زیاؤ ننگ (پروفیسر) ۴۶۱، ۴۶۴
فیصل آباد ۳۷۵
فریک ڈیل ایونیو ۵۸۰

"ق"

قابیل ۲۸۴
قاتیبائے، ملک اشرف قاتیبائے ۱۳۶
قادسیہ (جنگ) ۴۷، ۶۲، ۶۳
۳۶۴۔۳۶۵
قارۃ فتح المغرب ۱۰۹
قادیانی ۵۵۳، ۵۵۶، ۵۶۸
۲۸۲
Quadianisam
۵۵۶
قازق ۴۱۴
قاسم پاشا ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۵۷
قاسم بن قطلو بغا ۴۵
قاسمی، مولانا محمد سالم قاسمی، ۳۹۶
۵۰۷، ۶۰۲
قاسیون ۱۶۷، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۴
۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۵، ۳۰۸

www.freepdfpost.blogspot.com

قاضی القضاۃ ۳۶، ۳۸
قاھرہ ۷۶، ۸۲، ۸۴، ۸۷، ۸۹
۱۰۴، ۱۰۶، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۸
۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰
۱۵۲، ۱۵۸، ۱۶۴، ۲۹۱، ۳۱۴
۴۷۶، ۴۹۳، ۴۹۴
قبا ۹، ۴۸، ۴۹
قبالی جارشی (بند بازار ترکی) ۳۶۴
قبرص ۳۲۰
قطبی بادشاہ ۱۲۲
قبۃ النسر ۲۷۴، ۲۷۷
(ابن) قتیبہ ۱۷، ۱۳۴
(مختصر القدوری ۱۶۰
قدیس (قلعہ) ۶۲
قذافی، کرنل معمر قذافی (صدر لیبیا)
۳۳۰
قرآن کریم ۷، ۹، ۲۹، ۶۵، ۱۳۱
۱۳۲، ۱۴۴، ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۸۶
۱۸۷، ۱۸۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲
۲۱۶، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۳۸
۲۴۲، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۶۳، ۲۶۴
۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۷، ۳۰۴، ۳۰۵
۳۱۴، ۳۳۱، ۳۴۹، ۳۵۱، ۳۵۴
۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۴۰۶، ۴۱۶
۴۲۰، ۴۴۱، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۸۱
۴۹۸، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۵، ۵۴۷
۵۴۸، ۵۶۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۶
قرآن کریم کے تراجم (موضع) ۳۱۴
قرافہ ۱۳۵، ۱۵۳
قراقرم (سلسلۂ کوہ) ۴۱۰، ۴۱۱
القرضاوی، یوسف القرضاوی، دکتور
۳۹۶
القرن الذھبی۔ دیکھئے۔ گولڈن ہارن
قریش ۵۳
قریش مکہ ۵۱۳
قزوینی ۶۵، ۶۸، ۶۹
قزوینی، علامہ زکریا بن محمد قزوینی
۱۰۷، ۲۰۸
القزوینی، شیخ محمد بن محمد احمد البرسانی
القزوینی ۴۱۸
قسطنطنیہ ۱۱۶، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰
۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵
۳۲۶، ۳۲۹، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۳
۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۵۳
۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸
۳۶۸، ۳۶۹

قسطنطین شاہ ۳۱۸، ۳۱۹
۳۲۷، ۳۲۸، ۳۴۴، ۳۴۵
قسمۃ الملائکۃ ۱۷۲
قصارۃ، قلعہ خیبر ۱۶۹
القصبہ، قلعہ ۹۷، ۹۸، ۹۹
قصر، اصغر ۳۶۸،
قصر الامارۃ ۷۴
قصر باب المدفع، ترکی ۳۳۶
قصر محمد الفاتح ۳۳۶
قصر یلدز ۳۳۲، ۳۴۹، ۳۵۰
قصص الأنبیاء، عبد الوہاب النجار
۱۸۹، ۲۰۹
قصص القرآن سوہاروی ۱۸۹
۲۱۸، ۲۹۷
قصیدہ صیفیہ ۶۱
القضائی حافظ ابن الابار القضاعی
۹۹، ۱۰۱
(علامہ ابن) القطان ۱۰۰
قطر ۳۹۵، ۳۹۷
قطر الندی ۱۵۹
(حضرت) قعقاعؓ ۶۳
قلعۃ الجبل ۱۲۸، ۱۴۳
قلعۃ صلاح الدین ۱۲۸، ۱۴۴
قلعۃ القاھرۃ ۱۴۳
قمر الزماں مولانا ۵۳۱، ۵۳۲
قموص، قلعہ خیبر ۱۶۹، ۱۷۰
۱۷۱، ۱۷۳
قواریہ ۹۱
قونگ ۴۱۴
قونیہ ۴۷۱
قہرمان/قارمان ۴۴۸
قیروان ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸
۱۱۰، ۱۱۱
قیصر (روم) ۴۷، ۶۲، ۱۲۲
۱۹۶، ۲۲۲، ۲۸۳، ۲۹۹، ۳۲۰
۳۲۸، ۳۲۹، ۳۴۴، ۳۴۹
(ابن) قیم، علامہ ۵۹۱
قین ۲۳۰

"ک"

کاجیرہ (وادی) ۱۴۷
کارل مارکس ۴۵۸
کاشغر ۴۱۴
کاظمیہ (بغداد) ۳۲
کافیہ ۲۲
(حضرت) کالب بن یوحنا ۲۹۶
الکامل (لابن اثیر) ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹
۱۱۰، ۲۷۹

www.freepdfpost.blogspot.com

کانپور ۵۲۰
کاندھلوی مولانا انعام الحسن کاندھلوی
۵۳۰
کاندھلوی، مولانا کاندھلوی
۵۲۸
کانسو (صوبہ چین) ۴۱۵، ۴۳۱
۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹
۴۴۰، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۵۲، ۴۵۳
۴۶۶، ۴۶۸
کانفرنس ۹، ۳۱۶۔۳۷۱
کانگریس ۳۲۰
کتاب الأم ۱۳۲
کتاب الایمان ۵۴
کتاب التفسیر ۲۶۳
کتاب التہجد ۱۰۲
کتاب الثقات (لابن حبانؒ) ۳۸
کتاب الجلسہ ۱۴۶
کتاب الجہاد ۵۳، ۳۲۰
کتاب الرقاق ۱۰۲
کتاب الزھد ۱۹۶
کتاب الصلوۃ ۲۰۲
کتاب الطلاق ۴۱۶
کتاب المغازی ۲۳۲، ۲۳۳
کتاب المناقب ۱۴۶، ۲۰۲
کتب خانہ سلیمانیہ ۳۶۳
(علامہ ابن) کثیر ۲۹۷، ۲۹۸
کراچی ۴، ۳۰۷، ۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۲
۳۷۵، ۳۹۵، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۸۵
۵۰۴، ۵۴۸، ۵۷۲، ۵۷۵، ۶۰۰
۶۰۱، ۶۰۷
کراچی ائیر پورٹ ۳۷۲
کراچی یونیورسٹی ۱۸۳
کزاروی فخر الحسن کراروی مولانا ۴۰۹
کربلا ۷۰، ۷۱، ۷۵، ۷۶، ۷۷
دشت کربلا ۷۶، ۲۵۶
کرخ ۱۸
کرخی، حضرت معروف بن فیروز کرخیؒ
۱۸، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸
۳۹، ۴۰
کردی ۲۳
کرغیر ۴۱۴
کرک اسٹریٹ ۴
کروگرس ڈورپ ۵۴۴، ۵۵۲
۵۶۹
(پیر محمد) کرم شاہ جسٹس ۳۷۵
کسریٰ ۱۷، ۴۷، ۵۴، ۵۸، ۵۹
۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۳۴۹

ککر ۶۵
کسیلہ ۱۱۰
کشف الخفاء ۲۴۷
کشک چہ الماسی ۳۴۱
کشمیری حضرت مولانا نور شاہ کشمیریؒ
۵۰۳، ۵۱۴، ۵۴۷
کعب ۲۳۷
(بنو) کرب (قبیلہ) ۲۳۶
کعبہ شریف۔ دیکھئے۔ بیت اللہ
(بنو کلب (قبیلہ) ۲۳۶
کلبی، حضرت دحیہ کلبیؓ ۲۹۸، ۲۹۹
کلدانی ۶۵
کلیسا ۳۱۹، ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۳
۳۴۴، ۳۴۵، ۳۶۱
کلیۂ الٰہیات ۳۷۰
کلیۂ دار العلوم ۱۲۱
کلیۂ الدعوۃ الإسلامیۃ ۳۳۰
کلیۃ الشریعۃ ۱۱، ۲۵۲، ۲۸۹
کمال اتاترک ۳۴۷، ۳۵۳، ۲۶۶
کمرنگی چر ۳۹۲
کمیونٹی سینٹر ہال ۵۸۲
کمیونزم ۳۰۸، ۴۵۴
کمیونسٹ انقلاب ۴۵۵، ۴۶۹
کمیونسٹ پارٹی ۴۱۵، ۴۲۰، ۴۶۰
۴۶۲، ۴۶۳، ۴۷۹
کمیون سسٹم ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۶۳
کنانہ ۱۷۳
کنانی، جثامۃ بن مساحق الکنانی ۳۹۹
۴۰۴
کنز العمال ۵۴، ۳۹۹، ۴۰۳
۴۰۴
کنعان ۲۴۴
کنونشن ۱۰
(دریائے) کنہار ۲۴۵
کنیڈا ۴۱۱، ۴۸۲، ۵۷۵، ۵۷۸
۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴
۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۹
۵۹۶، ۶۰۰، ۶۰۵
کنیڈین آبشار ۵۸۵
زکینتہ یوحنا ۲۷۲
الکواکب السائرۃ للمغزی ۱۳۵، ۱۳۷
کواکب الہواء ۲۰۶
کوالالمپور ۳۷۵، ۳۷۶
کوانگچو ۴۱۴
کورن وال ۵۹۵
کوریا ۴۱۱

www.freepdfpost.blogspot.com

کوفہ ۱۷، ۴۱، ۶۴، ۶۵، ۶۶
۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳
۷۴۔۷۵
کوہستان ۴۱۱
کویت ۱۱، ۳۰۷، ۳۹۶
کیفی، زکی کیفی مرحوم ۵۱۵
کے، ایل ایم (ایئر لائنز) ۵۵۴
کیبل کیبن ۵۹۸
کیپ آف گڈ ہوپ ۷
Cape of good Hope
۵۶۴
کیپ پراونس ۵۴۲، ۵۶۵
کیپ پوائنٹ ۵۶۹
کیپ ٹاؤن ۳، ۴، ۶، ۷، ۸
۵۵۳، ۵۵۵، ۵۵۷، ۵۶۰
۵۶۲، ۵۶۴، ۵۶۶، ۵۶۷
۵۶۸، ۵۶۹
کے، ٹو، قراقرم ۴۱۰
کیرالہ ۵۴۲
کیمبرج ۵۷۹
کینوھا (دریائے) ۴۷۶
کیوبیک ۵۷۸، ۵۷۹
کینیا ۳، ۵۴۱، ۵۵۴، ۵۷۰
۵۷۱، ۵۷۲

''گ''

گارڈن سٹی ۱۴۵
گبن، ایڈورڈ ۳۲۶، ۳۴۵
گجرات ۵۴۲، ۵۴۴، ۵۸۲
گڈوآسٹن ۴۱۰
گروپ ایریا ایکٹ ۵۴۵
گریٹ ہال ۴۱۹، ۴۳۰، ۴۳۱
گلگت ۴۱۰
گنبد خضرا ۹
(دریائے) گنگا ۳۹۳
گنگوہی ۵۱۲، ۵۱۵، ۵۲۵، ۵۲۶
گنگوہی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۵۰۷، ۵۱۷، ۵۱۹، ۵۲۵، ۵۲۷
۵۲۸، ۵۲۹، ۵۱۹
گنگوہی شیخ عبدالقدوس گنگوہی ۵۲۵
۵۲۶، ۵۲۷
گنگوہی، شیخ مولانا مفتی محمود گنگوہی ۵۳۲
گولڈن ہارن ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶
۳۲۷، ۳۳۴، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۹
گہوارۂ چین ۴۳۶
گیلان ۱۹
گیلانی ریاض الحسن گیلانی ۴، ۴۴، ۵۴۴

گینیا ۱۱

''ل''

لاچی ۴۴۵
لاطینی ۱۸۴، ۱۲۷، ۳۱۵
لال قلعہ ۵۳۰
لال کتاب ۴۵۵، ۴۵۸
(مسٹر) لابن لی ۴۴۶
لان ۱۷
لانچو (چائنا) ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸
۴۳۹، ۴۶۸، ۴۷۰
لانچوائیر پورٹ ۴۵۲، ۴۵۳
لاہور ۳، ۳۷۵، ۴۰۹، ۴۹۷
لاہوری گروپ ۵۵۶
لاؤس ۴۱۱
لائبریری آف کانگریس ۵۹۲
لائٹ ہاؤس ۳۵۸
لبنان ۲۸۴، ۳۰۷، ۴۷۷
لحظ الالحاظ لابن الفہد ۱۵۶، ۱۵۷
لخم، قبیلہ ۲۳۰
لدھیانوی، مولانا محمد یوسف لدھیانوی
۴
لسان العرب ۱۰۴
لسان المیزان ۱۵۵
لکونیا ۳۴۴
لکھنؤ ۳۱۲، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴
۵۳۵
لکھنوی، مولانا عبدالحئی لکھنویؒ ۴۱۶
لن پیاؤ ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹
۴۶۰
لندن (برطانیہ) ۳۳۰، ۴۸۳، ۴۹۲
۴۹۳، ۵۴۲، ۵۴۹
لن شاہ ۴۳۹، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۵
۴۶۶، ۴۶۸
(حضرت) لوط علیہ السلام ۱۸۶، ۲۰۸
۲۰۹، ۲۱۱، ۳۱۲
لہر، احمد حسن لہر ۵۴۱، ۵۵۲
اللؤلؤ والمرجان ۴۳۸
لیبیا ۱۰۶، ۳۱۴، ۳۳۰، ۳۳۱
۳۴۴
لیث ابن سعدؒ ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۴
۱۳۵
لیزر شعاعیں ۵۸۸
Legal person ۵۵۸
(ابن ابی) لیلیٰ قاضی ۳۸
لینیشا ۵۴۴
لیوشاؤچی ۴۵۸، ۴۵۹

www.freepdfpost.blogspot.com

"م"

مآثر حکیم الامت ۵۲۱
ماتی فا ۴۵۰
ماجدین عبدالعزیز (امیر منطقہ مکہ مکرمہ) ۱۱
ماجستیر ۲۲
(امام ابن) ماجہ ۲۹۲
(ابن) ماجہ، سنن ۳۳، ۱۹۴، ۲۰۱
مادورا ۳۷۸
مارکسزم ۴۵۵
ماروت ۶۵
ماسولین (حبیب اللہ ماسولین) ۴۳۸، ۴۳۹
مسٹر، ماشن ۴۴۶
(حضرت امام) مالکؒ ۱۳۰، ۱۳۳
مالک الصغیر ۱۶۲
مالکی علامہ دردیر مالکی ۱۶۱، ۱۶۲
مالکی، فقیہ ۱۶۱
مالکی، مذہب ۱۶۲
مالوکا ۳۷۸
مالی ۱۱
مالے کیول ۵۸۸
مامقانی ۶۹
(خلیفہ) مامون رشید ۸۶
مانٹریال ۵۷۶، ۵۷۸، ۵۸۹، ۵۹۵، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹
ماوراء النہر ۴۱۸
ماہر آثار قدیمہ ۸۵
ماؤنٹ ایورسٹ ۴۱۰
ماؤزے تنگ (چیئرمین) ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۵۵، ۴۵۷، ۴۵۹، ۴۶۰
مائی سرینوس ۸۶
(مولانا قاری محمد) مبین ۵۳۱
متنبی (شاعر) ۵۰۱
متوکل ۶۱، ۳۳۸
مجدد الف ثانیؒ ۱۶۴
مجذوب، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ ۵۲۱
مجرد الیمنی حضرت شاہ جلال مجرد الیمنیؒ جلال
مجلۃ الاحکام العدلیۃ ۳۰۶
مجلس تحفظ ختم نبوت ۵۵۴، ۶۰۱، ۶۰۵
مجلس الدعوۃ اسلامیۃ ۳۱۴
مجلس شوریٰ ۳۷۵
مجلس المعارف (دمشق) ۳۰۷
مجمع الجزائر ۳۷۷
مجمع الزوائد (للہیثمیؒ) ۱۸۰، ۲۰۵
مجمع الفقہ الاسلامی (جدہ) (اسلامی فقہ اکیڈمی) ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶۷، ۲۴۳

۲۴۴، ۲۸۹، ۳۱۴
محرز، علامہ ابوبکر محرز ۹۹
محکمۂ آثار قدیمہ ۲۱۹، ۲۲۴
محکمۂ اوقاف ۲۲۴، ۳۰۳
محکمۂ سیاحت ۶۳
محکمۂ مذہبی امور ۳۹۵
(ڈاکٹر) محمد ۹۰
(شیخ) محمدؒ ۸۷
محمد بن ابی بکر ۲۷۱
(مولانا) محمد احمد پرتاب گڑھی ۵۳۲
محمد بن اسحاق ۴۰
(سیاح) محمد بن جبیر ۲۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷
محمد بن جعفر ۲۷۱
محمد علی پاشا ۱۲۹
(الحاج) محمد علی ٹران جے ۴۱۳
محمد علی صبیح ۱۴۸
(سلطان) محمد فاتح ۳۱۳، ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۶، ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۹، ۳۵۶، ۳۶۴، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹
(حضرت مولانا حافظ) محمد اللہ صاحب ۳۹۲
(شیخ) محمد المبارک ۳۹۶
(حضرت) محمد بن مسلمہ ۱۷۰
محمدی، مولانا شبیلۃ الحسین محمدی ۳۷۵
(مولانا مفتی) محی الدین ۳۹۳، ۵۱۴
(مولانا) محی الدین خان ۳۸۹
(شیخ اکبر) محی الدین ابن عربی ۹۹، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸
مختصر تاریخ دمشق (لابن منظور) ۲۵۳، ۲۸۴
مختصر خلیل ۱۶۱
مخزیؒ، ابوسعد قاضی ۲۰
مدائن ۴۵، ۴۷، ۴۶، ۵۱، ۵۲
۵۴، ۵۵، ۵۸، ۵۹، ۶۲
مدائن صالح ۱۶۸، ۱۷۶
مدراس ۲۷۵، ۵۴۲
مدرسہ اشرف العلوم ۳۹۳
مدرسہ اصغریہ ۵۱۵
مدرسہ تحفیظ القرآن (ترکی) ۳۶۴
مدرسہ عالیہ ۳۹۰
مدرسہ قاسم العلوم (سلہٹ) ۳۸۷، ۳۹۰
مدرسہ ملیہ ۱۵۶
مدرسۃ الواعظین ۳۷۵
مدنی، مولانا اسد مدنی ۵۰۷
مدنی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ۵۰۲، ۵۱۳، ۵۹۱

www.freepdfpost.blogspot.com

مدوّرہ ۱۸۲
مدیر خدام الدین ۵۱۳
مدیر ماہنامہ الحق ۵۰۹
مدیر المعہد الاسلامی ۱۱
مدین ۱۸۸،۱۸۹
مدینہ طیبہ ۸،۹،۱۱،۱۵،۳۳،۴۸
۴۹،۵۲،۵۳،۵۴،۵۹،۷۴
۷۶،۱۳۰،۱۴۴،۱۶۷،۱۶۸،۱۶۹
۱۷۳،۱۷۹،۱۸۰،۱۸۲،۱۹۸،۲۰۱
۲۰۴،۲۲۹،۲۳۳،۲۵۶،۲۵۹
۲۶۰،۲۶۲،۲۶۴،۲۶۵،۲۶۸
۲۶۹،۲۷۰،۲۷۱،۲۹۳،۲۹۴
۲۹۹،۳۰۷،۳۱۴،۳۵۵،۵۰۷
۵۵۳،۵۶۸
مدینۃ الروم (استنبول) ۳۱۸
مدینۃ السحر ۶۵
مدینۃ السلام ۱۸
مڈل برگ ۵۴۴،۵۵۲
مذاہب اربعہ ۱۵۸
مرآۃ الجنان (للیافعی) ۳۸
مراد رائع۔ سلطان ۳۳۴،۳۴۰،۳۵۹
مراصد الاطلاع (للبغداد) ۷۳
مراکش ۹۲،۱۰۶،۱۰۸،۱۰۹،۱۱۱
۱۶۲،۳۵۲،۳۹۶
مرج (دمشق) ۲۵۱
مرجب (یہودی پہلوان) ۱۷۱،۱۷۲
مرزا غلام احمد قادیانی ۳،۵۵۶،۵۶۱
مرزائی ۴،۵۵۶،۵۵۵،۵۵۷
۵۵۸،۵۵۹،۵۶۱،۵۶۲،۵۶۳
مرزائی انجمن ۵۶۴
مرسیہ (اندلس) ۲۸۶
مرغوب، محفوظ احمد مرغوب ۴۰۹
مرکز الابحاث للتاریخ والثقافت والفنون
الاسلامیۃ ۳۳۱،۳۳۲،۳۴۹،۳۵۲
مرکز تبلیغ نظام الدین ۵۳۰
مرگلہ پہاڑی ۴۱۰
مرمارا یونیورسٹی ۱۱،۳۶۷،۳۷۰،
مریخ، سیارہ ۴۷۹
مزار ۲۲۶،۳۳۵
مزہ ۲۹۷،۲۹۸،۳۰۰
مزی حافظ ابوالحجاج مزی ۲۹۸
مسالک الابصار فی ممالک الامصار ۲۷۶
مستدرک حاکم ۵۳،۱۹۳،۱۹۴،۱۹۷
۱۹۹،۲۰۲
مستشار وزیر الاوقاف ۲۰۲،۱۵
مستشرقین ۲۰۹،۳۳۱،۵۹۱،۵۹۴

مسجد ابراہیم ۲۸۴
مسجد الاسلام ۵۹۵
مسجد اقصیٰ۔ دیکھئے۔ بیت المقدس
مسجد بیت المکرم (ڈھاکہ) ۳۸۹
مسجد الحافظ ابن حجر ۱۵۲،۱۵۸
مسجد حرام۔ ملاحظہ کیجئے۔ بیت اللہ
مسجد خالد بن ولیدؓ ۲۴۳
مسجد درسگاہ ۳۹۱
مسجد رحمت ۵۷۶
مسجد سلطان احمد ۳۳۲،۳۳۵،۳۶۰
مسجد سلمانؓ ۵۶
مسجد امام شافعیؒ ۱۳۳
مسجد ابوعبیدہ بن جراحؓ ۹۱،۲۴۶
مسجد المدینہ ۵۷۹،۵۸۰،۶۰۵
مسجد نبوی ﷺ ۹،۲۹۴
مسجد نبوی ﷺ (تبوک) ۱۸۱
مسجد نیوٹاؤن (جوہانسبرگ) ۵۴۵
مسجومی پارٹی ۹،۳۷،۳۸۲
(مولانا حکیم) مسعود احمد ۵۲۸
(صحیح) مسلم ۵۳،۵۴،۱۴۶،۱۵۷
۱۷۴،۲۳۹،۲۵۸،۳۶۳
مسلم ایسوسی ایشن ۴۴۵،۴۵۱
مسلم سربراہ کانفرنس ۱۰
(حضرت) مسلم بن عقیلؓ ۷۰
مسلم فاؤنڈیشن ۶۰۴
مسلم کمیونٹی سینٹر ۶۰۲،۶۰۳،۶۰۴
مسلم وزرائے خارجہ ۱۰
(حضرت) مسلم بن مخلد انصاریؓ ۸۸
مسند احمد ۵۳،۱۵۲،۱۷۳،۱۹۳
۱۹۷،۲۰۳،۳۲۰
مسند الشہاب ۹۹
مسند عبد بن حمید ۵۳۴
(حضرت) مسیح علیہ السلام ۸۳،۸۵
(حضرت مولانا) محمد مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم
۵۲۰،۵۲۴،۵۴۳،۵۸۳
مسیحی مصادر ۲۱۷،۲۱۸
مشاجرات صحابہؓ ۱۴۴
مشارف ۲۳۱
المشتہ ۱۵۵
مشتری، سیارہ ۶۵
مشرقی وسطی ۵۹۳
مشرقی پاکستان ۳۸۷
مشرقی جاوا ۳۸۱
مشکوٰۃ ۴۳۸،۴۵۱،۴۷۰
۵۴۸
المصباح المضیئی لابن ابی جدیدہ ۲۹۹

www.freepdfpost.blogspot.com

مصر ۸۲_۸۳،۸۸،۱۰۶،۱۷۷
۱۲۱،۱۲۲،۱۲۷،۱۲۸،۱۲۹،۱۳۱
۱۳۴،۱۳۵،۱۳۶،۱۳۹،۱۴۰،۱۴۲
۱۴۵،۱۴۸،۱۵۰،۱۵۱،۱۵۲،۱۵۶
۱۵۸،۱۵۹،۱۶۲،۱۸۸،۲۵۶،۲۸۰
۲۸۶،۲۸۸،۲۹۹،۳۳۸،۳۴۳
۳۴۴،۳۶۴،۴۷۷،۴۹۳،۵۶۸
۵۹۲
مصطفیٰ البابی ۱۴۸
(سلطان) مصطفیٰ سوم ۳۴۰
مصطفیٰ کمال پاشا ۳۴۷
مصعب بن عمیرؓ ۷۱
مصلح الدین آغا ۳۶۸
مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۸،۴۱۳
مصنف عبدالرزاق ۱۹۶،۲۰۶
مطار صدام (صدر صدام ایئر پورٹ ۱۶
مطاف ۲۱
مطعم ابوکمال (دمشق) ۲۸۹
المطلوع، شیخ عبداللہ علی المطلوع ۳۹۶
المطیعی شیخ محمد نجیف المطیعی ۳۹۶
مطین ۷۴
مظاہر العلوم (سہارنپور) ۵۱۶،۵۲۹
۵۹۶
(مولانا) مظہر عالم صاحب ۵۹۶،۵۹۷
(حضرت) معاذ بن جبلؓ ۲۰۱،۲۰۲
۲۰۳،۲۰۴،۲۰۵،۲۰۶،۲۷۰
معارف القرآن ۲۱۸،۳۸۹
معرف القرآن بنگلہ ۳۹۰
معرفتِ حق ۵۳۱
معان ۱۳۱،۲۳۰
(حضرت) معاویہؓ ۵۸،۷۴،۸۸،۱۰۶
۱۰۸،۱۴۴،۲۵۴،۲۶۹،۲۹۲
۲۹۵،۲۹۶،۳۰۲،۳۰۳،۳۲۰،۳۵۵
(حضرت) معاویہؓ اور تاریخ حقائق ۳۰۴
معجم البلدان للحموی ۶۵،۶۷،۶۸،۷۶
۹۱،۱۴۱،۱۴۲،۱۶۹،۲۲۱،۲۵۵
۲۹۰،۲۹۸
المعجم الکبیر للطبرانی ۱۵،۴۵،۱۸۰
معجم ما استعجم (للبکری) ۶۵،۱۶۹
۱۷۲
معراج، شب ۱۴۶
معراج النجاح ۳۰۷
معرکۃ الایمان والمادیت ۲۲۵
معز لدین اللہ ۱۴۲،۱۴۹
(بنو) معن ۲۳۶
معہد الرشید الاسلامی ۵۹۵

المغازی للواقدی ۱۷۳،۲۲۹،۲۳۱
مغلس مقطی ۲۷
مغنی اللبیب ۱۵۹
(حضرت) مغیرہ بن شعبہؓ ۶۶،۶۹،۷۴
مفتاح العادۃ ۴۱
مفتی اعظم دار العلوم دیوبند ۵۰۶
مفتی مصر ۴۹۳
مفرداتِ القرآن ۲۳
المقامات الحریریۃ ۴۲۱
مقبرۃ باب الدیر ۲۴
مقبرۃ الخیزران ۴۰،۴۲
مقبرۃ قاسی ۵۰۱،۵۰۳
مقدسی، ابوعبداللہ البشاری المقدسی ۲۲۱
مقدمۃ المعارف ۱۷
مقدونی، سکندر مقدونی ۱۴۰،۲۵۳
مقریزی، علامہ ۸۳،۸۴،۸۷
۱۴۷،۱۵۲
مقوقس (شاہ مصر) ۱۲۲،۱۲۳،۱۲۴
۱۲۷،۱۲۹،۱۴۰،۱۴۱،۳۳۸
مکتبہ دار العلوم کراچی ۵۱۶،۵۵۶
مکتبۃ المثنی ۴۳،۴۴
مکتوبِ گرامی ۳۳۸
مکہ مکرمہ ۸،۹،۱۱،۲۱،۴۱،۴۸
۵۲،۱۳۰،۱۳۱،۱۵۴،۲۰۲،۲۲۸
۲۳۶،۲۵۸،۲۵۹،۲۶۳،۲۶۵
۲۶۶،۲۶۸،۲۹۴،۵۲۰،۵۵۳
۴۸۷
ملائیشیا ۱۱،۳۷۵،۳۷۶
ملایا ۳۷۶،۳۸۳،۵۴۲،۵۶۶
۵۶۷،۵۶۸
ملتقی الفکر الاسلامی ۸۱،۹۳
(ابن) الملقن ۱۵۶
الملک المؤید ۱۶۱
الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ۲۴۴
المملکۃ الہاشمیۃ الاردنیۃ ۲۴۸
مملوک سلاطین ۳۳۸
منارۃ العروس ۲۷۷
مناقب الامام الاعظم للمکی ۴۱
المنتظم لابن جوزی ۲۰
المنجد ۱۰۴
(ابن) مندہ ۳۹۹،۴۰۳
منصور، خلیفہ ۱۷،۱۸،۱۹،۴۲
۶۰،۶۱،۱۳۴
منظمۃ المؤتمر الاسلامی۔ دیکھئے۔
آرگنائیزیشن آف اسلامک کانفرنس
(ابن) منظور (مؤرخ) ۲۵۳

www.freepdfpost.blogspot.com

(مولانا) منظور حسین ۶۰۱
منف ۱۴۰، ۱۴۳
منکارہ ۸۵، ۸۶
۴۲۸
منگ خاندان ۴۱۷، ۴۲۱، ۴۲۳
منگ مقبرے ۴۲۸، ۴۳۰
منگولیا ۴۱۱، ۴۲۷، ۴۵۹
منٰی ۵۰۵، ۵۰۹
مواحدین (شاہی خاندان) ۹۷، ۹۸
موتہ ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۱
۲۳۴، ۲۳۵
موجبات الأحکام ۴۵
موریہ ۳۲۷
موزنبیق ۵۵۱
(حضرت) موسیٰ علیہ السلام ۶۸، ۱۲۹
۱۴۰، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹
۲۹۶
(حضرت) موسیٰ الأشعریؓ ۱۹۹
(حضرت) موسیٰ کاظم ۳۲، ۳۳، ۳۴
۳۵، ۳۶
موسیٰ بن المہدی (خلیفہ) ۳۸
موسوعہ۔ دیکھیں۔ انسائیکلوپیڈیا
موصل ۱۷
موطا امام مالکؒ ۱۳۲
موقع أصحاب الکہف ۲۱۵، ۲۱۹
۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳
مولسری ۵۰۱
مونٹ لارنس ۵۹۷
موئے مبارک ۳۳۸
(ابو) المہاجر ۱۱۰
مہاجر مکی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۵۲۰، ۵۲۵
مہتمم جامعہ نعیمیہ لاہور ۴۰۹
مہتمم دار العلوم دیوبند ۵۰۲، ۵۰۷
(امام) مہدی علیہ السلام ۲۷۷
مہدی، خلیفہ ۱۸، ۳۳
مہدی عباس ۳۲۱
مُہر مبارک ۳۳۸
مُہر نبوت ۴۹
میدان التحریر ۱۲۱
میدانیہ ۳۰۵
میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۵۲۸
''میرے والد ماجد'' ۵۰۳
میزاب رحمت ۳۳۹
میزان الاعتدال للذھبی ۶۹
میکرو پیڈیا ۲۱۰

میکگل یونیورسٹی ۵۸۹
میکلا غارد (استنبول) ۳۱۸
(ام المومنین حضرت) میمونہؓ ۲۷۱
۵۵۵
''ن''
بامبلس ۱۹۱، ۲۰۶
نادر شاہ ۳۴۲
ناصر، ڈاکٹر ۳۷۹، ۳۸۲
ناصر بن علناس ۹۱
ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ۵۳۳
ناعم قلعہ خیبر ۱۶۹، ۱۷۰
ناقۂ قصواء ۳۵۵
ناگا پربت ۴۱۰
(درۂ) ناکو ۴۲۵
نانوتوی، مولانا محمد احسن ۵۱۶
نانوتوی، حجۃ الإسلام مولانا محمد قاسم
۵۰۱، ۵۱۶، ۵۱۸
نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی ۵۱۶
۵۱۸
نانوتوی، مولانا مملوک علی نانوتوی
۵۱۶، ۵۲۵
نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی ۵۱۶، ۵۱۸
۵۱۹
نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ۵۱۶
۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۸
نانوتہ ۵۱۲، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۹
نائب شیخ الأزھر ۱۵۲
نائب صدر صوبائی سیاسی مشاورتی کمیٹی
۴۳۹
نائب قونصل ۴۷۶
نبطی بُت پرست ۲۱۷
نپولین، بوناپارٹ ۳۴۲
النتف فی الفتاویٰ ۴۵
نٹال ۷، ۵۴۲، ۵۴۴، ۵۴۸
شیخ نجار ۵۶۸
نجار، عبدالوہاب نجار (مصر محقق) ۱۸۹
۲۰۹، ۲۱۰
نجاشی (شاہِ حبشہ) ۲۳۹، ۲۶۷
۲۶۸
نجران ۱۳۰، ۱۳۱
نجف ۷۳، ۷۴، ۷۵
(حضرت) بابا نجم احسنؒ ۵۳۰
النجوم الظاھرہ لابن تغری بردی ۱۲۳
۱۲۷، ۱۲۸
نخبۃ الفکر ۱۵۵
ندوۃ ۵۳۴

www.freepdfpost.blogspot.com

ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۵۵
۳۴۰، ۳۹۶، ۴۰۷، ۵، ۵۳۲، ۵۳۳
۵۳۴
ندوی، پروفیسر حبیب الحق ندوی ۵۴۹
۵۵۶
ندوی، ڈاکٹر سلمان ندوی ۵۴۹، ۵۶۹
ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی ۱۸۸، ۲۱۸
۵۲۳۸، ۵۴۹، ۵۶۹، ۵۷۰
ندوی، مولانا عبدالباری ندوی ۵۲۱
النسائی، سنن ۲۰۲
نصب الرایہ ۱۰۰
نصرانی عالم ۴۸
نصیری ۳۰۸
النصیف، شیخ عبداللہ عمر نصیف ۱۱
بنو نصیر ۱۶۹، ۱۷۳
نطارۃ (قلعہ خیبر) ۱۶۹
خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ۵۳۰
شیخ نظیم ۵۶۴، ۵۶۸
نعلی آبشار ۵۸۴، ۵۸۵
نعمانی، مولانا محمد منظور نعمانی ۵۳۳
۵۳۵، ۵۴۳
جناب نعیم صاحب ۶۰۱
(ابو) نعیم، امام ۷۶، ۱۹۶
۳۹۹، ۴۰۳
نعیمی، علامہ نعیمی ۲۷۶
نعیمی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی ۴۰۹، ۴۴۳
نمرود ۲۹۳
حضرت نوح علیہ السلام ۶۵، ۶۸
۸۳، ۲۵۳
نورالأنوار ۲۲
نورالأیضاح ۳۰۷
(مولانا) نورالحسن ۵۲۰
نوسانشلرا ۳۷۷
نہاوند ۲۹
نہفۃ العلماء ۳۷۹
نیاگرا آبشار ۵۸۳، ۵۸۵، ۵۸۶
نیپال ۴۱۱
نیروبی (کینیا) ۴، ۸، ۵۴۱، ۵۵۲
۵۵۴، ۵۷۰، ۵۷۲
نیشنل پیپلز کانگریس ۲۶۱
نیل، دریائے ۸۳، ۸۴
۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۸، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۴۷
۴۹۴
نیلس پرٹ ۵۴۴
نیوجے اسٹریٹ ۴۱۷
نیوجے مسجد ۴۱۸

نیوکاسل ۵۴۸
نیوورلڈ پریس ۴۶۰
نیویارک ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۸۳
۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۲۸۸، ۵۴۲
۵۴۹، ۶۰۳، ۶۰۶
"و"
واٹرفال ۵۴۷، ۵۵۴، ۵۵۶
واٹرفال اسلامک انسٹی ٹیوٹ ۵
واٹرلو ۵۷۵، ۵۷۷، ۵۷۸
۵۷۹
وادیٔ شعیب ۱۸۸، ۱۹۰
وادیٔ صومام ۱۰۳
وادی القریٰ ۱۷۷
واسکوڈی گاما ۷، ۵۶۵
واشنگٹن ۴۷۵، ۴۸۳، ۴۸۵
۴۸۶
واقدی علامہ ۲۰۰
(حضرت) والد صاحبؒ (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) ۹، ۲۰۷، ۲۱۵
۲۶۱، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۸
۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷
۵۱۹، ۵۲۲، ۵۲۶، ۵۲۹، ۵۴۳
۵۴۴، ۵۴۵، ۶۰۰
مسٹر، وانگ یان ۴۴۶
واں لی ۴۲۹
وراچھیہ، امین وراچھیہ ۵۵۲
وراچھیہ، ابوبکر وراچھیہ ۵۵۲، ۵۵۳
۵۵۴
وراچھیہ ۵۵۲
وراچھیہ فیملی ۵۵۲
ورلڈ اسلامک کال سوسائٹی ۳۳۰
ورلڈ ٹریڈ سینٹر ۶۰۳
وزارۃ الاوقاف ۱۵، ۴۴، ۴۵
۵۵
وزارۃ خارجہ ۴۲۵
وزارۃ الشؤن الدینیہ ۹۰
وزارۃ مذہبی امور ۱۵، ۱۶، ۸۱
۹۳، ۳۸۰، ۴۰۹، ۴۲۵، ۴۳۲
وزیر اطلاعات ۸۲، ۳۳۲
وزیر اعظم ہندوستان ۵۵۰
وزیر اقلیتی اقوام ۴۳۰
وزیر اوقاف ۴۴
وزیر الشؤن الدینیہ ۱۱
وزیر مذہبی امور ۳۷۵، ۳۷۷
وصیت العرفان ۵۳۱
(حضرت مولانا شاہ) وصی اللہ ۵۲۱
۵۳۰، ۵۳۱

www.freepdfpost.blogspot.com

الوطیح (قلعہ خیبر) ۱۶۹،۱۷۱
وفاقی شرعی عدالت ۳۷۵: وفیات
الأعیان ۲۸۰
(حضرت ابو) وقاصؓ ۴۱۴
وکٹوریہ (دمشق) ۲۵۲،۳۰۱
وکٹوریہ جھیل ۱۴۷
حضرت، وکیع بن جراحؒ ۷۰
وکیل الأزھر ۱۵۱،۱۵۲
وکیل وزارۃ العدل ۱۱
(ڈاکٹر) ولفریڈ کینول اسمتھ ۵۹۱
ولندیزی ۳۷۸،۳۷۹
ولندیزی شرق الہند ۳۷۸
ولید بن عبدالملک ۸۹،۲۷۲
۲۷۳،۲۷۴،۲۷۵،۴۱۴
ولی عہد ریاست قطر ۳۹۷
وھبی سلیمان، شیخ ۱۸۳
الوھم والابہام ۱۰۰
وی آئی پی لاؤنج ۸،۴۱۲،۴۳۶
ویت نام ۱۱
ویسٹ آئی لینڈ ۵۹۵
ویسٹ انڈیز ۶۰۵
ویسٹ ورجینیا ۴۷۵
ویغور ۴۱۴
ویمبلے ۵۸۲

"ھ"

ھابیل ۲۸۴
ھاروت ۶۵
ہارون رشید، خلیفہ، ۱۸،۳۳،۳۴
۳۷،۱۳۰،۳۲۱
(محمد ہاشم) لونات ۵۵۲
ھاشمیہ ۱۷
ہالی ڈے ان ہوٹل ۴۷۶،۴۸۲
ہان ۴۱۴
ہانگ کانگ ۴۵۳
(حضرت) ہانی بن عروۃؓ ۷۰
ہاؤسنگ کارپوریشن ۵۹۹
ہاؤسنگ کوآپریٹو کارپوریشن ۵۸۱
(ابن) ھبیرہ ۴۱
ھیوڈروم ۳۳۵
ہدی الساری ۱۵۵
ھرقل، شاہ روم ۱۸۰،۱۸۱،۲۳۰
۳۹۹،۴۰۴
الہرام الأکبر ۸۳،۸۵،۸۶
ہرم اوسط ۸۶،۸۷
(أبو) ھریرۃؓ ۲۳۹
(ابن) ہشام نحوی ۱۵۸،۱۵۹
ہشام بن عبدالملک ۳۰۲،۳۲۱
ہلٹن ہوٹل ۵۵۴
(علامہ ابن) ھمامؒ ۱۳۵
ہندو ۳۷۹،۵۳۸،۵۴۲
ہندوستان ۷،۳۶،۵۷،۳۶۴
۳۷۵،۳۷۷،۳۷۹،۳۸۹،۳۹۵
۳۹۶،۴۱۱،۴۹۷،۵۰۵،۵۰۶
۵۰۷،۵۰۸،۵۰۹،۵۱۲،۵۲۴
۵۳۵،۵۳۶،۵۳۷،۵۳۸
۵۴۲،۵۴۳،۵۶۵،۵۶۸،۵۷۰
ہندی الأصل باشندے ۵۴۶،۵۴۹
۵۵۱
ہنگری ۳۶۲
ہوا کوفنگ ۴۵۹،۴۶۰،۴۶۳
ہوٹی ۴۱۴،۴۱۷
(دی) ہولی آرتھوڈوکس چرچ ۳۴۴
ہی پولیس ۳۱۸
ہشیمی، علامہ ابن حجر ہشیمیؒ ۳۵
ہیٹ وار ۳۶۶
ہیک پورٹ ۵۴۴
ہیئۃ المکتب ۱۱،۱۳

"ی"

(حضرت مولانا محمد) یحییٰؒ ۵۰۲،۵۲۸
یافعیؒ ۳۸
یافعیؒ، حضرت ابو مسلم یافعی ۸۸
یثرب (مدینہ طیبہ) ۱۷۳
(حضرت) یحییٰ علیہ السلام ۲۷۵
(حضرت) یحییٰ بن معین ۳۸
یزید بن خالد ۷۴،۷۶
(حضرت) یزید بن ابی سفیان ۱۷۷
یزید بن معاویہ ۱۰۸،۲۵۶،۳۲۰
۳۵۵،۳۵۶
(مفتی ابو) الیسر ۳۰۶
(مولانا) یعقوب باوا ۶۰۱
یعقوب ساروغی (جیمس کاہن) ۲۱۷،۲۱۸
یمان ۴۸،۵۲،۵۳
یمن ۱۳۰،۱۸۹،۲۰۲،۲۱۵،۲۹۳
۲۹۴،۵۱۳
الیمنی عمارۃ الیمنی (فقیہ) ۸۷
(مسٹر) ینگ ۵۵۸،۵۵۹،۵۶۰
۵۶۳
ینی چری ۳۲۸
یوآن ۴۱۷،۴۶۸
الیواقیت والدرر ۱۶۱
یورپ ۱۱۲،۱۱۶،۱۱۸،۲۱۲،۲۷۸
۲۸۰،۳۱۶،۳۲۲،۳۲۳،۳۲۵

www.freepdfpost.blogspot.com

۳۴۲،۳۴۴،۳۴۸،۳۶۱
۳۶۲،۳۶۹،۳۷۰،۳۷۶،۳۸۳
۴۳۷۵،۵۲۴،۵۳۷،۵۴۲،۵۵۰
(حضرت امام ابو) یوسف ۳۶،۳۷
۳۸،۳۹،۴۰،۴۵،۷۰
(مفتی محمد) یوسف صاحب ۵۸۲،۶۰۵
یوسف ایمجی ۵۵۲
یوسف بن ۶ تا شفعین
یوسف جیری ۱۱
یوسف قلیچ، ڈاکٹر ۳۳۲،۳۵۴
۳۶۳،۳۷۰،۳۷۱
(مولانا) یوسف کران ۵۶۸
یوسف ماتن ۴۳۹
یوسف نانا بھائی ۵۵۲
(حضرت) یوشع علیہ السلام ۱۸۶،۱۸۷،۲۹۶
یوگنڈا ۱۴۷،۵۷۱،۵۷۲
یونان (جمہوریہ) ۳۱۴،۳۱۵،۳۲۲
۳۴۳،۴۹۳
یونانی زبان ۳۷۸
یونانی فلسفے ۳۱۵
(حضرت) یونس علیہ السلام ۶۸
(مولانا محمد) یونس ۵۴۸
مولانا محمد یونس پٹیل ۱۸
(شیخ) یونس بان سین ۴۳۷،۴۳۸
۴۳۹،۴۴۳،۴۴۶
یوھانی (بحیرہ) ۴۳۶
یہودی ۵۴۲،۵۵۸
(مسٹر) لی جیانگ ینگ ۴۶۱

ختم شد

سفر در سفر

سفر نامہ

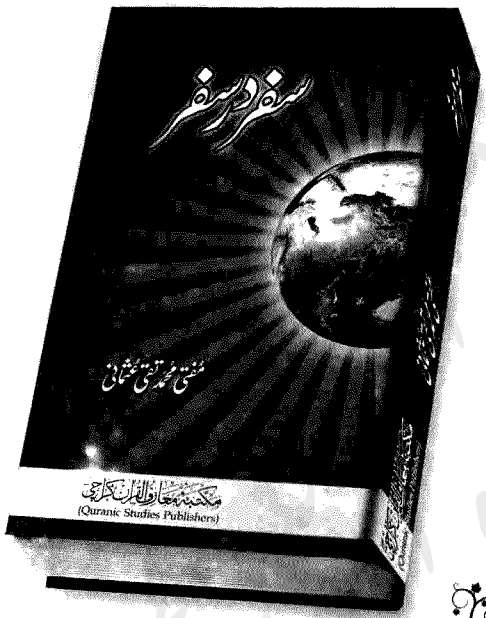

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

www.freepdfpost.blogspot.com

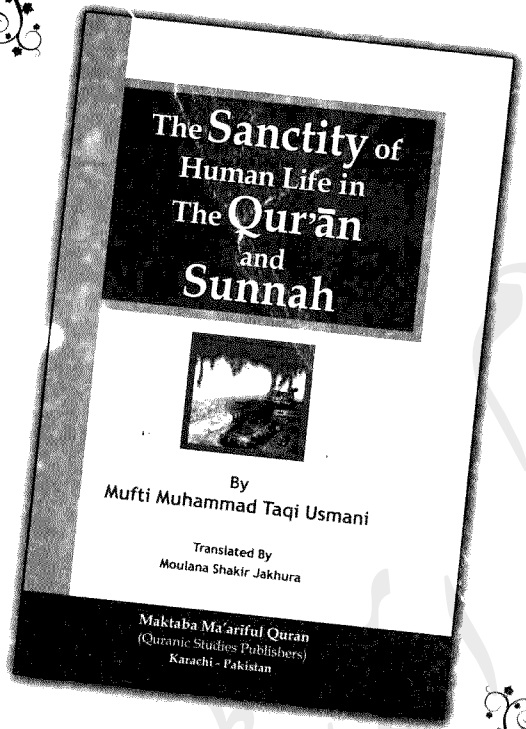

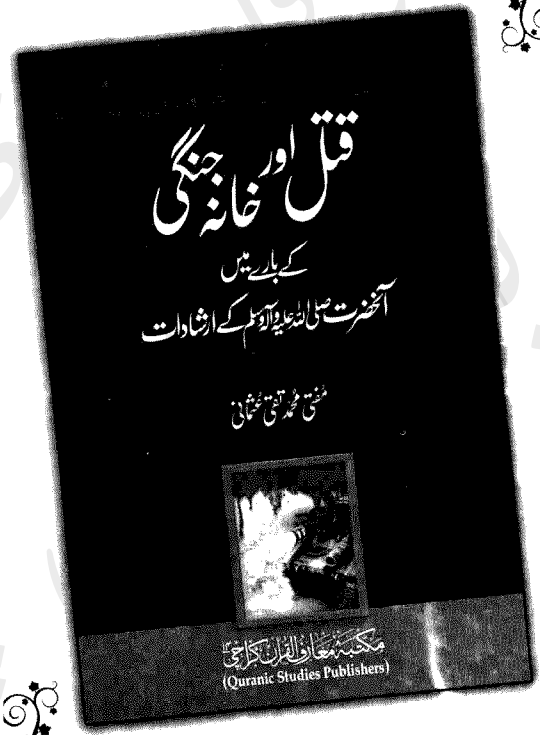

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

www.freepdfpost.blogspot.com

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

- عہدِ یونان سے موجودہ دور تک کے سیاسی نظریات
- مختلف نظام ہائے حکومت
- اسلامی اصولِ سیاست
- عہدِ حاضر میں ان اصولوں کا نفاذ

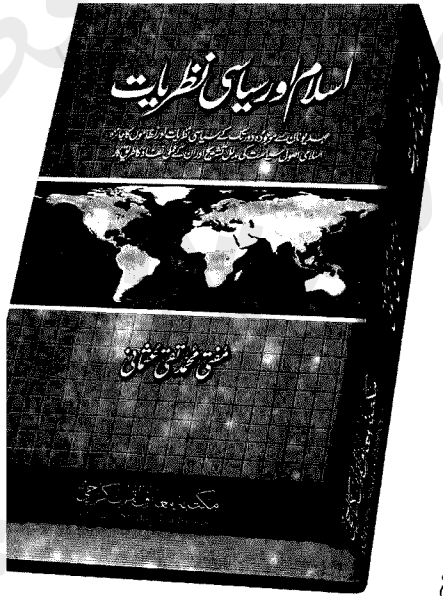

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

www.freepdfpost.blogspot.com

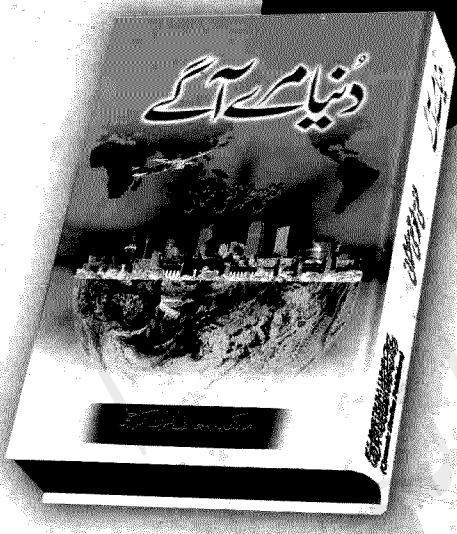

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
www.quranicpublishers.com

www.freepdfpost.b